مون ڈائجسٹ

کراچی میں رقصِ ابلیس!

پسِ پردہ خفیہ ہاتھ کس کا ہے؟

چوتھا مارشل لاء ہرگز نہیں لگنے دیں گے!

بے نظیر بھٹو

Pakistanipoint
Waqar
Azeem

ملتان ترقیاتی ادارہ ملتان

شارٹ ٹنڈر نوٹس

مندرجہ ذیل آئٹم/ شیڈول سربمہر ٹینڈر ملتان ترقیاتی ادارہ ، ایچ اینڈ پی ، پی ڈبلیو ڈی ، آئی اینڈ پی پبلک ہیلتھ اور واپڈا وغیرہ کے منظور شدہ ٹھیکیداران جنہوں نے سال نو کی تجدید کرائی ہے ، مطلوب ہیں۔ زرضمانت بطور کال ڈیپازٹ کسی بھی شیڈولڈ بنک سے بحق ڈائریکٹر فنانس ایم ڈی اے ٹینڈر کے ہمراہ منسلک ہونا چاہیے ورنہ ٹینڈر قابل قبول نہ ہوگا۔ نیز ٹینڈر کھولنے والے دن کوئی ٹینڈر جاری نہ ہوگا دیگر شرائط طلب کردہ اتھارٹی سے کسی روز ٹینڈر کھولنے سے کم از کم ایک دن قبل حاصل کی جا سکتی ہیں۔

تفصیل کام	اندازہ لاگت زرضمانت	قیمت ٹینڈر مدت تکمیل	طلب کردہ اتھارٹی	تاریخ اجراء تاریخ وصولی
۱- جی پی - ۶۵ اسمبلی پویلین اور ریسٹ ہاؤس کی تعمیر	۶٫۲۰ لاکھ ۱۲۴۰۰/-	۳۰۰/- ۶ ماہ	ایکسی این نمبرا	۲-۸-۸۹ ۳-۸-۸۹
۲- جی پی - ۸۸ ڈویلپمنٹ چوک کیفے عرفات قلعہ کہنہ قاسم باغ (اضافی کام)	۸٫۰۰ لاکھ ۱۶۰۰۰/-	۴۰۰/- ۴ ماہ	ایضاً	ایضاً

ملتان ترقیاتی ادارہ
ملتان

آئی پی ایل ۵۳۶۹

ٹینڈر نوٹس

محکمہ خوراک کے رجسٹرڈ شدہ ٹھیکیداران برائے سال ۱۹۸۹ء سے ۹۰-۱۹۸۹ء کے لئے یکم اگست ۱۹۸۹ء سے شروع ہو کر ۳۱ جولائی ۱۹۹۰ء کو اختتام پذیر ہوگا۔ سربمہر ٹینڈر بابت پلیداری، باربرداری اور نقل و حمل اندرون ضلع گوجرانوالہ گندم چینی اور باردانہ وغیرہ درکار ہیں۔ خواہشمند حضرات مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۸۹ء دو بجے دوپہر تک زیر دستخطی کے دفتر واقع سول لائن ہسپتال روڈ گوجرانوالہ سے بعوض ۵۰/- روپے فی ٹینڈر فارم سرکاری خزانہ میں جمع کروا کر چالان پیش کر کے خرید سکتے ہیں۔ ٹینڈر بابت نقل و حمل پلیداری و باربرداری گندم، چینی اور باردانہ وغیرہ مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۹ء ساڑھے دس بجے صبح تک سربمہر لفافہ میں سیل بند صندوقچی میں مذکورہ بالا دفتر میں ڈالنے ہوں گے جو اسی روز ٹھیک گیارہ بجے قبل از دوپہر روبرو ٹینڈر دہندگان یا ان کے بااختیار نمائندگان جو اس وقت موجود ہوں گے کھولے جائیں گے۔ کوئی ٹینڈر دستی وصول نہیں کیا جائے گا اور محکمہ ہذا کے نا کام ٹھیکیداروں کو ٹینڈر فارم جاری نہیں کئے جائیں گے۔

الف۔ مقامی پلیداری و باربرداری

نام مرکز خرید	ٹینڈر دینے کی مجاز کیٹگری	زرِ بیعانہ	زرِ ضمانت
۱۔ حافظ آباد	سی اور ڈی	۶۰۰۰/- روپے	۱۲۰۰۰/- روپے
۲۔ سکھیکی	〃	۲۰۰۰/- 〃	۴۰۰۰/- 〃
۳۔ کاموکی	〃	۵۰۰۰/- 〃	۱۰۰۰۰/- 〃
۴۔ ایمن آباد	〃	۵۰۰۰/- 〃	۱۰۰۰۰/- 〃
۵۔ نوشہرہ ورکاں	〃	۵۰۰۰/- 〃	۱۵۰۰۰/- 〃
۶۔ گکھڑ	سی اور ڈی	۳۰۰۰/- روپے	۶۰۰۰/- روپے

ب۔ نقل و حمل گندم
چینی اور باردانہ وغیرہ اندرون ضلع گوجرانوالہ

شرح کرایہ حسب ذیل فاصلوں کے مطابق درج کرتے ہوں گے

۱۔ ایک کلومیٹر تا ۲۵ کلومیٹر

۲۔ ایک کلومیٹر تا ۵۰ کلومیٹر

۳۔ ایک کلومیٹر تا ۷۵ یا زائد کلومیٹر

نام مرکز خرید گندم	ٹینڈر دینے کی مجاز کیٹگری	زر بیعانہ	زر ضمانت
۱۔ واہنڈو	سی اور ڈی	۳۰۰۰/- روپے	ورک آرڈر کی مالیت کا ۶ تا ۱۰ فیصد
۲۔ کاموکی	〃	۵۰۰۰/- 〃	〃
۳۔ ایمن آباد	〃	۵۰۰۰/- 〃	〃
۴۔ تتلے عالی	〃	۵۰۰۰/- 〃	〃
۵۔ نوشہرہ ورکاں	〃	۵۰۰۰/- 〃	〃
۶۔ قلعہ دیدار سنگھ	〃	۳۰۰۰/- 〃	
۷۔ نوکھر	〃	۳۰۰۰/- 〃	〃
۸۔ کوٹ لدھا	〃	۳۰۰۰/- 〃	〃

۹۔ گکھڑ	سی اور ڈی	۳۰۰۰/- روپے	ورک آرڈر کی مالیت کا ۶ تا ۱۰ فیصد
۱۰۔ چوڑاسیان	"	" ۳۰۰۰/-	"
۱۱۔ مریدکے	"	" ۳۰۰۰/-	"
۱۲۔ کھیوںوالی	"	" ۳۰۰۰/-	"
۱۳۔ احمد نگر	"	" ۵۰۰۰/-	"
۱۴۔ علی پور چٹھہ	"	" ۲۰۰۰/-	"
۱۵۔ حافظ آباد	"	" ۶۰۰۰/-	"
۱۶۔ کوٹ مبارک	"	" ۲۰۰۰/-	"
۱۷۔ کولوتارڑ	"	" ۲۰۰۰/-	"
۱۸۔ کالیکی	"	" ۳۰۰۰/-	"
۱۹۔ ونیکے تارڑ	"	" ۳۰۰۰/-	"
۲۰۔ جلال پور بھٹیاں	"	" ۶۰۰۰/-	"

مراکز خرید گندم قلعہ دیدار سنگھ اور گکھڑ سے نقل و حمل گندم اور باردانہ وغیرہ اندرون ضلع کے لئے صرف ایک کلومیٹر تا ۲۵ کلومیٹر فاصلوں کے ٹینڈر درکار ہیں لہٰذا خواہش مند حضرات نوٹ فرمالیں۔

دیگر شرائط ٹینڈر وہی ہوں گی جو روزنامہ جنگ، مشرق، وفاق اور تجارت کے شمارہ مؤرخہ ۲ مارچ ۱۹۸۹ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ نوٹ فرمالیں۔

(چودھری عبدالمجید)

ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر گوجرانوالہ

آئی پی ایل ۵۹۵۹

نوٹس نیلام عام

برائے پٹہ

عوام الناس کی اطلاع کے لئے بذریعہ اشتہار ہذا مشتہر کیا جاتا ہے کہ درج ذیل پلاٹس یا پانڈ ایریا کو برائے ایک سال (۸۹/۶/۱ تا ۱۹۹۰/۵/۳۱) دفتر زیر دستخطی میں برائے پٹہ مؤرخہ ۸۹-۷-۳۱ بوقت ۱۱ بجے صبح کو نیلام کیا جائے گا۔

سائٹ (پلاٹ) کے مختصر کوائف				رقبہ	زر بیعانہ
۱۔	اراضی برائے کاشت پلاٹ	نمبر۱	در حدود موضع کری تحصیل و ضلع گجرات	۱۵۵ ایکڑ	۵۰۰/- روپے
۲۔	"	نمبر۲	" "	" ۳۲۶	" ۲۰۰/-
۳۔	"	نمبر۳	" "	" ۱۴۲	" ۲۰۰/-
۴۔	"	نمبر۴	" "	" ۱۴۰	" "
۵۔	"	نمبر۵	در حدود موقع مرالہ سگری پور تحصیل و ضلع سیالکوٹ	" ۱۴۰	" "
۶۔	"	نمبر۶	" موضع منور پور " "	" ۴۵	" "
۷۔	"	نمبر۷	" " زندہ جوال "	" ۱۹۰	" "
۸۔	"	نمبر۸	" موضع چیپراڑ " "	" ۲۶	" "
۹۔	"	نمبر۹	" موضع چھن پروال بے چراغ " "	" ۳۲	" "
۱۰۔	"	نمبر۱۰	" موضع مہد پور " "	" ۲۵	" "
۱۱۔	"	نمبر۱۱	" موضع چھن خھر پور گورد خیر " "	" ۲۶۴	" "
۱۲۔	"	نمبر۱۲	" "	" ۱۹۰	" "
۱۳۔	"	نمبر۱۳	" موضع سکہ بیلا " "	" ۵۰	" "
۱۴۔	"	نمبر۱۴	" "	" ۵۰	" "

وقار اعظم پاکستانی ورثہ ڈاٹ کام

شرائط نیلام

۱۔ نیلام میں شرکت کرنے کے خواہش مند افراد کو ہر صورت میں درج ذیل زرِ بیعانہ داخل کرانا ہوگا جو ناکام بولی دہندہ کو واپس کر دیا جائے گا۔
۲۔ کامیاب بولی دہندگان سے پیشکش کی کل رقم موضع پر وصول کی جائے گی۔
۳۔ سب سے اونچی بولی کی منظوری اتھارٹی مجاز کے تابع ہوگی۔
۴۔ پلاٹ میں موجود اشجار کا نقصان بذمہ کامیاب بولی دہندہ ہوگا۔
۵۔ کامیاب بولی دہندہ کو بعد منظوری لیز ایگریمنٹ کرنا ہوگا۔
۶۔ محکمہ کو مدت لیز کے دوران اراضی یا اس کے کسی حصّہ کی ضرورت ہونے پر بولی دہندہ کو اس کو چھوڑنا ہوگا۔
۷۔ محکمہ ہذا سب سے اونچی بولی کو منظور کرنے کا پابند نہ ہوگا۔ جب تک مجاز اتھارٹی اس کو موزوں نہ سمجھے۔
۸۔ محکمہ اور پٹہ دار کے درمیان تنازعہ کی صورت میں سپرنٹنڈنگ انجینئر یو سی سی لاہور کا فیصلہ حتمی ہوگا۔
۹۔ رقبہ اور سائٹ پلان دفتر زیر دستخطی میں کسی بھی اوقات کار کے دوران دیکھے جا سکتے ہیں۔
۱۰۔ اراضی ہذا پر پختہ عمارات کی تعمیر ممنوع ہوگی۔
۱۱۔ محکمہ بصورت نقصان فصلات بذریعہ آفات سماوی یا پانڈ کی سطح اونچی ہونے کی صورت میں کسی قسم کے نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا اور نہ ہی کوئی کلیم قابل قبول ہوگا۔
۱۲۔ نیلام پر پلاٹ کی سابقہ سہ سالا اوسط رقم سے بالا بولی سے شروع ہوگا۔
۱۳۔ محکمہ ہذا کو ان رقبہ جات سے بصورت ضرورت مٹی اٹھانے کا حق ہوگا جس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔
۱۴۔ بولی کو کسی وقت بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔
۱۵۔ اس سلسلہ میں دیگر متعلقہ شرائط بوقت نیلام سنائی جائیں گی۔

ایگزیکٹو انجینئر

مرالہ ڈویژن یو سی سی
ڈاک خانہ ہیڈ مرالہ ضلع سیالکوٹ

آئی پی ایل ۵۹۴۶

ٹینڈر نوٹس

محکمہ خوراک کے رجسٹرڈ شدہ ٹھیکیداران جن کی تجدید برائے سال ۱۹۸۹ء ہو چکی ہے سے سربمہر ٹینڈر برائے پلیداری / مقامی نقل و حمل / بار برداری گندم، چینی، باردانہ، سٹاک ریٹیکل وغیرہ بذریعہ ٹرک برائے سال ۹۰-۱۹۸۹ء (۸۹-۸-۱ تا ۹۰-۷-۳۱) درکار ہیں خواہشمند حضرات اپنے اپنے ٹینڈر مورخہ ۸۹/۷/۳۰ بوقت دس بجے قبل دوپہر تک زیر دستخطی کو پہنچا دیں اس کے بعد کوئی ٹینڈر قابل قبول نہیں ہوگا۔ ٹینڈر وصول کرنے کے بعد اسی روز ٹینڈر دہندگان یا ان کے مجاز نمائندگان کے رُوبرو کھولے جائیں گے۔ ٹینڈر فارم زیر دستخطی سے مبلغ ۵۰/= روپے فی فارم (ناقابل واپسی) کی ادائیگی پر مورخہ ۸۹-۷-۲۹ تک کال ڈپازٹ پیش کرنے پر حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ دوسرے اضلاع سے آنے والے حضرات اپنے متعلقہ ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر سے اپنی تسلی بخش کارکردگی کا سرٹیفکیٹ پیش کر کے ٹینڈر فارم حاصل کر سکیں گے ٹینڈر جن سے مفت، غیر معمولی، ناقابل عمل، ناقابل یقین ریٹ درج ہوں گے مسترد کر دیئے جاویں گے اسی طرح شیڈول ریٹ سے کم ریٹ بھی مسترد کر دیئے جائیں گے۔

حصّہ اوّل :- پلیداری / مقامی نقل و حمل

نمبر شمار	نام سنٹر	ٹینڈر دینے کی کیٹگری	مجاز رقم زرِ بیعانہ	رقم زرِ ضمانت
			روپے	روپے
۱۔	لالیاں	بی یا ڈی	۴۰۰۰/=	۸۰۰۰/=
۲۔	شورکوٹ روڈ	〃	۳۰۰۰/=	۵۰۰۰/=
۳۔	گڑھ مہاراجہ	〃	۳۰۰۰/=	۵۰۰۰/=
۴۔	دریام	〃	۳۰۰۰/=	۵۰۰۰/=
۵۔	رستم سرگانہ	〃	۳۰۰۰/=	۵۰۰۰/=

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مُون ڈائجسٹ

An Independent

جلد: ۷ شمارہ: ۰۷

چیف ایڈیٹر **ادیب جاودانی**
آرٹسٹ **سعیدالحسن**
آرٹ ایڈیٹر **فاروق امین**

اشتہارات **قاری سلطان احمد قاسمی** ○ انچارج مون پزل **مسعود احمد اصغر**

مجلس مشاورت

○ خالد شریف ○ اثر چوہان ○ فوزیہ ادیب ○ اقبال احمد خواجہ ایڈووکیٹ (مشیر قانون)

ہمارے نمائندے

اندرون ملک :- راولپنڈی اسلام آباد: شہریار خان • پشاور: زبیدہ فردوس زوبی • حیدر آباد: سعیدہ نازش
فیصل آباد: ملک سجاد انور • گوجرانوالہ: خالد جذبی • سیالکوٹ: ڈاکٹر چشتی مجاہد

بیرون ملک :- امریکہ: محمد ناظم شاہ، محمد منظم شاہ • سعودی عرب: نسیم سحر • برطانیہ، فرانس، مغربی جرمنی: محمد اسحاق ساجد
متحدہ عرب امارات: محمد خالد شہزاد • ڈنمارک، ہالینڈ: آصف عمر لطیف، ماہم عمر لطیف

رابطہ آفس: دفتر ماہنامہ "مُون ڈائجسٹ" ۶۳-سی شاہراہ قائد اعظم نزد ریگل چوک لاہور فون ۳۲۳۱۶۹
۳۱۲۵۶۰

ادیب جاودانی ایڈیٹر پبلشر نے باہتمام سیف الدین پرنٹر ابوالمعالی پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر ۲۷ نسبت روڈ لاہور سے شائع کیا

حصہ دوم :- بار برداری گندم، چینی، باردانہ، سٹاک آرٹیکلز وغیرہ اندرون ضلع جھنگ

جس فاصلہ کے لیے ٹینڈر درکار ہے

نمبر شمار	نام سنٹر	ٹینڈر دینے کی کیٹگری	مجاز تا ۲۵ کلومیٹر	ا تا ۵۰ کلومیٹر	۵۰ کلومیٹر سے زائد	رقم بیعانہ	رقم زر ضمانت
۱	جھنگ I - II - III	سی تا ڈی	درکار ہے	درکار ہے	درکار ہے	۳۰۰۰/-	۶ فیصد بمطابق ورک آرڈر
۲	چک کوڑیانہ	"	"	"	"	۵۰۰۰/-	"
۳	چنیوٹ	"	"	"	"	۵۰۰۰/-	"
۴	شورکوٹ روڈ	"	"	"	"	۵۰۰۰/-	"
۵	شاہ جیونہ منڈی	"	"	×	"	۵۰۰۰/-	"
۶	۱۸ ہزاری	"	"	×	"	۵۰۰۰/-	"
۷	ربوہ	"	"	درکار ہے	×	۵۰۰۰/-	"
۸	چک نمبر ۱۱	"	×	"	درکار ہے	۵۰۰۰/-	"
۹	لنگر مخدوم	"	درکار ہے	×	"	۵۰۰۰/-	"
۱۰	گڑھ مہاراجہ	"	"	درکار ہے	×	۵۰۰۰/-	"
۱۱	گڑھ موڑ	"	"	"		۵۰۰۰/-	"

شرائط

جملہ شرائط حسب سابق ہوں گی جو دفتری اوقات کار کے دوران زیر دستخطی میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ کال ڈیپازٹ صرف ضلع جھنگ کے شیڈولڈ بینکوں کی قابل قبول ہوں گی۔

ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر
جھنگ

آئی پی ایل ۵۹۳۴

ہم چوتھا مارشل لاء نہیں لگنے دیں گے!

دعوے اور عزم نیک ہے مگر عمل بھی ہونا چاہیئے اور حالات کی اصلاح بھی

کتنا بڑا المیہ ہے اور کیسی عجیب بدقسمتی ہے کہ پاکستان جو برصغیر کے مسلمانوں کی جمہوری رائے سے معرضِ وجود میں آیا تھا اس پر مارشل لاء کے سائے ہمیشہ منڈلاتے رہتے ہیں جو ملک ایک سیاسی جماعت "آل انڈیا مسلم لیگ" کے پرچم تلے اور ایک عظیم سیاسی رہنما قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں تشکیل پایا تھا اسی میں سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کو پابندِ نظر بند کرنے کے سلسلے چل نکلے اور اگرچہ یہ لطیفہ محسوس ہوتا ہے لیکن سو فیصد حقیقت ہے کہ ہم یا ہمارے سیاستدان اور سیاسی جماعتیں مارشل لاء میں جمہوریت کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں اور جمہوریت میں یہی حضرات اور جماعتیں، انتہائی کھینچا تانی اور بڑے زوروں کی کشمکش کے ساتھ مارشل لاء کے نفاذ کی کوششوں میں مصروف ہوتی ہیں ـــ!

محترمہ بے نظیر بجا کہتی ہیں کہ ہم چوتھا مارشل لاء نہیں لگنے دیں گے یا یہ کہ ہم نے مارشل لاء کے نفاذ کی راہیں مسدود کر دی ہیں لیکن یہ سوال اپنی جگہ پھر بھی موجود ہے کہ مارشل لاء کے نفاذ کا انسداد کیسے ہو سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہمیں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے اور یہ حقیقت ہے کہ آئین و قانون خواہ کتنے ہی مقدس و ارفع و اعلیٰ کیوں نہ ہوں وہ بہرحال کتابوں میں درج ہوتے ہیں اور طاقت کے مقابل آکر یہ کتابیں صرف کاغذ کے پرزے بن کر رہ جاتی ہیں۔

۱۹۷۳ء کا آئین اس قوم کا متفقہ آئین تھا یا ہے اس کے تحت مارشل لاء کے نفاذ (یا آئین کو ٹیک اوور کرنے) کی سزا موت مقرر تھی لیکن آئین کی یہ شق، مارشل لاء کے نفاذ کو نہ روک سکی اور نہ ہی اس شق نے مارشل لاء کے کسی محرک یا محرکین کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا اس کے برعکس خود منتخب (مگر متنازعہ) وزیراعظم کو پھانسی پر لٹکنا پڑا۔

سو بات یہ ہے کہ بھینس اسی کی ہوتی ہے جس کی لاٹھی ہو یا جس کے پاس لاٹھی ہو۔ بے شک یہ جنگل کا قانون ہے مگر مارشل لاء نافذ کرنے والے کب یہ کہتے ہیں کہ یہ تہذیب و تمدن کا قانون ہے؟

تو پھر اس خوفناک عمل کی روک تھام کیسے ہو؟ ہماری رائے میں اس مقصد کے حصول کے لیے سیاستدانوں کا عوام سے اتحاد ایک لازمی شرط ہے اور یہ کہ سیاسی جماعتوں کی جڑیں لازمی طور پر عوام میں ہونا چاہئیں کیونکہ صرف عوام ہی ایک ایسی طاقت ہیں جو کسی مارشل لاء کو گندے کپڑے کی طرح اٹھا کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں مارشل لاء کبھی نہیں لگتے۔ جرنیل جانتے ہیں کہ ان ملکوں کے باشعور عوام انہیں ملک پر مسلط نہیں ہونے دیں گے دور نہ جائیں صرف بھارت کی مثال لیں ـــ بھارت میں مارشل لاء کیوں نہیں لگتا ـــ؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بھارت کی سیاسی جماعتوں کی جڑیں عوام میں ہیں۔ بھارت کی آزادی کے ساتھ ہی اقتدار جس پارٹی کو منتقل ہوا وہ آل انڈیا نیشنل کانگرس تھی اور یہ جماعت بہرحال عوام میں سے ابھری تھی پھر اس ملک کے سیاستدان بھی عوام سے مربوط ہے۔ نتیجہ میں سیاسی عمل جاری رہا اور جمہوریت کی گاڑی بھی چلتی رہی۔

لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ صورتحال نہیں رہی۔ سب سے پہلا دھچکا جو سیاسی عمل کو لگا وہ حضرت قائداعظمؒ کی ناگہانی رحلت تھی اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ میں قائداعظم کے دست راست لیاقت علی خان بھی گولی کا نشانہ بن گئے اور پھر تو اللہ دے اور بندے، قسم کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں سیاسی عمل سرے سے غائب رہا۔ اس کے برعکس سیاست ڈرائنگ روموں میں اقتدار کے ایوانوں میں، سہولتوں اور آسائشوں میں، ریشہ دوانیوں اور سازشوں میں پھلنے پھولنے اور چلنے لگی۔ پرمٹوں، لائسنسوں اور پلاٹوں کے حرام مال پر اس کی پرورش ہونے لگی ظاہر ہے کہ ایسی سیاست اور سیاسی جماعتیں کیا گل کھلا سکتی ہیں؟ ایسے سیاستدان مارشل لاء کی مزاحمت کیا کر سکتے ہیں؟

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں بعض سیاستدان، خود فوجی جرنیلوں کو دعوت دیتے رہے کہ آئیے اور ہم پر سوار ہو جائیے۔ جمہوریت کے بعض نام نہاد چیمپئن "انتخاب سے پہلے احتساب" کے نعرے لگاتے رہے حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ انتخاب بذاتِ خود ایک احتساب ہوتا ہے۔ دوسرے بہت سے سیاستدان (الا ماشاء اللہ) پر اسرار قسم کی زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف ہوتے رہے۔ ان کا رویہ حبِ علی پر نہیں بغضِ معاویہ پر مبنی رہا یعنی یہ کہ اگر ہم برسر اقتدار نہیں تو تمہیں بھی برسر اقتدار نہیں رہنے دیں گے ے

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

یہ کہانی ہے ہمارے مارشل لاؤں کی اور ہمارے سیاستدانوں کی۔ بلاشبہ یہ کہانی شرمناک بھی ہے اور وسیع تر مفہوم میں فحش بھی۔ جس کا عنوان ہے کہ سیاستدانوں کو مارشل لاء کا ڈنڈا بہت پسند آتا رہا۔ ہم اس کی مزید تفصیلات میں جانے کی ہمت نہیں رکھتے اس لئے اس باب یا بات کو یہیں ختم کئے دیتے ہیں۔

اور اب پھر محترمہ بے نظیر کے اس دعوے کی طرف آجائیے کہ ہم چوتھا مارشل لاء نہیں لگنے دیں گے۔ اس دعوے میں مضمر خلوص نیت پر ہمیں قطعاً کوئی شبہ نہیں لیکن دعوے اور نعرے قوموں کی تقدیر کے لئے فیصلہ کن نہیں ہوتے۔ انہیں پرکھنے کے لئے عمل کو دیکھنا پڑتا ہے اور عملاً جو حالات ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں وہ ہرگز خوشگوار نہیں۔

صورتحال یہ ہے کہ اپوزیشن کے بعض سیاستدان تو باقاعدہ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ مارشل لاء آئے اور ان کے وارے نیارے ہوں بہت سے افراد، بڑی سنجیدگی سے ایسے حالات پیدا کرنے میں مصروف ہیں جو مارشل لاء کے لئے وجہ جواز بن سکیں یہاں ان کے نام اور حوالے دینے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ان سے سبھی آگاہ ہیں اور ان کی کوششوں کو بھی سبھی جانتے ہیں۔ ان کوششوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو لاقانونیت، بدامنی، لوٹ کھسوٹ اور چیرہ دستیوں کے واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ موجود ہے۔ خود بقول وزیراعظم "سندھ کے حالات اگرچہ خوفناک نہیں جیسا کہ ماضی میں تھے مگر تشویشناک ضرور ہیں"۔

اور سندھ کے حالات کی خرابی صرف آج کی بات نہیں۔ ایک عرصہ سے سندھ کی حالت دگرگوں ہے، قبل ازیں اس ضمن میں یہ دلیل دی جاتی رہی کہ حالات کی یہ خرابی مارشل لاء کی سختیوں اور غیر جماعتی انتخابات کا نتیجہ ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اب جبکہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی برسر اقتدار آچکی ہے تو پھر بھی سندھ کے حالات بدستور تشویشناک ہیں۔ اب کیا وجہ ہے کہ سندھ کے بڑے شہروں خصوصاً کراچی اور حیدرآباد میں فسادات کے سلسلے ختم نہیں ہو رہے ہیں؟ ڈاکوؤں کی سرگرمیاں جاری ہیں؟ ـــ آخر کیوں؟

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ سندھ میں گڑبڑ کی ذمہ داری بھارت پہ عائد ہوتی ہے جس کے تخریب کار اور دہشت گرد اس صوبہ میں مسلسل سرگرم عمل ہیں ـــ اگر یہ سچ ہے تو پھر وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو یہ بات راجیو گاندھی سے کرنا چاہیئے تھی جن سے چھ ماہ کی محدود سی مدت میں ان کی متعدد ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔

ہم پھر عرض کریں گے کہ صرف دعوؤں سے بات نہیں بنتی، محترمہ کا یہ عزم کتنا ہی نیک اور مبارک ہو کہ ہم چوتھا مارشل لاء نہیں لگنے دیں گے مگر اس کے لئے حالات کا بہتر ہونا اولین شرط ہے اور وہ شرط ابھی تک تو پوری نہیں ہو پا رہی۔ ان حالات میں اور بعض سیاستدانوں کے رویہ کے پیش نظر اگر چوتھا مارشل لاء نہیں آرہا تو ہماری رائے میں اس کا تمام کریڈٹ چیف آف آرمی سٹاف مرزا محمد اسلم بیگ کو جاتا ہے جنہوں نے ابتداء میں جمہوریت کی بحالی اور پھر اس کی برقراری و استحکام کے لئے غیر معمولی دانش و بصیرت اور وطن دوستی کا ثبوت دیا لیکن اس ایک غیر متنازعہ اور قابل تعریف کریڈٹ کے بعد جہاں تک سیاستدانوں پر ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو وہاں معاملہ صفر نظر آتا ہے۔ ان حالات میں ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ جمہوریت کی گاڑی چلتی رہے اور خدا کرے کہ عوام اپنے شعور و عمل سے جمہوریت پسندی کا ثبوت دیتے رہیں ـــ!

Pakistanipoint
Waqar Azeem

◉ آپ کے نونہال آپ کے پاس قوم کی امانت ہیں

◉ مستقبل کے معماروں کی تعلیم و تربیت کے لئے

لاہور اور فیصل آباد کے سب سے زیادہ معیاری تعلیمی ادارے

مون لائٹ سکولز

زیر اہتمام

مون لائٹ ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ

● مون لائٹ سکول شاہ عالم مارکیٹ لاہور فون نمبر ۳۲۱۳۸۹

● مون لائٹ سکول نسبت روڈ لاہور۔ فون نمبر ۶۶۷۰۶

مون لائٹ آئیڈیل سکول بھمبر روڈ گجرات فون نمبر ۷۸۴۵

● مون لائٹ سکول کشمیر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور فون نمبر ۴۴۰۷۳۷

● مون لائٹ سکول شام نگر چوبرجی لاہور

● مون لائٹ سکول غلام محمد آباد فیصل آباد فون نمبر ۳۱۶۱۹

ان تعلیمی اداروں میں بچوں کو جدید ترقومی تقاضوں کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے

مسز فوزیہ ادیب، چیئرمین مون لائٹ سکولز لاہور، فیصل آباد

تعلیم کا موجودہ طریق کار طبقاتی فرق کا آئینہ دار

وفاقی وزیر مملکت برائے تعلیم شہناز وزیر علی سے ایک ملاقات

پرائمری کی سطح پر مادری زبان میں تعلیم دی جانا چاہئے اور ہر بچہ کو پہلی جماعت سے انگریزی پڑھنے کا موقع ملنا چاہئے

یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم اب تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ہم اپنے بچوں کو انگریزی میں تعلیم دیں، اردو میں نصاب پڑھائیں یا انہیں علاقائی زبانوں میں تعلیم دی جائے ہمارے نظام تعلیم کے اس تضاد نے معاشرہ میں طبقاتی رجحان پیدا کیا ہے جو بچے انگریزی اسکولوں سے تعلیم حاصل کر کے باہر نکلتے ہیں ان میں ایک طرح کا احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے جب کہ اردو میڈیم والے بچے اپنے آپ کو کمتر محسوس کرتے ہیں موجودہ حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ تعلیم کا ایسا نظام رائج کیا جائے جس سے اس طبقاتی فرق کو کم کیا جا سکے ان خیالات کا اظہار تعلیم کی وفاقی وزیر مملکت بیگم شہناز وزیر علی نے ایک ملاقات کے دوران کیا انہوں نے کہا کہ تعلیمی نظام ہمیشہ اپنے ملکی حالات کے مطابق رائج کرنا چاہئے ہمارے ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں بلوچستان میں تو کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں ہم اردو میں تعلیم نہیں دے سکتے ویسے بھی ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ ایک چار پانچ سال کے بچے کو اپنی مادری زبان میں تعلیم دینا بہت آسان ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ جہاں ضرورت ہو وہاں بچوں کو پرائمری تک کی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے مگر اس پر بھی پابندی نہیں ہونا چاہئے جن علاقوں میں بچے اردو سمجھتے اور بولتے ہیں وہاں اردو میں آسانی سے تعلیم دی جا سکتی ہے شہناز وزیر علی نے مزید کہا کہ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے اس لئے اس کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا سائنس کی تعلیم کیلئے انگریزی پڑھنا ہمارے طالب علموں کیلئے اشد ضروری ہے اس لئے ہم اس کے حق میں ہیں کہ ہر بچے کو پہلی جماعت سے انگریزی پڑھائی جائے ویسے بھی میں سمجھتی ہوں کہ اچھی تعلیم حاصل کرنا ہر بچے کا حق ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں خواندگی کی شرح بڑھانے کے سلسلے میں موجودہ حکومت کیا اقدامات کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟ وزیر مملکت شہناز وزیر علی نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح بہت افسوس ناک ہے پورے ملک میں صرف 26 فیصد افراد لکھنا پڑھنا جانتے ہیں جب کہ خواندہ خواتین کی تعداد صرف تیرہ فیصد ہے اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے تعلیم کے شعبے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے تعلیم کا بجٹ 68 ٪ زائد کر دیا گیا ہے اور قومی مجموعی پیداوار کا 1ء3 حصہ تعلیم کے لئے مختص کیا گیا ہے بیگم شہناز وزیر علی نے مزید کہا کہ تعلیمی بجٹ کے 90 ٪ فنڈز صوبوں کو جاتے ہیں اب یہ صوبوں پر منحصر ہے کہ وہ ایسے منصوبے بنائیں کہ جلد از جلد زائد سکول کھولیں اور اس سلسلے میں دیہاتوں پر خاص توجہ دیں پھر ٹیچرز کی تقرری کریں اور سکول ایسی جگہوں پر بنائیں جہاں لڑکیاں آسانی سے پہنچ سکیں۔ بعض اوقات بہت دور سکول ہونے کی وجہ سے والدین اپنی بچیوں کو سکول نہیں بھیجتے۔

ایک اور سوال کے جواب میں بیگم شہناز وزیر علی نے کہا کہ ہمارے دیہاتوں میں لوگوں میں یہ شعور بڑی تیزی سے پیدا ہوا ہے کہ بچوں کو تعلیم دلوانا بہت ضروری ہے اور بچے بھی تعلیم حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہیں مگر ہمارے ہاں بیس پچیس ہزار سکول ایسے ہیں جو بغیر چھت اور چار دیواری کے کام کر رہے ہیں بچوں کو موسم گرما کی تیز دھوپ میں آسمان تلے، درختوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھنا پڑتا ہے ان سکولوں کے پاس بلیک بورڈ ہوتا ہے نہ استاد کے ہاتھ میں چاک ہوتا ہے سب بچوں کے پاس اپنی اپنی کتاب بھی نہیں ہوتی دو دو تین تین بچے مل کر ایک کتاب پڑھتے ہیں آپ خود سوچیں کہ ان حالات میں یہ بچے کیسے صحیح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں ہماری خواہش ہے کہ جن علاقوں میں اس قسم کی صورتحال ہے وہاں کے لوگ اپنی تکالیف ہمارے سامنے لے کر آئیں تاکہ ان کا ازالہ کیا جا سکے اور بچوں کی تعلیم کیلئے بہتر انتظامات کئے جا سکیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے نزدیک موجودہ تعلیمی نصاب جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ہے یا اس میں ردوبدل کیا جانا چاہئے بیگم شہناز وزیر علی نے کہا کہ ہمارا نصاب بہت فرسودہ ہو چکا ہے اسے یکسر بدلنے کی ضرورت ہے ہم نے آج تک اپنے نصاب میں جدید علم کی روشنی میں تبدیلیاں نہیں کیں سائنس میں بہت سی ایسی حقیقتیں ہیں جو تبدیل ہو چکی ہیں یورپ اور امریکہ تک میں سائنس کے بدلتے ہوئے حقائق کے مطابق نصاب تبدیل کر دیا جاتا ہے مگر ہم اب تک اپنے بچوں کو وہی چیزیں پڑھا رہے ہیں جن کی حقیقت بالکل تبدیل ہو چکی ہے تعلیم کی وزیر مملکت شہناز وزیر علی نے مزید کہا کہ چھوٹے بچوں کے بھاری بستے کا بوجھ کم کیا جانا چاہئے پرائمری کی سطح پر سلیبس کم کیا جائے پہلی سے تیسری جماعت تک صرف تین کتابیں ہونا چاہئیں ایک حساب کی کتاب ایک زبان کی کتاب ایک قرآن ناظرہ۔ پھر چوتھی جماعت سے بچوں کے سوشل اسٹڈیز پڑھائی جائے جس میں اس علاقہ کی آب و ہوا مناظر وغیرہ کے بارے میں بتایا جائے اور پھر جس طرح بچے کی جماعت بڑھتی جائے اسے پاکستان کی اور پھر پورے خطے اور اس کے بعد پوری دنیا کے بارے میں پڑھایا جائے مڈل اور میٹرک تک نصاب میں صحت اور غذا ماحولیات اور منشیات جیسے موضوعات شامل کئے جائیں بیگم شہناز وزیر علی نے مزید کہا کہ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو صحیح طور پر مرتب کریں اس پر اب ہم نے کام شروع کر دیا ہے کہ جہاں جہاں تاریخ کے بارے میں غلط بیانی کی گئی ہے اسے درست کیا جائے مثلاً بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بارے میں ہماری نصابی کتابوں میں بالکل ہلکا سا تذکرہ کیا گیا ہے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ہمت کر کے موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کو صحیح حقائق بتائیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ نجی تعلیمی ادارے جو آئے دن فیسوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اس پر کسی قسم کا کنٹرول ہونا چاہئے یا نہیں؟ بیگم شہناز وزیر علی نے کہا کہ نجی تعلیمی اداروں کو کنٹرول کرنے کیلئے پہلے سے قوانین موجود ہیں مگر اس پر عملدرآمد نہیں کروایا جاتا باقاعدگی سے سکولوں کا معائنہ نہیں ہوتا میں سمجھتی ہوں کہ نجی اداروں پر کوئی نہ کوئی کنٹرول ضرور ہونا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ جتنی فیس لے رہے ہیں وہاں بچوں کو اس قدر سہولتیں فراہم کر رہے ہیں یا نہیں انہوں نے مزید کہا کہ ایسے سکول بھی ہیں جو سات سو اور آٹھ سو روپے ماہوار تک فیس لیتے ہیں جو سکول چار سو روپے سے زائد فیس لے رہے ہیں ان کا ضرور باقاعدگی سے معائنہ ہونا چاہئے شہناز وزیر علی نے مزید کہا کہ سکول ایک ایسا ادارہ ہے جو معاشرہ کو بگاڑ یا سنوار سکتا ہے اس سلسلہ میں سکول ایک بنیادی سروس ہے دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس قسم کی سروس فراہم کر رہا ہے ہمارے ہاں ناخواندگی بہت زیادہ ہے اور ہمارے وسائل بہت محدود ہیں اس لئے جہاں بھی کوئی سکول بنتا ہے ہم اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں مگر ہم اس کے ساتھ یہ واضح الفاظ میں کہنا چاہتے ہیں کہ نجی اداروں کو اس قسم کی تعلیم دینا چاہئے جس سے معاشرہ میں طبقاتی فرق بڑھنے کی بجائے کم ہو۔

شہناز وزیر علی نے مزید کہا کہ ہمارے یہاں ایسے ادارے بھی ہیں جو زیادہ نفع کمانے پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کے نزدیک اعلیٰ و ارفع مقصد یہ ہے کہ بچوں کو بہتر سے بہتر تعلیم فراہم کی جائے اور بس اتنی فیسیں لی جائیں جن سے صرف سکول کے اخراجات نکلتے رہیں ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم ایسے تعلیمی اداروں کی مدد اور حوصلہ افزائی کریں تاکہ ایسے اداروں میں اضافہ ہو جن کا مطمع نظر زیادہ فیسیں وصول کرنا نہیں بلکہ قوم کے بچوں کو اچھی تعلیم فراہم کرنا

ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ حدود آرڈی ننس کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا جاتا رہا ہے آپ کی حکومت اس میں کوئی ترمیم کرے گی یا نہیں؟

وفاقی وزیر مملکت شہناز وزیر علی نے کہا کہ فی الحال جب تک آٹھویں ترمیم ہے جو اقدامات ہم کرنا چاہتے ہیں ہم نہیں کر سکتے اس وقت حدود آرڈیننس پر لاء ڈویژن غور کر رہی ہے شریعت بل سینٹ میں پیش ہو گا اور اس پر بحث چلے گی انہوں نے کہا کہ ہم نے مصمم ارادہ کر رکھا ہے کہ جہاں جہاں ایسے کالے قوانین ہیں جن کے ذریعہ عورت کا استحصال ہوتا ہے اور اسے دوسرے درجہ کا شہری قرار دیا جاتا ہے ان قوانین کو ہم درست کریں گے ایک اور سوال کے جواب میں شہناز وزیر علی نے کہا کہ ہم 51 ٪ آبادی کو عضوِ معطل بنا کر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتے ملک کی ترقی میں پاکستانی خواتین نے پورا پورا حصہ لینا ہے انہوں نے کہا اس وقت بھی دیہات میں 85 ٪ کام عورت کرتی ہے مویشیوں کی دیکھ بھال سے لے کر کھیت میں بیج بونے فصل کاٹنے کے علاوہ گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش بھی کرتی ہے مگر اس اس محنت کو کسی اعداد و شمار میں نہیں لایا جاتا۔

شہناز وزیر علی کا خاندان برصغیر کی تقسیم کے وقت دہلی سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچا تھا ان کے والد ملک وزیر علی نواب زادہ لیاقت علی خان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے

اس وقت ملک وزیر علی کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ دہلی سے لوگوں کو بذریعہ ٹرین بھیجنے کا بندوبست کریں شہناز وزیر علی کا خاندان بھی اس طرح ریل کے ذریعہ کراچی پہنچا

اس وقت شہناز وزیر علی کی والدہ نے اپنے گھر کے ایک کمرہ میں سکول شروع کیا یہ سکول جو ناصرہ سکول کے نام سے چل رہا ہے اس وقت میاں چار ہزار سے زائد بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں شہناز وزیر علی کی والدہ کا یہ سکول قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ درمیانہ طبقے کے افراد جو بھاری فیسیں ادا نہیں کر سکتے ان کے بچوں کو اچھی تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ دیا جائے 1950ء میں اس سکول کو ایک ٹرسٹ کے نام کر دیا گیا شہناز وزیر علی نے اپنی تعلیم کا آغاز سٹیشن سکول سے کیا پھر سینٹ جوزف کالج میں پڑھتی رہیں امریکہ سے جرنلزم اور کمیونی کیشن میں بی اے کیا ہاورڈ یونیورسٹی سے بھی ڈپلومہ لیا امریکہ سے واپسی پر ناصرہ سکول میں پڑھانا شروع کیا اور پہلی جماعت سے لے کر میٹرک تک کے طلبہ کو سوشل اسٹڈیز، ہسٹری جغرافیہ غرض تمام مضامین پڑھائے 1978ء میں لاہور امریکن سکول میں کنڈر گارڈن سے لے کر دسویں تک پڑھایا تین چار سال تک امریکن سکول کی پرنسپل بھی رہیں سات سال قبل لاہور ریڈنگ کونسل کی بنیاد رکھی لاہور میں مختلف کانفرنسوں اور ورکشاپوں کا سلسلہ شروع کیا ان کانفرنسوں میں ادیبوں، پبلشرز اور اساتذہ اور ماہر تعلیم کو بلایا گیا تاکہ تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے سلسلے میں نئی سفارشات اور تجاویز سامنے آسکیں 78ء میں پیپلز پارٹی سے منسلک ہوئیں خواتین محاذ عمل کی بانی ممبران میں سے ہیں اور عورتوں کے حقوق سلسلے میں مسلسل جدوجہد کرتی رہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے شہناز وزیر علی نے کہا کہ میری خواہش یہ ہے کہ تعلیمی نظام کی بہتری کے سلسلے میں کوئی نمایاں کام کروں تاکہ ہمارے بچوں کو بہتر تعلیم اور تربیت مل سکے وزیر بننا بالکل بے معنی ہے اگر ہم آگے کام کر کے نہ دکھائیں شہناز وزیر علی نے کہا کہ ہم سب کی یہ کوشش ہے کہ اپنے اپنے شعبے میں زیادہ کام کریں پاکستان کے عوام کی حالت بہتر ہو، ہسپتال زیادہ بنیں، تعلیمی اداروں میں امن ہو، سکول اور کالجوں میں اضافہ ہو، لوگوں کو روزگار کے مواقع میسر ہوں جب یہ چیزیں ہوں گی تو میں سمجھوں گی کہ ہم نے کچھ حاصل کیا ہے۔

خوش قسمتی آپکی منتظر ہے

ماہوار قسط جمع کروا کر مندرجہ ذیل اشیاء بذریعہ قرعہ اندازی حاصل کریں

ٹیلی ویژن رنگین	200 روپے ماہوار
فریج	100 روپے ماہوار
واشنگ مشین ٹیلی ویژن بلیک اینڈ وائٹ	50 روپے ماہوار
سائیکل ٹیپ ریکارڈر سلائی مشین روم ڈیزرٹ کولر	25 روپے ماہوار

جوابی خط لکھ کر مکمل تفصیلات مفت حاصل کریں

فوبک رجسٹرڈ

637۔ سیاگر روڈ نزد بس سٹاپ صدر بازار۔ لاہور کینٹ

عوامی لیگ کی طرح

اب "ایم کیو ایم" کے سامنے بھی کوئی نہیں ٹھہر سکتا

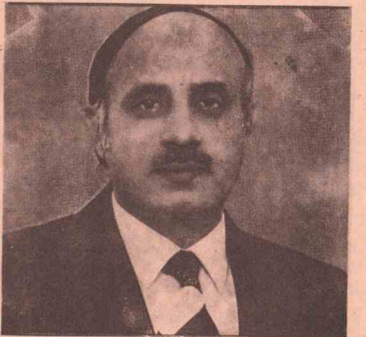

ممتاز دانشور
ڈاکٹر صفدر محمود
کا خصوصی انٹرویو

ندیم اپل صاحب نے یہ انٹرویو ڈاکٹر صاحب سے ان دنوں لیا تھا جب وہ سیکرٹری زکوٰۃ تھے

ادارہ موون ڈائجسٹ کا خیال تھا کہ جناب ڈاکٹر صفدر محمود کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ایک بھرپور انٹرویو ان صفحات کی زینت بنے لیکن بوجوہ یہ خواب ابھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔ تاہم اسی دوران ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور میں جناب ڈاکٹر صفدر محمود کا ایک انٹرویو نظر سے گذرا جو ہم موون ڈائجسٹ کے قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے شائع کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر محمود

ملک کی شاید وہ واحد شخصیت ہیں

کہ جنہوں نے پاکستان کی تاریخ اور سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اس کے علاوہ مذہب تعلیم ادب فن اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں اُن کی رائے کو ایک سند کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اب تک ملک کی تاریخ و سیاست اور تحریکِ پاکستان کے حوالے سے وہ پندرہ سے زائد تحقیقی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں پاکستان سے اُن کی والہانہ محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اوائل عمر میں ہی انہوں نے پاکستان کے قیام اور اس کی تاریخ کے بارے میں اخبارات سے مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس بات کا کریڈٹ بھی ڈاکٹر صاحب کو ہی جاتا ہے کہ پنجاب میں انفارمیشن سیکرٹری بننے کے بعد پہلی مرتبہ اپنی ذاتی کوشش سے انہوں نے ایک سکیم شروع کی جس کے ذریعے تحریک پاکستان کے کارکنوں کو گولڈ میڈل دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی حال ہی میں دوبارہ سیکرٹری اطلاعات کے عہدے پہ تقرری ہوئی ہے اس سے پہلے

دوسری اقوام نے جو تجربات
صدیوں میں کیے ہماری قوم نے
وہ بیالیس برسوں میں ہی کر لیے ہیں

ماضی میں بھی وہ صوبائی انفارمیشن سیکرٹری اور چیئرمین فلم سنسر بورڈ کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے کسی بھی موضوع پر بات کی جا سکتی ہے زیرِ نظر انٹرویو میں اگرچہ ہمارا موضوع چودہ اگست کے حوالے سے "تحریکِ پاکستان" تھا تاہم اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب سے بعض دوسرے اہم موضوعات اور قومی مسائل پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوئی ذیل میں جس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

س:۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کی شخصیت کے ساتھ ہی ذہن میں تحریکِ پاکستان کا تصور اُبھرتا ہے۔ جس قدر پاکستان کی تاریخ اور سیاست کے بارے میں آپ کے پاس مواد موجود ہے شاید اتنا مواد اس تحریک میں عملی طور پر حصہ لینے والوں کے پاس بھی نہ ہو۔ یوں تو ہر پاکستانی کی اپنے وطن سے محبت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہے لیکن پھر بھی میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کو پاکستان کی تاریخ و سیاست سے جو والہانہ لگاؤ ہے اس کا سبب کیا ہے کیا بچپن ہی سے آپ کا رجحان اس جانب تھا یا کسی خاص واقعہ نے آپ کو اس جانب مائل کیا۔

ج:۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس کی وجوہات کیا تھیں، لیکن ایک بات طے شدہ ہے کہ مجھے بچپن ہی سے پاکستان، قائداعظم اور تاریخِ پاکستان سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ ہم جس قصبے میں رہتے تھے آزادی سے پہلے وہاں زیادہ تر ہندو آباد تھے مگر جب وطن آزاد ہو گیا تو ہندو وہاں سے چلے گئے اور اُن کی جگہ مہاجرین کی آمد شروع ہوئی جن کی آبادکاری کے لیے میرے والد صاحب بہت سرگرمی سے کام کر رہے تھے وہ علاقہ کی ٹاؤن کمیٹی کے وائس چیئرمین تھے اس ناطے سے اپنے علاقے کے مسائل اور لوگوں کے آپسی جھگڑے وغیرہ بھی وہی نپٹایا کرتے تھے۔ جن دنوں مہاجرین کی علاقے میں آبادکاری ہو رہی تھی اُنہی دنوں کچھ لوگ ایک شخص کو پکڑ کر میرے والد صاحب کے پاس لائے اُس پر الزام تھا کہ اُس نے کسی کے گھر میں چوری کی ہے لوگ اُسے تھانے لیجانا چاہتے تھے مگر والد صاحب کا خیال تھا کہ اُسے یہیں پر سزا ملنی چاہیے، چنانچہ میرے والد نے جوتا اُتارا اور اُس شخص کو مارنا شروع کر دیا۔ میں بھی پاس ہی بیٹھا تھا اور میری عمر اُس وقت بمشکل تین چار برس کی ہو گی میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا جو بڑی دعاؤں کے بعد اُنہیں نصیب ہوئی تھی اس لیے انہیں مجھ سے بے پناہ محبت تھی چنانچہ والد صاحب جب اُس آدمی کو جوتا مارنے لگے تو میں نے اُن کا بازو پکڑ لیا۔ وہ حیرت اور غصے سے مجھے دیکھنے لگے اُنہیں مجھ سے ایسی گستاخانہ حرکت کی قطعی توقع نہ تھی مگر میں نے اُن سے کہا کہ ابا جان آپ نے جو قمیص پہن رکھی ہے اور اُس کے بازو کی کف پر جو بٹن لگا ہے اُس پر حضرتِ قائداعظم کی تصویر ہے اور جب آپ اس شخص کو جوتا مارتے ہیں تو وہ جوتا اس بٹن سے چھوتا ہے یوں قائداعظم کی تصویر کی بے حرمتی ہوتی ہے (اُس زمانے میں اکثر چیزوں پر قائداعظم کی تصویر کندہ ہوا کرتی تھی) تو جناب اس چھوٹے سے واقعہ سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ بچپن میں ہی پاکستان اور قائداعظم کے بارے میں میری سوچ کیا تھی؟

جب پاکستان بنا تو میری عمر ساڑھے تین یا چار برس تھی میں اس عمر میں اپنے بزرگوں کے پاس بیٹھ کر پاکستان کے بارے میں اُن کے خیالات سنا کرتا تھا اور اس موضوع پر اخبارات میں جو خبریں شائع ہوتی تھیں انہیں اپنے ہاتھوں سے نوٹ کیا کرتا تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس قسم کے مواد سے پورا ایک صندوق بھر گیا اس میں سے میں نے ایک کتاب مرتب کی اس کتاب پر میری جو محنت اور لاگت آئی وہ میرے نزدیک پندرہ برس گزر جانے کے بعد بھی پوری نہیں ہوئی لیکن جو لوگ قومی جذبہ رکھتے ہیں وہ اس قسم کے مالی منفعت کے پہلو کو سامنے نہیں رکھتے۔ آپ یقین کریں کہ ساڑھے تین یا چار برس تک میں نے اپنے بال بچوں کو چھوڑا والدین اور دوستوں سے الگ تھلگ رہ کر میں نے یہ کتاب لکھی مگر افسوس تو اس بات کا ہے یہاں کوئی کتاب پڑھتا ہی نہیں حالانکہ تاریخ قوم کا حافظہ ہوتی ہے اور جو قوم اپنی تاریخ کو بھول جاتی ہے وہ اپنے مقصد کو بھی بھول جاتی ہے ابھی انٹرویو سے قبل آپ نے اس جانب اشارہ کیا تھا کہ ہمارے دانشور قوم کی رہنمائی کیوں نہیں کرتے، لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جب کوئی دانشور کتاب لکھتا ہے تو اُسے کتنے لوگوں میں پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ ملک میں اس وقت ایسا کوئی بھی دانشور نہیں جس کی بات غور سے سنی جا سکے۔ یہ واقعی ایک خلا ہے جسے ہم اپنی بدقسمتی بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ ہمارے ہاں کتنے اخبارات پڑھے جاتے ہیں جس ملک میں خواندگی کی شرح سولہ فیصد ہو اور اُس میں بھی صحیح پڑھے لکھے افراد کی تعداد دو فیصد ہو اور باقی محض انگوٹھا لگانے والے ہوں تو اسے آپ کیا کہیں گے۔ ہمارے ملک میں کتاب کا محض ایک ایڈیشن چھپتا ہے مگر وہ بھی نہیں بکتا پھر دانشور بیچارہ کیا کرے۔ میں نے پاکستان کی تاریخ اور سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے ادب کے دوسرے تمام معاملات چھوڑ کر میں نے ساری زندگی اسی کام میں صرف کر دی ہے، مقصد صرف قوم کی خدمت تھا۔ قوم کی رہنمائی میں اس لیے نہیں کر سکتا کہ یہ

ہمارے فوجی حکمرانوں
نے سیاستدانوں کو گالیاں دینے کے
سوا کوئی کام نہیں کیا

بہت بڑا لفظ ہے تاہم میں اپنی کتابوں میں ملک کی تاریخ و سیاست کا تجزیہ کر کے لوگوں کو بتاتا رہتا ہوں کہ ہم نے ماضی میں کہاں کہاں غلطیاں کیں، لیکن جب کتاب چھپتی ہے تو بکتی نہیں البتہ ہمارے ہاں کتاب کی رونمائی کا رواج ضرور ہے مگر مجھے یہ انداز پسند نہیں۔ مجھے یہ بات عجیب لگتی ہے کہ کسی کو دولہا بنا کر سٹیج پر بٹھا دیا جائے اور پندرہ بیس لوگ اُس پر پھول نچھاور کریں چنانچہ میں نے کبھی بھی اپنی کسی کتاب کی رونمائی نہیں کی بہت سے لوگوں نے اصرار بھی کیا لیکن مجھے یہ بچپنا سا لگتا ہے کہ ایک آدمی کو دولہا بنا کر سٹیج پر بٹھا دیا جائے کیونکہ دولہا تو آدمی ایک دفعہ ہی بنتا ہے اور وہ حادثہ جو تھا آج سے بیس برس پہلے ہو چکا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں کتابیں پڑھی نہیں جاتیں نہ ہی اخبارات کے مضامین کا کوئی IMPACT ہوتا ہے اس لیے دانشوروں سے آپ کیا توقع رکھیں گے۔

س:۔ لیکن بہرحال آپ ایک دانشور ہیں اور اس قوم کو آپ سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں آزادی حاصل کیے بیالیس برس سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے اس دوران کئی مرتبہ مارشل لا لگا حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں ملک بھی دو ٹکڑے ہو گیا۔ وقتاً فوقتاً تعصبات کی آگ بھی بھڑکتی رہی، سیاسی لغزشیں

آدمی امریکہ میں بیٹھا

تھا مگر اُس کے نام پر زکوٰۃ

یہاں وصول کیجا رہی تھی

اور کدورتیں پروان چڑھتی رہیں ہر طرف ایک عجیب افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم رہا اور اب بھی ہے۔ لیکن میں آپ سے یہ جاننا چاہوں گا کہ آخر ہماری قوم کے کردار کی تشکیل اور اس کی تربیت میں ایسی کونسی کمی رہ گئی تھی کہ بحیثیت ایک آزاد قوم ہم ابھی تک سنبھل نہیں پائے ؟

ج :۔ جب ہم آزادی کے بیالیس برسوں پر نظر ڈالتے ہیں تو مجھے یہ دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے کہ شاید دنیا کی تاریخ میں ہم واحد ایسی قوم ہیں کہ جو اتنے تھوڑے عرصہ میں اس قدر رنگا رنگ تجربات سے گزری ہے۔ اس دوران ہمارے ملک میں پارلیمانی نظام بھی آزمایا گیا اور صدارتی نظام کو بھی اختیار کر لیا گیا۔ مارشل لا کا مزہ بھی چکھا اور ملک کو بنتے ٹوٹتے بھی دیکھا۔ یہ سارے کے سارے کام بیالیس برسوں کے کم عرصہ میں ہی ہوئے ہیں۔ لیکن اگر ایک دوسرے زاویہ سے دیکھا جائے تو ہماری ایک ہی نسل نے یہ سارے تجربات دیکھ لیے ہیں جسے باقی قوموں نے کرتے ہوئے صدیاں گزار دیں۔ اس لحاظ سے تو یہ واقعی عجیب و غریب بات ہے کہ آخر ہمارے ہاں کسی نظام کو استحکام حاصل کیوں نہیں ہوا رہ گئی قومی کردار کے تشکیل کی بات تو وہ برسوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں ہوتا ہے اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں آزادی کے بعد سیاسی اور جمہوری اداروں کو استحکام کیوں نہیں ملا؟"

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت ناکام نہیں ہوئی بلکہ اُسے پھلنے پھولنے کا مناسب موقع ہی نہیں دیا گیا جو کہ جمہوریت کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ قیامِ پاکستان کے بعد کافی عرصہ تک ہم دستور بنانے میں ہی ناکام رہے۔ ۱۹۴۷ء میں یہ ملک بنا مگر ۱۹۵۶ء تک ہم کوئی دستور ہی نافذ نہ کر سکے جبکہ ہندوستان نے آزادی حاصل کرنے کے دو ہی سال بعد دستور بنا لیا مگر ہماری بدقسمتی یہ ہوئی کہ قائداعظمؒ اور لیاقت علی خاں کے بعد عوام کو وہ مسلم لیگی قیادت میسّر نہ آسکی جس پر قوم پورے یقین کے ساتھ اعتماد کر سکے چونکہ اُس وقت ملک نیا نیا بنا تھا اس لیے سیاسی جماعتیں بھی موجود نہ تھیں لہٰذا ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیوروکریسی حکومتی اداروں پر قابض ہو گئی میں آپ کو بتاؤں کہ نوکر شاہی اس ملک میں پہلے بھی بہت مضبوط تھی اور اب بھی بہت مضبوط ہے۔ بیوروکریسی کی صورت میں ملک میں ایسا ایک ادارہ تو یقیناً موجود رہا ہے کہ جس نے ملک کو (INTACT) رکھا۔ اُس لحاظ سے بیوروکریسی کا ایک کردار بھی بنتا ہے لیکن دوسری طرف بیوروکریسی نے ملک کے سیاسی اور جمہوری اداروں کو برباد کرنے میں جو رول ادا کیا ہے اُس لحاظ سے یہ واقعی ہماری بدقسمتی رہی ہے اور شاید اسی وجہ سے ہم کافی عرصہ تک کوئی دستور بھی بنا نہ سکے۔

غلام محمد نے اسمبلی ہی توڑ دی اور دستور بنتے بنتے رہ گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۵۴ء میں جب غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو توڑا تھا اس سے چند روز قبل ہی محمد علی بوگرہ نے یہ بیان دیا تھا کہ اُمید کی پہلی کرن طلوع ہو گئی ہے اور ہم جلد ہی ملک کو ایک آئین دینے والے ہیں۔ اور واقعی ایسی صورت میں آئین بن سکتا تھا۔ اگر ۱۹۵۴ء میں دستور بنا لیا جاتا تو ہم بہت سی تباہیوں سے بچ سکتے تھے۔ پھر اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں ہم ایک دستور بنانے میں کامیاب ہوئے مگر اُسے بھی دو سال سے زیادہ نہیں چلنے دیا گیا۔ میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ ۱۹۵۸ء میں جب سکندر مرزا نے مارشل لاء لگایا تو اُس کی ROOTS اور وجوہات ہماری تاریخ میں پہلے سے موجود تھیں خود فیلڈ مارشل ایوب خان نے اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" میں کہا ہے کہ مجھے سیاست سے اس قدر دلچسپی تھی کہ ہم ۱۹۵۱ء میں ہی اپنے طور پر اس ملک کا دستور بناتے رہے تھے اور اس سے قبل جب غلام محمد نے پرانی کابینہ توڑ کر نئی کابینہ بنائی تھی تو اُس میں بھی انہوں نے ایوب خاں کو وزیرِ دفاع رکھا تھا اس طرح میں یہ سمجھتا ہوں کہ شیر کے مُنہ کو پہلے ہی خون لگ چکا تھا اور پھر جب ایوب خاں نے ۱۹۵۸ء میں مارشل لا لگایا تو یہ اس قوم کے ساتھ واقعی بہت بڑی ٹریجڈی تھی۔ وہ مارشل لا لگانے کا انتہائی ناموزوں وقت تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۵۶ء میں دستور بن چکا تھا مارچ ۱۹۵۹ء میں الیکشن کا وعدہ بھی کیا جا چکا تھا۔ اس پس منظر میں اگر آپ دیکھیں تو ۱۹۴۷ء کے بعد آنے والی حکومتیں کبھی بھی مستحکم نہیں رہیں وہ بہت جلد بن اور ٹوٹ رہی تھیں۔ اسی دوران ہمارے ہاں سیاستدانوں اور جاگیرداروں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے الیکشن کی بنیاد پر آئین ساز اسمبلی میں آگیا تھا جو بعد میں مستقل طور پر اسمبلیوں پر قابض ہو گیا جس کا کام ہی اپنے مفادات کی خاطر آئے دن مختلف پارٹیوں کے ساتھ اپنی وفاداریاں بدلتے رہنا تھا جو کسی طور پر اس ملک سے مخلص نہیں تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر چند مہینوں کا یہ عرصہ کسی نہ کسی طرح سے گزر جاتا اور مارچ ۱۹۵۹ء سے قبل ستمبر یا اکتوبر ۱۹۵۸ء میں انتخابات ہو جاتے تو یہ اس قوم پر بہت بڑا احسان ہوتا مگر ہوا یہ کہ ایوب خاں نے مارشل لاء لگا کر سیاستدانوں کو CONDEMN کرنا شروع کر دیا اُس وقت تو لوگوں نے اُسے خوش آمدید کہا لیکن وہ یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ جو شخص جمہوریت اور سیاستدانوں کی مذمت کر رہا ہے وہ عوام کا خیر خواہ کیسے ہو سکتا ہے بلکہ وہ تو جمہوری منزل کے نشانوں کو لوگوں کی نگاہوں میں مشکوک اور قابلِ نفرت بنا رہا تھا مگر جمہوریت کی یہ کوئی خدمت نہیں ہے کہ سیاستدانوں اور جمہوری اداروں کو گالیاں دی جائیں۔

جب ضیاالحق تک خفیہ رپورٹ پہنچی

تو ایم اے کے چوہدری کو ریٹائر

اور مجھے ٹرانسفر کر دیا گیا

ہمارے ہاں جب بھی مارشل لا آیا خواہ وہ ایوب خان کا ہو یحییٰ خاں کا یا ضیاء الحق کا ہو۔ یہ لوگ آتے ہی سیاستدانوں کو گالیاں دینے لگتے ہیں وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بالآخر اس قوم کی شناخت تقدیر اور مقدر سیاستدانوں ہی کے ہاتھ میں ہے اگر ہم اُن کو CONDEMN کریں گے تو یہ قوم کی کوئی خدمت نہیں ہے۔ اگر عوام ووٹ کے ذریعے کسی سیاستدان کو مسترد کر دیں وہ تو ایک جمہوری طریقہ ہے لیکن کسی تیسری قوت کو یہ اختیار نہیں پہنچتا کہ وہ بندوق یا توپ کے زور پر رات کے اندھیرے میں مارشل لا لگائے اور اس کے بعد ملک میں جو بھی اچھے یا بُرے لیڈر ہوں اُن کی مذمت شروع کر دے۔ ہمارے عوام کوئی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز نہ کر سکیں حالیہ الیکشن میں آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ بہت سے لوگ جن کی بظاہر لیڈرشپ تھی وہ سیاسی منظر سے ہٹ گئے۔ میرا ایمان ہے کہ لوگوں کو اگر فیصلے کا اختیار دے دیا جائے تو وہ بالکل صحیح فیصلہ کریں گے۔ مگر انہیں تو موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ گیارہ برس تک ایوب خان اس ملک پر مسلط رہے اور پھر جاتے ہوئے بھی یہ ملک ایک آمر کے سپرد کر گئے۔ میری مراد یحییٰ خان سے ہے جن کے فوجی عہد میں مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہو گیا۔ میں نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان توڑنے کے بیج بہت پہلے بو دیے گئے تھے یحییٰ کے دور میں تو

مجھے کتاب کی تقریب کا دولہا
بننا پسند نہیں دولہا تو آدمی
ایک بار ہی بنتا ہے

وہ صرف پھل پھول گئے تھے یہ درست ہے کہ ملک ٹوٹنے میں یحییٰ خان اور بعض سیاستدانوں کا بھی ایک کردار رہا ہے لیکن اس کی جڑیں ہماری تاریخ میں پہلے سے موجود تھیں۔ اگر کسی نہ کسی صورت میں ہمارے ملک میں جمہوریت قائم رہتی اور مشرقی پاکستان کے لوگوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا جاتا اُن کے حقوق کا خیال رکھا جاتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ علیحدگی کا مطالبہ کرتے یہ ساری خرابیاں مارشل لاء کی وجہ سے ہی پیدا ہوئیں۔

س:۔ یہ تو آپ نے درست فرمایا کہ ملک ٹوٹنے کا سبب وہ عوامل تھے جو مارشل لاء حکومتوں کے دور میں پیدا ہوئے لیکن ملک کو توڑنے میں کس کس کا ہاتھ ہے یہ بھی ایک الگ بحث ہے کوئی اس میں شیخ مجیب کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے تو کوئی بھٹو کو مجرم گردانتا ہے ایک طبقے کا یہ بھی خیال تھا کہ الیکشن کے دوران مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے اپنے علاوہ کسی اور پارٹی کو الیکشن میں کھڑا ہی نہیں ہونے دیا تھا اور وہ صرف ون مین شو تھا۔ آپ کی پاکستانی تاریخ پر بہت گہری نظر ہے۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟"

ج:۔ جب تاریخ میں کوئی اتنا بڑا واقعہ یا سانحہ ہو جائے تو اس کی ذمہ داری کسی ایک شخص پر نہیں ڈالی جا سکتی یاد رکھیے کہ جب کوئی اس قسم کی تحریک چلتی ہے تو یقیناً اس کے کچھ عوامل ہوتے ہیں۔ اس میں ہر کوئی اپنا اپنا رول ادا کرتا ہے کسی ایک کو آپ نشانہ نہیں بنا سکتے جہاں تک مشرقی پاکستان ٹوٹنے کا تعلق ہے تو اس میں یحییٰ حکومت سیاست دان اور آرمی یہ تینوں فریق شریک تھے لیکن بنیادی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے میں بنگالیوں کے احساس محرومی کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔ یہ جو آپ نے کہا ہے کہ مشرقی پاکستان میں واحد عوامی لیگ کا ہی ون مین شو تھا اور عوامی لیگ کے خوف کی وجہ سے کسی دوسری پارٹی کو الیکشن لڑنے کی جرأت نہ تھی۔ میں اس ضمن میں صرف یہی کہنا چاہوں گا کہ آپ جب کسی جماعت گروہ تنظیم یا صوبے کے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھتے ہیں تو اس صورت میں یہی کچھ ہوتا ہے جو عوامی لیگ نے کیا۔ اب آپ کراچی میں ایم کیو ایم کو ہی دیکھ لیں اب کسی کی مجال نہیں کہ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو سکے کیونکہ اس کی بھی وہی تاریخ ہے جیسی عوامی لیگ کی مشرقی پاکستان میں تھی۔ آپ نے اب یہ تو دیکھ لیا ہے کہ ایم کیو ایم یا عوامی لیگ اچانک ابھر کر سامنے آگئیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے پس پردہ عوامل کیا تھے لہٰذا میں پھر یہی کہوں گا کہ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے کی ذمہ داری کسی ایک فریق پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ یہ بہت بڑی تاریخ تھی جس میں ہر کوئی اپنا اپنا رول ادا کر رہا تھا اس میں غیر ملکی قوتیں بھی شامل تھیں۔ ہندوستان کی حکومت کا اس میں بہت بڑا ہاتھ تھا اور خود ہمارے دفاع اور دفاعی حکمت عملی بھی اس سانحے کی کسی حد تک ذمہ دار ہے۔ محض مجیب یا بھٹو پر اس سانحے کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی۔ بھٹو دور کے بعد اب آپ ۱۹۷۷ء کی تحریک پر آ جائیے۔ عالمی تاریخ میں آپ کو ایسی کوئی مثال نہیں ملے گی کہ کسی ملک کے عوام نے محض جمہوریت کو بچانے کے لیے اتنی بڑی تحریک چلائی ہو اور اتنے زیادہ لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہو۔ اب میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جس عوام نے کانگریس خاکسار اور احرار کو چھوڑ کر اور دوسری تمام سیاسی جماعتوں کو مسترد کر کے مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا اور پاکستان بنایا تھا اور پھر وہ قوم جس نے ۱۹۷۷ء میں محض اس بنیاد پر کامیاب تحریک چلائی کہ اُس کا حق رائے دہی مجروح ہوا تھا اور اس مقصد کے لیے انہوں نے سینکڑوں جانیں قربان کر دیں اب اُس قوم کو یہ کہہ دینا کہ وہ جمہوریت کی اہل نہیں ہے بڑی عجیب سی بات لگتی ہے۔ آپ اگر غور سے اپنی بیالیس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ عوام کو جمہوریت کا نااہل قرار دینے کا نعرہ صرف غیر سیاسی حکمرانوں نے دیا صرف آرمی کے فوجی حکمرانوں نے ہی یہ نعرہ لگایا کیا آپ نے بھی کسی سیاستدان کو یہ کہتے سنا ہے کہ عوام ووٹ دینے کے اہل نہیں ہیں وہ تو کبھی یہ بات نہیں کریں گے مگر جب بھی کوئی فوجی آمر یہاں پر آتا ہے تو وہ سب سے پہلے یہی کہتا ہے کہ یہ عوام بہت عظیم ہیں جنہوں نے پچھلی ظالم حکومت کو نکال دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب یہی عوام الیکشن کروانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور ووٹ کا حق مانگتے ہیں تو فوجی آمر کہتا ہے کہ "عوام جمہوریت کے اہل نہیں ہیں" ہماری سب سے بڑی بدقسمتی بھی یہی رہی ہے کہ یہاں پر جمہوریت کو چلنے اور پھلنے پھولنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا گیا۔

س:۔ ڈاکٹر صاحب! آپ نے مارشل لاء اور آمریت کی تمام تر ذمہ داری فوجی حکومتوں پر ڈال دی ہے لیکن کیا اس سلسلے میں سیاستدانوں کو بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے ایسے بھی بہت سے لیڈر ہیں جو فوجی آمروں کے آتے ہی اُن کی حاشیہ برداری میں لگ جاتے ہیں۔ مارشل لاء کو خوش آمدید کہتے ہیں کیا یہ درست نہیں کہ فوجی حکومتوں کو مستحکم کرنے میں ہمارے بعض سیاستدانوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے ایک طبقے کا تو یہ خیال ہے کہ مارشل لاء لگتا ہی سیاستدانوں کی نااہلی کی وجہ سے ہے آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

انارکلی کے ایک تاجر نے
محض ٹیکس بچانے کیلئے اپنی بیٹی
کا افسانہ سُنا دیا!

ج:۔ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ سیاستدانوں کو قطعی طور پر بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ایسی حرکتیں وہی سیاستدان کرتے ہیں جنہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ انتخابات کے نتیجہ میں اقتدار حاصل نہیں کر سکتے اور یا جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی سیاسی حکومت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا تب وہ اس قسم کا رویہ اختیار کرتے ہیں جو میرے نزدیک قابل اعتراض ہے لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا کہ جو سیاستدان اس قسم کی روش اپناتے ہیں یا فوج کو خط لکھ کر بلواتے ہیں انتخابات کے دوران عوام اُن کا حشر کیا کرتے ہیں لیکن میں پھر یہ کہوں گا اگر سیاستدانوں کو مسلسل کام کرنے کا موقع دیا جائے تو پھر شاید وہ خود کو اس کا اہل ثابت کر دیں۔

س:۔ ہمارے ہاں ایک اور خرابی یہ ہے کہ بعض سیاسی شخصیات پر بہت جلد حب الوطنی یا غداری کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے اس سلسلے میں ولی خان، جی ایم سید اور بعض دوسری شخصیات کے بارے میں آئے دن حکومتوں اور حکمرانوں کے نظریات نظریہ ضرورت کے تحت تبدیل ہوتے رہتے ہیں آخر ہمارے ہاں کسی کو غداری یا محب الوطنی کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا معیار کیا ہے؟

ج:۔ اس میں نہ تو کوئی معیار ہے اور نہ ہی کوئی پیمانہ بلکہ یہ رجحان ہماری قومی سیاسی اور ذہنی ناپختگی کی علامت

محض بھٹو یا مجیب پر
ملک توڑنے کی ذمہ داری نہیں،
ڈالی جا سکتی

ہے ہمارے ہاں ابھی قوم کی سیاسی بلوغت کا دور شروع نہیں ہوا اور جب قومیں سیاسی طور پر نابالغ ہوتی ہیں تو اس طرح کے حادثات ہوا ہی کرتے ہیں ایک حکمران آتا ہے تو وہ کسی کو حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے اور جب دوسرا حاکم آتا ہے تو وہ اُس شخص کو غدار کا نام دے دیتا ہے بیچاری قوم خاموشی سے یہ تماشا دیکھ رہی ہے جب ضیاء الحق نے عبدالغفار خاں کو حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ دیا تھا تو کیا قوم سے پوچھا گیا تھا یا آج جب ولی خاں کو غدار کہا جاتا ہے تو کیا قوم سے پوچھ کر ایسا کیا گیا ہے۔ قوم کے کسی کے بارے میں تاثرات تو انتخابات میں ہی سامنے آتے ہیں مثلاً میں پچھلے دنوں تجزیہ کر رہا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر عجیب و غریب حیرت ہوئی کہ ۱۹۷۱ء میں ولی خاں اور اُن کی جماعت نے سرحد میں جتنے ووٹ یا نشستیں حاصل کی تھیں اب بھی اُتنی ہی ہیں اگر آپ مزید پیچھے چلے جائیں تو گزشتہ چالیس برسوں میں ولی خاں کے ووٹرز میں نہ تو کوئی کمی ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی اضافہ ہوا ہے ایک خاص گروہ ہے اور کچھ مخصوص نشستیں ہیں جہاں سے وہ ہر مرتبہ جیت جاتے ہیں تو میرے بھائی قوم کا سرٹیفکیٹ تو یہ ہے قوم کا سرٹیفکیٹ یہ تو نہیں کہ ضیاء الحق جسے چاہے محب الوطن کہہ دے اور آجکی حکومت جسے چاہے غدار کہہ دے۔

ولی خان نے پچھلے چالیس برسوں میں جو کچھ کیا وہ سب آپ کے سامنے ہے وہ بے چارے کوشش کے باوجود قومی سیاسی لیڈر نہیں بن سکے کیونکہ دوسرے صوبوں سے انہیں عوامی حمایت حاصل نہیں ہوئی لے دے کے صوبہ سرحد رہ جاتا ہے جہاں اُن کا بعض حلقوں میں پچھلے چالیس برسوں سے مستقل اثر و رسوخ ہے جسے کم نہیں کیا جا سکتا۔

س:۔ ڈاکٹر صاحب ابھی تک تو ہم نے پاکستان کے حوالے سے بات کی ہے۔ آپ آج کل صوبائی چیف ایڈمنسٹریٹر زکوٰۃ ہیں۔ زکوٰۃ کے موجودہ نظام میں بھی بہت سی خرابیاں موجود ہیں۔ اوّل تو اس کی ایمانداری سے تقسیم ہی نہیں ہوتی دوسرا غیر مستحق لوگ اس سے استفادہ کر رہے ہیں اور تیسرا یہ کہ بیوگان اور دوسرے مستحقین کے لیے جو شرح مقرر کی گئی ہے وہ اس قدر کم ہے کہ اس سے امداد کے بجائے دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے۔ آپ نے ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے اب تک پنجاب میں کیا کچھ کیا ہے؟

ج:۔ آپ نے درست کہا۔ واقعی زکوٰۃ کی تقسیم کے نظام میں بہت سی خامیاں موجود ہیں۔ میری یہ ذاتی تجویز ہے کہ مستحقین کی معاشی ضروریات کا اندازہ لگا کر اس کے مطابق رقم مقرر کی جائے اور زکوٰۃ کی تقسیم بالکل ویسی ہونی چاہیے جیسے پنشنر حضرات بنک جا کر اپنی پنشن وصول کرتے ہیں تاکہ اس سے کسی کی عزتِ نفس بھی متاثر نہ ہو۔ زکوٰۃ کے نظام میں اس وجہ سے بھی گڑبڑ ہوتی ہے کہ بعض علاقوں میں مستحقین زیادہ ہیں مگر زکوٰۃ کی منظور شدہ رقم اُس سے بہت کم ہے۔ اور بعض علاقوں میں زکوٰۃ لینے والے کم ہیں مگر وہاں بھی مقرر شدہ رقم زیادہ ہوتی ہے اس طرح منصفانہ تقسیم نہیں ہو پاتی۔ ہونا یہ چاہیے کہ بیوگان اور دوسرے مستحق افراد کی ضروریات کے مطابق زکوٰۃ کی شرح مقرر کی جائے جو وہ ہر ماہ بنک کے ذریعے حاصل کریں۔ اب ہو یہ رہا ہے کہ لوکل زکوٰۃ کمیٹیوں کو پیسے بھجوا دیے جاتے ہیں اور وہ اپنے طور پر رقومات تقسیم کرتی ہیں لہٰذا اس سلسلے میں میرے پاس بڑی عجیب و غریب شکایات آتی ہیں مثلاً ایک شکایت یہ آئی کہ بعض لوگ اپنے نوکروں اور نوکرانیوں کو زکوٰۃ فنڈ سے تنخواہیں اور دوسری مراعات دلواتے ہیں۔ زکوٰۃ تقسیم کرنے والوں نے ایسے لوگوں کو بھی پیسے دیے جن کا نام و نشان تک نہیں میرے پاس یہ بھی شکایت آئی کہ ایک ایسے آدمی کو زکوٰۃ کے پیسے دیے جا رہے ہیں جو کہ امریکہ میں بیٹھا ہے یہ واقعات اس لیے ہو رہے ہیں کہ جیسی قوم ویسے فرشتے۔ ہمارے لیے تو مسئلہ یہ ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے جب ہمیں کوئی شکایت آتی ہے تو ہم انکوائری کرتے ہیں اور شکایت زکوٰۃ کونسل کو بھجوا دی جاتی ہے —— وہی اُس کا فیصلہ کرتی ہے۔

—— زکوٰۃ ایڈمنسٹریٹر کو تو ایک دھیلے کا بھی اختیار نہیں ہے وہ نہ تو کسی کو ایک پائی دے سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو DECLAR کر سکتا ہے اُسے کسی کو معطل کرنے یا کسی کو ہٹانے کے اختیارات بھی نہیں ہیں۔ وہ تو محض ایک انتظامی سربراہ ہے جو شکایات کو آگے زکوٰۃ کمیٹیوں تک لے جاتا ہے۔

س:۔ ڈاکٹر صاحب! آپ آجکل ریونیو بورڈ کے ممبر بھی ہیں لیکن اس سے پہلے آپ ایک زمانے میں انکم ٹیکس آفیسر بھی رہ چکے ہیں تو ٹیکسوں کے موجودہ نظام میں جو خامیاں پائی جاتی ہیں یا جن جن طریقوں سے ٹیکس بچایا جاتا ہے اُس بارے میں آپ کے کیا تجربات و مشاہدات ہیں۔

ج:۔ بات یہ ہے کہ ٹیکس کے نظام میں خرابیاں دونوں طرف سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ لوگ ہمارے ہاں عموماً ٹیکس نہیں دیتے ہر شخص اپنی آمدنی چھپاتا ہے اور بے ایمانی کرتا ہے اس لیے ٹیکس والے بھی ہر شخص کو اس سلسلے میں شک کی نظر سے دیکھتے یا پھر یہ ہوتا ہے کہ دونوں فریق مل کر سمجھوتہ کر لیتے ہیں مگر حکومت کے خزانے میں کچھ نہیں جاتا یوں اس شعبے میں کرپشن کی صورت پیدا ہوتی ہے یہ ایسا سنگین مسئلہ ہے جو سخت سے سخت قوانین بنا کر بھی حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں مجھے کچھ واقعات یاد آ رہے ہیں میں جس زمانے میں انکم ٹیکس آفیسر ہوا کرتا تھا ان دنوں بڑے عجیب و غریب ٹیکس دہندگان سے میرا واسطہ پڑتا تھا۔ جس دور کا میں واقعہ سنانے جا رہا ہوں اُن دنوں لاہور کے ایک اہم سرکل میں میری پوسٹنگ تھی۔ ایک روز میں آفس میں بیٹھا کسی بزنس مین کے اکاؤنٹس دیکھ رہا تھا اُن صاحب کا انارکلی کے اچھے کھاتے پیتے بزنس مینوں میں شمار ہوتا تھا بہرطور اُس کی اکاؤنٹس فائل دیکھ کر یہ پتہ چلا کہ اس سال اپنی بیٹی کی شادی پر اُس نے دو لاکھ روپے خرچ کیے ہیں۔ یہ رقم صرف برات کے کھانے پینے اور دوسری رسم و رواج پر صرف ہوئی تھی اس میں جہیز شامل نہیں تھا۔ میں اکاؤنٹس دیکھ رہا تھا اور وہ صاحب میرے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے تو بمشکل تیس چالیس ہزار روپے آمدنی ظاہر کی ہے مگر اس سال دو ڈھائی لاکھ روپے آپ نے اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ کر دیے۔ اُس نے جواب میں کہا۔ "جناب اگر آپ علیحدگی میں میری بات سُن لیں تو مہربانی ہوگی"۔ میں نے کمرے میں موجود دوسرے افراد کو باہر بھجوا دیا تب وہ تنہائی میں مجھے بڑی رازداری سے کہنے لگا۔ "جناب! میں دل پر پتھر رکھ کر آپ سے یہ بات کہنے جا رہا ہوں کہ شادی پر اخراجات میں نے اپنے پاس سے نہیں کیے بلکہ میری لڑکی نے خود کوشش کر کے ایک امیر لڑکے سے شادی کی ہے اور شادی کے اخراجات اُس لڑکے نے اپنی جیب سے کیے ہیں۔"

میرے زمانے میں کسی
اخبار یا رسالے کو اضافی اشتہارات
سے نہیں نوازا گیا

> ملک میں ایسا ایک
> بھی قد آور دانشور نہیں جس
> کی بات غور سے سُنی جائے

ندیم صاحب! اُس بزنس مین کی بات سنکر مجھے اُس سے اس قدر نفرت ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا کہ بعض لوگ محض ٹیکس بچانے کی خاطر کس حد تک پستی میں چلے جاتے ہیں ایسی دولت پر لعنت ہے جو اس انداز سے بنائی اور چھپائی جائے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک صاحب میرے پاس اپنے اکاؤنٹس لے کر آئے انہوں نے بوسیدہ سی خاکی پتلون اور شدید سردی میں بغیر بازوؤں کے سویٹر پہن رکھا تھا اُس کا یہ حقیر سا حلیہ دیکھ کر میں بہت متاثر ہُوا۔ اُس وقت میں نے نئی نئی ملازمت شروع کی تھی اور میں لوگوں کے ظاہر کو بہت زیادہ اہمیت دیا کرتا تھا۔ چنانچہ یہ صاحب جب آئے تو اُنہوں نے اپنے اکاؤنٹس دکھائے اور دُکھ کا رونا رویا میرے دِل پہ اُن کی ظاہری حالت کا بہت زیادہ اثر ہوا اُن کی انکم ASSESS ہوئی انہیں معمولی سا ٹیکس لگا دیا اور وہ رخصت ہو گئے۔ اس واقعہ کو دو برس گزر گئے۔ میں کسی اور سروے پر تھا۔ ایک روز میں انکم ٹیکس کی عمارت سے اُتر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک صاحب آئے اور سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے تیزی سے میرے پاس سے گزرے۔ میں نے بھی محسوس کیا کہ میرے قریب سے ایک نوجوان خوبصورت سوٹ میں ملبوس کار کی چابی لہراتے ہوئے گزرا ہے۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے اُترا جب میں نے بغور اُس کی صورت دیکھی تو چہرہ کچھ شناسا لگا اتنے میں اُس نے اپنی نئی نویلی گاڑی سٹارٹ کی اور چلا گیا تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یاد آیا کہ یہ تو وہی نوجوان تھا جو ایک مرتبہ بوسیدہ سی پتلون اور بغیر بازو والے سویٹر میں ملبوس میرے پاس آیا تھا اور جس نے میرے سامنے اپنی غربت کا رونا رو کر ٹیکس میں بہت زیادہ رعایت لے لی تھی۔ اب اس واقعہ کے بعد یہ ہوا کہ میں تھوڑا سا محتاط ہو گیا۔ اپنے آفس میں آنے والے ہر شخص کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ چنانچہ ایک روز اُردو بازار کے علاقے سے کسی آدمی کا میرے پاس کیس آیا۔ اُس کو نوٹس دے کر طلب کیا گیا۔ جب وہ نوجوان شخص میرے کمرے میں داخل ہُوا تو اُس نے آتے ہی دروازہ بند کر دیا اور رونا شروع کر دیا۔ یہ میرے لیے پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے سامنے کسی صحت مند شخص کو روتے دیکھا تھا۔ اب ظاہر ہے میرے ذہن پہ اُس کا بہت گہرا اثر ہوا چونکہ اُس سے پہلے مجھے ایسا ہی ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا اس لیے میں ذرا محتاط رہا اور اُس کی حالت پر اپنی اندرونی کیفیت ظاہر نہ کی۔ بہر حال قصّہ مختصر یہ کہ میں نے بہت مشکل سے اُسے چپ کرایا اور اپنے پاس بٹھا کر اصل ماجرا پوچھا۔ اُس نوجوان نے بتایا: "جناب میں نے غلطی سے ایک مرتبہ امپورٹ لائسنس لے لیا تھا جو بعد میں میں نے اسّی ہزار روپے میں بیچ دیا تھا کیونکہ میں غریب آدمی تھا اور کچھ امپورٹ نہیں کر سکتا تھا لیکن اب میری غربت کی یہ حالت ہے کہ میں نے بچّوں کو اسکول سے بھی اُٹھا لیا ہے۔ میں اور میرا سارا خاندان رات بھر بیٹھ کر کاغذ کے لفافے بناتا ہے جسے میں صبح ایک پھل والے کے پاس دس پندرہ روپے میں بیچ کر آتا ہوں اُس سے ہم اپنا وقت گزارتے ہیں لہٰذا میں نے اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کوئی ٹیکس ادا کر سکوں۔"

میں نے نوجوان سے کہا: "ٹھیک ہے تم جاؤ میں چند روز بعد تمہیں زحمت دوں گا۔" مقصد یہ تھا کہ مجھے اُس کی باتوں کی تصدیق کرنے کا موقع مل جائے چنانچہ میں نے اُس شخص کے بارے میں اُسی کے علاقے میں رہنے والے

معزز آدمی سے رپورٹ مانگی اور دوسری طرف اپنے محکمے کے ایک انسپکٹر کو بھی اسی کام پر مامور کیا لہٰذا دونوں طرف سے مجھے یہی رپورٹ ملی کہ وہ نوجوان درست کہتا تھا اب مجبوری یہ تھی کہ اُس کی فائل کے مطابق اُسے تھوڑا بہت ٹیکس لگنا چاہیے تھا مگر میری اطلاع یہ تھی کہ وہ ٹیکس ادا کرنے کا اہل ہی نہیں ہے حتیٰ کہ وہ چالیس پچاس روپے ٹیکس ادا کرنے سے معذور تھا۔ چنانچہ تین دن بعد جب وہ نوجوان آیا تو میں نے اُسے کہا۔ ٹھیک ہے تم بے فکر ہو کر جاؤ میں تمہارا ٹیکس اپنی جیب سے ادا کر دوں گا۔ بہر طور میں نے اُس کا انکم ٹیکس ادا کیا اور اُس کی PROCEEDINGS فائل کر کے اُس فائل کو ان الفاظ کے ساتھ REMOVE کر دیا کہ یہ آدمی ٹیکس ادا ہی نہیں کر سکتا۔

س:۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کافی عرصہ تک صوبائی سیکرٹری اطلاعات بھی رہ چکے ہیں کیا یہ درست ہے کہ اشتہارات کے معاملے میں کچھ مخصوص اور منظورِ نظر اخبارات ورسائل کو نوازا جاتا ہے مثلاً لاہور کا ایک ڈائجسٹ ایسا بھی ہے جسے مہینے میں بیس سے بھی زائد ٹینڈر نوٹس دیے جاتے ہیں جبکہ اُس کے مقابلے میں دوسرے ڈائجسٹ کو جو سرکولیشن کے مقابلے میں اُس کے برابر ہے دو یا تین ٹینڈر نوٹس دیے جاتے ہیں کیا اس قسم کا امتیازی برتاؤ آپ کے دور میں بھی ہوتا تھا؟

ج:۔ ندیم صاحب! میں تو بطور انفارمیشن سیکرٹری اپنے دور کی بات ہی کر سکتا ہوں میرے زمانے میں ایک بھی ایسا کیس نہیں تھا کہ کسی میگزین کو ناجائز طور پر اشتہارات سے نوازا گیا ہو۔ ہمارے زمانے میں طے شدہ ضابطے کے مطابق ہی اشتہارات جاری کیے جاتے تھے۔ اس کے لیے دو ہی معیار تھے پہلے تو یہ دیکھا جاتا تھا کہ آیا مذکورہ پرچہ میڈیا لسٹ میں آگیا ہے اور دوسرا یہ کہ اے بی سی سرٹیفکیٹ کی کیا رپورٹ ہے چنانچہ میں نے اپنے اختیارات کو بہت تدبر اور احتیاط سے استعمال کیا تھا۔ میرے زمانے میں اس قسم کی ناانصافی کا ایک بھی ایسا کیس نہیں ہُوا۔ جو بات دراصل آپ کر رہے ہیں یہ میرے علم میں نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ میرے آنے کے بعد کی بات ہو۔ میرے دور میں کئی اخبارات اور رسائل حکومت کی پالیسیوں سے اختلاف بھی رکھتے تھے مگر اس بنیاد پر کسی پرچے کے اشتہارات کے کوٹے میں کمی بیشی نہیں کی گئی۔ اب اُس زمانے کے طریقہ کار ـــ کو اپنایا جا رہا ہے یا نہیں میں تو اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

> بیوروکریسی نے ملک کے
> سیاسی اور جمہوری
> اداروں کو تباہ کیا ہے

س:۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کافی عرصہ تک فلم سنسر بورڈ کے چیئرمین بھی رہ چکے ہیں۔ میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ آجکل ہماری نوجوان نسل میں تشدد بے حیائی بے راہ روی اور بزرگوں کی بے ادبی کے جو رجحانات پیدا ہو گئے ہیں اُس میں ہماری اپنی فلم کا کس حد تک دخل ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ بھارتی ذرائع ابلاغ کے حوالے سے ہم پر جو ثقافتی یلغار جاری ہے اُس کے ہماری موجودہ نئی نسل پر کس حد تک بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

ج:۔ یہ بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ آج آپ دنیا کے کسی بھی حصّے میں چلے جائیں نوجوان نسل اس قسم کے اخلاقی بحران کا شکار ہے یہ رجحان تو پورے دنیائے اسلام کے

ایسی دولت پر لعنت ہے
جو ٹیکس چوری کر کے
بچائی جائے

ممالک میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے مگر اس پر تھوڑا سا وقت لگے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے جو سوشل ریفارمرز ہیں ہماری جو مذہبی اور اصلاحی تحریکیں ہیں وہی اس طوفانِ بدتمیزی کے سامنے بند باندھ سکتی ہیں، حکومتیں تو صرف اس سلسلے میں ان تنظیموں کو سپورٹ دے سکتی ہیں پالیسیاں بنا سکتی ہے کہ جس سے یہ مقصد پورا ہو سکے لیکن حکومت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس طرح کے غلط رجحانات کے آگے بند باندھ لے یہ ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں اوّل تو آپ کا میڈیا اتنا اچھا ہونا چاہیے کہ لوگ باہر نہ دیکھیں انہیں صحت مندانہ قسم کے تفریحی پروگرامز دکھائے جائیں اور دوسرا یہ کہ معاشرے کے اندر اصلاحی تحریکیں چلائی جائیں جو معاشرتی اقدار کا احیا کریں جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ہماری فلم نے نئی نسل کو کس حد تک بگاڑا ہے تو میں اس سلسلے میں اپنے حوالے سے ہی بات کر سکتا ہوں۔ میرے زمانے میں سب سے زیادہ فلمیں بنیں اور کامیاب بھی ہوئیں۔ بطور چیئرمین فلم سنسر بورڈ — میں نے فن کے اوپر کبھی کوئی غلط ضابطہ یا پابندی نہیں لگائی تھی اُس زمانے میں بھی مسئلہ فلموں میں فحاشی کا نہیں بلکہ تشدد کا تھا اور اس زمرے میں مجھ سے جو کچھ بھی ہوا میں نے کیا۔ میں نے فلم کی بہتری کے لیے جو کوششیں یا جائز فیصلے کیے اُس کا فائدہ فلم والوں کو ہی ہوا۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ میرے زمانے میں پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ فلمیں بنیں بقول بعض مخالفین کے اگر میں فلموں سے خائف تھا تو زیادہ فلمیں کیوں بنیں اور وہ کامیاب کیوں ہوئیں۔ میرا اب بھی یہی نظریہ ہے کہ جو فلم لوگوں کے مزاج اور کردار کو سدھارنے کی نیّت سے بنائی جائے گی وہ ضرور کامیاب ہو گی۔ اگر کسی فلم سے عوام میں بُرائیاں اور غلط رجحانات جنم لیتے ہیں تو میرے نزدیک وہ ایک فلم نہیں بلکہ ایک بُرائی ہے اور عوام کو اس سے دُور ہی رہنا چاہیئے

س:۔ آپ بے شمار اہم نوعیت کے عہدوں پر فائز رہے ہیں اور اب تک ہیں اس طویل پیشہ وارانہ زندگی میں کچھ ایسے دلچسپ واقعات بھی یقیناً ہوں گے جو اب تک آپ کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں محفوظ ہوں گے۔ اگر اُن میں سے کچھ واقعات ہمیں سنائیں تو یقیناً یہ ہمارے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

ج:۔ ندیم صاحب! واقعات تو بے شمار ہیں لیکن اس وقت جو چند ایک واقعات مجھے یاد آ رہے ہیں وہ میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔ ایک زمانے میں جب میں انفارمیشن ڈویژن میں تھا یہ غالباً بھٹو صاحب کے دور کی بات ہے اُس وقت جو انفارمیشن منسٹر تھے انہوں نے ایک مرتبہ وزیرِ اعظم صاحب کو کسی مسئلے پر ایک نوٹ لکھا جس میں انہوں نے اپنی طرف سے بڑی افلاطونی تحریر لکھی تھی۔ دراصل اس قسم کی چیزیں وزیرِ اعظم کو متاثر کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ اب مشکل یہ تھی کہ میں اس محکمے کا سربراہ تھا اور ہر چیز میری نظر سے گزرتی تھی چنانچہ وزیرِ اطلاعات کا بھجوایا ہوا نوٹ جب وزیرِ اعظم کی طرف سے واپس آیا تو اس کے نیچے بھٹو صاحب نے صرف ایک انگریزی فقرہ لکھا تھا جس کا اُردو ترجمہ کچھ یوں تھا۔

"کیا میرا پاگلوں سے پالا پڑا ہوا ہے؟"

اس طرح اُس زمانے میں وزارتِ اطلاعات نے — وزیرِ اعظم بھٹو کو ایک نوٹ بھجوایا جس میں لکھا تھا کہ میں نے پشاور میں ریڈیو اسٹیشن قائم کر لیا ہے مگر واپڈا والے ال کا لکشن نہیں دے رہے۔ اس پر وزیرِ اعظم بھٹو لے لہٰذا یہ فقرہ لکھ کر فائل واپس بھجوا دی کہ "واپڈا کو ہنم رسید کر دو۔"

اب وزارتِ اطلاعات کو مسئلہ درپیش ہوا کہ وزیرِ اعظم کے ان احکامات پر کیسے عمل درآمد کیا جائے اور پھر لُطف کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں وزارتِ اطلاعات کا باقاعدہ ایک اجلاس بھی ہوا جس میں اس بات پر غور ہوا کہ واپڈا کو کس طرح جہنم رسید کیا جائے۔

اسی طرح مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے یہ بھی بھٹو صاحب کے دور کی بات ہے۔ جس زمانے میں یہاں قادیانیوں کے خلاف تحریک چلی تھی تو آپ کو یاد ہو گا کہ سر ظفر اللہ خان نے انہی دنوں لندن میں یہ بیان دیا تھا کہ پاکستان میں قادیانیوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ لندن کے اخبارات میں اُن کا یہ بیان شائع ہوا۔ ہماری وزارت کی ہر روز ایک میٹنگ ہوا کرتی تھی جس میں حکمتِ عملی پر تبادلہ خیال ہوا کرتا تھا چنانچہ اُس روز یہ مسئلہ درپیش تھا کہ سر ظفر اللہ خاں نے جو بیان دیا ہے اُس کا توڑ کیا جائے۔ اجلاس میں مختلف لوگ مختلف تجاویز دے رہے تھے۔ ہماری وزارت کے ایک افلاطونی وزیر نے یہ تجویز پیش کی "سر ظفر اللہ خان سے کہا جائے کہ وہ اپنا بیان واپس لے لے۔" جب انہوں نے یہ تجویز پیش کی تو میں معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ اُس زمانے میں ہمارے وزیرِ اطلاعات مولانا کوثر نیازی ہوا کرتے تھے انہوں نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "جناب میرے دوست نے تجویز پیش کی ہے کہ سر ظفر اللہ خان سے کہا جائے کہ وہ اپنا بیان واپس لے لیں، لیکن میرے یہ دوست بھول گئے ہیں کہ سر ظفر اللہ خان حکومتِ پاکستان کے کبھی ملازم نہیں رہے" چنانچہ اس بات پر بہت قہقہہ پڑا۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ ہمارے جو افلاطونی قسم کے "اعلیٰ افسر" ہیں وہ اس قسم کی افلاطونی تجاویز پیش کیا کرتے تھے۔

بھٹو نے وزیر اطلاعات کے
نوٹ کے نیچے لکھا کیا میرا
پاگلوں سے واسطہ پڑا ہے؟"

س:۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے آپ کے کسی افسرِ اعلیٰ یا کسی حکمران کا آپ پر عتاب نازل ہوا ہو؟

ج:۔ ضیاء الحق کا مارشل لا لگا تھا اور میں اُس زمانے میں انٹیلی جنس میں ہوا کرتا تھا یہاں میں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ ایک حکومت تو وہ ہوتی ہے جو بظاہر نظر آتی ہے لیکن اصل حکومت ہمیشہ پس پردہ ہوتی ہے جو فیصلے کرتی ہے اُس دور میں بھی حکومت پر ایسی ہی شخصیات حاوی تھیں چنانچہ ایک روز مجھے اُس زمانے کے ڈائریکٹر انٹیلی جنس ایم اے کے چوہدری نے — بلوایا جو میرے باس تھے وہ بہت عظیم اور قابل انسان ہیں میں اُن کا بے حد احترام کرتا ہوں تو ایک روز شام کے وقت انہوں نے مجھے اپنے گھر پر بلوایا اور جب میں وہاں پہنچا تو وہ بے چینی سے ڈرائنگ روم میں ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے لمبی چوڑی فائلیں مجھے دیتے ہوئے کہا کہ ضیاء الحق نے نیشنل عوامی پارٹی کے بارے میں ہماری رائے طلب کی ہے لہٰذا آپ ساری فائلیں لے جائیں اس میں حیدر آباد ٹریبونل سے متعلق بھی مواد موجود ہے اور اس کی روشنی میں آپ ایک SUMMARY لکھ دیجئے تاکہ صدر صاحب کو بھجوائی جا سکے۔ میں رات بھر اُن فائلوں کو دیکھتا رہا اور سمری لکھ کر چوہدری صاحب کو بھجوا دی۔ چوہدری صاحب نے اس سمری کو مزید جامع اور مختصر کر دیا۔ بہرکیف ہم نے اس میں لکھا تھا کہ نیپ

ضیاالحق سے کہا گیا تھا کہ نیپ
پر سے پابندی اُٹھانے کی صورت
میں وہ اس کا ساتھ دے گی

پر جو پابندیاں لگی ہیں وہ جوڈیشنل پروسیس کے ذریعے لگائی گئی ہے جسے باقاعدہ سپریم کورٹ میں پیش کیا گیا تھا جس پر عدالت نے یہ فیصلہ دیا ہے لہذا کوئی یکطرفہ فیصلہ کرنے کی بجائے آپ اسی مقدمے کو کورٹ کے حوالے کر دیں۔ ان لوگوں کی ضمانتیں بھی ہو سکتی ہیں اس کے علاوہ کورٹ اپنے فیصلے کو تبدیل کرنے کی بھی اہل ہے۔ کیونکہ اس وقت نیپ نے اس مقدمے کا بائیکاٹ کر رکھا تھا لہذا اسے کہا جا سکتا ہے کہ اب وہ اپنا نقطہ نظر پیش کریں، مقصد یہ تھا کہ اگر نیپ پر سے پابندی اُٹھانا مقصود ہے تو وہ عدلیہ کے ذریعے ہی ہٹائی جائے؛ اس کے علاوہ نوٹ میں بعض اور بھی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ اب ملاحظہ کیجئے کہ اس زمانے میں ہمیں اُوپر سے یہ حکم نامہ ملا تھا کہ آئندہ حکومت کو جو بھی تجاویز بھجوانا مقصود ہو وہ نیشنل سیکورٹی کونسل کے ذریعے ہی بھجوائی جائیں حالانکہ اس سے پہلے انٹیلی جنس بیورو ہر خط ہر رپورٹ اور ہر سمری براہِ راست صدر یا وزیراعظم کو ہی بھجوایا کرتی تھی لیکن جب نیشنل سیکورٹی کونسل بنی اور جو لوگ اُس پر حاوی تھے انہوں نے انٹیلی جنس بیورو کا جو رویّہ دیکھا اور جب یہ محسوس کیا کہ وہاں سے آنے والی رپورٹیں زیادہ تر نیپ کے حق میں نہیں ہوتیں تو وہ تھوڑے سے خبردار ہو گئے اور اتفاق سے وہ لوگ جو صوبہ سرحد سے تھے اور جو اُس وقت نیشنل سیکورٹی پر قابض تھے اُن کے بھتیجے بھانجے اور بہنوئی وغیرہ سب نیپ سے تعلق رکھتے تھے لہذا انہوں نے صدر ضیاالحق کو یہ پٹی پڑھائی تھی کہ اگر آپ نیپ پر سے پابندی ہٹا دیں گے تو نیپ آپ کے ساتھ ہو گی اور یوں آپ نہ صرف پیپلز پارٹی سے نپٹ سکیں گے بلکہ نیپ کو بھی پی پی پی کے خلاف استعمال کر سکیں گے۔ اس طرح کی وہ صورتِ حال تھی جس میں صدر صاحب کے پاس یہ سمری چلی گئی تو چند دنوں بعد مجھے ایم اے کے چوہدری صاحب نے بلوایا اور کہا!

"صفدر! معاملہ کچھ گڑبڑ نظر آ رہا ہے" میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ہم نے صدر صاحب کو جو سمری بھجوائی تھی اُس سلسلے میں آج صبح جب صدر صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ تم نے مجھے وہ سمری نہیں بھجوائی۔ میں نے کہا جناب وہ تو میں نے اُسی دن بھجوا دی تھی۔ صدر صاحب نے کہا "پھر کہاں گئی؟" میں نے کہا جناب ہمیں یہ حکم نامہ جاری ہوا تھا کہ ہر چیز [illegible] کونسل کی وساطت سے بھجوائی جائے۔" اس کے بعد صدر صاحب خاموش ہو گئے۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ چوہدری صاحب کی صدر سے ملاقات سے پہلے ہی نیپ پر سے پابندی ہٹائی جا چکی تھی اور صدر صاحب اس یکطرفہ فیصلے کا اعلان بھی کر چکے تھے۔ صدر صاحب نے کہا میں نے فیصلہ تو کر دیا ہے مگر آپ نے مجھے رائے نہیں دی۔ چوہدری صاحب نے کہا رائے تو میں نے دے دی تھی مگر آپ تک پہنچی نہیں۔

اب اس بات پر چوہدری صاحب کو ذرا سا خطرہ محسوس ہوا کہ کچھ ہونے والا ہے اور پھر اس واقعہ کے چند ہی روز بعد چوہدری صاحب کو ریٹائرڈ کر دیا گیا اور ایک مرتبہ مجھے بھی وہاں سے ٹرانسفر کر دیا گیا۔

❋

Pakistanipoint Waqar Azeem

آسیہ رزاقی

شہرِ بے اماں کی روشن شام

بھائی جان کے خط نے مسرتوں کے خزانے الٹ دیے۔

خط نہیں۔ وہ ارمانوں، آرزوؤں کی تکمیل کی نوید تھی۔ مژدۂ جاں فزا تھا۔ امی شکرانے کے سجدے کر رہی تھیں اور ہم سب ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ شادی کے نو برس بعد — سوکھی کھیتی ہری ہوئی تھی۔ بھائی جان کے باغ زیست میں ایک کلی کھلی تھی۔ پھول مہکا تھا۔ ہاں — نو برس۔ انتہائی آرزو اور انتظار کے نو برس۔ نو صدیاں۔ دعائیں کرتے کرتے امی کی زبان خشک ہو جاتی تھی۔ آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ جب اللہ نے ان کی دعا کو قبولیت کے درجے پر پہنچایا۔ بھائی جان بھی اب ابا جان بن گئے تھے اور وہ نازک اندام، حسین پری چہرہ بھابی — آخر کار اماں جان ہو گئی تھیں۔

ہم لوگ رات دیر تک یہی باتیں کرتے رہے۔ بھابھی کیسی لگتی ہوں گی۔ گود میں بچہ۔ آس پاس بچے کا بکھرا ہوا سامان ہم نے تو انہیں سدا فرصت میں دیکھا تھا۔ اور لپ جھپ ادھر ادھر کام میں مصروف۔ اب وہ بھی اپنے بچے میں پھنسی ہوئی ہوں گی۔

ہم سب بہن بھائی مٹھائی کھا کھا کر تصورات سے دل بہلاتے رہے۔ بھابھی کو روتے ہوئے بچے کو سینے سے لگائے دودھ بنا کر پلاتے دیکھتے رہتے۔ ناامیدی میں امید کی کرن۔ اس خبر پر سب بے حد مسرور تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اس نے ہمیں بھی اس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا۔

بھائی جان نے مجھے اور امی کو لندن بلانے کا لکھا تھا۔ ان کے خطوط تو اکثر آتے رہتے تھے۔ وہ امی کو لندن بلاتے تھے لیکن امی ہر بار گھر کی مصروفیت کا کہہ کر انکار کر دیتی تھیں گھر سنبھالنے کا تو بہانہ تھا۔ دراصل امی فہد اور احد کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھیں ورنہ چھوٹی بھابی گھر سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ بھائی جان نے ٹکٹوں کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ ننھے کھلونے کو دیکھنے کا ایسا شوق ہوا کہ امی۔ فہد اور احد کو بھول گئیں۔ بھائی جان کے بیٹے کے لیے کپڑے سینے بیٹھ گئیں۔ رضائیاں، تکیے، تولیے، غلافوں پر ننھے منے پھول۔ بھائی جان سات سال سے لندن میں تھے۔

امی کو اپنی تمام اولادوں میں بھائی جان سب سے پیارے تھے۔ ایک تو وہ ان کی پہلی اولاد تھے۔ دوسرے بے حد سعادت مند — خدمت گزار اور فرماں بردار۔ بھائی جان نے کبھی امی کو تنگ نہیں کیا۔ (ہم لوگوں کی طرح) ہمیشہ امی کی خواہش کا احترام کیا۔ وہ ہمارے گھر کے کفیل تھے۔ ہمارا خرچ پابندی سے بھیجا کرتے۔ میں اسکول سے نکل کر کالج میں آگئی۔ اور کالج سے فارغ ہو کر گھرہستی سیکھنے میں لگ گئی۔ بھیا اور منے بھیا بھی تعلیمی مدارج طے کر کے بڑوں میں شمار ہونے لگے۔ یہاں تک کہ بھیا کی سروس ملتے ہی ان کی خوب دھوم دھام سے شادی کر دی گئی۔ بھائی جان ان دنوں امریکہ گئے ہوئے تھے۔ بھابھی لندن میں ہی تھیں۔ وقت کم تھا اس لیے وہ لندن سے شادی میں شریک ہونے پہنچ گئیں۔ بھائی جان نہیں آسکے تھے۔ بعد میں امی نے انہیں کئی بار منع کیا کہ وہ اب خرچ نہ بھیجا کریں۔ ناصر کی معقول تنخواہ ہے۔ ہمارا گزر ہو جائے گا مگر وہ ہر بار لکھتے۔

"آپ لوگ کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھائیں۔ ہم دو آدمیوں کا خرچ ہی کیا ہے۔ میرا جو کچھ ہے ناصر، طاہر اور شمع کے لیے ہے۔"

چھوٹے بھیا کی شادی کے کچھ بعد بھائی جان چند دن کے لیے آئے تھے۔ بھابھی ہمراہ تھیں مگر وہ یہاں بہت پریشان رہیں۔ ہر ایک کے لبوں پر یہی سوال تھا۔

"بچہ کیوں نہیں ہوا؟ علاج کرایا؟ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

بعض لوگوں نے بھائی جان کو دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا۔ بھائی جان ہنس کر ٹال گئے۔ امی سے بھی کسی خیر خواہ نے یہی ذکر کیا۔ وہ بے چین ہو گئیں۔ بھائی جان بھابی کی محبت مثالی تھی۔ بھابھی نے ہم سب کے لیے بھی اپنے دل کو کشادہ رکھا تھا تو بھلا بھائی جان تو ان کی زندگی تھے۔ اپنی زندگی تو سب کو عزیز ہوتی ہے۔

"ارے نہ — نہ،" امی بے قراری سے کہتیں "خدارا یوں نہ کہو۔ میرے بیٹے کو اولاد نہ ہونے کی شکایت نہیں ہے یہ تو اللہ کی دین ہے۔ جسے چاہے نوازے۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میری بہو کا دل ٹوٹا تو عرش لرزنے لگے گا۔ اور غیب کا علم کس کو ہے — دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی تو —؟"

امی کو خوفِ خدا تھا مگر لوگ اسے دکھاوا سمجھتے تھے۔ بھابھی کو امی سے اپنی سگی ماں جیسی محبت تھی۔ امی بھی انہیں اپنی اولاد سے کم نہیں چاہتی تھیں۔

"اولاد نہیں ہے تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوگی۔"

امی اسی طرح سب کے منہ بند کر دیتی تھیں۔ پھر چھوٹی بھابھی نے ان کو تین سال میں دو بچے دے کر نہال کر دیا۔ فہد، احد کو دیکھ دیکھ کر بھابھی کا ذکر کر کے امی اداس ہو جاتیں۔ اور کہتیں۔

"نگوڑی کو بچے کی آرزو ہوگی۔ مگر اللہ کے کارخانے میں کچھ دیر ہوگی۔ اشارہ ہوتے ہی آرزو بر آئے گی۔"

اور اب اشارہ ہو گیا تھا۔ بھائی جان نے مفصل حال لکھا تھا۔

بھابھی بہت بیمار رہیں۔ اسی لیے بھائی جان نے پہلے کچھ نہیں لکھا کہ بھابھی کمزور تھیں۔ بچہ بھی کمزور۔ صحیح سلامت پیدا ہونے کی امید بھی نہ تھی۔ اب جب کہ ممتا کی قوت نے بھابھی کو صحت عطا کر دی اور ماں بیٹا صحت مند ہو گئے۔ تو انہوں نے چاہا کہ ہم ان کے کھلونے کو دیکھیں۔ بھابھی کو سفر کی اجازت نہ تھی۔

غرض کہ ہم لوگ مارا مار تیاری کرنے لگے تھے۔ شاپنگ سلائی اور پھر ایبٹ — خدا خدا کر کے ہماری تیاری مکمل ہوئی۔ چھوٹے بھیا بھابھی اور منے بھائی کو چھوڑ کر ہم لوگ جہاز میں بیٹھے تو امی کی آنکھیں نم تھیں۔ انہیں فہد، احد کی جدائی کا دکھ تھا لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر بھائی جان موجود تھے۔ لندن میں بادلوں کا ہجوم تھا۔ لوگ برساتی پہنے پھر رہے تھے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چمکتی دمکتی روشنیاں دیکھ رہی تھی امی کو جلد سے جلد گھر پہنچنے کی فکر تھی تاکہ اپنے پوتے کو دیکھیں وہ سوال کر کر کے بھائی جان سے ایک ایک تفصیل معلوم کرتی رہیں۔

بھائی جان بے حد خوش تھے۔ دیارِ غیر میں اپنوں کی قدر ہوتی ہے۔ اور وہ تو تھے ہی محبت و شفقت کا بحرِ بے کراں۔ اولاد کی خوشی کے علاوہ میری اور امی کی آمد بھی ان کی مسرت کی وجہ تھی۔

بھائی جان کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔ ہم دونوں کے سامان سے بھر گیا تھا — بچہ بہت پیارا اور بہت خوبصورت
تھا۔ گول مٹول۔ بھابھی بہت کمزور تھیں مگر خوشی سے
نہال۔ امی بھی بے حد خوش تھیں۔ اس خوشی کے موقع پر
ساس بہو آنسو بہانے لگیں تو مجھے ہنسی آگئی۔ پھر امی
پوتے کو بسم اللہ کہہ کر گود میں اٹھایا۔

"یہ ہے تمہارے باپ کی نسل۔" امی فخر سے منے کو
کر بولیں۔

"کیوں؟ وہ فہد اور احد کیا ابا کی نسل نہیں؟"
بھی بس۔" مجھے ناصر بھائی سے زیادتی پسند نہیں آئی۔

"وہ تمہارے دادا کی نسل ضرور ہیں مگر میرے لیے
تمہارے باپ کی نسل اصل میں طارق سے ہی چلے گی۔ یہ میر
یقین ہے۔ اللہ میرے سب بچوں کو زندہ سلامت رکھے
اور فہد اور احد کو لمبی عمر عطا کرے۔ میری دعاؤں کو قبول
نصیب ہوئی۔ تب میرا یہ کھلونا دنیا میں آیا ہے۔"

امی کو یقین تھا کہ انہی کی دعاؤں نے جیتا جاگتا صح
بچہ بھائی جان کو دیا ہے۔ کئی دن میں اور بھابھی باتوں
مصروف رہے۔ پھر کچھ پاکستانیوں سے ملاقات ہوئی
بھائی جان کافی مقبول تھے یہاں اور ان کا حلقۂ احبا
بھی کافی وسیع تھا۔

ایک ہفتہ بعد ہم تفریح کے لیے گھر سے نکلے۔ جہا
بھی مجھے کوئی شلوار قمیص اور ساڑھی میں ملبوس لڑکی یا
عورت نظر آتی میں اس کو بغور دیکھتی کہ شاید کوئی شنا
چہرہ ہو۔

ایک دن ہم ایک شاپنگ سینٹر سے نکل رہے تھے
وہیں ایک ساڑھی والی لڑکی نظر آئی اس کے ساتھ ای
گورا چٹا لمبا تڑنگا آدمی بھی تھا۔ چونکہ دونوں پر بیک وق
نگاہ پڑی تھی اس لیے میں ہچکچا سی گئی۔ چہرہ کچھ شناسا
پھر ہمت کر کے آگے بڑھی۔ لڑکی اس لمبے آدمی سے
کر رہی تھی۔ میں اس لڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ راستہ
رک گیا تو اس نے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے ہی اسے پہچانا

"لالہ —!"

اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ خشک ہونٹ
ذرا سا کھلے۔ بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "شمع؟"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ پھر لندن کی اس
بے حد مصروف رواں دواں سڑک کے پرہجوم فٹ پاتھ

پر ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"تم ۔۔۔ کیسے ۔۔ ؟ شادی ؟"

"نہیں"۔ میں نے انکار میں گردن ہلائی۔" بھائی جان کے پاس آئی ہوں۔ تم اپنا پتا بتا دو۔ میں ملنے آؤں گی۔" میں نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

"اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔ معاف کرنا شمع ! آفس کے کام سے آئی تھی۔ تم ایڈریس بتا دو میں خود آجاؤں گی۔"

اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ میں نے بھابھی سے پوچھ کر اپنا ایڈریس بتایا۔ ہم اس وقت بھائی جان کے گھر سے دور نہیں تھے۔ لالہ نے مجھے آفس کا فون نمبر دیا اور اس لمبے تڑنگے امریکن سے میرا تعارف کرایا۔ امریکن نے بگڑی ہوئی انگلش میں کچھ کہا۔ اس کی آواز بھی بہت گونج دار سی تھی۔ میں تو گڑبڑا گئی۔ بھئی سچی بات ہے۔ کورس کی کتاب کے سوا دوسری انگلش تو میں نے کبھی سنی نہ تھی۔

لیکن یہ تو امریکن لہجے والی زبان تھی کتابی انگلش سے یکسر نئی اور مختلف تھی۔ جب اس نے اپنا سنہری روئیں سے بھرا مضبوط ہاتھ مصافحے کے لیے میری سمت بڑھایا تو میں سراسیمہ ہو کر اپنے ہاتھوں کی حفاظت میں مصروف ہو گئی۔ کہ کہیں وہ بزور نہ میرا ہاتھ پکڑ لے۔ لالہ ہنسنے لگی۔ پھر اس سے بولی۔

"میک ! جانتے ہو یہ بھی میری جیسی ہے"

امریکن نے ہمیں تیز مسکراتی نظروں سے دیکھا۔ پھر کچھ کہا۔ لالہ مجھ سے معذرت کر کے جانے لگی تو میں نے پوچھا۔

"کب آؤ گی ؟"

"آج ہی"۔ اس نے کہا اور دونوں چلے گئے۔ میں دور کھڑی بھابھی کے قریب آ گئی۔

شام کو بھائی جان بھابھی منے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے تھے۔ وہ آ گئی۔ آتے ہی اس نے کہہ دیا کہ وہ زیادہ دیر نہیں رک سکے گی۔ امریکن اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور پندرہ منٹ بعد لینے کے لیے آنے کا کہہ گیا۔ امی کباب اور شیر خورمہ لے آئیں جسے بڑے شوق سے وہ کھانے لگی۔ کھاتی جاتی اور تعریف کیے جاتی۔ میں جلدی جلدی جاننے والوں کی خیریت اسے بتا رہی تھی۔ تب اس نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

"اور تم ہماری طرف بھی گئی تھیں ؟"۔ گو کہ عرصے سے میں اس کے گھر نہیں گئی تھی مگر پردیس میں عزیزوں کا درد رکھنے والی ہستی کو مایوس نہ کر سکی اور اقرار کر لیا کہ

"ہاں، کچھ ماہ پہلے گئی تھی۔"

اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا۔ "یہ تو بتاؤ وہ سب کیسے ہیں۔۔ اور ۔۔ کیا بھابھی جان کے ہاتھ سے اب بھی برتن گر کر ٹوٹتے ہیں ؟ کیا اب بھی وہ سالن جلا دیتی ہیں۔۔ اور کیا اب بھی بھائی جان اس جلے ہوئے کڑوے سالن کو اسی ذوق و شوق سے کھاتے ہیں جیسے بہت لذیذ کھانا کھا رہے ہوں۔"

اس کے لہجے میں حسرت و شوق نمایاں تھا۔ اس کی بھابھی بہت دلچسپ خاتون تھیں۔ ہر وقت ہنستی رہتی تھیں لطیفے سنانا ان کی ہابی تھی۔ باتوں میں ایسی مگن ہو جاتیں کہ کچن کو بھول جاتیں۔ سالن جل کر سیاہ پڑ جاتا۔ مگر بھائی جان اس طرح تعریف کر کے کھاتے جیسے بہت عمدہ کھانا کھا رہے ہوں۔ انہیں وہ کبھی بھی بدمزہ نہ لگتا۔ گو کہ لالہ ہمیشہ منہ بناتی اور کھانا کھانے سے انکار کر دیتی۔ تب اس کے بھائی پیار سے کہتے۔

"کھا لے رانی ! کھا لے کتنے لوگوں کو تو یہ بھی میسر نہیں۔"

"نہ ہو۔ میں بھوکی رہ لوں گی مگر یہ کڑوا سالن نہیں کھاؤں گی روز روز۔"

اس کے بھائی بھابھی میں مثالی محبت اور ہم آہنگی تھی بھائی جان اور بھابھی دونوں لاپروا، مست مگن قسم کے لوگ تھے۔ بھائی جان ہر روز کوئی نہ کوئی نقصان کر ڈالتے کبھی ان کی جیب کٹ جاتی۔ وہ گھر آ کر بتاتے تو بھابھی جان فوراً بے نیازی سے کہتیں۔

"چلو جانے دو۔ جان کا صدقہ گیا۔ افسوس نہ کرو۔ ۔۔۔ اس مہینے تنگی سے گزارہ کر لیں گے۔ مگر ان کی خوش مزاجی پر کوئی اثر نہ پڑتا ہنستی مسکراتی رہتیں۔ لالہ کو وہ بہت چاہتی تھیں مگر لالہ جب اپنے بھائی کو پھٹے کالر والی قمیص ۔۔۔ پہنے آفس جاتے دیکھتی یا بغیر پالش کے جوتے پہنے دیکھتی تو اس کا منہ پھول جاتا۔ وہ بھابھی جان سے خفا ہو جاتی۔ مگر وہ اسے منانے کے لیے طرح طرح کے منہ بنا بنا کے ہنساتیں۔

"آج پھر بھائی جان بغیر پالش کے جوتے پہن کر ۔۔۔ دفتر گئے ہیں۔" وہ شکوہ کرتی۔

"تو بھئی، کیا کریں۔ دن رات پالش ہی کرتے رہیں ؟ فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔" وہ لاپروائی سے کہتیں۔

"آپ کو اور کون سا کام ہے ؟ کچن میں آپ سے بیٹھا نہیں جاتا۔ پڑوسنوں کو بلا کر باتیں شروع کر دیتی ہیں پھر سب کچھ بھول جاتی ہیں۔ آخر آپ دل کیوں نہیں لگاتیں گھر میں۔"

"اپنے فرشتہ صفت میاں سے فائدہ اٹھاتی ہوں وہ سختی کریں تو گھر میں کیا جہنم میں بھی دل لگا لوں۔ وہ کچھ کہتے نہیں۔" وہ قہقہہ لگاتیں۔

"کبھی اس فرشتہ صفت کو اپنی طرف سے بھی فائدہ پہنچا دیا کریں۔ کف کے بٹن لگا کر یا کالر سی کر یا۔"

"بھئی، ہماری تفریح ہی کیا ہے۔ گھر کا کام ہم سے ہوتا نہیں۔ یہ مصیبت ہے۔"

کبھی اسکول سے آ کر کھانا منہ تک لے جاتے ہی لالہ چلا اٹھتی۔" جلا دیا۔ کڑوا۔ اخ تھو۔"

بھائی جان ہوتے تو دہی لینے دوڑ جاتے۔ یا بالائی لے آتے اور خوشامد کرتے۔

"کھا لے میری بہنا۔ میں نے بھی تو یہی کھایا ہے جلا ہوا۔ چل تو بالائی سے کھا لے۔"

لالہ بھناتی ہوئی اٹھ جاتی۔ اسے غصہ بہت آتا تھا اور وہ حق بجانب تھی۔ صبح کا ناشتا وہ خود بنا کر جاتی تھی شام کا کھانا آ کر پکاتی تھی۔ گھر بھی شام کو ہی صاف کیا جاتا لالہ بھتیجیوں کے کپڑے بھی سیتی اور گھر بھر کے کپڑے دھوتی۔ صرف دوپہر کا کھانا بھابھی جان کے ذمے تھا۔ وہ بھی وہ لاپروائی سے جلا دیتیں یا زیادہ تردد کرتیں تو گوشت سبزی کچے ہوتے۔ دراصل ان کو باتوں کے علاوہ ناول کی چاٹ بھی تھی۔

میں تو جب بھی ان کے گھر جاتی لالہ بھتیجے بھتیجیوں میں مصروف ہوتی اور بھابھی جان صحن میں جھلنگا پلنگ پر آرام کرتی پائی جاتیں۔ یا مونڈھے پر دنیا و مافیہا سے بے خبر ناول پڑھتی ہوتیں۔ گھر کے ہر حصے۔ بلکہ کونے کونے کھڑکی کھڑکی۔ میز میز۔ کتابیں پائی جاتیں۔ پھٹے ہوئے اوراق ادھر سے ادھر اڑتے۔ وہ جدھر سے گزرتیں کتاب اٹھا کر پڑھنے میں مصروف ہو جاتیں۔ ہر وقت سر کتا جاتا بھابھی جان وہیں کھڑی یا بیٹھی کتاب لیے پائی جاتیں۔ جب کوئی مہمان آتا تو انہیں جھنجوڑنا پڑتا۔ فوراً ہی کتاب پھینک کر باتوں میں لگ جاتیں۔ باتیں بہت دلچسپ کرتیں۔ مستقل مسکراہٹ نے ان کے ۔۔۔ چہرے پر عجیب نرمی اور بھول پن پیدا کر دیا تھا۔ سنجیدہ ہوتیں تب بھی مسکراتی ہوئی لگتیں۔ لالہ کی تنک مزاجی اور اعتراض پر کبھی خفا نہیں ہوتیں۔ خود لالہ بھی کہتی۔

"بھابھی جان ! میری بدمزاجی کو آپ برداشت کر لیتی ہیں۔ کوئی دوسری بھابھی ہوتی نا تو اگلے دن ہی گھر سے نکال باہر کرتی۔"

"نکالیں گے۔ ہم بھی نکالیں گے تمہیں، انتظار کرو۔" وہ ہنستی ہوئی کہتیں۔ "دوسرے گھر جا کر تمہاری بدمزاجی بھی ختم ہو جائے گی۔ بدل جاتی ہیں عادتیں سسرال جا کر۔"

"تو آپ کی عادتیں کیوں نہیں بدلیں۔ ؟" وہ چڑ کر کہتی۔

"بدل گئی ہیں بھئی۔ میں تو اپنے گھر میں نہایت نکمی مشہور تھی۔ بات تک کرنے کی تمیز نہ تھی، کام کا کیا ذکر۔ سب کہتے تھے سسرال سے اگلے دن ہی نکال دی جائے گی۔ دیکھو۔ آخر میں کام کرتی ہی ہوں اور سب خوش ہیں کہ نہیں ۔"

"ہونہہ ۔!" لالہ بڑبڑاتی "خوش ہیں۔ یا مجبور ہیں۔"

لالہ اپنے بھائی کی بہت لاڈلی تھی۔ وہ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ وہ جتنے خاموش تحمل برداشت والے تھے۔ لالہ اسی قدر تیز اور تیکھی۔ اور بھائی جان اس کے مزاج کو بگڑنے سے پہلے ٹھنڈا کرنے کی سعی کرنے لگتے۔

ہم نے ایک اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا۔ میں خالہ کے پاس ایبٹ آباد گئی ہوئی تھی۔ واپس آ کر سنا کہ ایک اچھا رشتہ آ گیا تھا۔ لالہ کی شادی کر دی گئی ۔۔۔ لڑکا لندن میں ہے۔ ماں باپ کوئی نہیں ہیں۔ صرف ایک بہن ہے۔ لالہ ایسی گئی کہ چار سال تک واپسی کا ذکر نہیں سنا۔ کبھی کبھی اس کا خط بھابھی کے نام آ جاتا بھابھی

جان مطمئن تھیں۔ بڑے وثوق سے کہتیں۔

"ارے اسے فرصت ہی کہاں ہے۔ سیریں کرتی پھرتی ہے۔ مہینہ بھر میں ہی ہماری یاد آجاتی ہے۔ تو بہت ہے۔"

پھر چھ چھ مہینے بعد خط آتا۔ لالہ نے لکھا تھا اس نے وہاں جاب کر لی ہے۔ خالی بیٹھنے سے دل گھبراتا تھا۔ یہاں زیادہ تر لڑکیاں سروس کرتی ہیں۔" میں شروع میں تو اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے اس کے بھائی کے ہاں کئی بار گئی۔ بھابھی جان سے گپ شپ کر کے آگئی۔ گھر کی حالت وہی تھی۔ البتہ اب ایک کھانا پکانے والی رکھ لی گئی تھی۔ جس نے بھائی جان کو لذیذ کھانوں سے روشناس کرایا۔ خود بھابھی جان نے ہنس ہنس کر بتایا۔

"اب تو ایسے ایسے کھانے ملتے ہیں جیسے ہم کبھی اپنے میکے میں کھاتے تھے۔"

اور اب اتنے سال کے بعد۔ لالہ پوچھ رہی تھی کہ کیا بھابھی جان اب بھی سالن جلا دیتی ہیں — اور بھائی جان اسی ذوق و شوق سے کھاتے ہیں؟

میں نے کہا۔

"اور کیا — بھائی جان تو بہت ذوق و شوق سے کھاتے ہیں۔ مگر۔ باورچن کے ہاتھ کا۔"

"اور — بھائی جان۔ وہ مجھے یاد کرتے ہیں؟"

وہ کچھ ہچکچا کر بولی۔ "بھابھی میرا ذکر کرتی ہیں؟"

"ہائیں۔ لالہ! پاگل ہے۔ ارے میں تو جب بھی گئی انہوں نے تیرا ہی ذکر کیا۔ مجھ سے اور کیا بات کریں۔"

میں نے لالہ کے آنسو اپنے دوپٹہ میں جذب کر لیے۔

"اور وہ — تمہارے وہ۔ انہیں لاتی ناں۔ بہت دل چاہتا ہے دیکھنے کا۔"

"اُن کو اس وقت چھٹی نہیں ملتی۔ ان کا آفس بھی بہت دور ہے۔ پھر کسی دن لاؤں گی۔ اب تو میں نے گھر دیکھ لیا ہے۔" لالہ نے اطمینان دلایا۔ بیس منٹ ہوئے تھے کہ میک آگیا۔

"یہ ہے کون؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔ حالانکہ یہ سرگوشی لاحاصل تھی۔ وہ اردو کب جانتا تھا۔

"میرے آفس کا مینجر ہے۔ بہت ہمدرد انسان ہے اس کی وجہ سے بہت بچت ہوتی ہے میری۔"

"ارے کیوں نہ اسے بھی شیر خورمہ کھلایا جائے۔" میں نے تجویز پیش کی۔ لالہ نے اسے اندر بلا لیا۔ وہ معذرت کرتا رہا۔ مگر نہ صرف شیر خورمہ بلکہ کباب بھی کھا گیا۔ گو کہ مرچوں کی وجہ سے اس کا رنگ انگارہ ہو گیا تھا۔ اس کی زبان سرخ ہو گئی۔ کنپٹی سے پسینہ بہہ نکلا۔ لالہ نے چمچے سے شیر خورمہ اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ تب اس کی جان میں جان آئی۔

جب وہ رخصت ہو کر باہر گئے۔ میں نے دیکھا۔ اس نے لالہ کو بازو سے پکڑ کر گاڑی میں بٹھایا۔ اس کی بے تکلفی پر میں سوچ میں پڑ گئی۔ کیا لندن آ کر لالہ اتنی بدل گئی ہے کسی غیر۔ انجان۔ غیر مذہب آدمی کے ساتھ اس کا پھرنا عجیب لگتا ہے۔ لالہ بہت شرم و حیا والی لڑکی تھی۔

بھائی جان نے ہم لوگوں اور ننھے کی آمد کے سلسلے میں دعوت کا انتظام کیا۔ سبھی ملنے والوں کو بلایا۔ میں تو پریشان تھی کہ دو کمروں میں اتنے بہت سے لوگ کہاں سما پائیں گے۔ مگر بھابھی نے کہا کہ ہم سامنے والوں کا اپارٹمنٹ مانگ لیں گے۔ اور کرسیوں کی ایسی سیٹنگ کریں گے کہ دونوں گھر ایک ہو جائیں گے۔ میں نے لالہ کے آفس فون کر کے اس سے بات کی۔ اور اسے اس کے شوہر سمیت مدعو کیا۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا۔ کھانے سب گھر میں امی اور میں نے پکائے تھے۔ بھائی جان کی ہدایت پر مرچیں بہت کم بلکہ برائے نام ڈالی گئیں۔ تاکہ انگریز لوگ بھی بآسانی کھا سکیں۔ بھابھی نے گھر کی آرائش بہت اچھے طریقے سے کی تھی بھائی جان نے بھی تعریف کی۔

شام بلکہ رات کو لوگ آنا شروع ہو گئے۔ لالہ سب سے آخر میں آئی۔ اور اب بھی اس کے ساتھ وہی امریکن — آتے ہی اس نے شوہر کی طرف سے معذرت کی۔ اس کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ وہ آج نہ آنے کی وجہ سے خود بھی شرمندہ ہے۔ پھر کسی دن لاؤں گی۔ وغیرہ۔

امریکن اسے چھوڑ کر جانے لگا تو میں نے لالہ سے کہا۔

"یہ تو بہت برا لگ رہا ہے لالہ! تم انہیں روک لو۔ اب کیا یہ تمہارے ڈرائیور ہی کا کردار ادا کریں گے۔ اور ہمارے اخلاق کے بارے میں کیا اندازہ لگائیں گے؟ اگر بہت ضروری کام نہ ہو تو کھانا کھا کر ہی جائیں۔"

لالہ نے میک کو میرا پیغام دیا۔ چند منٹ دونوں میں مشورہ ہوا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ اور غالباً میرا شکریہ ادا کیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اور شوخ نظروں سے لالہ کو دیکھ رہا تھا۔

لالہ ہنسی اور بولی۔ "سنو یہ کہہ رہا ہے کہ کیا آج بھی مرچیں کھلا کر سزا دینے کا پروگرام ہے؟ اور اس دن کی جیسی کوئی میٹھی چیز بطور تریاق بھی ہو گی؟"

میں نے تسلی دی کہ آج بھائی جان کے انگریز دوستوں کی خاطر ہر چیز کم مرچ بلکہ تقریباً بغیر مرچ کے ہے۔ پھر میں اسے دوسرے اپارٹمنٹ میں بھائی جان کے پاس لے گئی جہاں مردوں کا اجتماع تھا۔ اس کا تعارف کرایا۔ اسے وہاں ہم وطن تو نہیں ملے۔ ہم زبان ضرور مل گئے۔ مگر انگریز لوگ ہر کسی سے بے تکلف نہیں ہوتے۔ اور امریکیوں سے خاصا تعصب برتتے ہیں۔ لالہ خواتین کے مجمع میں گھبرا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آ کر پچھتا رہی ہو — بولی

"خالہ کہاں ہیں؟ میں ان کے پاس بیٹھ جاتی ہوں۔"

"تو یہاں تمہاری کوئی واقف کار نہیں۔ ارے لالہ! اتنے عرصے سے تو تم یہاں رہ رہی ہو کسی سے بھی شناسائی نہیں؟ چلو میں تمہیں سب سے ملاؤں۔"

"نہیں شمع! رہنے دو۔ میں۔ مجھے کسی سے مل کر کیا لینا ہے۔" اس نے سرد آہ بھری۔ پھر کہا۔ "چلو تم انجوائے کرو۔ میں خالہ کے پاس جاتی ہوں۔"

میں اسے امی کے پاس لے گئی۔ جو بھائی جان کے بیڈروم میں اپنے پوتے کو لیے بیٹھی تھیں۔ میں پھر خواتین کے پاس آگئی۔ اور ان کی گفتگو سننے لگی۔ ایک صاحبہ تو بے حد مزیدار باتیں کر رہی تھیں۔

"ہاں بھئی، یہاں تو اپنے عیش ہیں۔ پاکستان میں یہ مزے کہاں۔"

"مگر پاکستان میں نوکر تو مل جاتے ہیں۔ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ٹھاٹھ سے آرام کرو۔ یہاں تو کام کر کر کے مر جاؤ۔ جو کچھ کرنا ہے خود کرنا ہے۔" دوسری صاحبہ منہ بنا کر بولیں۔

"مگر مزے بھی تو ہیں۔ گھر میں ہر چیز کارٹن رکھ کر چین کی نیند سوؤ۔ جب جی چاہا یا ضرورت پڑی۔ کارٹن نکالا۔ اور آنچ دے کر کھا لیا۔ وہاں تو سبزی بازار سے منگاؤ۔ پھر اسے چھیلو نفاست سے۔ گھنٹہ بھر لگا کر۔ پھر ہانڈی میں ڈالو۔ پھر اس کے گلنے کا انتظار کرتے رہو۔" یہ لالہ کی بھابھی جان کی قسم کی خاتون تھیں۔

"نہ کرو انتظار۔ بغیر گلا ہی کھا لو۔ خیر چھوڑو۔" ایک صاحبہ نے بھابھی کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"سنا ہے آنٹی پان کا کوئی اسپیشل برادہ لائی ہیں۔ بھئی ہمیں بھی کھلواؤ نا۔"

امی پاکستان سے پان کتھا چونا سکھا کر برادہ بنا کر لے آئی تھیں۔ چھالیہ الگ تھی۔ وہی برادہ چھالیہ اور الائچی ڈال کر مہمانوں کو پیش کیا جاتا۔ میں امی سے وہی لینے گئی۔ تو لالہ کی آنکھیں سرخ تھیں امی بھی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ میں نے ڈبے سے برادہ نکال کر پیالے میں رکھا۔ ابھی واپس نہیں گئی تھی کہ بھائی جان ایک خاتون کے ہمراہ اندر داخل ہوئے۔

"امی جان! ان سے ملیے۔ یہ مسز یوسف علی ہیں۔ آپ سے ملنے کی مشتاق ہیں۔"

وہ سرخ سفید اور بے حد شاندار سی خاتون امی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اور تب میں نے لالہ کو دیکھا وہ بھائی جان کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے

پیارے بچوں کے لئے محمود خاور کی
۵ خوبصورت رنگین کتابیں
الٹم بلٹم کی شرارتیں، دونوں نکلے تھے دنیا کی سیر کو اور یہاں آکر پھنس گئے، الٹم بلٹم دونوں شیخی بھگارتے اور اپنے بہادری کے قصے سناتے، وہ تھے کتنے بہادر، یہ تو آپ کو پڑھ کر ہی پتا چلے گا،
ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دینے والی دل چسپ کہانیاں،
محمود خاور کی لکھی ہوئی بڑے سائز کی یہ پانچ کتابیں شائع ہو گئی ہیں:

انکل الٹم بلٹم
الٹم بلٹم اور دو شرارتی ساتھی
الٹم بلٹم کی پٹائی
الٹم بلٹم نے چور پکڑا
الٹم بلٹم نے حلوا پکایا

فوراً خرید لیں، فی کتاب قیمت ۶ روپے،
رنگارنگ کتاب کلب
۳۷-اردو بازار، کراچی، فون ۲۱۶۳۶۱

پر حیران کن اداسی تھی اور رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ میں نے بھائی جان کو مخاطب کر کے کہا۔

"بھائی جان۔! آپ لالہ سے ملے؟ میری دوست میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تھا نا؟"

بھائی جان نے بھی لالہ کو دیکھ کر عجیب سا انداز اختیار کیا۔ وہ رک سے گئے۔ ان کے چہرے پر بھی سفیدی دوڑ گئی۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر مڑے اور باہر نکل گئے۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کو بہت کام تھا۔ ان کے تمام دوست منتظر ہوں گے۔ مگر میری دوست سے ایک لفظ ہی کہہ دیتے۔ لالہ بھی پھر ٹھہر نہ سکی۔ اور امریکن کو لے کر جانے لگی۔ میں اسے رخصت کرنے باہر تک آئی۔ (باہر سے مراد وہ جگہ تھی جہاں اندر داخل ہو کر لوگ جوتے کوٹ وغیرہ اتارتے ہیں۔ اس ڈیوڑھی میں گرل اور شیشہ لگا تھا جہاں سے سڑک بخوبی نظر آتی تھی۔)

باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے میں سڑک تک نہیں گئی۔ باہر نکلنے سے پہلے لالہ نے یونہی سرسری سا سوال کیا۔

"یہ دعوت کس سلسلے میں تھی؟ میں پوچھنا بھول گئی۔"

وہ کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ رنجیدہ یا فکر مند۔

"اور میں بتانا بھول گئی۔ ہمارے بھائی جان کے ہاں نو برس کے بعد امید کا پھول کھلا ہے۔" میں شوخی سے بولی "میرا چھوٹا سا منا۔ تم نے دیکھا تو تھا نا۔ امی کی گود میں۔ اسی کی خوشی میں دعوت تھی۔"

میں تو چہکتی ہوئی آواز میں یہ بات کر رہی تھی۔۔ اور لالہ۔۔ وہ پوری بات سنے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ شیشے کی دیوار سے میں نے دیکھا وہ بارش میں بھیگتی ہوئی دوڑتی ہوئی سڑک تک پہنچ گئی تھی۔ امریکن میرے سامنے کھڑا اپنی مسکراہٹ لٹا رہا تھا۔ اوکے بونگے، لہجے میں شاید میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ پھر وہ بھی دروازہ کھول کر نکلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا لالہ کے پیچھے چلا گیا۔ میں نے حیرت سے یہ سین دیکھا۔ میک اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ اور لالہ جو کار سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر بٹھایا۔ اندر جا کر بھی لالہ اسی طرح منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ اس کا عجیب رویہ سمجھ سے بالاتر تھا۔

میں واپس آئی تو امی سے پوچھا "جب میں آئی تھی تو آپ اور لالہ رو رہی تھیں۔ کیا بات تھی؟" دراصل میں معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔

"ارے ہاں۔ وہ اپنے اوپر گزرنے والی مصیبت کا ذکر کر رہی تھی۔ اللہ نے اس کی جان بچا لی بیٹا ہوا تھا۔ مگر۔ مر گیا۔ یہ بھی مرتے مرتے بچی ارے کہنے کی بات ہے کہ انگلینڈ امریکہ ترقی یافتہ ہیں سائنس نے ہر چیز آسان کر دی ہے۔ ہونہہ۔ یہاں تو بیمار ہونا بھی مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ بے چاری بچی کو ڈاکٹروں نے حلال کر کے رکھ دیا۔"

خدا جانے امی کس معاملے کی بات کر رہی تھیں۔ معمہ حل نہیں ہوا۔ امی ایسی ویسی باتیں مجھے بتاتی بھی نہیں۔ بھائی جان سے اگلی صبح ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ لالہ کو جانتے ہیں؟ وہ کچھ سوچنے لگے۔ پھر بولے۔

"شاید۔ مگر لالہ کے نام سے نہیں مسز عارف کے نام سے وہ بھی سرسری سا۔"

ذہن میں گرہ سی تھی۔ کھل نہ سکی۔ لالہ بھائی جان کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ پھر جب میں نے اسے منے کی پیدائش کا بتایا۔ تو اس نے ایک دم باہر دوڑ لگا دی۔ لالہ اتنی بد اخلاق تو نہ تھی۔ ممکن ہے اسے اپنے مردہ بچے کا خیال۔۔ آ گیا ہو۔ کچھ دیر پہلے ہی تو وہ امی سے ذکر کر رہی تھی۔ میں کئی دن اس کی منتظر رہی۔ اس کا فون بھی نہیں آیا۔ مسز یوسف اکثر آ جاتی تھیں۔ امی سے بہت گھل مل کر باتیں کرتیں اکثر مجھے اپنے ساتھ لے جاتیں انہوں نے کئی بار مجھے اپنے گھر بھی بلایا۔ کئی تحفے بھی دیے میری سمجھ میں ان کی عنایات نہ آئیں۔ ویسے وہ بے تکلف قسم کی شخصیت تھیں۔

ایک روز میں ان کے ساتھ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور گئی۔ انہیں کچھ چیزیں پاکستان بھیجنا تھیں۔ جو وہ ہمارے ساتھ بھیجنا چاہتی تھیں۔ مجھے ساتھ لے کر جاتی تھیں تاکہ میں نئی نئی چیزیں پسند کر دوں۔ جو پاکستان میں نہیں ملتیں۔ یا کم ملتی ہیں۔ ہم نے کئی چیزیں پیک کرا لی تھیں۔ میں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی۔ اچانک مجھے ایک جگہ میک نظر آ گیا۔ وہ ہمیشہ ہر جگہ سب سے

نمایاں رہتا تھا۔ اس کا چھ فٹ کا قد۔ ورزشی جسم۔ اور گونجدار آواز۔ آج اس کے ساتھ لالہ نہ تھی۔ وہ اکیلا تھا اور تنہا تنہا سا لگا۔ جیسے لالہ کا وجود اس کے ساتھ ضروری ہو۔ میں بلا ارادہ اس کی طرف بڑھی۔ ہمت کر کے اپنی کچی پکی انگلش میں اس سے لالہ کے متعلق سوال کیا اس نے اپنا لمبا سا ہاتھ ہلا کر گول گول الفاظ میں کچھ کہا۔ جانے کیا۔

میں نے جھلا کر اس کی جیکٹ کی آستین پکڑ لی۔۔ اور اشاروں سے کہا کہ لالہ کا ایڈریس لکھ دے۔

وہ پھر کچھ بولا۔ غالباً کہہ رہا تھا کہ لالہ نے منع کیا ہوا ہے۔ اور بار بار کہہ رہا تھا وہ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے لالہ سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ ادھر وہ آفس بھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے کئی بار فون کیا۔ پھر مسز یوسف بھی ہماری بحث میں شریک ہو گئیں۔ اور تقاضا کرنے لگیں۔

"آپ بتا دیں نا۔ یہ دونوں بچپن کی دوست ہیں۔ پیار کرتی ہیں۔"

وہ کچھ عاجز سا ہو گیا۔ جب دو عورتیں ایک مرد پر بھرے بازار میں حملہ آور ہو جائیں تو مرد اپنی نجات ان کی خواہش پوری کر دینے میں ہی سمجھتا ہے۔ میک نے ایک کاغذ کے پرزے پر ایڈریس لکھ کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ پھر وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا اسٹور سے باہر نکل گیا۔ مسز یوسف نے میرے ہاتھ سے پرچہ لے کر پڑھا۔

"پلیز۔ مجھے اس کے گھر لے جائیں گی آپ؟" میں نے لجاجت سے کہا۔ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"ممکن ہے وہ آفس گئی ہو۔"

"اگر آفس ہوتی تو میک بتا دیتا۔ ویسے بھی میں کئی بار فون کر چکی ہوں۔"

وہ سوچ میں گم تھیں۔ بولیں۔ "یہ جگہ تو۔۔ کچھ اچھی نہیں ہے۔ مزدور ٹائپ کی بستی ہے۔ میں کبھی گئی تو نہیں۔ سنا ہے آئے دن دنگا فساد ہوتا ہے۔"

میری خوشامد پر وہ پسیج گئیں۔ اور کئی سڑکوں کو کاٹتی ہوئی بالآخر ایک بوسیدہ سی بستی میں پہنچیں لکڑی کی بالکنیوں میں کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ جا بجا کوڑے کے ڈھیر تھے۔ انتہائی غلیظ بچے گلیوں میں کھیل رہے تھے

یہ لندن تھا؟

سیلن کی ٹھنڈی بو۔۔ کچرے کی ناگوار بدبو کے بھبکے مجھے بار بار خیال ہوتا کہ ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔ مگر مسز یوسف انتہائی اعتماد سے کار گھما رہی تھیں۔ پُر پیچ راست تنگ گلیاں۔

"مجھے یقین نہیں کہ لالہ۔۔ یہاں رہتی ہو گی۔۔ وہ تو بہت صفائی پسند، نفیس مزاج لڑکی ہے۔ باجی۔ آپ غلط راستے پر تو نہیں آ گئیں۔" میں نے ان سے کہہ ہی د

"یہاں پر پاکستانی اس سے بھی گندی جگہ پر رہتے ہیں شمع۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن۔ وہ۔۔ لالہ کے بھائی اسے کسی مزدور سے تو نہیں بیاہ سکتے۔ کسی۔ مستری یا۔"

"وہاں رہنے والے۔ یہاں کی زندگی سے ناواقف ہوتے ہیں بی بی۔ انہیں کیا پتا کہ انگلینڈ میں لوگ ہوٹل میں برتن مانجھ کر اور سڑکوں پر جھاڑو لگا کر بھی فخر کرت ہیں۔ اور وہاں جا کر۔۔ اپنی عیش و آرام کی زندگی کا چرچا کرتے ہیں۔ یہی ہے ان کی عیش کی زندگی۔ دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے۔ لالہ کے بھائی بھی اسی دھوکے میں آ گئے ہیں بہرحال۔ یہ لو۔ آ گئی وہ بلڈنگ۔"

انہوں نے کار روک کر ایک میلے کچیلے لڑکے سے پوچھا۔ اس نے اشارہ کر کے کچھ بتایا۔ اب ہم لکڑی کی بوسیدہ "ہلڑ جلڑ"، سیڑھی پر چڑھ رہے تھے۔ ہر قدم جو ہمیں اوپر لے جا رہا تھا۔ میں خوف سے نیم جان ہو رہی تھی کہ اگر سیڑھی ٹوٹ گئی۔۔ سیڑھی بھی شاید ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کی تھی۔ جس پر چکنائی اور میل کے لیو چڑھے ہوئے تھے۔ ریلنگ کو چھونے سے کراہت آ رہی تھی۔ سنبھل سنبھل کر چڑھنے میں کافی وقت لگا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا۔ میں مسز یوسف کو تکلیف نہ دیتی۔ بھائی جان کے ساتھ آتی۔ آس پاس کے سارے فلیٹ انتہائی گندی حالت میں تھے وہاں رہنے والے بھی نہایت مدقوق اور گندے سے تھے۔ نہیں لالہ جیسی لڑکی۔

مگر اگلے ہی لمحے ہم ایک فلیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ مسز یوسف کی انگلی گھنٹی کے بٹن پر تھی۔ اندر سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ آس پاس کے فلیٹوں کے دروازے کھلنے لگے۔ لوگ سوالیہ نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے۔

بارہ گھنٹی بجائی۔ اس دوران سیڑھی پر سے اوپر جانے ے کتنے لوگ ہمیں دیکھتے ہوئے رکتے ٹھٹھکتے پھر آگے ڑھ جاتے۔ چینی عورتیں چپٹے جاپانی مرد۔ چینچناتی آواز لی ملایائی عورتیں پرانے کپڑے سوکھے بدن۔ پیلے چہرے ے لوگ۔ مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ادھر دروازہ ں کا توں بند تھا۔ اندر سے اٹھا پٹک کی آواز آ رہی تھی ر کسی کو دروازہ کھولنے کی توفیق نہیں ہو رہی تھی۔ میں ک آ کر واپس جانے کا سوچ رہی تھی۔ کہ ایک جھٹکے ے دروازہ کھل گیا۔

او۔ میرے خدا۔ کاش۔ میں نے نہ دیکھا ہوتا۔ ں واپس چلی گئی ہوتی۔ بکھرے ہوئے بال۔ چہرے پر ھر دپنجوں کے نشان۔ کتھئی بدرنگ بلاؤز۔ جس کا کندھا ھٹا ہوا تھا۔ کالا پیٹی کوٹ پہنے۔ ہاں وہ لالہ ہی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں اور حیران چہرے میں۔ اپنی ساری نفاست کی دھجیاں سی بکھیرتی۔ یہ لالہ تھی۔ نہیں۔ یہ وہ نہ تھی۔ اندر کسی اندھیرے کمرے سے ایک چنگھاڑ سنائی دی۔

"کتیا کی بچی۔ کتنی دیر لگے گی۔ باہر تیرے یار کھڑے ہیں جو جم کر رہ گئی ہے۔"

ہاں وہ جم کر رہ گئی تھی۔ وہ بھی اور میں بھی۔ میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں دھندلانے لگیں دوسری بار پھر وہی دھاڑ۔ گالی گلوچ کسے کہتے ہیں۔ آج میں نے جانا۔ لالہ کو بھی جنبش ہوئی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بلکنے لگی۔ پھر بولی۔

"کیوں آئی ہو تم؟ کیوں آئی ہو بولو۔ چلی جاؤ للہ چلی جاؤ۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ اگر اسے معلوم ہوا کہ تم۔"

میرے پیر تو لکڑی کے فرش پر چپک کر رہ گئے تھے۔ جیسے انہیں کیلوں سے ٹھونک دیا گیا ہو۔ شاید میری آنکھیں بھی منجمد ہو گئی تھیں۔ زندگی اے زندگی۔ کتنے رنگ ہیں تیرے۔ کیا اسرار ہیں۔

"اب جاؤ بھی۔ خدا کے لیے جاؤ۔ دیکھ تو لیا ہے تم نے۔ اب کیا میری لاش دیکھ کر جاؤ گی۔ کل۔ نہیں پرسوں فون کروں گی یا۔ آؤں گی۔"

اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں اپنے ہوش میں نہ تھی۔ مسز یوسف نے میرا بازو تھاما۔ اور میں ان کے ساتھ گھسٹتی رہی۔ دماغ پر برف سی جم گئی تھی۔ اور ہاتھ پیر بے جان ہو گئے تھے۔ نہ سوچ سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ کب انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں ڈالا اور کیسے گھر جا کر گھسیٹ کر اندر لائیں۔ میں بے ہوش نہیں تھی۔ تو ہوش میں بھی نہ تھی۔ مجھے گھر میں آتا دیکھ کر بھابھی اور امی دوڑتی آئیں۔ شاید بہت برا حال تھا میرا۔

مسز یوسف نے کیا کہا۔ کس طرح امی اور بھابھی کو اطمینان دلایا۔ معلوم نہیں۔ پھر بھابھی نے کوئی دوا لا کر کھلائی۔ اس سے نیند آ گئی۔ سو کر اٹھی تو شام ہو چکی تھی۔ اور بھائی جان گھر آ چکے تھے۔ انہوں نے مجھے لپٹا لیا۔ اور پیار کرنے لگے۔ نہ جانے کتنے آنسو میں نے بہا دیے بھائی جان کی آستین گیلی ہو گئی۔ جب میں چپ ہوئی تو وہ رنجیدہ سے تھے۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اس کے گھر چلی جاؤ گی۔ ورنہ پہلے ہی منع کر دیتا۔"

"تو آپ کو معلوم تھا کہ۔"

"ہاں۔ وہ ایک ستم رسیدہ لڑکی ہے۔ اس کا شوہر ظالم، مکار اور بے درد انسان ہے۔ بلکہ اسے انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔ بس اب بھول جاؤ۔"

بھائی جان درد بھری آواز میں سمجھانے لگے۔

"یہاں تو نجانے کتنی بے قصور لڑکیاں ماں باپ کے فخر کی بھینٹ چڑھی نظر آتی ہیں۔ اور ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ قانون سے واقف ہیں نہ کوئی طاقت رکھتی ہیں۔ ان کے والدین نے تو یورپ کا نام سن کر ہی انہیں عیش و آرام کی نذر کر دیا۔ مگر وہ عیش گندی گلیوں اور تاریک مکانوں تک محدود ہو گیا۔ ماں باپ کچھ بھی معلوم نہیں کرتے اپنی بیٹی سخت اور سرد تہہ خانوں میں دھکیل دیتے ہیں کہ یہی ان کا نصیب سہی۔ اور لالہ۔ یہ تو چاہے بھی تب بھی اس شخص سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔ وہ بہت عیار آدمی ہے۔ ورنہ یہاں تو اکثر لڑکیاں۔ دھوکے کی شادی سے علیحدگی حاصل کر لیتی ہیں۔ خود محنت مزدوری کر کے پیسہ پیسہ جوڑتی ہیں۔ پھر سالوں بعد۔ ان کی وطن واپسی ایسے ہوتی ہے کہ نہ سہاگ کا جوڑا تن پر نہ جینے کی امنگ من میں۔ وہ زندہ لاش ہوتی ہیں۔ زندہ لاش۔ لالہ ایک مشرقی حیادار لڑکی ہے۔ وہ اپنے خاندان کی عزت کو سینے سے لگائے ظلم سہہ رہی ہے۔ اس کی قسمت نہ جانے کہاں سو رہی ہے کہ کوئی ستم۔ کوئی زیادتی اسے جاگنے کی مہلت نہیں دیتی۔ عارف جیسے عیار، مکار اور کم ظرف کو ایسی بیوی ملنا۔ اس کی خوش قسمتی ہی کہہ سکتے ہیں۔ خواہ لالہ کی بدقسمتی۔"

"بھائی جان۔ لالہ کے بھائی جان اس کے دشمن تو نہ تھے۔" میں رونے لگی۔

"اتنی بے خبری۔ معصومیت۔ جھوٹ پر یقین کرنا میرے خیال میں جاہلیت یا پاگل پن ہو سکتا ہے۔ انہیں کسی طرح بھی معلومات تو حاصل کرنا چاہیے تھیں تمہارے ذریعہ۔ میرے ذریعے۔ یہ اتنا مشکل بھی نہ تھا۔" بھائی جان کی ہر بات صحیح تھی۔

دو تین دن تو میرا ذہن سویا سویا رہا۔ نیند تھی نہ بیداری۔ دل اچاٹ تھا۔ نہ سیر کو جانے کو جی چاہتا۔ نہ شاپنگ کرنے کو۔ بھابھی بار بار مجھے سمجھاتیں دل بہلاتیں فلمیں لا کر دکھاتیں۔ لیکن میرے ذہن پر لالہ پر گزرنے والی مصیبت سوار رہتی۔ اس کے بھائی جان کو خبر ہو گی تو وہ تڑپ کر رہ جائیں گے۔ ارے۔ اتنا بڑا دھوکا ایسا ظلم وہ چاند جیسی اجلی پھول جیسی معصوم لڑکی۔ جس پر بھائی بھابھی جان نثار کرتے تھے۔ کس عذاب سے گزر رہی ہے مجھے تو صحیح طور پر ابھی تک یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کس قسم کی ستم زدہ ہے۔ چلو غربت تو کوئی جرم نہیں۔ اگر عارف مزدور ہے تب بھی لالہ بھی تو سروس کرتی ہے۔ ان دونوں میں بنتی نہیں۔ لالہ کی بدمزاجی یا عارف کی سخت گیری۔ لالہ کا فون آیا۔ نہ وہ خود۔ اس کے آفس سے بھی کچھ پتا نہ چلا۔ مشکل یہ تھی کہ بھائی جان اس معاملے میں الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے انہیں عارف کی مکاری سے خدشہ تھا کہ وہ انہیں بھی نہ کسی طرح ملوث کر کے اپنا فائدہ اٹھا لے۔

کئی دن انتظار کے بعد۔ وہ تو نہ آئی۔ البتہ امریکن آ گیا۔

کرن بیوٹی بکس
خوبصورت بنیے

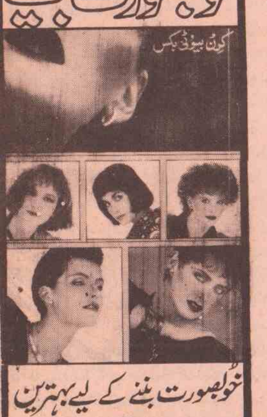

خوبصورت بننے کے لیے بہترین
مشوروں پر مبنی قیمتی کتاب
بہت سی تصاویر کے ساتھ شادی بیاہ
کے میک اپ کے لیے بہترین کتاب
ہر بک سٹال پر دستیاب ہے یا ہم سے براہِ راست
منگوا لیں
قیمت — 24 روپے، ڈاک خرچ 5 روپے
رنگارنگ کتاب کلب، ۳۔ اردو بازار کراچی

امّی بھائی جان کے ساتھ مسز یوسف کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ میں اور بھابھی گھر میں تھے۔ میک کا چہرہ فق تھا۔ اس کے مکئی کے بالوں کی رنگت کے بال بکھرے ہوئے اور لباس بالکل ملگجا سا تھا۔ وہ اس صورت میں کبھی میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ ضرور لالہ کی موت کی اطلاع لایا ہے۔ میں کمرے میں گھس کر رونے لگی۔ جس حال میں لالہ کو میں دیکھ آئی تھی۔ اس کے بعد کی منزل موت ہی ہو سکتی تھی۔ بھابھی نے اندر آکر میرے کندھے کو چھوا۔

"وہ کہتا ہے لالہ بہت بیمار ہے۔ ہاسپٹل میں داخل ہے۔"

"لالہ کی زندگی کی نوید"۔ میں جلدی سے اُٹھ گئی پھرتی سے آنسو پونچھے۔

"اس نے — تمھیں بلایا ہے۔" بھابھی نے رُک رُک کر کہا۔

"بھابھی! میں جاؤں گی۔" عجیب سا طاقت ور جذبہ بیدار ہوگیا تھا مجھ میں۔

"دیکھو شمو! نہ تمھارے بھائی جان ہیں اور نہ ہی امّی موجود ہیں۔ اس امریکی کا بھی کیا بھروسہ۔ یہاں قدم قدم پر فراڈ ہوتے ہیں۔ اگر کچھ ایسا ویسا ہوگیا تو میں تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔" بھابھی ہچکچا رہی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوگا بھابھی۔ میک دھوکے باز نہیں۔ اس کی شفاف بھوری آنکھیں — اور — مسکراتے چہرے پر کہیں بھی مکّاری عیاری نہیں۔ وہ لالہ کا دوست ہے، ہمدرد ہے۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گی بھابھی۔" میں ضد کرنے لگی۔

"دیکھو مجھے امتحان میں مت ڈالو۔ میں اتنی بڑی ذمّے داری کی اہل نہیں۔ یہ ملک بھی تمھارے لیے اجنبی ہے۔ تم تو یہاں کی سڑکوں سے بھی واقف نہیں۔ میں بھی چلتی مگر — اسے تو جلدی ہے اور مجھے فراز کو کسی کے پاس چھوڑنا پڑے گا۔"

"نہیں بھابھی! فکر نہ کریں۔ میں ہاسپٹل جاکر فون کروں گی۔ اچھا۔"

میں نے جلدی جلدی کوٹ پہنا۔

"بھابھی! مجھے یقین ہے۔ میک سچ کہہ رہا ہے۔ آپ نے لالہ کا حال دیکھا نہیں نا۔ وہ اگر مر گئی — تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔"

میں تیزی سے باہر آئی۔ میک گاڑی میں میرا منتظر تھا۔ اس نے گاڑی بہت تیز چلائی۔ اسی فرّاٹے سے وہ بول رہا تھا۔ تعجب کی بات ہے۔ آج میں اس کی ہر بات سمجھ رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت تیزی سے بول رہا تھا۔ فکرمندی اور پریشانی سے اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ مگر ہمدردی کی زبان شاید سب کے لیے یکساں ہوتی ہے۔ اس نے بتایا کہ لالہ کو اس کے کسی پڑوسی نے ہاسپٹل میں داخل کیا۔ وہ سخت زخمی حالت میں تھی۔ اس نے ہوش میں آنے کے بعد میک کا پتا بتایا۔ وہ اطلاع ملتے ہی پہنچا۔ اور تین دن سے وہیں تھا۔ اس کی جان بچنے کی امید ہوتے ہی دوڑا آیا۔

"بہت دُکھی ہے۔ بہت تھک گئی ہے وہ۔ اسے اپنے بھائی یاد آرہے ہیں اور اپنا بچّہ بھی۔ اگر وہ اس کے پاس ہوتے — تو وہ اپنے سارے دکھ بھلا دیتی۔" میک نے کہا۔

پارکنگ پلاٹ میں گاڑی کھڑی کر کے ہم نے ہاسپٹل کی طرف دوڑ لگادی۔ کیونکہ اچانک بارش شروع ہوگئی تھی۔ لندن کے موسم کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یا دھند چھائی رہتی یا بارش ہوجاتی۔ وہی میک تھا وہی میں تھی۔ جو میک سے ہاتھ ملانے میں بھی پریشانی محسوس کرتی تھی۔ آج وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہاسپٹل میں دوڑ رہا تھا۔

لالہ ہماری منتظر تھی۔ سفید بستر پر وہ ایک لاش کی طرح پڑی تھی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر دیکھا ہونٹ ہلے۔

"بھابھی جان! — بچّہ —" اس نے کہا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ سفید ڈیلے میں سیاہ پتلی بہت مدھم مدھم حرکت کر رہی تھی۔ پتا نہیں کمبل کے اندر اس کا جسم تھا بھی کہ نہیں۔ سر اور بازو کے سوا — جو کمبل سے باہر تھے۔ اور کہیں پر کوئی اٹھان کوئی حرکت نہ تھی۔ میں اس پر جھک گئی۔ کس قدر پیار آیا مجھے جی چاہا اسے بازوؤں میں چھپالوں۔ اس کو زندگی تازگی شگفتگی لادوں کہیں سے بھی۔ اس نے پھر کہا۔

"بچّہ — نہیں —" میک مجھے دیکھ رہا تھا۔

اور اشارے سے کہہ رہا تھا۔

"بولو — بولو" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ بچّہ اور بھائی جان سب آجائیں گے۔ تم ٹھیک ہوجاؤ لالہ۔ میں بھابھی جان کو بھی بلالوں گی. پھر ہم خوب باتیں کریں گے۔ ہے نا؟ میں تو تم سے بات کرنے کو ترس رہی ہوں لالہ —"

اس کے لبوں پر سوکھا تبسم نمودار ہوا۔ پھر آنکھیں بند کر کے کروٹ لے لی۔ اس کے سر اور بازو پر پٹی بندھی تھی۔ میں نے اسے غافل دیکھ کر میک سے فون کرنے کو کہا۔ پھر باہر گیلری میں نکل کر میں نے بھابھی کو فون کیا۔ امّی اور بھائی جان آگئے تھے۔ وہ لوگ فکرمند تھے کہ میں لالہ کو دیکھ کر پھر اپنا حال خراب کرلوں گی۔ میں نے انھیں اطمینان دلایا۔

لالہ نے پھر آنکھ کھولی. مسکرائی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"میں — زندہ ہوں — زندہ ہوں نا۔" اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ زندگی کی چمک۔

"ہاں لالہ! تم بہت جلد اچھی ہوجاؤ گی۔ پھر ہم باتیں کریں گے۔ بھائی جان کی اور بھابھی جان کی۔ اپنے وطن کی۔ سُنا لالہ۔ بس تم فٹافٹ تندرست ہوجاؤ۔" میں اسے بہلانے لگی۔

وہ میک کی طرف دیکھنے لگی۔ میک اس کے قریب آگیا۔ "سُنا تم نے۔ میری دوست کہتی ہے کہ میں فوراً صحت یاب ہوجاؤں تاکہ وہ مجھ سے باتیں کرے۔"

لالہ دھیمی کمزور آواز میں میک کو بتانے لگی۔ اس نے لالہ کا زخمی ہاتھ تھام لیا۔

میں خود لالہ سے باتیں کرتی رہی۔ امید افزا اور صحت کی، خوشیوں کی۔

"ہم سیر کرنے جائیں گے اور خوب بارش میں بھیگیں گے۔ لالہ یاد ہے ہم بھابھی جان کی خفگی کے باوجود بارش میں بھیگا کرتے تھے۔ پھر کانپتے ہوئے اندر آتے تو کتنی ہنسی آتی تھی۔ اب بھی ہم یہی کریں گے اور پارک میں جاکر دوڑ لگائیں گے۔ ہے نا؟ میں، تم اور میک۔ خوب ہنسیں گے۔"

"ہاں۔" لالہ کمزور آواز میں بے بسی سے بولی۔ "پھر وہ آجائے گا۔ مجھے لے جائے گا۔" وہ خوف زدہ تھی۔

"نہیں۔ کیسے آئے گا؟ ہم جو ہوں گے وہاں۔ اسے پتا ہی نہیں چلے گا لالہ۔ میں تمھیں چھپالوں گی اگر وہ آیا۔"

"اسے پتا چل جائے گا۔ اسے پتا چل جاتا ہے۔" وہ ہذیانی آواز میں زور سے بولی۔ "پھر وہ مجھے بہت مارے گا۔ بہت زیادہ۔ نہیں اب میں نہیں سہہ سکتی۔ میں اچھا نہیں ہونا چاہتی شمع۔"

لالہ نے بازو اپنے منہ پر رکھ لیا جیسے وہ کسی حملے سے خود کو بچانا چاہتی ہو۔ پھر وہ زور سے چیخی۔ اور چیختی ہی رہی۔ میک نرس کو بلا لایا۔ اس نے ہمیں باہر نکال دیا۔ ہم باہر گیلری میں کھڑے ہوگئے۔ بھائی جان بھی آگئے۔ وہ میک کو الگ لے جاکر اس سے باتیں کرنے لگے۔ پھر میک نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"وہ بہت ڈرتی ہے۔ اسے اس خوف سے نجات دلانا بہت ضروری ہے مسٹر طارق! اس کو زندگی کی آرزو ہے مگر وہ مر رہی ہے۔ اس لمحہ لمحہ قریب آتی موت سے بچائیں۔ آپ۔ جو اس کے اپنے ہیں ورنہ پھر میں —"

میک کا امریکی خون کھول رہا تھا وہ تپ کر تانبے جیسا ہوگیا۔ غصے سے اس نے مُکّہ فضا میں بلند کیا۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کہیں چلا گیا۔ گھر آکر میں نے امّی اور بھابھی کو سارا حال سنایا اور بھائی جان سے منّت کی۔

"کوئی ترکیب کریں بھائی جان۔ کسی طرح اس کی جان بچالیں۔

وہ میری بچپن کی سہیلی تھی۔ اور ہم میں بے حد پیار تھا۔ میں نے اس کے سوا کبھی بھی کسی کو دوست نہیں بنایا۔"

بھائی جان حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کو میری اور لالہ کی دوستی کا اندازہ نہ تھا۔ وہ اسکول کی دوست تھی — اور بھائی جان برسوں سے انگلینڈ میں رہ رہے تھے۔ انھیں میری جذباتی کیفیت پر تعجب ہو رہا تھا۔ پھر امّی جان میری اور اس کی دوستی کے قصّے سنانے لگیں۔ لالہ کی تعریفیں کرتی رہیں. اس کے بھائی بھاوج کی سادگی اور خلوص کے واقعات۔

"اچھا!" بھائی جان نے نرمی سے کہا۔ "وہ تندرست ہوجائے۔ تو کچھ کرتے ہیں۔"

دوسرے دن میں نہیں جاسکی۔ مسز یوسف اپنی فیملی کے ہمراہ آرہی تھیں۔ پتا نہیں ان کی پہلے سے بھائی جان سے اتنی دوستی تھی یا ہم لوگوں کے آنے کے بعد بڑھی تھی. میں ہاسپٹل جانے کے لیے بے چین تھی اور بھائی جان یوسف علی کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ جو اپنے ساتھ دو عدد بھائیوں کو بھی لے آئے تھے۔ مسز یوسف امّی کے ساتھ چپکی ہوئی

تھیں۔ میں بے دلی سے بھابھی کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ سب نے ساتھ کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد بہت دیر ہوگئی۔ ہاسپٹل جانا بیکار تھا۔ مجھے مسٹر یوسف پر غصہ آرہا تھا۔ بھابھی ان کے جانے کے بعد برتن دھونے لگیں۔ میری بدمزاجی دیکھ کر ہنسیں، بولیں۔

”اچھا یہ تو بتاؤ۔ یوسف علی کے بھائی تمھیں کیسے لگے؟“

”کیسے لگے؟ مطلب؟“ میں حیرت سے انھیں دیکھنے لگی۔

”بھئی ان کے وہ براؤن سوٹ والے بھائی۔ مونچھوں والے۔ تمہارے لیے سنجیدہ ہو گئے ہیں۔“

”اچھا تو یہ بھی وہ وجہ۔ امی ہر تیسرے دن یوسف علی کے گھر یونہی نہیں جاتی تھیں۔ مگر یہ سن کر بھی میری مزاجی کیفیت بدلی نہیں۔

”ان سے کہہ دیں بھابھی، ایسا نہیں ہوگا۔ میں لالہ کا انجام دیکھنے کے بعد یہاں کی زندگی پر لعنت بھیجتی ہوں۔“

لندن کا موسم بھی پل میں تولہ ماشہ ہو رہا تھا۔ اگلے دن صبح سورج نکلا دیکھ کر سب خوش ہوئے۔ بھائی جان مجھے ہاسپٹل لے گئے۔ لالہ کی طبیعت بہتر تھی۔ وہ بستر پر بیٹھی تھی، بھائی جان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بھائی جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تسلی دی، پھر وہ کونے میں چلے گئے۔ جہاں میک غصے میں بھرا منہ پھلائے کھڑا تھا۔ اسے ڈاکٹر نے سزا دی تھی کیونکہ وہ ان کی ہدایات پر عمل نہیں کرتا تھا اور مسلسل لالہ سے باتیں کیے جاتا تھا۔ ڈاکٹر چاہتے تھے کہ لالہ پر کسی قسم کا ذہنی بوجھ نہ ہو۔ وہ تکان کا شکار نہ ہو۔

”وہ مجھ سے محبت کرتا ہے شمع۔“ لالہ روتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”میں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ مانتا نہیں۔ دیکھو پانچ چھ دن سے مسلسل یہیں موجود ہے۔ سونے کے لیے بھی گھر نہیں جاتا۔“

”اچھا تم اس کی فکر چھوڑو۔ وہ کوئی بچہ تو نہیں۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ پاکستان تمہارے بھائی جان کو اطلاع دے دی جائے؟“

یہ تجویز میک کی تھی۔ اس کے خیال میں حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ اس کے ورثا کو خبر دینا ضروری تھا۔ لالہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ گردن انکار میں ہلا کر رہ گئی شاید آنسوؤں نے اس کی آواز بھی بند کر دی تھی۔ مجھے بھی رونا آگیا۔

اگلے دن بھائی جان مجھے ہاسپٹل چھوڑ کر چلے گئے۔ انھیں آفس میں دو گھنٹے کا کام تھا۔ اس کو کر کے پھر مجھے گھر چھوڑ کر آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ لالہ اکیلی تھی۔ میک وہاں نہ تھا۔

”ہاں اب تم جھٹ پٹ مجھے پوری بات سناؤ لالہ۔ میں طے کر کے آئی ہوں کہ آج ہر بات معلوم کروں گی۔“

میں لالہ کے پاس بیٹھ گئی۔ لالہ بھی شاید اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے شادی سے لے کر لندن آنے تک کا قصہ سنایا۔ ”یہاں آکر میں نے دیکھا۔ نہ اچھی نوکری، نہ پیسہ۔ جس کا اظہار وہاں تو خوب کیا گیا تھا۔ میں بھائی جان بھابھی جان کے تصورات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ صبر سے کام لیتی رہی۔ وہ شکی اور بدمزاج تھا۔ ہر وقت روک ٹوک، پابندیاں جواب طلبی، میں گھبرا گئی۔ ایسی زندگی کے بارے میں تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اس کی نوکری چھوٹ گئی۔ عارضی اور وقتی ملازمت سے گزارا مشکل ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تم نوکری کر لو۔“ میں مان گئی۔

مصیبت وہیں سے شروع ہوئی۔ اسے ہر وقت یہ خیال رہتا کہ میں دفتر میں نوکری کرتی ہوں۔ نہ جانے کس کس مرد سے سابقہ پڑتا ہے اور کیا کیا ہوتا ہے۔ میں — لاکھوں قسمیں کھاتی، بیکار۔ وہ شک میں غصہ کرتا۔ مجھے مارتا اور نوکری چھوڑنے کی تاکید کرتا۔ روزانہ جب میں دفتر سے آتی۔ اگلے دن دفتر نہ جانے کا حکم دیتا۔ اور دوسرے دن صبح دفتر بھیجنے پر اصرار۔ کیونکہ اس کی تو کوئی آمدنی ہی نہ تھی۔

پھر میں نے نوکری چھوڑ دی۔ کیونکہ میں فاقے برداشت کر سکتی تھی، اس کی مار نہیں۔ جھگڑے ہوتے رہتے۔ مار پیٹ بھی — پھر ایک دن — غربت اور فاقوں سے بچنے کی اس نے ایسی تجویز پیش کی۔ جس نے مجھ سے جینے کی امنگ بھی چھین لی۔ فاقہ زدہ جسم، مایوس اور بیزار دل۔ غصہ، شرم اور غیرت کی آگ میں جلنے لگا۔ بے بسی کی آگ۔ انکار سن کر تو وہ بھی آگ بگولہ ہو جاتا تھا۔ اس دن بھی — مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔ لہولہان ہو گئی۔ تین دن ہاسپٹل میں گزرے۔ بچ گئی۔“

لالہ تھک گئی تھی۔ میں نے اسے بات کرنے سے روک دیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ تھکن تھی یا ہیجان۔

”ایک دن وہ مجھے سیر کرانے کے لیے باہر لے گیا۔ میں اتنا خوش —“

لالہ نے چند منٹ کی خاموشی کے بعد پھر اپنی داستان شروع کر دی۔

”میں سمجھی — پچھتا رہا ہے۔ شاید شرمندہ ہے — وہاں — ہم نے کھانا کھایا۔ پھر اس کا کوئی جاننے والا مل گیا۔ اس نے مجھے — ہاں مجھے — اس کے حوالے کر دیا۔ جب بات سمجھ میں آئی۔ تو میں چیخی، چلائی — اس نے میرا گلا دبا دیا۔ چیخنے کی سزا — احتجاج جرم تھا۔ میں روتی پیٹتی گھر آئی۔ وہ آدمی تو ڈر کر بھاگ گیا۔ اور یہ بھی میرا جرم ٹھہرا۔ گھر آکر میں نے اس کا مقابلہ کیا۔ جب تک دبتی رہی وہ مجھے دباتا رہا۔ مگر معاملہ ایسی جگہ آ پہنچا تھا کہ میں چپ نہیں رہ سکتی تھی۔ میں چیخی چلائی۔ اسے گالیاں دیں تو جانتی ہو اس نے کیا کہا۔ بولا پہلے کون سی پاک دامن ہو۔ دفتر میں آفیسروں کو گرم کرتی تھیں۔ چار پیسے میں کما لوں تو تمھیں زہر لگتے ہیں۔ میں نے کہا۔

”اگر چار پیسے کمانے ہیں تو میں خود ہی کیوں نہ کھاؤں۔ تمہارے ساتھ کیوں رہوں۔“ شمع — میں بہت ڈھیٹ ہو گئی ہوں۔ اب — مجھے کوئی بات بھی بری نہیں لگتی۔ اتنا کچھ جان گئی ہوں، اتنا سہہ چکی ہوں کہ اب — اب ہر ستم کے لیے تیار رہتی ہوں۔ اس کا اصرار، میرا انکار۔ فاقے تکرار اور مار پیٹ روز کا معمول بن گیا۔ میرا جسم پتھر بن گیا۔ پھر وہ مجھے زبردستی گھر سے نکالتا اور دھمکی دیتا کہ دو گھنٹے میں اتنی رقم لے کر آؤں۔ ورنہ وہ مجھ پر فحاشی کا الزام لگا کر جیل میں پہنچا دے گا۔ میں جیل سے ڈرتی ہوں شمع۔ تھوڑی بہت عزت بچا کر رکھی ہوئی ہے۔ وہ گوروں کی جیل میں گنوانا منظور نہیں۔ ویسے ہی گھر سے نکل جاتی۔ کبھی کسی سے مانگتی، کبھی کسی سے۔ وہ سمجھتا رہا کہ میں اس کے حکم کے مطابق — جسم فروشی کر رہی ہوں۔ نہیں نہیں۔ خدارا نہیں۔“ لالہ اب پسینے پسینے ہو گئی تھی۔

”اب چپ ہو جاؤ لالہ۔ پلیز مت کہو ذلت کی یہ آپ بیتی۔“

میں اس کی کہانی سن کر کانپنے لگی تھی۔ یہ ایک لڑکی پر گزرنے والی بدترین اذیت ناک قیامت تھی۔ عذاب تھا۔ جہنم تھا۔ لالہ ایک کلی کی طرح پاکیزہ تھی۔ وہ حسین تھی۔ ذرا تنک مزاج ضرور تھی مگر ضدی ہٹ دھرم نہ تھی۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں جانتی ہوں وہ سچ کی زبان تھی۔ اسے کس جرم کی سزا مل رہی تھی؟ سچ بولنے کی۔ بزرگوں کے فیصلوں پر سر جھکا دینے کی۔

”ضد، ناز نخرے تو سب پاکستان میں رہ گئے۔“ لالہ آنسو بہلانے کے بعد پھر سے بولی۔

”اب یہاں آکر تو — میں اپنی غیرت کی لاش اٹھائے پھرتی ہوں۔ ایک عزت نفس تھی۔ وہ بھی۔ وہ بھی اس ذلیل انسان کے ہاتھوں — لٹا بیٹھی —“

آنسو پھر اس کی آنکھوں میں جمع ہو گئے۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے تھپتھپایا۔ آواز میری بھی حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ نرس نے آکر لالہ کو دوا دی۔ اس کی خیریت پوچھی۔ اسے اچھے دنوں کی آس دلائی۔ صحت کے لیے دعا کی اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

”ایک بار اس نے مجھے بڑی رقم کی وصولی کے لیے بھیجا۔ اتنی بڑی رقم میں کسی سے کیسے مانگتی۔ میں ایک پارک میں جا کر بیٹھ گئی۔ وہیں پارک میں میک ملا۔ پتا نہیں کیوں۔ مجھے اس سے امید تھی کہ وہ مدد کر دے گا۔ شاید اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ یا اس کی آنکھوں میں کسی گناہ کی ترغیب نہ تھی۔ میں نے اس سے مدد مانگی۔ بھکارن بن کر نہیں۔ ضرورت مند کے طور پر۔ اسے میں نے سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی کہ میں کبھی گناہ نہیں کروں گی۔ لیکن — اس کمینے کے لیے مجھے ہی پیسے کمانے ہیں۔ نوکری میں تو بندھی ہوئی حقیر رقم ملتی ہے جب کہ اسے عیش کرنے کے لیے بہت سے پیسے درکار ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے پیسہ بنانے کی مشین سمجھ لیا تھا۔ میک نے سب کچھ سنا۔ اور پوری رقم میرے ہاتھ میں رکھ دی۔ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ بھی میری مدد کرے گا۔ مگر اس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ یہ ممکن نہ تھا۔ میں اتنی بے آسرا بے بس اور مجبور تھی کہ — کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتی

بھی۔ جب شوہر ہی عزت آبرو کا دشمن بن جائے تو کسی دوسرے سے کیا امید۔

انہی دنوں — مجھے معلوم ہوا کہ میں — امید سے ہوں۔ ناامیدی کے دنوں میں اس "امید" کی نوید۔"

لالہ ہنسی تو اس کے چہرے پر تلخی پھیلی ہوئی تھی۔

"اسے منظور نہ تھا۔ اس نے چاہا کہ — میں اس سے چھٹکارا حاصل کرلوں۔ میں جانتی تھی کہ یہ بچّہ کسی گناہ کا نتیجہ نہیں۔ میں نے قسمیں کھائیں۔ خوشامدیں کیں مگر اسے کب یقین آتا۔ وہ گھسیٹ کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ میں نے ڈاکٹر کو بتا دیا کہ میں ایسا نہیں چاہتی۔ وہاں سے جان بچا کر آئی تو — پھر مار پیٹ۔ اب میں بھی ڈھیٹ ہوگئی۔ اور میں نے اس سے کہا۔ یہ بچّہ میرا ہے۔ تمھارا نہیں ہے۔ پھر تمھیں اس پر کیا اختیار ہے۔ افسوس میں کتنی بے بس اور مجبور ہوگئی۔ اپنے جائز بچے کو — ناجائز کہہ رہی تھی۔ حالانکہ — وہ اسی کا تھا۔ مگر اسے یقین بھی ہوجاتا کہ وہ اس کا جائز بچّہ ہے تب بھی وہ اپنے گندے کاروبار کے لیے — میری گلوخلاصی کراتا۔ یہ میں نے اس وقت نہ جانا۔ وہ بے غیرت بے ضمیر۔

پھر کچھ ہمدرد پڑوسیوں کی مداخلت نے — مجھے اس ظالم کے پنجے سے رہائی دلائی۔ مالکہ مکان نے آ کر دھمکی دی کہ اگر اس نے بیوی پر ظلم کا سلسلہ بند نہ کیا تو وہ مکان خالی کرالے گی۔ لندن میں گھر کا حصول ناممکن تھا۔ ان حالات میں — کہ آمدنی صفر ہو۔ وہ چُپ ہوگیا مگر رقم لانے کا تقاضا برقرار تھا۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کی مہلت دیتا۔ میں خالی ہاتھ واپس جاتی تو — مار کھاتی۔ پھر اس نے دھمکی دی کہ وہ میرے پیٹ پر بکے مار مار کر اس فتنے کو ختم کرسکتا ہے۔ میں ڈر گئی۔ وحشی سے کچھ بعید نہ تھا۔

ایک روز پھر میک مِل گیا۔ میں — اتنی کمزور اور لاغر تھی کہ — اسے ترس آگیا۔ اس نے مجھے کھلایا پلایا۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ دوائیں خرید کردیں۔ اور اتنی رقم کہ ہفتہ بھر آسانی سے گزر جائے۔ آخر کار ایک پڑوسن کی مدد سے میں نے قریب کی ایک فیکٹری میں سروس کرلی۔ وہاں تمام عورتیں تھیں۔"

"اب چُپ ہوجاؤ لالہ۔" میں نے کہا۔ "تم تھک گئی ہو۔ میں کل پھر آؤں گی۔ آؤ اب ہم اچھی اچھی باتیں کریں۔"

مگر لالہ کے جذبات کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ برسوں کا رُکا ہوا پانی نشیب میں بہنے سے کون روک سکتا ہے۔

"وہیں فیکٹری میں ایک چھوٹا سا ہاسپٹل تھا۔ میں وہیں چیک اپ کراتی رہی۔ خون کی کمی تھی۔ طاقت نہ تھی۔ مِل سے جواب مل گیا کیونکہ میں محنت کے قابل نہ رہی تھی۔ اور بیمار تھی۔ انھوں نے اتنی مہربانی کی کہ ایک بڑے ہاسپٹل میں مجھے ایڈمٹ کرا دیا۔ وہاں پتا چلا کہ میرا کیس سیریس ہے۔ وہیں تمھارے بھائی جان سے ملاقات ہوئی۔ شاید ان کی بیگم بھی بیمار تھیں۔"

"ہاں۔ منّے کی پیدائش کے وقت بھابھی بہت بیمار ہوگئی تھیں۔"

"مجھے اگر اس وقت یہ معلوم ہوجاتا کہ — یہ تمھارے بھائی ہیں — خیر۔ انھوں نے میری بہت دیکھ بھال اور دلجوئی کی۔ ایک روز وہ ذلیل شخص آیا۔ اور اس نے بھائی جان کو دیکھ لیا۔ اس نے دھمکی دی کہ وہ — بچّے کو جان سے مار ڈالے گا۔ اور اس شخص یعنی بھائی جان کو بھی مزا چکھا دے گا۔ میں کہتی رہی کہ یہ تو مجھے یہیں ملے ہیں اس سے پہلے میں انھیں جانتی تک نہ تھی۔ مگر۔ اس نے کب کسی بات کا یقین کیا ہے — مجبوراً میں نے بھائی جان کو اپنا دُکھ، اپنی مصیبت کا حال بتا دیا۔ میں بچّے کی پیدائش کے بعد گھر جانے سے خوف زدہ تھی۔ کوئی میرا شناسا نہ تھا۔ جو تھے انھیں میں ذلت کی یہ داستان کیسے سُناتی۔ بھائی جان سے میں نے التجا کی۔ میری مدد کریں۔ اس کا انھیں بہت صلہ ملے گا۔ وہ — انھوں نے میری مدد کی۔ ہر طرح دیکھ بھال اور دلجوئی — یقین دلانی — میں ان کے احسان کو کبھی نہیں بھولوں گی۔"

لالہ کا چہرہ سفید ہوگیا۔ اس کی آواز تھم گئی — سانس تیز ہوگئی۔ اچانک اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ اس طرح اس کے دل کا بوجھ خود بخود ہلکا ہوتا گیا۔ پھر اس نے بلاؤز کا بٹن کھولا۔ اور دائیں ہاتھ سے بائیں جانب گردن کے کچھ نیچے ٹٹولنے لگی۔ میں نے دیکھا۔ وہ سُرخ رنگ کا پھیلا ہوا بڑا سا مسّہ تھا۔ وہ اس مسّے کو سہلانے لگی۔ پھر سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"میری امّی کی روح مجھے بلاتی ہے۔ مگر — میں جا نہیں سکتی۔ کیسے جاؤں۔ اسے چھوڑ کر مرنا بھی آسان نہیں۔ میں کب تک زندگی کے عذاب سہوں گی۔ اب یہ جُدائی برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے فاقے سہے۔ مار کا کرب سہا۔ شک کی اذیتیں برداشت کیں۔ مگر — یہ جدائی۔ اپنے خون کی۔"

"لالہ — لالہ اب بھول جاؤ سب کچھ۔"

"سب کچھ بھول جاؤں گی شمع۔ سب کچھ مگر اپنے بچّے کو نہیں بھول سکتی۔ کبھی نہیں۔ اس پوری دنیا میں وہی تو میرا تھا۔ میرا اپنا۔ میرے جسم کا حصّہ — اُسے بھی میں —"

"اچھا اچھا۔ خدارا چُپ رہو۔ ورنہ کوئی ڈاکٹر مجھے بھی سزا میں کونے میں کھڑا کردے گا۔" میں نے کہا۔

اس کا بچّہ منوں مٹی تلے جا سویا۔ اور وہ — یکہ و تنہا رہ گئی۔ سچ کہہ رہی تھی وہ۔ وہی تو تھا اس کا اپنا۔ اس نے مسّے کو سہلاتے سہلاتے میری طرف دیکھا۔

"میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی شمع۔ بھائی جان کے پاس بھی نہیں۔ تم نہیں جانتیں۔ کچھ نہیں جانتیں میں کیا منہ لے کر پاکستان جاؤں۔ اور میں زندہ کب ہوں۔ لاش لندن میں ہو۔ یا لاہور، کراچی میں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ میں جا بھی نہیں سکتی۔ اپنے بچّے کو چھوڑ کر۔"

کمرے کی کھڑکی کے باہر کسی پیڑ کی شاخ ہوا سے لہرائی۔ اس شاخ میں سبز پتّے تھے۔ وہ تیز ہوا سے لہرا رہی تھی۔ شاید بارش پھر آنے والی تھی۔ بھائی جان ابھی تک نہیں آئے تھے۔ دو گھنٹے ہونے ہی والے تھے۔

"تم جاؤ یا نہ جاؤ لالہ! مگر میں تمھارے بھائی جان سے اتنا ضرور کہوں گی۔ اپنی بیٹیوں کو وہ تعلیم نہ دیں جو لالہ کو دی تھی۔ سر جھکانے اور نام نہاد خاندانی انا کی حفاظت میں سر کٹانے والی۔ انھیں ہمّت حوصلہ اور زبان کھولنے کی طاقت ضرور دیں تاکہ وہ بے زبانی کی سزا نہ اٹھائیں۔ کھوکھلے سماج کے مردہ قانون کو قبر میں اتارنے کی ہمّت دیں۔ کہ اپنی زندگی کو خوشی کی کوئی نوید بہار کا پھول تو دے سکیں۔"

میں جذباتی ہوگئی۔ لالہ نہیں۔ یہ میں تھی۔ یہ مجھ پر گزرنے والی کہانی تھی۔ میں اسے خود سے الگ نہیں کرسکتی۔ کیا ہم لڑکیاں سر جھکا کر بڑوں کے فیصلوں پر یونہی قربان ہوتی رہیں گی۔ قانون۔ سماج۔ شرافت کی حفاظت کرتے کرتے بے عزّت اور ذلیل ہوتی رہیں گی۔ یہ لفظ ہمیں کیا دیتے ہیں۔ بے بسی۔ آنسو۔ ہم اس وسیع زمین کے ہوتے ہوئے بے زمین اور آسمان کے تلے بے آسمان ہو جاتے ہیں۔ کوئی مدد کو نہیں آتا۔ زمین پیروں سے کھسک جاتی ہے۔ آسمان سر سے اٹھ جاتا ہے۔

"نہیں نہیں شمع۔ ان سے کچھ نہ کہنا۔" وہ تڑپ گئی۔ "اگر پاکستانی ماں باپ بھی آزادی اور خود مختاری کی تعلیم دینے لگے تو — وہاں بھی معاشرہ تباہ ہوگا۔ یہاں کی طرح بے راہ روی عام ہوجائے گی۔ اور اولاد ماں باپ سے دور ہوتی جائے گی۔ پھر تو سبھی بے سائبان ہوجائیں گے۔ والدین بھی۔ اولاد بھی۔ سماج بھی۔ قانون کو توڑنے کے بجائے اس کی حفاظت کرنا بہتر ہے شمع۔ ضمیر تو زندہ رہتا ہے۔ ہاں ان سے یہ ضرور کہنا لڑکیوں کو پتھر کی چٹان نہ سمجھیں۔ انھیں شیشے کی طرح نزاکت سے سنبھال کر رکھیں ملکوں کی دوری بے بسی کا باعث بنتی ہے۔ اور بے بسی دلوں کی دوری بن جاتی ہے۔"

"اچھا خیر تم کسی طرح پاکستان چلنے کا سوچو۔ وہاں تمھارے بھائی جان ہیں۔ سب سنبھال لیں گے۔ تم ہمّت تو کرو۔ یہ مصیبتیں تمھاری کم ہمّتی کی وجہ سے ہی آئی ہیں۔"

وہ نقاہت سے مسکرائی۔ "میں کمزور نہیں تھی شمع۔ ہمّت تھی تو سب کچھ سہار گئی۔ میں نے شرافت کا دامن پکڑ لیا۔ اخلاق سے گری ہوئی حرکت کرنے پر رضامند نہ ہوئی۔ مگر — مجبوراً — ہاتھ پھیلانے پڑے۔ اور جب ناکردہ گناہی کی سزا بھی بھگتی۔ اور — خود ہی اپنے گناہ کا اقرار کیا۔ تب میں کتنی گندی غلیظ ہوگئی تھی۔"

"پھر بھی تم جانتی ہو۔ مادرِ وطن کی گود کتنی وسیع ہے۔ چلو لالہ۔ ہمارے ساتھ۔"

"نہیں۔ تمھارے بھائی جان جب تک یہاں ہیں۔ میں کہیں نہیں جاسکتی۔"

"مگر پھر تو خطرہ رہے گا۔ عارف — !"

"اب وہ خطرہ نہیں ہے شمع۔ مرچکا ہے میرے

لیے اس نے مجھے میک کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ میں نے کہا تھا نا۔ ایک عزتِ نفس باقی ہے۔ سو وہ بھی نہ رہی۔ اس نے طلاق بھی — دیکھو —" وہ کانپتے ہاتھ سے تکیہ ٹٹولنے لگی۔ کاغذ نکال کر مجھے دکھایا "دیکھا تم نے۔ میک اسے ایک بڑی رقم دے آیا ہے۔ شاید اس کے لیے وہ بڑی رقم نہ ہو۔ میرے لیے تو ہے۔ میں آج — بک گئی زرخرید — وہ بھی ایک غیر مذہب —"

وہ رونے لگی "میں یہ تو نہیں چاہتی تھی۔ مرتی یا جیتی۔ میں اسی کے پاس رہنا چاہتی تھی۔ وہ میرا قانونی وارث تو تھا۔ میرے بزرگوں کا دیا ہوا وارث۔ اب میں لاوارث ہوں۔ کہاں جاؤں، کیا کروں۔ میک تو میرا خرچ تا زندگی اٹھانے کو تیار ہے مگر وہ میرا کون ہے؟ میں اسے کیا دے سکتی ہوں؟ اس کے اتنے احسانات جو میری جان پر ہیں۔ انھیں مر کر بھی ادا نہیں کر سکتی۔ قرض دار ہوں اس کی۔ کبھی کبھی جی میں آتا ہے۔ مذہب قانون اور اخلاق کی ساری حدیں پھلانگ کر میک کے پاس چلی جاؤں۔ اور کہوں۔ لو میک میں آ گئی ہوں۔ اپنا سارا قرض اتار لو جس طرح چاہو۔ مجھے یہ بوجھ بہت بھاری لگتا ہے۔ میں آنکھ بند کر کے سارا بوجھ اتار دوں۔ مگر میک — وہ بہت شریف ہے۔ مجبوری کا سودا کرنا ہوتا تو بہت پہلے کرتا۔ جب میں اس لیے باہر نکلتی تھی۔ میک کو مشرقی انداز پسند ہیں۔ اسے حیا اور پابندیٔ اخلاق کی قدر ہے۔ وہ محبت کرتا ہے مجھ سے۔ اسی لیے ہر بار۔ جب بھی میں اس کے پاس آئی۔ خالی ہاتھ نہیں گئی۔ اور عارف — عارف مجھے گندے الفاظ سے — ہاں وہ مجھے میک کی رکھیل سمجھتا ہے۔ سمجھتی ہو تم — یہ کتنی ذلیل گری ہوئی عورت — خدا کی قسم میں ایسی نہیں۔ میک ایسا نہیں اسے میری شرم، غیرت اور گریز پسند ہے۔ تبھی — تبھی اس نے آج تک — کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور اب — تو میں — بک گئی اس کے ہاتھوں حالانکہ سچی بات ہے۔ اس نے تو مجھے پہلے ہی خرید لیا تھا — اپنے اخلاق، محبت، ہمدردی سے۔ جب بغیر کسی طلب کے اس نے مجھے پونڈ دیے۔ جب مجھے اپنے دفتر میں نوکری دلائی۔ اور مجھے دلاسے دیتا رہا۔ ہاسپٹل میں پانچ راتیں گزار کر میری خبر گیری کرتا رہا۔ میں اس کے کتنے احسان اتاروں گی؟ کیسے؟"

"تو۔ اب۔ کیا تم میک کے ساتھ رہو گی؟" میں خوف زدہ ہو گئی۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ مغموم مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری "پتا نہیں کیا کروں گی۔ بے زمین۔ بے سائبان۔ اب تو میرے پاس کوئی امید نہیں سوائے اس کے کہ اب میں اس کی پابند نہیں۔ اور وہ اپنا اختیار کھو چکا ہے۔ میرا جسم میری روح۔ زخمی ہونے سے بچے رہیں گے۔" وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

"یہ تم — مسّے کو کیوں چھو رہی ہو لالہ۔" میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔ مسّے کو سہلا سہلا کر اس نے آس پاس کی جلد بھی سُرخ کر ڈالی تھی۔

"جب میں چھوٹی سی تھی۔ کوئی بھی مجھے جھڑکتا۔ مارتا میں اپنی امّی کی گود میں لیٹ جاتی۔" وہ اب نیم وا آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ "امّی کی گردن کے نیچے۔ اسی جگہ ایسا ہی مسّہ تھا۔ میں اپنا ہر دکھ اس مسّے کو چھو کر اس سے لپٹ کر بھول جاتی تھی۔ میرے بھی ایسا ہی مسّہ ہے۔ جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ میرا بچہ بھی اسی طرح۔ میرے سینے سے لپٹ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میری گردن کو چھوئے۔ میرے مسّے کو سہلائے۔ جیسے میں بچپن میں۔ آج بھی۔ جب کوئی مصیبت، کوئی فکر گھیر لے۔ میں اپنے مسّے کو چھوتی ہوں۔ سہلاتی ہوں۔ بڑی تسکین ملتی ہے۔ بہت آرام آتا ہے۔ اس کے سینے پر بھی — ایسا ہی ننھا سا نشان تھا سُرخ —"

وہ اب سرگوشی میں بول رہی تھی۔ اسے مخاطب کرنا بیکار تھا۔ وہ جانے کن نظاروں میں کھو گئی تھی۔

"جب میں نے اسے دیکھا۔ بس ایک بار ہی تو دیکھا تھا۔ تب مجھے اس کا مسّہ نظر آ گیا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ میں جب بھی اسے دیکھوں گی۔ پہچان لوں گی۔ پھر وہ اُسے لے گئے — اب میں — کہاں جاتی اسے ڈھونڈنے — مگر قدرت مہربان ہے۔"

لالہ کو نیند آ رہی تھی شاید۔ باہر بارش تیز ہو گئی اور کھڑکی کے شیشے کے پار ایک سرسبز پتوں سے لدی شاخ بار بار جھوم جھوم کر اپنے وجود کا احساس دلاتی رہی۔

مسز یوسف اب مجھے بلاتیں تو میں انکار کر دیتی۔ وہ وہ کسی شاپنگ پلازا یا ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سیل کی خوش خبری سناتیں۔ مجھے دلچسپی نہ تھی۔ وہ یہ سب مہربانیاں اپنے

ہے۔ اس میں سنجیدگی کی بھلا کوئی تک ہے۔

"انھیں پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا ہے تو چلی جائیں پاکستان۔" میں نے بھابی کے بار بار تفصیلی بیان سن کر اکھڑ لہجے میں کہا۔

"لڑکیوں کی وہاں کوئی کمی تو نہیں۔ اب بھی ہزاروں والدین اپنی بیٹیاں ہتھیلی پر سجائے بیٹھے ہیں کہ کوئی لندن پلٹ یا امریکن شہریت والا آئے اور ان کی بیٹی کو عذاب کی زندگی کے مزے چکھائے۔"

"سب — سب تو ایسے نہیں ہوتے شمع — وہ اویس تو بہت ہی قوم پرست — وطن پرست ہے۔ اسی لیے تو پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"تو کر لے۔ وہاں وطن میں — پاکستان میں — میں فالتو تو نہیں ہوں۔ جو دیکھ بھال کر مکھی کھا لوں۔"

بھابی ہنسنے لگیں۔ مسز یوسف آئیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مجھے تسلیاں دینے لگیں۔

"جو فیملیز برسوں سے یہاں سیٹل ہیں۔ وہ تمہارے پاکستان میں رہنے والوں سے زیادہ ہی مذہبی اور وطن پرست ہیں۔ ان کا مقابلہ اکیلے کمانے کے لیے آنے والوں سے کرنا بہت زیادتی ہے۔ یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے شیر اور گیدڑ کو ایک لاٹھی سے ہانکا جائے۔"

"مجھے اس ملک سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"روزی کی خاطر تو رہنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی صحراؤں میں، کبھی پہاڑوں پر۔ چلو میں ضمانت دیتی ہوں اویس کی۔ وہ سچا پاکستانی ہے، شریف ہے، بلند اخلاق ہے۔"

"مجھے کسی سے کیا مطلب، کوئی بلند اخلاق ہو یا بلند اقبال۔" میں چڑ گئی۔

"دراصل یہ پاکستان میں ہی چاہتی ہے۔" بھابی نے مسز یوسف کو جتایا۔ وہ کچھ مایوس ہو گئیں۔ "ویسے ہر کس و ناکس کو ایک پلڑے میں تولنا تو بدمعاملگی ہو گی تمہاری۔ وہ لالہ بہت مضبوط اور بلند کردار ہے۔ اس کا شوہر بدکردار، مگر میں کئی ہم وطنوں کو جانتی ہوں جو یہاں آ کر ذلیل سے ذلیل حرکت کرتے ہیں، لڑکیاں بھی۔"

لالہ اب صحت مند ہو رہی تھی مگر ہاسپٹل سے چھٹی نہیں ملی۔ بھائی جان مجھے روزانہ اس کے پاس لے جاتے تھے۔ میک ایک پجاری کی طرح اس کے پاس بیٹھا ہوا ملتا۔

تو۔ ایک بار ہی ملی ہوں، نہیں دو بار۔"

"دراصل اللہ میاں نے نو سال کے بعد ان کی گود بھری ہے۔ امی کھلونے کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہیں۔ بہت ہی والہ و شیدا ہیں۔"

"بچو کو ہاسپٹل لانے کی اجازت تو نہیں، مگر میں ڈاکٹر سے خصوصی اجازت لے لوں گی۔"

"مجھے وہ اپنی بھابی جان کی طرح ہی لگی ہیں۔"

"ارے نہیں نہیں۔ میری بھابی تو بہت ہی سنجیدہ مدبر قسم کی ہیں، سب کا خیال رکھتی ہیں۔ اپنے بیٹے کا تو ہر لمحہ ہی دھیان رہتا ہے انہیں، انہیں مجھ پر یا امی پر بھی بھروسہ نہیں، سچ۔"

"خدا کرے وہ اسے اسی طرح سدا چاہتی رہیں۔" بڑی حسرت تھی اس کی آواز میں۔

"ارے جان نچھاور کرتی ہیں اس پر۔ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں اس کا۔ صرف گود میں لینے کا کام امی کرتی ہیں۔ پتا ہے، کتنے بڑے بحران سے بچایا ہے منے نے بھابی کو، لوگ تو بھائی جان کی شادی ہی کرنے لگے تھے دوسری، اتنی ناامیدی تھی سب کو، مگر امی ڈٹ گئیں، انہیں بھابی کی خامی نظر ہی نہیں آتی تھی۔"

"بہت اچھی ہیں تمہاری امی، بالکل میری امی کی طرح حالانکہ میں نے تو اپنی ماں کو دیکھا ہی نہیں۔"

وہ اب بہت بولنے لگی تھی، اس کی صحت بحال ہو رہی تھی۔ ہم لوگوں کے واپس پاکستان جانے میں بہت کم دن رہ گئے تھے۔ اس کے ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے میں بھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ جسمانی طور پر وہ تندرست ہے۔ لیکن ذہنی طور پر اب بھی بیمار ہے، اس کو کوئی خوف ہے یا کوئی بوجھ ہے دماغ پر، جب تک نارمل نہ ہو جائے، اسے چھٹی نہیں مل سکتی۔

سب ڈاکٹر ہمدرد تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ لالہ کو ملی تو غیروں سے ہمدردی ملی وہ بھی غیروں سے۔

ایک روز میں بھائی جان کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی، پتا نہیں کہاں اٹک گئے تھے مجھے ہاسپٹل جانا تھا۔ دراصل آج میں اس سے یہ اقرار کرانا چاہتی تھی کہ ڈسچارج ہو کر وہ اِدھر اُدھر نہ بھٹکے۔ بلکہ بھائی جان کے گھر آ جائے۔ یہاں اسے

بچی محبت اور ہمدردی ملے گی، میری بے چینی دیکھ کر بھابی نے کہا۔

"تم ان کا انتظار نہ کرو، وہ اسی کے پاس گئے ہوں گے۔"

"اُس کے پاس؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "کیا آپ سے کہہ کر گئے ہیں؟"

"نہیں، مجھ سے کیوں کہتے۔" وہ طنزاً مسکرائیں۔ "میں اندھی تو نہیں، دیکھ رہی ہوں، اس میں ان کی دلچسپی، کسی نہ کسی منزل پر مجھے برباد کر دے گی۔"

"خدا نہ کرے۔" میرے منہ سے نکلا میں بھونچکا سی ان کو دیکھنے لگی۔ یہ بھابی کیا کہہ گئیں اتنی بڑی غلط فہمی، وہ تو اسے ستم زدہ اور میری دوست سمجھ کر اس سے ہمدردی کر رہے تھے۔ محض ہمدردی، مگر بھابی بھی میری صفائی کو قبول کرنے پر تیار نہ تھیں۔

"تم کو کیا معلوم۔" وہ افسردگی سے بولیں۔ "آج کل تو ہر دم اسی کا ذکر اسی کی فکر رہتی ہے انہیں، یوں لگتا ہے کہ جیسے میں پس منظر میں چلی گئی ہوں۔"

"نہیں نہیں بھابی، خدارا وہم نہ کریں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں بے قرار ہو گئی۔

"وہم نہیں، میں حقیقت پر یقین رکھتی ہوں، انہیں تو اسے گھر لانے کی جلدی ہے۔ اور بس، مجھ سے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔" وہ مایوسی کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ اگر وہ سچ سمجھی تھیں، تو ان کے خیال کے مطابق ابھی بھائی جان ہاسپٹل میں ہوں گے۔

"تم نہیں سمجھو گی۔ میں عورت ہوں، اور مرد کی نفسیات سے واقف ہوں۔ جو اتفاق سے میرا شوہر ہے۔"

ان کے لہجے میں طنز تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کوٹ پہنا برساتی لی اور گھر سے باہر آ گئی۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ ٹیکسی روکنے کا طریقہ تو آ ہی گیا تھا۔

ٹیکسی ہاسپٹل کے دروازے پر رکی اور میں نے اندر کی دوڑ لگائی۔ لالہ کا کمرہ بند تھا۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میک کی آواز نہیں تھی۔ بھابی کے اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔ میں بھائی جان کی آواز پہچان گئی۔ میں چھپ کر باتیں سننے کو بہت معیوب سمجھتی ہوں۔ مگر یہاں معاملہ میری جان سے عزیز بھابی کی خوشیوں کا تھا میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ بھائی جان لالہ سے کیا بات کر رہے ہوں گے۔ چنانچہ میں دروازے کے پاس یوں کھڑی ہو گئی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں، مگر میرے کان اندر کی سمت لگے تھے۔

"میں تمہارے ساتھ دشمنی نہیں کروں گا لالہ" بھائی جان کی واضح آواز آئی۔ "تم اسے کچھ نہ دے سکو گی۔ تحفظ نہ عزت نہ خاندان، صرف محبت سے سارے مسائل حل نہیں ہوتے۔"

"خدا کے لیے، جہاں اتنے احسان آپ نے کیے ہیں۔ وہاں اتنا اور کرم کریں۔ مجھے اور نہ آزمائیں۔ جہاں اتنے عذاب سہے ہیں۔ وہاں اور مصائب بھی برداشت کر لوں گی۔ نوکری کروں گی، آپ سوچیے، میں کیسے زندہ رہوں گی۔ مامتا کو کیا سمجھاؤں گی۔ دل کو کیسے تسلی دوں گی، کیسے جیوں گی میں۔" وہ بے قراری سے کہہ رہی تھی میں الجھن میں پڑ گئی۔ یہ کیا قصہ ہے۔

"تم کچھ بھی کہو، میں نادانی نہیں کر سکتا۔ یہ دشمنی ہو گی تمہارے ساتھ۔ سنو لالہ، تم یقین دلاتے دلاتے مر بھی جاؤ۔ تب بھی عارف نہیں مانے گا کہ وہ اس کا جائز بچہ تھا۔ تم نے خود اسے یقین دلایا تھا کہ، یاد ہے؟ کوئی عورت کہاں سے گھنٹہ دو گھنٹہ میں اس کے لیے رقم لائی ہے۔ یہ بات اسے یاد ہو گی۔ اور وہ ہرگز نہیں مانے گا کہ میک فرشتہ ہے۔ ذرا غور کرو، یہ معاشرہ تمہیں کبھی تحفظ نہیں دے سکتا۔ نہ پہلے دیا نہ اب دے گا جب تک کہ تمہارے سر پر مضبوط چادر نہ ہو۔ اور میں وہ چادر بن سکتا ہوں، تمہیں سوچنا چاہیے۔ اور اگر عارف کو پتا چلا کہ تم پھر سے بے سہارا ہو گئی ہو۔ وہ تمہیں اذیت پہنچانے کے لیے پھر آ جائے گا۔ اس وقت وہ اپنے بچے کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ صرف تمہیں دکھ دینے کے لیے۔ ورنہ وہ تو کب مانتا ہے۔ تم جانتی ہو ہمارے لوگوں میں ایسے بچے کی کیا عزت ہوتی ہے۔" بھائی جان تقریر کرنے کے موڈ میں تھے شاید۔

"مگر وہ ایسا نہیں ہے، میں حلف اٹھا کر کہتی ہوں۔"

لالہ چیخی۔

"کیا تم سمجھتی ہو عارف تمہارے حق میں گواہی دے گا؟ تم اس کے باپ کے خانے میں کس کا نام لکھواؤ گی؟ ہزاروں مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ ابھی تم محفوظ ہو، آزاد ہو۔"

"مجھے ایسی آزادی نہیں، بچہ چاہیے۔ میں اسے پاکستان لے جاؤں گی۔"

"وہاں کیا عارف کا کوئی عزیز نہیں؟ جونہی وہاں سے

عارف تک یہ خبر پہنچی کہ تم بچے کے ساتھ پاکستان پہنچی ہو وہ اس کی تشہیر کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ کیا میں تفصیل بتاؤں؟ یہاں پر گزاری ہوئی زندگی۔ اور، اچھا چھوڑو خود تمہارا نقصان کیا ہے۔ اسی پر غور کرو۔ وہاں کوئی تمہاری بات پر حلف پر یقین نہیں کرے گا۔ تمہارا کوئی گواہ ہی نہیں پھر جو تم نے مصیبتیں اٹھائی ہیں صبر کی صلیب پر چڑھتی رہی ہو۔ وہ قربانی ایک آن میں رائگاں جائے گی۔ بہت ظالم دنیا ہے یہ۔ اچھا۔ تم سوچو میں چلتا ہوں۔ کل آؤں گا۔"

یہاں تو کوئی اور ہی معاملہ تھا میں سوچتی رہ گئی اور ابھی دروازے سے ہٹنے بھی نہ پائی تھی کہ بھائی جان برآمد ہوئے۔ مجھے دیکھ کر ایک پل کے لیے ان کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ پھر وہ مجھے کھینچتے ہوئے گیلری میں لے آئے۔ دانت بھینچ کر سرگوشی میں بولے۔

"کب سے کھڑی تھیں تم؟ اندر کیوں نہیں آ گئیں۔"

"میں آپ کی آواز سن کر حیران ہو رہی تھی۔ آپ کس کی بات کر رہے تھے۔ اب میں بھابی کو بتاؤں گی کہ آپ ہاسپٹل آتے تھے۔ آپ۔ لالہ سے شادی۔"

بھائی جان کا رنگ سرخ ہو گیا غصے سے۔ ان کے ہاتھ کی گرفت میرے بازو پر سخت ہو گئی۔

"تم اپنی بھابی کو کچھ نہیں بتاؤ گی، سنا، نہ ہی لالہ کو۔ تم صرف چپ رہو گی۔"

"کیوں؟ یہ چھپ چھپ کر ہاسپٹل آنے کا مطلب کیا ہے بھلا؟ اب میں جان گئی ہوں۔"

"بتاتا ہوں، بیوقوف۔" وہ دانت پیس کر رہ گئے۔ "ہم اس کے بچے کے بارے میں۔"

"مگر وہ تو مر چکا۔" میرے منہ سے نکلا۔

"نہیں خدا نہ کرے۔ وہ زندہ ہے۔ جب وہ پیدا ہونے والا تھا لالہ بہت پریشان تھی۔ عارف اس کا دشمن ہو رہا تھا۔ بچے کو مارنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ میں نے لالہ سے وعدہ کیا تھا کہ مدد کر دوں گا۔ ان دنوں ایک خاتون بھی ہاسپٹل میں داخل تھیں۔ ڈاکٹروں کی انتہائی کوشش کے باوجود ان خاتون کے بچے کو بچایا نہ جا سکا۔ اور وہ اس قدر جذباتی تھیں۔ کہ یہ سچ سن کر زندگی ہار جاتیں۔ وہ بہت خطرے میں تھیں۔ یہ سمجھو کہ موت زندگی سے لڑ رہی تھی۔ وہ بچے سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھیں، اور بچہ بچایا نہ جا سکا۔ پھر ڈاکٹروں کی اجازت سے۔ لالہ کو عارف کے ظلم سے بچانے کی کوشش کے طور پر وہ بچے کو بیہوش خاتون کے پاس لٹا دیا گیا۔ لالہ کی مشکل حل ہو گئی وہ بھی بچ گئی۔ بچہ بھی۔ اور وہ خاتون بھی۔ عارف سے کہہ دیا۔ بچہ مر گیا۔ مردہ بچہ اس کو دکھا دیا گیا۔ یہ کام میں نے کیا۔ اب۔ عارف کے خطرے سے نکلنے کے بعد وہ بچے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میں کیا کروں، وہ عورت تو اسے اپنا بچہ سمجھتی ہے۔ دو عورتوں کی مامتا کے درمیان، میں قاتل بن رہا ہوں۔"

بھائی جان مجھے بتاتے جا رہے تھے۔

"اور ہاں۔ اپنی بھابی کو کچھ نہ بتانا۔ ابھی مکمل صحت نہیں ہوئی ہے انہیں، چڑچڑی ہو گئی ہیں۔ خبردار، انہیں نہ بتانا کہ میں یہاں آیا تھا میں لالہ کو۔ بہن سمجھتا ہوں سمجھیں

"بھابی جانتی ہیں کہ آپ یہاں آتے ہیں!" میں نے ڈرا دیا وہ پریشان ہو گئے۔ گھر جا کر میں بھابی کا سامنا نہ کر سکی۔ لیکن پھر جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ اور بھائی جان کی صفائی میں بتایا کہ میں نے ہاسپٹل سے بھائی جان کو فون کر کے بلوایا تھا وہ دفتر میں تھے۔

لالہ کے بچے کا خیال ذہن میں آتا تو بے چین ہو جاتی۔ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہ تھا۔ اور اس کا خیال آ رہا تھا لالہ جو ماں تھی۔ کیسے جدائی برداشت کر رہی ہے۔ اگلے دن میں نے لالہ سے کہا۔

"جب تم صحت یاب ہو کر بھائی جان کے گھر جاؤ تو بھابی کو اپنی بھابی جان سمجھنا۔ اسی طرح پیش آنا۔"

"اور میں انہیں کیا سمجھتی ہوں؟ تم کیا کہہ رہی ہو شمع۔"

وہ حیران ہو گئی۔

میں نے نظریں چرا لیں۔ "میں تو وہی سمجھتی ہوں، مگر شاید بھابی نہ سمجھیں۔ عورت ہیں نا۔"

لالہ بغور مجھے دیکھتی رہی۔ شاید اسے کچھ نظر آیا ہو۔ اندیشے، فکریں۔ یا۔

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ اور رونے لگی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں کسی کو بھی یقین نہیں دلا سکتی۔ اب میں۔ وہاں نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔"

میں بوکھلا گئی۔ "ارے یہ تو مطلب نہیں ہے میرا۔" مگر لالہ کا رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کی خامو سسکیوں کا اثر چہرے پر بھی عیاں تھا۔ جو پہلے سے بیمار اور

جس دن ہمیں پاکستان جانا تھا، مسز یوسف کی پوری ملی رخصت کرنے آئی تھی۔ دھوپ نے چمک دکھائی خوشگوار ی حرارت فضا میں موجود تھی۔ بھائی جان اور بھابی سے جدائی دکھ تو تھا ہی۔ لالہ کی بے سائبان زندگی بھی آنسوؤں کا سبب ھی۔ میں نے تو ہر دفعہ اس کی جگہ خود کو رکھ کر محسوس کیا تھا۔ گر آج میں سوچ رہی تھی۔ اگر میں لالہ ہوتی تو اس موقع پر کیا رتی۔ کس کا دامن تھامتی کس سے امیدیں قائم کرتی؟ میں بھابی سے لپٹی ہوئی تھی، تب انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

”تم! بے چارے اویس کی طرف بھی دیکھ لو۔ بڑی امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے تمہیں۔“

”بھابی! میں کسی کو بھی امید کا سہارا دینے کے حق میں نہیں۔ آپ مسز یوسف کو بتا دیں۔“

امی پوتے کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ ایئرپورٹ پر لوگوں کا ہجوم تھا، مگر ایسی خاموشی تھی جیسے لوگ قبرستان میں ہوں۔ نہ سامان گھسیٹتے ٹرالی کھینچنے کی آوازیں، نہ دوامی ڈائیلاگ، نہ لاپروا حضرات کے قہقہے۔ ہمارے لاہور میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ لندن، خوابوں کا جزیرہ۔ دھند میں لپٹی عمارتوں کا شہر۔ آج میں اس شہرِ اماں سے رخصت ہو رہی تھی۔ پھر کبھی نہ آنے کی ضد لے کر۔

بھابی چپ چپ تھیں ہم لوگوں سے جدائی، یا بھائی جان کی طرف سے کوئی غبار، دونوں باتیں ہی ہو سکتی ہیں۔ جہاز کی روانگی میں کافی دیر تھی۔ ہم باتیں کر رہے تھے۔ امی مسلسل بھابی کو ہدایتیں دے رہی تھیں، سردی سے بچانے کے نسخے، نظر نہ لگنے کے ٹوٹکے، دودھ کے اوقات، اور سونے کی پابندی۔ بھابی بے دلی سے سن کر سر ہلا رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ جسے وہ جھک کر رومال سے خشک کر لیتیں۔

تبھی میں نے میک کو دیکھا جو متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا آ رہا تھا۔ اس کا لمبا قد، مکئی کے بھٹے کے بالوں کی رنگت کے بال۔ اسے ہر جگہ نمایاں کر دیتے۔ میں کھڑی ہو گئی وہ قریب آیا تو اس کے ساتھ لالہ بھی تھی۔ آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ کمزور لاغر۔

”میں ہاسٹل والوں سے چھپ کر آئی ہوں۔ اس نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔“ اور میں نے ابھی ابھی میک سے شادی اس کے چہرے پر ہلکا سا رنگ تھا۔ اس نے لباس بھی کافی خوبصورت پہنا ہوا تھا۔

”میں نے اس کام میں بہت جلدی کی ہے نا؟ صرف اس لیے کہ تمہارے جانے سے پہلے اپنی منزل کا تعین کر لوں۔ تم فکرمند نہ رہو کہ میں بے سہارا ہوں گی۔ فاحشہ بننے کے بجائے یہ راستہ زیادہ آسان تھا۔ آزمایا ہوا انسان۔ تم خوش نہیں ہو؟“

”ہاں۔ اس لیے کہ، اب تو تم نے وطن سے تعلق ہی توڑ لیا۔ میک کو بھلا پاکستان سے کیا دلچسپی۔“

”ہم وطنوں کو ہی وطن سے دلچسپی نہیں۔“ وہ پھیکی مسکراہٹ [illegible]۔ ”خیر میں نے وطن سے ناتا توڑا ہے نہ ہم وطنوں سے۔ اور [illegible] بھی جب میں نے لندن کی سرزمین پر قدم رکھے تھے۔ اپنے وطن سے ناتا [illegible] مگر اب مجھے اپنی حفاظت کے لیے ایک چھت تو میسر آ گئی۔“

(ہاں۔ بہت لمبی چھت، یہاں سے وہاں، آسمان کی طرح۔)

بھائی جان میک کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے سرشار امی کے پاس آئے۔ انہوں نے امی کو گویا خوشخبری سنائی کہ امی ہی نہیں بھابی بھی مسرت بھرے انداز میں بھائی جان اور میک کو دیکھنے لگیں۔ بھابی کے چہرے پر ایک نکھار سا آ گیا۔

دل کی خوشی کا رنگ آنکھوں کو گلابی اور رخساروں کو سرخ کرنے لگا۔ ان کے چہرے اور آنکھوں کا غبار آن واحد میں صاف ہو گیا تھا۔

”بھائی جان نے انہیں شادی کی خبر سنادی ہے شاید۔“ میں نے اندازہ لگایا۔

”صرف شادی، میک۔ کل کلمہ پڑھ کر اسلامی شریعت کے مطابق مجھ سے شادی کرے گا شمع۔ اس نے بھائی جان سے درخواست کی ہو گی۔“

بھابی عجلت میں قدم اٹھاتی ہمارے پاس آئیں۔ لالہ کو گلے لگا کر بولیں۔

”تم ہاسٹل سے ہمارے گھر آنا تمہاری رخصتی تمہارے بھائی کے گھر سے ہو گی آیا سمجھ میں۔“ میں بھابی کے کھلتے گلاب جیسے چہرے کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

”تم اپنے بچے کو۔“ میں کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ بھائی

جان نے تاکید کی تھی لالہ کو نہ بتاؤں۔ اور میں، وہی غلطی کرنے والی تھی۔

”میں اسے بھول جاؤں گی۔ کم از کم اسے اپنی کوتاہی یا محرومی کا پہاڑ نہیں بناؤں گی۔“ وہ بھی بے خیالی میں بولی۔

”وہ اپنوں میں ہے۔ محبتوں کے حصار میں۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ امی کی گود سے منے کو لے کر اسے بغور دیکھنے لگی۔

امی نے سلامی کے طور پر کچھ رقم میک کو دی۔ اسے بھائی جان نے بتایا کہ یہ ہمارے ہاں کی رسم ہے۔ داماد کو سلامی دیتے ہیں۔

میک زور سے ہنسا۔ اسے یہ رسم بہت اچھی لگی۔

”یہ تو اچھی بات، بہت اچھی۔“ اس نے بگڑی انگلش میں کہا۔ اور آگے جا کر وہ رقم منے کے ہاتھ میں رکھ دی۔ بولا۔

”ہمارے ہاں بھی یہ رسم ہے کہ سب سے چھوٹے رشتے دار کو کوئی تحفہ دیتے ہیں شادی کے وقت۔ میرے پاس کوئی تحفہ نہیں۔ ہاسٹل سے بھاگا بھاگا آ رہا ہوں۔“

اس نے صفائی پیش کی۔ لالہ ہنس پڑی۔

مسافروں کے نام پکارے جا رہے تھے۔ پھر سے معانقے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تب اویس علی صاحب نے پہلی بار میرے قریب آ کر باوقار انداز میں کہا۔

”میں بہت جلد پاکستان آؤں گا۔“

جی بجا کہوں۔ مگر میں لندن نہیں آؤں گی۔

”میرا کورس ختم ہو گیا ہے۔ اور مجھے وہاں اچھی جاب مل جائے گی۔“ انہوں نے کہا۔

پہلی بار میری نظریں ان کے چہرے پر سچائی کی تلاش میں گئیں۔ بندہ خاصا خوش شکل اور سچا لگتا ہے۔ خوش اطوار بھی۔ پہلی بار مخاطب ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے کئی مواقع آئے تھے، مگر وہ منہ بند کیے رہا۔ میں نے بھی اسے لفٹ نہ کرائی۔ شاید وہ مجھے آزما رہے تھے۔ مجھے ہنسی آنے لگی وہ بھی مسکرائے اور ان کے نتھنوں سے ایک لمبا سانس آزاد ہوا۔ شاید اطمینان کا سانس۔

میں جلدی سے مسز یوسف سے لپٹ گئی۔ بھابی روتے روتے ہنس دیں۔ ”ہائیں ہائیں۔“

میں نے جھینپ مٹانے کو بھابی کی گود سے منے کو لیا۔ بھائی جان لالہ کو اپنے بازوؤں میں سہارا دیے کھ تھے۔ لالہ بہت دل گرفتہ تھی، مگر بھائی جان کے سہار مطمئن اور بے فکر۔ کبھی کبھی میک جھک کر اس سے کو سرگوشی کرتا اور وہ مسکرا دیتی۔ اور کبھی آنکھ میں اٹکا ہ آنسو انگلی سے پونچھ لیتی۔

بھابی نے منے کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھا د مگر ان سے پہلے لالہ میرے قریب آ گئی۔ اس نے کو گود میں لے لیا۔ اور اسے گلے لگا کر چومنے لگی پھر ا کا ہاتھ منے کے سوئیٹر کی سمت ابھرا۔ اس نے سوئیٹر بٹن کھول کر اس کی گردن کے نیچے ہونٹ رکھ دیے زیادہ قریب تھی۔ اور میں نے اس وقت واضح طور پ کی گردن کے نیچے سینے کے قریب ایک سرخ نشان گول سا سرخ نشان۔ ایک مسّے کا ابھار۔ ایک لحظہ میری نظر اس پر پڑی۔ پھر اس سرخ مسّے پر لالہ کا آ گیا۔

میں حیرت سے دیکھتی رہی۔ اس مضبوط اعصا لڑکی کے چہرے پر زردی چھا رہی تھی۔ پھر اس ک آگ کی طرح دہکنے لگے۔ اس نے سر اٹھا کر مجھ کو مخ کیا۔

”بھائی جان اور بھابی کو میری طرف سے کہن کاغذ کے وہ ٹکڑے نہیں۔ جو جیب سے نکل جائی جان کا صدقہ سمجھ لیا جائے اور کتاب سے پھٹ نور دی۔“

منے کو بھابی کی گود میں دے کر وہ سر اٹھائے ک طرف دیکھے بغیر مڑ کر واپس چلی گئی۔ لوگوں کے ہجوم م غائب ہو گئی۔ روشنیوں میں گم ہو گئی۔ چمکتی دھوپ بادل کا سایہ آ گیا۔ اب پھر لندن دھند کی لپیٹ میں ہیتھرو ایئرپورٹ روشنی میں نہا رہا تھا۔ امید آ روشنی میک کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔

رفوگر

نگہت سیما

لوگ ہمیشہ پتھر بدست کیوں رہتے ہیں وہ رے پھولوں کے جواب میں اگر ہماری طرف پھول نہیں پھینک تے تو ہمارا دامن کانٹوں سے کیوں بھر دیتے ہیں۔

اُس نے قلم ہاتھ میں لیے لیے سوچا۔ سیاہ جلد والی ڈائری اُس کی گود میں کھلی پڑی تھی ر اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن آنسو اُس کے اندر ہی کہیں کھو گئے تھے گم ہو گئے تھے اور آنکھیں خشک صحرا بنی ہوئی تھیں۔

کتنے دنوں بلکہ کتنے مہینوں بعد اس نے ڈائری اٹھائی تھی۔ اُسے ڈائری لکھنے کی عادت نہ تھی لیکن کبھی کبھی جب اُس کے دل پر بہت بوجھ ہوتا اور وہ کسی سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی تو تب وہ قلم کا سہارا لیتی۔ قلم اُس کا بہت اچھا دوست تھا۔ بہت سے مشکل لمحوں میں اُس نے اُسے سہارا دیا تھا۔ اپنا بوجھ ڈائری میں منتقل کر کے وہ ریلیکس (Relax) ہو جاتی۔

"اُف" اُس نے دونوں کنپٹیوں کو زور سے دبایا۔ درد اب ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ مگر وہ اسے بڑی ہمت اور حوصلے سے برداشت کر رہی تھی۔ عذاب ہمیشہ دو طرح سے اس پر ٹوٹتا تھا۔ ایک جسمانی عذاب اس اذیت ناک درد کی صورت میں اور ایک روحانی عذاب جو روح اور دل کو کچلے جاتا۔

اُس نے قلم رکھ کر سر کو زور زور سے پلنگ کی پٹی پر مارا اور ہولے سے بڑبڑائی۔

It is unbearable (اِٹ اِز اَن بیرایبل)

"اوہ میرے خدا اب نہیں۔ اب برداشت نہیں ہوتا۔"

اور پھر ہولے ہولے درد کی شدّت خود ہی ہمیشہ کی طرح کم ہو گئی۔ لیکن دل اسی طرح بوجھل تھا اور روح پر ویسی ہی بھاری سلیں گری ہوئی تھیں۔

میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا میرے خدا کہ میری محبتوں اور میرے خلوص کا صلہ مجھے اس طرح ملے کہ محبتوں پر سے میرا اعتماد اُٹھ جائے میرا یقین متزلزل ہو جائے۔"

اُس نے قلم اُٹھا کر اپنی ڈائری کھول لی۔

"یہ صحیح ہے کہ میں ابراہیم بن ادھم نہیں تھی اور میں لوگوں سے ویسی محبّت نہیں کر سکی جیسی کرنا چاہتی تھی کہ میرا آئینہ چٹخا ہوا تھا اور وہ ذرا سی ضرب سے

Junaid Asser

Pakistanipoint Waqar Azeem

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن میرے خدا تُو جانتا ہے کہ میں نے ایسا چاہا تھا اور ایسا سوچا تھا کہ میں بھی ابراہیم بن ادھم کی طرح روزِ محشر یہ کہہ سکوں کہ۔

اے اللہ میں نے تیرے بندوں سے محبت کی ہے بلا تفریق۔ اور تُو جانتا ہے میرے خدا کہ میں نے تیری تخلیق کی ہوئی ہر چیز سے محبت کی ہے۔ نیلے آسمان سے، اُڑتے ہوئے پرندوں سے، بہتے ہوئے پانیوں سے، چمکیلے بادلوں سے اور ہنستے ہوئے بچّوں سے۔

لیکن۔ لیکن یہ آج میں اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہوں کہ میرے دل کے اندر چھپی محبت نفرت کا روپ دھار رہی ہے اور میرا دل بار بار کیوں کہہ رہا ہے کہ دنیا محبت کے قابل نہیں ہے یہ تو قابلِ نفرت ہے اس سے نفرت کرو۔ خوب جی بھر کے اسے توڑ پھوڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو کہ یہ تمہارے پیار کے جواب میں تمہارے چہرے پر طمانچے مارتی ہے۔ اور یہ نفرت اور محبت کی جنگ۔ مجھے توڑ رہی ہے۔ میں ٹوٹ رہی ہوں۔ میرے خدا میں نفرت نہیں کرنا چاہتی کہ انہوں نے میری محبت کی میرے خلوص کی توہین کی ہے۔ اور میں اپنے مذہب سے منکر ہو رہی ہوں کہ میرا مذہب، میرا مسلک تو محبت تھا اور تُو جانتا ہے میرے خدا کہ اس میں صرف میں ہی قصوروار نہیں ہوں بلکہ وہ سب ہی اس میں برابر کے شریک ہیں جنہوں نے میرے پھولوں کے جواب میں میری راہ میں کانٹے بچھائے ہیں۔ تیری تخلیق کی ہوئی چیزوں سے محبت کرنا کیا کوئی گناہ ہے۔ بچّوں سے، پرندوں سے جانوروں سے محبت کرنا۔ درد کی ایک شدید لہر پھر اُس کے سر میں اُٹھی، قلم اس کے ہاتھ سے گر گیا اور اُس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"درد ناقابلِ برداشت درد جیسے کوئی ہتھوڑے سے سر میں میخیں گاڑ رہا ہو۔

"مس نور۔ مس نور۔"

مسز جانسن اُسے پکارتی ہوئی اندر آ گئیں۔

"ارے کیا ہوا۔؟"

وہ اُسے یوں دونوں ہاتھوں میں سر تھامے دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"کچھ نہیں۔"

اُس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"بس یونہی سر میں معمولی سا درد ہے۔"

اب وہ اُنہیں کیا بتاتی کہ یہ درد کتنا اذیّت ناک اور کس قدر ناقابلِ برداشت ہے۔

"اتنا سوچا نہ کرو۔ اچھی لڑکی مجھے لگتا ہے جیسے تم بہت زیادہ سوچتی ہو۔"

"نہیں تو مسز جانسن!" وہ مُسکرائی۔

"میں تو کچھ بھی نہیں سوچتی۔"

"اچھا کرتی ہو۔ دنیا جس ڈگر پر چل رہی ہے اُسے چلنے دو تمہارے سوچنے اور کڑھنے سے وہ بدل نہیں جائے گی۔"

"یس، مسز جانسن آپ صحیح کہتی ہیں۔"

"آج پھر تم نے کھانا نہیں کھایا۔"

"بھوک نہیں تھی۔"

"تو پھر دودھ ضرور پی لینا میں مس ملک سے کہہ دوں گی لگتا ہے آج کل وہ تمہارا خیال نہیں کرتی بہت کمزور ہو رہی ہو۔"

"نہیں تو مسز جانسن بینا بہت پیاری دوست ہے اور میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ اور اگر اُس کا سہارا نہ ہوتا تو۔ میں تو شاید مر ہی جاتی۔"

"ہاں اچھی لڑکی ہے کیوٹ سی۔ تمہاری تو آج ڈیوٹی بھی تھی۔

یہ بچے اسٹڈی ٹائم میں بہت شرارتیں کرتے ہیں خاص طور پر لوائز۔"

"جی مس جانسن! میں ابھی جا رہی ہوں۔"

"نہیں ڈارلنگ تم آرام کرو میں کسی اور کو بھیج دیتی ہوں۔"

"تھینک یو مس جانسن۔"

اُس نے متشکر نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

How Kind you are "آپ کتنی مہربان ہیں"

مس جانسن اُسے وش کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

اور یہ مس جانسن کتنی مہربان اور محبت کرنے والی ہیں۔ مخلص اور ہمدرد۔ گویا دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی اور یہ کہ۔ یہ کہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ شاید غلطی کہیں مجھ ہی سے ہوئی ہے۔

مسز جانسن کی مہربانی کا احساس اُس کے جلتے

سر میں ڈنک مارتے درد کی شدت کم ہونے لگی۔

عنبرین ابھی تک کمرے میں نہیں آئی تھی شاید وہ مس شمشاد کے پاس بیٹھی گپیں مار رہی ہو گی۔ اُس کا اور عنبرین کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ بچپن سے وہ اُس کی دوست تھی پھر ہوسٹل میں پانچ سال انہوں نے اکٹھے ایک ہی کمرے میں گزارے تھے اور اب سروس کے بعد بھی تین سال سے وہ اس اسکول میں اکٹھا پڑھا رہی تھیں۔ یہاں بھی وہ دونوں ایک ہی کمرے میں تھیں۔ وہ تو اُس کی رگ رگ سے واقف تھی اور اُس کے چہرے کے بدلتے رنگوں سے اُس کے اندر کا حال جان لیا کرتی تھی۔ شکر ہے کہ وہ کمرے میں نہیں تھی ورنہ۔

اُس نے ڈائری بند کر کے اپنے بیگ میں رکھ دی اور تکیہ آنکھوں پر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر لفظ تو گویا سانپوں کی طرح اُس کے ذہن میں رینگنے لگے ڈنک مارنے لگے۔

"اور یہ تم کیا کہہ گئے چاند تم نے تو مجھے خود میری نظروں میں گرا دیا ہے۔ اور میں ساری زندگی خود سے نظر ملا کر بات نہ کر سکوں گی۔ اور تمہارے دوستوں نے تم سے ایسی بات کیوں کی اتنی چھوٹی، اتنی گھٹیا اور معمولی بات۔ اُن کی ذہنیت اتنی گندی کیوں ہے۔ تم نے بھی تو کچھ کہا ہو گا نا چاند۔ یوں ہی تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اور تم تو میرے بچّوں کی طرح ہو ٹونی اور تومی کی طرح اور مجھے اتنے ہی عزیز اتنے ہی پیارے تھے۔"

اُس کی آنکھیں پھر جلنے لگیں اور وہ جو تھوڑی دیر پہلے ٹھنڈک کا سا احساس ہوا تھا وہ ایک دم معدوم ہو گیا۔ اب پھر وہی جلتا ہوا ذہن اور دل میں وہی اذیّت ناک احساس بچھو کے مار رہا تھا کہ کیا اُس نے غلطی کی تھی۔؟

نہیں یہ غلطی تو نہیں تھی۔

میرے خدا کیا تیرے بندوں سے تیری مخلوق سے محبت کرنا جرم ہے، گناہ ہے اور اگر جرم ہے گناہ ہے تو پھر تیرے فرشتوں نے حضرت ابراہیمؒ بن ادھم کا نام اُس کاغذ پر سرِ فہرست کیوں لکھا تھا جس پر

برسوں پہلے حضرت ابراہیمؒ بن ادھم والی پوئم پڑھ کر سوچا تھا کہ اے اللہ میں بھی تیرے بندوں سے محبت کروں گی۔ اور میری یہ خواہش کوئی اتنی بڑی بھی نہ تھی پھر میرے دامن میں اتنے خار کیوں آ گرے کہ سارا دامن تار تار ہو گیا ہے۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھیں اب بھی جل رہی تھیں اور درد کی ہلکی ہلکی لہریں کنپٹیوں میں ہلکورے مارنے لگیں۔ وہ رونا چاہتی تھی تاکہ دل پر دھرا بوجھ کم ہو مگر آنسو اس دُکھ کی شدّت سے خشک ہو گئے تھے۔ اُس نے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ لیا۔

"تو تمہارے دوستوں نے تم سے یہ کہا چاند کہ مس نور اور تم۔"

"اوہ نہیں میرے خدا۔"

میں اُس لمحے زمین میں کیوں نہ گڑ گئی اور میرے دل کی دھڑکن بند کیوں نہ ہو گئی چاند جب تم مجھے یہ سب بتا رہے تھے۔

اُس کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے اور رگیں جیسے چٹخنے لگیں۔ اور تب ہی عنبرین ملک نے ہولے سے دروازہ کھولا تاکہ وہ ڈسٹرب نہ ہو لیکن پھر اُسے اِس طرح بیٹھے دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی۔

"گڑیا۔ گڑیا کیا ہوا ہے بتیں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ زبردستی مُسکرائی۔

"پھر اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟"

"یونہی سوچ رہی تھی۔"

اُس نے دائیں ہاتھ سے اپنے سر کو دبایا۔

"کہ آخر لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں نظر نہ آنے والے ہتھیار کیوں چھپا رکھے ہوتے ہیں۔ اور وہ اُنہیں موقع ملتے ہی لفظوں کی صورت دل میں کیوں اُتار دیتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ انہوں نے کتنے گہرے زخم لگائے ہیں اور کتنا خون بہایا ہے۔"

"کیوں کیا کسی نے کچھ کہہ دیا گڑیا۔ مس کیتھی نے مس شمشاد نے یا پھر مس جانسن نے۔"

وہ اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"نہیں تو۔ یہ سب تو بہت اچھی ہیں۔"

"پھر کیا کسی؟"

"نہیں بینو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ میں بس یونہی سوچ رہی تھی۔" اُس نے تردید کی۔

بہت ساری باتیں وہ عنبرین کو بھی نہیں بتاتی تھی۔ حالانکہ وہ اُس کی بہت گہری، بہت پیاری دوست تھی۔

"نہیں خیر، کچھ تو ہے۔ تم بہت ڈسٹرب لگ رہی ہو۔ اور مصیبت یہ ہے کہ تم علامتوں میں باتیں کرتی ہو اور میرے جیسا نالائق بندہ سمجھ نہیں سکتا۔ اور مجھے تمہاری یہ عادت ہمیشہ سے ہی بُری لگتی ہے۔ پلیز عینی مجھ سے صاف صاف باتیں کیا کرو۔ اس طرح اندر ہی اندر کُڑھ کر تو تم مر جاؤ گی۔ تم سارے جہاں کے مسائل شیئر کرتی پھرتی ہو۔ کوئی ایک بندہ ایسا بھی تو ہونا جس سے تم اپنے دُکھ شیئر کر سکو۔ میں نہیں کوئی اور ہی سہی۔"

"تم سے بڑھ کر مجھے کوئی پیارا نہیں ہے بینو اور جتنا تم مجھے جانتی ہو اتنا کوئی نہیں جانتا۔"

"تو پھر بتاؤ نا اتنی اپ سیٹ کیوں ہو؟"

"کیا بتاؤں؟" وہ ہنس دی۔

"کوئی بات ہو تو تب نا!"

"بات تو ہے گڑیا جی یہ الگ کہ آپ بتانا نہ چاہیں۔"

"ہاں شاید!"

اس نے سوچا اور نگاہیں جھکالیں۔

"بات تو ہے بظاہر اتنی بڑی بھی نہیں مگر بہت بڑی بھی۔

It is nothing but it is too much.

اُس نے کنکھیوں سے عنبرین کی طرف دیکھا جو بہت غور سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"دیکھو گڑیا یہ دنیا اور دنیا والے ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔ پلیز تم ان کے بارے میں سوچ سوچ کر کُڑھا نہ کرو۔ میں جانتی ہوں کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔ مس شمشاد نے مس کیتھی کی بُرائی کی ہوگی یا پھر سسٹر میری نے بوڑھے جان محمد کی بے عزتی کی ہوگی۔ ہے نا؟"

"تمہیں کیا پتا بینو کہ کسی نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ بس مجھے بلندیوں سے نیچے لا پٹخا ہے اور میری اپنی ذات بگولوں کی زد میں آئی ہوئی ہے۔ اور پتھر براہِ راست مجھے آکر لگے ہیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اپنے زخموں پر مرہم کیسے رکھوں۔"

اس نے چپکے چپکے سوچا اور عنبرین کی طرف دیکھا۔

"تم نے کھانا بھی نہیں کھایا گڑیا! جان اتنی حساس مت بنو کہ کرچی کرچی ہو جاؤ۔ اس سے تو تمہاری وہ بے حسی ہی اچھی تھی۔ کم از کم تمہیں دوسروں کے مسائل اپ سیٹ تو نہیں کرتے تھے۔"

"نہیں بینو! تمہیں کیا خبر کہ وہ بے حسی بھی کتنی تکلیف دہ اور کتنی اذیت ناک تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنا آپ کہیں گم کر بیٹھی ہوں۔ اور کبھی کبھی کتنا دل چاہتا تھا کہ — کوئی انگلی کے بھالوں سے میرے زخموں کو یوں کھرچے

کہ ہر انگلی سے خون ٹپکے۔
کوئی بچھڑی محبت
آنکھ میں سیلاب لے آئے
کوئی تو ہو
جو مجھ کو زندگی کی اور لے آئے۔ وگرنہ موت ہی آئے۔

اور پھر کتنی عجیب اور غیر متوقع بات ہوئی تھی بے حسی کا یہ طلسم اچانک ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اُس بچّے کی آنکھوں کا حزن اور اُس کے چہرے کا ملال اس کے پتھر کو توڑتا چلا گیا تھا وہ اُس روز کتنا روئی تھی پورے دو سالوں بعد اُس کی خشک آنکھوں سے چشمے پھوٹ بہے تھے اور اس کے پتھر دل میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور اُس نے پورے دو سالوں بعد اپنے دل میں کسی کے لیے درد محسوس کیا تھا۔ اُسے اپنے دُکھ سے زیادہ کسی اور کا دُکھ محسوس ہوا تھا۔ اور وہ بار بار ایک ہی گیت سنتی رہی تھی۔

میرا دُکھ کتنا کم ہے۔ دنیا میں کتنا غم ہے۔

"کیا سوچنے لگیں گڑیا؟"

عنبرین نے ہولے سے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

"سو جاؤ، اب بہت رات ہوگئی ہے۔ لائٹ آف کر دوں؟"

"ہاں کر دو۔"

اُس نے آہستگی سے کہا۔ حالانکہ نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ اور اندھیرے سے اُسے خوف آتا تھا۔ گھر میں وہ ہمیشہ لائٹ جلا کر سوتی تھی۔ اور آج تو ویسے بھی اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ زخم ہی گہرا تھا۔ چوٹ بھی شدید لگی تھی دو سالوں کے بعد اس کا پہلا قدم ہی غلط پڑا تھا کیا وہ پرانے راستوں پر چلنے کے طریقے بھول گئی تھی۔ یا پھر قدم تو صحیح تھا لیکن راستے زیادہ پُر خار تھے اور دُکھ کی بات تو یہ تھی کہ اب وہ اکیلی تھی۔ نہ فرو بھائی تھے اور نہ مس نازگل جو راہ کے کانٹے چننے میں اُس کی مدد کرتے تھے۔ اُس کا دل گھبرا رہا تھا لیکن عنبرین کے خیال سے اُس نے لائٹ آف کروا دی کیونکہ اُسے روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔

وہ تو بچپن سے ہی ایسی تھی۔ دوسروں کی خاطر اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو مار دینے والی۔ بہت چھوٹی عمر سے ہی وہ چھوٹی چھوٹی قربانیاں دیتی آئی تھی۔ چاک بار اُسے بہت پسند تھی اور کبھی کبھی مانی اپنے جیب خرچ میں سے اُس کے لیے چاک بار لے آتے تو وہ بے تحاشا خوش ہوتی مگر چاک بار منہ کی طرف لے جاتے ہوئے کبھی جو اُس کی نگاہ ماسی بختاں کے پاس بیٹھی مانو پر پڑ جاتی تو وہ فوراً چاک بار اُس کی طرف بڑھا دیتی۔

"لو مانو! یہ تم کھالو۔"

مانی بھائی اُسے آنکھیں دکھاتے تو وہ نگاہیں چُرا لیتی۔

"وہ مانی بھائی! دراصل میرا گلا خراب ہے نا اس سے اور خراب ہو جائے گا۔"

"اور اس مانو کی بچّی کا گلا خراب نہیں ہوتا۔ کل جب بابا بڑا پیک لائے تھے تو پوری آدھی لیٹر تو یہ کھا گئی تھی۔"

مانی جل کر کہتے تو وہ مسکرا دیتی۔ حالانکہ اُس کا کتنا دل چاہ رہا ہوتا تھا چاک بار کھانے کو مگر اس کا ننھا سا دل مانو کی ترسی ہوئی نظریں دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔

وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ فرحان بھائی، عمران بھائی، شایان بھائی تینوں اس پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ مانی سے پورے سات برس چھوٹی تھی۔ اور اُس کی کوئی فرمائش رد نہ کی جاتی تھی۔ بابا، اماں اور تینوں بھائی سب ہی اُسے بے تحاشا چاہتے تھے۔

اماں ٹوکتی رہتیں۔

"ارے اس سے اتنی محبت مت کیا کرو فرو! کل کو اسے دوسرے گھر جانا مشکل ہو جائے گا۔"

"واہ کیوں نہ کریں اس کے لاڈ۔ ایک ہی ایک تو ہماری بہن ہے اتنی پیاری سی گڑیا سی۔"

مانی اُسے گود میں اٹھا کر اُچھالتے۔

اور اماں کتنا سچ کہتی تھیں۔ محبتیں کامل کر بچھڑ جانا کتنا عذاب ہو گیا تھا۔ جینا مشکل لگتا تھا۔

"جب دیکھو بھائیوں کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔"

اماں بڑبڑاتیں تو فرو بھائی اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیتے۔

"نہ اماں اس کو ڈانٹا نہ کریں اتنی حساس ہے یہ کہ آپ ذرا اونچا بولتی ہیں تو اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ جاتا ہے۔"

"تم نے فرو اس کی ذرا ذرا سی خواہش پوری کر کے اسے نازک بنا دیا ہے۔ یہ دنیا بڑی ظالم جگہ ہے۔ کیسے مقابلہ کرے گی یہ دنیا کا۔ تم اسے ہتھیلی کا پھپھولا مت بناؤ۔ اسے پتا چلنے دو کہ کچھ خواہشیں پوری نہیں بھی ہوتی ہیں۔"

مگر فرحان بھائی اماں کی بات ایک کان سے سُن کر دوسرے سے اُڑا دیتے۔

"آپ اس کے لیے پریشان ہونا چھوڑ دیں اماں! اور اسے وہ سب کرنے دیں جو یہ کرنا چاہتی ہے۔"

فرحان بھائی ہمیشہ اُس کا ساتھ دیتے اور اُس کی سائیڈ لیتے تھے۔

وہ چپکے چپکے اپنے راز انہیں بتایا کرتی۔

"آج بے چاری ماسی بختاں بہت بیمار ہے اور اُس کے پاس دوائی کے لیے پیسے تک نہیں۔"

اور فرو بھائی اُس کے ہاتھ میں چپکے سے روپے تھما دیتے اور وہ اماں سے چوری ماسی بختاں کو دے دیتی۔

اور کبھی وہ فرمائش کرتی۔

"یہ میرے جیسا لال فراک مانو کو بھی لا دیں۔ اُس کا بڑا دل چاہتا ہے۔"

اور جب اماں مانو کو اتنا قیمتی فراک پہنے دیکھتیں تو حیران سی رہ جاتیں کہ ہر وقت مہنگائی کا رونا رونے والی ماسی بختاں نے اتنا قیمتی فراک کیسے خرید لیا۔

فرحان بھائی اُس کا آئیڈیل تھے اور وہ لاشعوری

بچپن سے ہی اُن کی شخصیت کے رنگ نقش ہو گئے تھے۔ کئی رنگین خاکے تھے۔ اپنا سوئیٹر اور قمیص اُتار کر بوڑھے فقیر کو دیتے ہوئے ۱۹۷۲ء کی جنگ میں رات گئے تک ہاسپٹل میں زخمیوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے چوکیدار کے کوڑھی بیٹے کو اکثر اپنی گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہوئے۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ کیا کبھی وہ بھی فرو بھائی کی طرح بن سکے گی۔

بابا کہتے تھے "فرو کا دل سمندر ہے۔"

کیا اُس کے دل میں بھی کبھی اتنی وسعت پیدا ہو سکے گی۔ وہ سوچتی رہتی فرحان بھائی سے سوال کرتی رہتی اور وہ اپنے شفیق انداز میں اس کو مطمئن کر دیتے۔ وہ اُن کے کہے ہر لفظ کو آسمانی صحیفوں کی طرح اپنے دل میں اُتار لیتی تھی حفظ کر لیتی تھی۔

دنیا سے، لوگوں سے محبت کرنے کا درس بھی تو انہوں نے ہی اُسے دیا تھا۔

"خدا کی بنائی ہوئی دنیا سے اور اس کے بندوں سے محبت کرنا بے لوث اور بے غرض محبت بہت بڑی نیکی ہے گڑیا۔"

"مگر فرو بھائی! میں آپ کی طرح ہر ایک سے محبت نہیں کر سکتی پتا جب آپ مانی فتو کو ہاسپٹل لے جا رہے تھے تو میرا دل خوف سے کانپ رہا تھا اور مجھے کئی ہفتے نیند نہیں آئی تھی کہ کہیں کوئی جراثیم آپ کو نہ چمٹ گیا ہو۔ میرے دل میں آپ کے دل جتنی وسعت کیوں نہیں ہے فرو بھائی۔"

"تو ابھی چھوٹی ہے گڑیا اور تیرے دل کے آئینے میں ابھی اتنی پختگی نہیں آئی۔ مگر تیرا دل بہت غنی ہے عینو اور تیرے دل میں سمندروں جیسی وسعت ہے۔ بس تو میری ایک بات یاد رکھنا کبھی کسی سے نفرت نہ کرنا بُرے سے بُرے آدمی سے بھی نہیں اس لیے کہ بُرے لوگ اپنی بُرائی کے تنہا خود ذمہ دار نہیں ہوتے۔ اچھے لوگوں سے تو سب ہی پیار کرتے ہیں۔ بات تو جب ہے کہ آدمی بُرے لوگوں کو چاہے۔ اور اس بات کی کبھی پروا نہ کرنا کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں بلکہ ہمیشہ یہ دھیان رکھنا کہ تم کیا ہو۔ اور صرف اُسی راستے پر چلنا جس پر چلنے دیکھنا کہ اس راستے پر چلنے والی تم تنہا فرد ہو۔ اور دوسرے راستے پر لوگوں کا ہجوم ہے بس تم۔"

اماں سنتیں تو ضرور ٹوکتیں۔

"اسے اُلٹی سیدھی پٹیاں نہ پڑھایا کرو فرو۔ لڑکی ہے یہ اور اس کے دل کے آئینے میں ابھی پختگی نہیں آئی ہے۔ اتنی بڑی بڑی باتوں کے بوجھ سے چٹخ جائے گا۔ اسے الگ الگ راستوں پر چلنے کا سبق نہ دے۔ اُسی راستے پر چلنے دے جس پر ساری دنیا جا رہی ہے ورنہ اکیلی ہو جائے گی، تنہا رہ جائے گی۔"

اماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن کتنی صحیح اور کھری باتیں کرتی تھیں۔ وہ واقعی تنہا رہ گئی تھی اور اکیلی بھی۔ اور اُس کا آئینہ جگہ جگہ سے چٹخ گیا تھا اب تو اسے خود اُس میں اپنی واضح شکل نظر نہیں آتی تھی۔

مگر تب وہ فرو بھائی سے چمٹی کھڑی اماں کی باتیں بڑی لاپروائی سے سنتی تھی۔

"نہ اماں آپ تو یونہی لایعنی باتیں کرتی ہیں۔" وہ اُس کے گرد اپنے بازو حمائل کر لیتے۔

"ہم دونوں بہن بھائی مل کر ساری دنیا کو اپنی محبت سے تسخیر کریں گے۔ ہم لوگوں کو محبت کا درس دیں گے انہیں محبت کرنا سکھائیں گے۔ ارے آپ کو کیا پتا ہمارے کیا کیا پلان ہیں۔ کیوں عینو۔"

اور اُس کی بڑی بڑی لانبی پلکوں والی خوبصورت آنکھوں میں جگمگاہٹیں اتر آتیں۔ وہ تو ان کی دیوانی تھی۔ چکور کی طرح اُن کے گرد گھومتی تھی۔ ذرا دیر سے گھر آتے تو رونے لگ پڑتی۔

"ارے ایسی دیوانی محبت۔"

اماں بڑبڑاتیں۔

"نہ دیکھی نہ سنی۔ پاگل ہے تُو تو عینی، بھائی تو شادی کے بعد آنکھیں بدل لیتے ہیں۔ کل کو تیری بھابھی آئے گی تو اس کے پاس تیرے لاڈ اُٹھانے کو وقت نہیں رہے گا۔ کیسے جیے گی۔ او کھی ہو گی تو عینو۔"

مگر اُسے فرو بھائی پر پورا یقین تھا اور واقعی اُس کا یہ مان ٹوٹا نہیں تھا۔ شادی کے بعد بھی فرو بھائی ایسے ہی تھے۔ حتیٰ کہ نومی اور ٹونی کی پیدائش کے بعد بھی وہ اُس کے ساتھ اسی طرح لاڈ کرتے تھے۔ یوں

تو مانی اور شانی بھائی کے ساتھ بھی وہ فرینک تھی۔ مانی کے ساتھ مل کر اُس نے لڑکوں والے سارے کھیل کھیلے تھے۔ چھت پر چڑھ کر پتنگ اڑانے سے لے کر کالج گراؤنڈ میں سائیکلیں چلانے تک۔

اور شانی بھائی کے ساتھ اُس نے گھنٹوں شاعری اور ادب کے موضوع پر باتیں کی تھیں۔ لیکن جتنی دوستی اس کی فرو بھائی سے تھی اتنی کسی اور سے نہ تھی۔ حالانکہ وہ اس سے پورے چودہ برس بڑے تھے۔ اور جب وہ لاہور گئے تھے تو ان کی جدائی میں رو رو کر وہ بیمار پڑ گئی تھی تب اماں سے اجازت لے کر وہ اسے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ اور وہاں ہی داخل کروا دیا تھا۔

اُس کی ذات کے سارے رنگ تو وہاں ہی نکھر کر واضح ہوئے تھے۔ فرو بھائی کی حوصلہ افزائی اور مس نازگل کی صحبت نے اُس کی شخصیت کے کئی نئے گوشے اجاگر کیے تھے۔

مس ناز سائیکالوجی ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ تھیں اور انہوں نے اپنی زندگی دوسروں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ پاکستان بنتے وقت اُن کا پورا خاندان ختم ہو گیا تھا۔ وہ تنہا تھیں اور اپنی زندگی ایک مشن کے تحت گزار رہی تھیں اُس نے کبھی کچھ کہے سنے بغیر اُن کی انگلی تھام لی تھی اور اُن کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ بہت حیران ہو کر اس ننھی سی لڑکی کو دیکھتی تھیں جس کے حوصلے چٹان تھے۔

"ریفارمر بننا کوئی آسان کام نہیں ہے اس راہ میں بڑے کانٹے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں مس۔" وہ مسکرا دیتی۔

"میں راہ کے کانٹوں سے خوفزدہ نہیں ہوتی۔"

"دیکھو نور العین! یہ بہت مشکل کام ہے۔"

مس نازگل اُسے سمجھاتیں۔

"اس کے لیے بڑے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے۔"

وہ اُسے اپنے پاؤں کے چھالے اور ہاتھوں کے زخم دکھاتیں۔

"یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔"

"ہم تو ظالم نہیں ہیں نا۔ پھر لوگ کب تک ہمارے —— پھولوں کے جواب میں کانٹے پھینکیں گے کبھی تو۔ کبھی تو مس وہ ہماری راہوں کو پھولوں سے سجائیں گے۔"

اور مس نازگل نے اُسے اپنی تنظیم میں شامل کر لیا۔ اس تنظیم کے ذمے بہت کام تھے۔ غریب مریضوں کو دوائیاں اور خون مہیا کرنا غریب طالب علموں کے لیے تعلیم کا بندوبست کرنا۔ غریب لڑکیوں کے لیے جہیز اکٹھا کرنا اور ایسے ہی سینکڑوں کام۔ وہ سب میں پیش پیش رہتی تھی۔ فرو بھیا نے ہر ہر قدم پر اسے اپریشیٹ کیا تھا۔ اُس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ زندگی اپنی مرضی اور مشن کے مطابق گزار رہی تھی اس لیے ہر وقت خوش اور فریش رہتی تھی۔

"تو تھکتی نہیں گڑیا۔"

کبھی کبھی فرو بھیا پوچھتے۔

"نہیں تو۔" وہ ہنس دیتی۔

"تم نے اپنی ہمت سے زیادہ کام اپنے ذمے نہیں لے لیے۔"

"نہیں تو، مجھ میں بڑی ہمت ہے۔"

اور واقعی اس میں بڑا حوصلہ تھا بڑی ہمت تھی اتنے ڈھیر سارے کاموں کے علاوہ وہ ہفتے میں دو بار فونٹن ہاؤس جاتی تھی اور وہاں کے ممبرز کو پینٹنگ اور فلاور میکنگ سکھاتی تھی۔ وہ سب جن کے آئینے چٹخے ہوئے تھے اور جن کا درد اس کے دل میں اُتر آیا تھا لیکن وہ ہوش و حواس سے دور ان لوگوں کے درد کو کم کرنے پر قادر نہ تھی مگر وہ ان سب سے محبت کرتی تھی۔

بڑی بڑی آنکھوں والے منصور احمد سے جس نے کچی عمر میں محبت کا روگ پالا تھا اور برداشت نہ کر سکا تھا۔

صالح خان سے جو ابھی صرف تیرہ برس کا تھا لیکن اتنا حساس کہ ماں باپ کی نفرت محسوس کر کے دیوانہ ہو گیا تھا۔

سہیل سے، فاریہ سے رابعہ سے۔

سب کی الگ الگ کہانیاں تھیں الگ الگ دکھ تھے۔ وہ ان سب سے بے لوث محبت کرتی تھی۔ یوں بھی اس نے اپنے دل کو ہر قسم کی غرض سے پاک کر تھا۔ وہ ان سب لاچار لوگوں سے اس لیے محبت

نہیں کرتی تھی کہ وہ بھی صلے میں اُس سے محبت کریں۔ لیکن وہ سب اُسے چاہتے تھے۔ اس کا اظہار کرتے تھے اُس سے محبت کرتے تھے۔

اُن دنوں کئی بار اُس نے سوچا تھا کہ اُسے بہت محبتیں ملی ہیں اُس کی طلب سے زیادہ۔ وہ ایک دم بہت خوبصورت لگنے لگی تھی۔ اُس کے اندر کا تمام حُسن اُس کے چہرے پر اتر آیا تھا۔ وہ عام سی شکل وصورت کی لڑکی جب دھیمے دھیمے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بات کرتی تو اُس کے لہجے کی نرماہٹ اور گداز مخاطب کو ایک دم سے اسیر کر لیتا تھا۔

وہ یکدم ہی بہت مقبول ہو گئی تھی۔ کالج میں فونٹن ہاؤس میں، تنظیم میں ہاسٹل میں ہر جگہ روز بروز اُس کا دل زیادہ نرم ہوتا جا رہا تھا اُس میں زیادہ وسعت آتی جا رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس نے ہمیشہ پھول ہی چُنے ہوں۔ کئی بار اُس کے پاؤں زخمی بھی ہوئے اور دل پر چوٹ بھی لگی لیکن اُس نے راستہ نہیں بدلا تھا کیونکہ فرو بھائی تھے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے اور مس ناز تھیں اس کی ہمت بڑھانے کو۔ کئی بار لوگوں نے اُسے دھوکا دیا اور اس کے ساتھ فریب کیا لیکن وہ سوچتی کہ وہ کسی ایک شخص کے جرم کی سزا دوسروں کو تو نہیں دے سکتی نا۔ سو اس نے اپنا مشن ترک نہیں کیا تھا۔

کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ وہ وہ سب کچھ نہ کر پاتی جو کرنا چاہتی تھی ایسے میں وہ بہت ڈسٹرب ہوتی تھی۔

جب صمد بیدار خان کی خودکشی کے بعد اس کی بیوی اپنے سوتیلے بیٹے کو مارتی تو وہ گیلری میں سے اُسے دیکھتے ہوئے مضطرب ہو جاتی تھی۔ اس کے ہاتھ بے اختیار اُسے بچانے کے لیے آگے بڑھتے پھر بے بسی سے گر جاتے وہ بے چینی سے ہونٹ کاٹتی اور اُس کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور وہ بھیا سے کہتی۔

"فرو بھیا پلیز منوں کو اپنے گھر لے آئیں۔ ہم اسے پڑھائیں گے۔ تاج بی بی اُس پر بہت ظلم کرتی ہے۔ پلیز فرو بھائی۔"

"بہت سی باتیں آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں عینی گڑیا! اُن کا کرب، اُن کا دُکھ اپنی جگہ پر۔ اگر تم کسی کے دُکھ کو دور کرنے پر قادر نہیں ہو گڑیا! تو یہی بڑی بات ہے کہ تم نے اُس کے درد کو اس کے دُکھ کو محسوس تو کیا ہے نا۔"

فرو بھائی اُسے سمجھاتے۔

مگر وہ صرف محسوس ہی نہیں بلکہ ان دُکھوں کو دور بھی کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے جب کسی کے آنکھ کے آنسو نہ پونچھ سکتی تو ڈسٹرب ہوتی تھی۔ کئی کئی دن اپ سیٹ رہتی تھی۔ جب وہ مجرم بچوں کی نفسیات کے بارے میں پڑھ رہی تھیں تو مس ناز گل انہیں بچوں کی جیل میں لے گئی تھیں۔ تب اُس کا دل کتنا دُکھا تھا۔ وہ کتنی ڈسٹرب ہوئی تھی یہ بچے جن کے ہاتھوں میں کتابیں اور کاپیاں ہونی چاہیے تھیں جن میں نہ جانے کتنے قائداعظم اور اقبال چھپے تھے لیکن جو کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں جیل کی اونچی دیواروں کے پیچھے بند تھے۔ اور جن کے معصوم چہروں پر کرختگی تھی اور آنکھوں میں عجیب بیگانگی اور نفرت اور وہ تیرہ چودہ برس کا لڑکا جس نے اپنے سوتیلے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ اُف کتنی نفرت کتنا غصہ تھا اس کی آنکھوں میں۔ اُس کا کتنا دل چاہا تھا کہ اُس کے کھردرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے پوچھے۔

"میرے ننھے بھائی! تمہاری آنکھوں میں اتنا غصہ اور نفرت کیوں ہے؟ تمہیں کس سے اتنا گلہ اتنا شکوہ ہے؟"

اُس کا کتنا دل چاہا تھا کہ اُس کے محبت کے گزر سے ناآشنا دل کو محبت سے روشناس کرائے۔ اُس سے اتنی محبت اتنا پیار کرے کہ اُس کی آنکھوں میں دہکتی نفرت کی آگ بجھ جائے اور وہاں محبت کے دیے روشن ہو جائیں۔

لیکن وہ کتنی بے بس تھی اور اُس روز فرو بھیا کو اُن بچوں کے متعلق بتاتے ہوئے وہ یکدم رو پڑی تھی۔

"کیا ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے فرو بھائی! ہم اتنے بے بس کیوں ہیں۔ وہ چہرہ ایک قاتل کا چہرہ تو نہیں تھا فرو بھائی وہ تو ایک معصوم بچے کا چہرہ تھا جو ساری دنیا سے خفا اور ناراض ہو جو۔"

اور تب پہلی بار فرحان اُس کے لیے پریشان ہو گئے تھے۔

"گڑیا! میرا دل اب تیرے لیے ڈرنے لگا ہے۔ آدمی کا اپنی ذات پر بھی تو کوئی حق ہوتا ہے نا اور تم اپنی ذات کی نفی کر رہی ہو۔ تمہاری صحت پہلے جیسی نہیں رہی تم اتنی جلدی جلدی بلڈ مت دیا کرو۔ مجھے ڈر ہے گڑیا کہ اماں کے خدشے صحیح ہی نہ ہوں۔"

اور وہ ہنس دی تھی۔

"ارے فرو بھائی! آپ تو یونہی گھبراتے ہیں۔"

اور اُس رات بہت دیر تک وہ اُن کے پاس بیٹھ کر مستقبل کے پلان بناتی رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کی ہاں میں ہاں ملانے والے فرو بھائی یوں اس طرح اچانک اُس کا ساتھ چھوڑ جائیں گے کہ سارے پلان خاک میں مل جائیں گے۔ اُسے کالج لانے کے لیے وہ اپنے آفس سے نکلے تھے کہ ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ دنوں، ہفتوں، مہینوں اُسے یقین نہ آیا کہ اُس کے اتنے اچھے اتنے پیارے فرو بھائی یوں اس طرح۔ اُس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا اور بند کمرے میں چیخیں مار مار کر روتی دیواروں سے سر ٹکراتی۔ سب اُسے سمجھاتے۔ بابا، اماں، شافی اور مانی بھائی مگر اُس کے سینے میں کوئی برچھیاں مارتا رہتا۔ اُس کے آنسو نہ رکتے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اُس دُکھ کا بدلہ کس سے لے۔ کس سے گلہ کرے کس سے شکوہ کرے۔

حنا بھابھی عورتوں میں بیٹھ کر عجیب عجیب بین کرتیں جیسے کوسنے دے رہی ہوں۔ جیسے فرو بھائی سے اُنہیں بے حد بے حساب گلے شکوے ہوں کیسی بیوی تھیں وہ جنہیں فرو بھائی کی مہربانیاں اور محبتیں تو یاد نہ تھیں ہاں اُن کی بے نیازیوں کے شکوے وہ ہر آنے والی عورت سے کرتیں۔

"سدا بہن کے ہی ناز اٹھاتا رہا۔ بچوں کی اور میری تو پروا ہی نہیں تھی۔ لوگوں کی بہت فکر تھی۔"

"آپ کے دل میں اتنا کینہ بھرا تھا حنا بھابھی!"

وہ تڑپ کر انہیں دیکھتی۔

"ایسے ہی کالج لینے جا رہا تھا کہ۔"

اور اُس کے اندر کوئی نیزے کی انی کھبو دیتا۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتی۔

"کاش آپ مجھے اس روز لینے نہ آتے تو شاید۔ یا پھر میں بھی آپ کے ساتھ ہوتی۔ اور ساتھ ہی مر جاتی۔ کیسے۔ کیسے جیوں گی میں۔

مگر وہ زندہ رہی فرو بھائی کے بغیر بھی اُن کے بعد بھی۔

مس ناز گل نے اسے بہت سمجھایا تھا اور اُسے خود لینے آئی تھیں۔

"اپنے آپ کو سنبھالو عینی! تمہارا حوصلہ تو بہت بڑا تھا۔ اپنا نہیں تو نومی اور ٹونی کا ہی خیال کر لو۔ کہ اب تم نے انہیں وہ محبتیں بھی دینی ہیں جو فرحان انہیں دیتے ان کا دُکھ تم سے بڑا ہے اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ اتنی عظیم محبت سے محروم ہو گئے۔ اپنی امی کا خیال کر لو۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مس۔"

وہ نومی اور ٹونی کو لپٹا کر رو دی کیسے ہنستے مسکراتے بچے پل بھر میں مرجھا گئے تھے۔ ذرا ذرا سے منہ نکل آئے تھے اُن کے۔

"اور وہاں بھی سب تمہیں یاد کرتے ہیں تمہارے منتظر ہیں۔ منصور، فارینہ، صالح، رابعہ سب تمہارے متعلق پوچھتے ہیں اور وہ صالح اُسے تو پھر دورے پڑنے لگے ہیں محبتوں پر سے اُس کا اعتماد اُٹھ جائے گا۔ اُسے تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔"

"یس مس!"

اس نے اپنے آنسو اپنے اندر اُتار لیے اور مس ناز گل کے ساتھ لاہور آ کر ہوسٹل میں منتقل ہو گئی۔ وہی لاہور تھا مگر کتنا اداس۔ وہاں سب نے اسے بہت دلاسا دیا۔ بہت حوصلہ دیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو مصروف کر لیا تھا مگر اب کے اُسے بہت ٹھوکریں لگیں، بہت کانٹے چبھے۔ فرو بھائی جو نہیں تھے اُس کے زخموں پر مرہم رکھنے والے۔ کئی بار وہ مس ناز کی گود میں سر رکھ کر رو دی۔

"لوگ ایسے کیوں ہوتے ہیں مس! دنیا میں اتنی نفرت، اتنا دھوکا، اتنا فریب کیوں ہے۔؟"

وہ چھٹیوں میں گھر آتی تو نومی ٹونی کے ساتھ اتنا لاڈ کرتی، اُن کے اتنے ناز اٹھاتی کہ حنا بھابھی چڑ جاتیں

"تم انہیں بگاڑ دو گی عینی!"

"محبتیں بگاڑتی نہیں، سنوارتی ہیں بھابھی!"

وہ انہیں اپنے ساتھ لگا لیتی۔ وہ ایک دم ہی خود

کو بہت بڑا سمجھنے لگی تھی۔ حنا بھابھی انہیں خواہ مخواہ ڈانٹتیں، غصہ ہوتیں، مارتیں تو وہ ان کی ڈھال بن جاتی۔

"بھابھی پلیز، انہیں کچھ نہ کہیں۔"

آنسو بھر بھر اُس کی آنکھوں سے بہتے۔

"ان کے دل تو پہلے ہی دیمک زدہ ہو گئے ہیں۔"

"باپ نہیں ہے تمہارا۔ مت فرمائشیں کیا کرو۔"

"ہم جو ہیں ان کے ہم سب ہیں۔ بابا۔ اماں، مانی اور شانی بھائی۔"

مگر وہ جو منہ میں آتا کہتی چلی جاتیں مگر وہ اُنہیں لے کر اپنے کمرے میں گھس جاتی۔ اُن کے ساتھ کھیلتی، انہیں پڑھاتی۔ اُن سے اچھی اچھی باتیں کرتی، نومی، ٹونی کبھی ممی کی شکایت کرتے تو وہ ڈانٹتی۔

"وہ ماں ہیں تمہاری اور اُن پہ غم کا اتنا بڑا پہاڑ آگرا ہے وہ اپنا غصہ کس پہ نکالیں۔"

"آپ زیادہ بزرگ نہ بنا کریں آنٹی۔"

نومی کو غصہ آتا کہ وہ آنٹی جو کل تک اُن کی دوست تھیں اُن کے ساتھ مل کر پیٹھو گرم کھیلتی تھیں اور شرارتیں کرتی تھیں اب ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی تھیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگی تھیں۔

"بھئی، دوست تو ہم اب بھی ہیں۔"

دھیمی دھیمی مسکراہٹ اُس کے چہرے کو روشن کر دیتی۔

وہ جتنے دن گھر پر رہتی حنا بھابھی کا غصہ عروج پر رہتا۔ وہ بہانے بہانے اُسے ہزاروں باتیں سنا جاتیں مگر وہ نظر انداز کر دیتی بچّوں کے لیے۔ اُن کی خاطر۔ وہ ہنستی رہتی کہ اُسے اداس دیکھ کر وہ بھی اداس ہو جاتے تھے۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔ شانی بھائی اور نومی کی شادیاں ہو گئیں۔ وہ تعلیم ختم کر کے گھر واپس آئی تو نومی، ٹونی کالج میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن وہ اب بھی اُن کی ذرا ذرا سی فرمائشیں پوری کرتی تھی۔ اُن کے لاڈ اٹھاتی۔ حنا بھابھی اب بھی ہر وقت غصے میں رہتی تھیں اور سارا وقت کچھ نہ کچھ بولتی رہتیں۔ اب تو رافعہ بھابھی اور افشیں بھابھی بھی تھیں۔ رافعہ بھابھی کی زبان بہت تیز تھی شانی بھائی پہلے سے زیادہ کم گو ہو گئے تھے۔ وہ بولتی رہتیں اور وہ کتابوں میں سر گھسائے بیٹھے رہتے۔ البتہ افشیں بھابھی اور مانی بھائی کی خوب بنتی تھی۔ وہ دونوں اکثر شام کو گھومنے چلے جاتے تھے۔ یہاں آ کر زندگی محدود تو ہو گئی تھی لیکن پھر بھی اس نے خود کو مصروف کر لیا تھا۔ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کوئی تیر اس کا کلیجہ چھلنی کر دیتا لیکن نومی اور ٹونی اُس کے زخموں پر مرہم رکھتے۔

"آپ امی اور چچی کی باتوں کا خیال نہ کیا کریں۔"

"نہیں، میں تو خیال نہیں کرتی۔"

وہ اُن کا دل رکھنے کو اپنے زخم چھپا جاتی۔

حنا بھابی بے جا بچوں کو ڈانٹتیں تو نومی جواب دیتا۔

"آنٹی کی شہہ پر تمہیں جواب دیتا ہے۔"

رافعہ بھابھی سکھاتیں۔

اور حنا بھابھی کے تیر سیدھے اُس کے سینے میں آکر لگتے۔

"نومی! تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ مت جواب دیا کرو۔"

"آنٹی! بس آپ امی کی غلط حمایت نہ کیا کریں۔"

تب وہ بھابھی کو سمجھاتی۔

"بھابی پلیز جوان بچوں سے نرمی سے محبت سے بات کرنی چاہیے۔"

"تم نے ہی بگاڑا ہے انہیں۔"

اور وہ مجرم سی بن جاتی۔

پھر یکایک ہی رافعہ بھابی اُس پر مہربان ہو گئیں۔ پتا چلا وہ اپنے لاڈلے بھائی کا رشتہ لائی ہیں۔ اُس کے لیے اُس نے صاف صاف انکار کر دیا۔

"کیا خرابی ہے اُس میں؟"

حنا بھابی نے پوچھا۔

"کوئی خرابی نہیں کیا؟"

وہ حیرت سے انہیں تکنے لگی۔

"یہ عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرتے ہیں اور جھوٹ کس قدر بولتے ہیں۔ میں تو گھُٹ گھُٹ کر مر جاؤں۔"

اور مانی نے سنا تو کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے، اگر عینی کی مرضی نہیں ہے تو نہ سہی یوں بھی اماں اس کے لیے تو کوئی بہت ہی نفیس بندہ ہو، جو اسے سمجھ سکے۔"

"تو پھر ڈھونڈ لاؤ نا کوئی نفیس بندہ۔"

رافعہ بھابی گھنٹوں بول بول کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہیں۔ شانی بھیا بت بنے بیٹھے رہے۔ ایک بار بھی نہ کہا کہ میری چھوٹی سی نازک دل والی بہن پر اتنے تیر نہ برساؤ وہ کمرہ بند کر کے فرد بھائی کو یاد کر کے بہت روتی۔ آخر مانی کو ہی بولنا پڑا۔

"بس کر بلا بھابی اب۔"

اور پھر افشین بھابی ہمدرد بن کر اپنے ایک دور دراز کزن کا رشتہ لے آئیں۔

"کون خاران؟"

مانی نے سنا تو اُچھل پڑا۔

"وہ شرابی، آوارہ۔ ان پڑھ۔ تم، تم نے ایسا سوچا ہی کیوں؟"

"اے لو میں نے تو ہمدردی کی تھی۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ تمہاری بہن کے لیے کوئی شہزادہ آئے گا۔"

افشین کی تیز آواز اُس کے دل کو چیرتی چلی گئی اور وہ وہیں سے واپس اپنے کمرے میں پلٹ آئی۔

"کیا کہتی ہے وہ تم سے، کیا لگتی ہے دن تمہارا؟"

مانی کی غصیلی آواز جاتے جاتے اُس کے کانوں میں پڑی تھی۔

افشین سے مانی نے لو میرج کی تھی لیکن پھر بھی اُس کے لیے وہ بھی کبھی اُس سے اُلجھ پڑتے تھے۔ وہ روٹھ جاتیں تو پھر اُنہیں منا بھی لیتے آؤٹنگ کے لیے بھی لے جاتے لیکن اُس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ اُس کی حمایت تو کرتے تھے شانی بھائی کی طرح انہوں نے لب سی نہیں لیے تھے۔

پھر اُس روز شام کو تینوں برآمدے میں بیٹھ کر اونچا اونچا بولتی رہیں۔

"لو آج تک تو کسی نے پوچھا نہیں اور اب ہم جو رشتے لائے ہیں وہ پسند ہی نہیں آتے، مزاج ہی نہیں ملتے۔"

رافعہ بھابی کہہ رہی تھیں۔

اُس نے اُٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

"آپ کو کیا پتا رافعہ بھابی کہ کیسے کیسے ہاتھ میری طرف بڑھے تھے اور کن کن لوگوں نے۔ مگر اُس نے تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ اُس کا مشن تو کچھ اور تھا اور یہ کہ وہ اپنے فرد بھیا کا سر نہیں جھکانا چاہتی تھی۔

وہ احمد حسن جو اُن کی تنظیم کا صدر تھا۔

کتنی بار اُس نے مس نازگل سے کہا تھا۔

"وہ شخص بڑا خوش قسمت ہو گا جس کی رفیق عینی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ شخص میں ہی ہو جاؤں۔"

وہ آنکھوں میں امید لیے اُسے تکتا لیکن وہ نظر انداز کر جاتی۔

اور پھر ڈاکٹر انجم جو اُس سے بہت متاثر تھے میجر ناصر، جو اُس کے ممنون تھے۔

جن کی بوڑھی والدہ ہاسپٹل میں تھیں اور اُن کی چار بڑی بہوئیں اُن کی خبر تک نہ لیتی تھیں اور ایک روز یونہی وارڈ میں پھل تقسیم کرتے کرتے وہ اُن کے کمرے میں چلی گئی تھی اور پھر اُن کی تنہائی کے کرب کو محسوس کر کے بہت دیر تک اُن کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ اور پھر اکثر بھی وہ ہاسپٹل جاتی اُن کے پاس جاتی، اُن کے کنگھی کرتی اُن کے کپڑے تبدیل کرواتی، اُن کا بستر جھاڑتی اور، دیسے ہی ایک دن اُسے میجر ناصر ملے تھے اور بعد میں کئی بار تنظیم کے دفتر آئے تھے۔ اُس کا شکریہ ادا کیا تھا اور ا

گولڈن پاکٹ بکس کی فخریہ پیشکش

ناول

مزاحیہ

شعر و شاعری

نفسیات

تراجم

بچوں کا ادب

خلیل جبران

کشیدہ کاری

[illegible]

شفیع برادرز پوسٹ بکس ۵۸۶ کراچی۔۱

پرپوز کیا تھا

"نہیں میجر ناصر!"

"کیوں کیا آپ شادی نہیں کریں گی؟"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ شعبہ تو میرے والدین کا ہے۔"

"تو پھر میں آپ کے والدین سے ملوں۔"

"نہیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں فیملی سے باہر شادیاں نہیں ہوتیں۔"

اُس نے نظر بھر کر میجر ناصر کو دیکھا تک نہ تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ بہت نفیس اور بہت پیارا بندہ ہے۔

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔"

"نہیں پلیز، میں اپنی بھابیوں کی نظروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی سوری۔"

اُس نے اُنہیں ایک دم مایوس کر دیا تھا۔ فرو بھائی بھی تو نہیں تھے۔ وہ کس برتے پر اُنہیں امید دلاتی۔ لیکن کئی دن تک اُن کا مایوس چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے آتا رہا۔ اب بھی کبھی کبھی بھولے بھٹکے تنظیم کے دفتر سے ہوتا ہوا اُس کا کوئی خط آ جاتا تھا۔ وہ اب بھی اُس کے منتظر تھے۔

اور رافعہ بھابی کہتی تھیں کہ۔

اور اُس کے سر میں درد کی ایک لہر سی اُٹھی۔

عجیب سا درد تھا رگوں کو بل دیتا ہوا۔ اس سے پہلے ایسا درد کبھی نہیں ہوا تھا۔

سب کی باتوں کی طرح وہ اس درد کو بھی برداشت کر گئی۔ پتا نہیں کیوں سب کی زبانوں پر کانٹے اُگ آئے تھے۔

مانی ذرا اُس سے بات کر لیتے تو گھنٹوں افشین بھابی کا منہ سوجا رہتا۔ کبھی جو وہ اُس کے پاس آ کر بیٹھ جاتے تو وہ چھوٹے سے فراج کو بلا وجہ ہی پیٹ ڈالتیں۔

"مانی بھائی! شاید فراج آپ کے لیے رو رہا ہے۔"

وہ اپنے آنسو پی لیتی۔

"گڑیا! ہنسا بولا کرو، گھوما پھرا کرو، اتنی اداس، اتنی چُپ چُپ نہ رہا کرو۔"

مانی جاتے جاتے اُسے سمجھاتے اور اُن کی اس محبت پر اُس کا دل بھر بھر آتا۔

ماسی بختاں کی چھت گر گئی تو اُس نے چپکے سے اُنہیں پانچ سو روپے پکڑا دیے۔ افشین بھابی نے دیکھ لیا تو خوب واویلا مچایا۔

"پیسے کی قدر نہیں۔ بھائیوں کی کمائی لٹائی جا رہی ہے۔"

"ابھی تو ابھی تو اماں اور بابا ہیں اور وہ کسی کی محتاج نہیں۔ مانی اور شانی بھائی اب بھی اکثر بابا سے پیسے مانگ لیتے ہیں۔" تب بھی افشین بھابی ایسا کہہ رہی تھیں۔

وہ عنبرین کے پاس جا کر بہت روئی اور پھر عنبرین کے مشورے سے ہی اُس نے اُسی کے اسکول میں جاب کر لی اور مری چلی آئی مانی افسردہ سے تھے۔

"تمہیں سروس کی کیا ضرورت تھی گڑیا۔ شاید تم نے افشین کی بات کو مائنڈ کیا ہے۔"

"نہیں مانی بھائی! گھر میں میرا دل گھبراتا تھا بس وقت گزارنے کے لیے مجھے کوئی مصروفیت چاہیے ہی نا۔"

پھر وہ ہولے ہولے بہل گئی۔ مس ناز کے اور دوسرے دوستوں کے خط اُسے حوصلہ دیتے رہتے اور وہ ایک بار پھر پرانے راستوں پر چل پڑی تھی۔ اور اُس روز بھی وہ عنبرین کے ساتھ سینی ٹوریم گئی ہوئی تھی جب وہ اندوہناک خبر آئی تھی۔ مانی بھائی کا اسکوٹر سلپ ہو گیا تھا اور سامنے سے آنے والے ایک ٹرک نے اُن کی زندگی کا چراغ بجھا دیا تھا۔ وہ مانی بھائی جو اپنے جیب خرچ سے پیسے بچا کر اُس کے لیے چاک بار لاتے تھے۔ اور جن کے ساتھ اُس نے اماں سے چوری کالج گراؤنڈ میں گھنٹوں سائیکلنگ کی تھی اور جو اب بھی اکثر اُس کی ڈھال بن جاتے تھے اور اُس کے لیے افشین سے لڑ پڑتے تھے۔ اب کے اُسے چپ لگ گئی تھی۔ جیسے وہ ساری دنیا سے خفا ہو حتیٰ کہ خدا سے بھی اُس نے نمازیں پڑھنا چھوڑ دی تھیں اور خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا۔ لومی، لوٹی اُسے بلا بلا کر تھک جاتے لیکن وہ دروازہ نہ کھولتی۔

"تمہارا خدا سے جھگڑا ہے عینو! نماز پڑھا کرو۔"

اماں اُسے سمجھاتیں لیکن وہ ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہتی۔

"تیرا دُکھ مجھ سے بڑا تو نہیں ہے۔"

ایک روز انہوں نے اُسے سمجھایا۔

"وہ میرے بیٹے تھے۔"

ہاں واقعی اُس کا دُکھ اُن سے بڑا تو نہ تھا۔ انہوں نے انہیں جنم دیا تھا اُن کے لیے راتوں کو جاگی تھیں مگر شاید

اُس کے پاس حوصلے کی کمی تھی۔ وہ اس آزمائش پر پوری نہیں اُتر سکی تھی۔

"آپ صحیح کہتی ہیں اماں!"

اُس نے نگاہیں جھکا لیں تو اماں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ اور اُس کی خشک آنکھوں سے سیلاب بہہ نکلے۔ اور اُس روز مانی کے بعد پہلی بار وہ باہر آ کر افشین بھابی کے پاس بیٹھی تھی۔ اور روتے ہوئے فراج کو گود میں لینا چاہا تھا۔ لیکن افشین بھابی نے اُسے جھپٹ لیا۔

"رہنے دو۔"

"رونے دو نا اسے۔"

رافعہ بھابی نے جو شاید کسی بہت ہی اہم موضوع حنا بھابی سے بات کر رہی تھیں ڈسٹرب ہو کر کہا۔

"واہ شوہر تو مر گیا اب بچے کو بھی کھو دوں۔ حنا بھابی کو دیکھیں، کیسے اُن کے بچوں کو اپنا بنا لیا ہے۔ ماں کی تو فکر نہیں آنٹی کے لیے مرے جاتے ہیں۔"

افشین بھابی کو ذرا خیال نہ تھا کہ وہ پاس بیٹھی ہے۔

"میں تو کہتی ہوں بھابی! اب بھی وقت ہے لومی، لوٹی کو روک لو۔ کل کو تمہیں پوچھیں گے بھی نہیں اور۔"

اُس نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تو۔ میں تو صرف اُن محبتوں کا قرض ادا کر رہی ہوں جو فرو بھائی نے مجھے دی تھیں۔ اور بیٹے تو وہ آپ کے ہی ہیں آپ ہی کے رہیں گے۔"

اُس نے کہنا چاہا تھا لیکن لفظ اُس کے حلق میں پھنس گئے اور وہ چُپ چاپ وہاں سے اُٹھ آئی تھی۔

"یہ سب کیا تھا۔"

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا۔

اُس کے سمندر دل بھائیوں کی بیویوں کے دل اتنے چھوٹے کیوں تھے۔ وہ تاک تاک کر تیر چلاتیں اور کوئی نشانہ خالی نہ جاتا۔ افشین بھابی کو مانی کی جواں مرگی سے زیادہ اپنی کم عمری کا دُکھ تھا۔ اُن کے انشورنس اور پراویڈنٹ فنڈ کی فکر تھی، جائداد کی پریشانی تھی۔ حنا بھابی کو بھی سمجھاتیں کہ وہ بابا سے فرو بھائی کے حصے کی جائداد اپنے نام کروا لیں کیا پتا بابا کے آنکھیں بند کرتے ہی کل شانی بھائی مکر جائیں۔ رافعہ میں پوری جادوگری ہے اور بے چارے شانی تو اللہ میاں کی گائے ہیں۔

"یا اللہ یہ تیری دنیا کیسی ہے۔"

یہاں اتنی خود غرضی اتنی نفسا نفسی کیوں ہے۔

یہاں فرو بھائی اور مس ناز جیسے لوگ کم کیوں ہیں۔"

وہ زخم کھا کھا کر پتھر ہوتی جا رہی تھی۔ لومی اور لوٹی اُس کے پاس آ کر بیٹھتے تو وہ اُٹھ جاتی۔

"آنٹی!" لومی احتجاج کرتا۔

"ہم آپ کے پاس آتے تھے۔ ہم سے باتیں کریں، ہم آپ سے باتیں کرنے کو ترس گئے ہیں۔"

"اپنی امی کے پاس جاؤ۔ اُنہیں تمہاری ضرورت ہے۔ اُن سے باتیں کیا کرو۔ اُن کے پاس وقت گزارا کرو۔"

"مگر آپ کے پاس کیوں نہیں؟"

لومی بالکل فرو بھائی کی طرح اُس کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیتا۔

"پلیز آنٹی! پہلے جیسی بن جائیے نا۔ آپ تو ہمیں حوصلہ دیتی تھیں اب خود حوصلہ ہار بیٹھی ہیں۔ بابا جی اور ماں جی کا ہی خیال کریں۔"

وہ گھبرا کر اُس کی بانہیں اپنے گلے سے نکال دیتی کہ اگر حنا بھابی نے دیکھ لیا تو وہ کہیں گی کہ اُن کے بیٹوں کو اُن سے چھین رہی ہوں۔

"مجھے پتا ہے آپ کو امی کی کسی بات سے دُکھ پہنچا ہے۔"

لوٹی نے اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگا لیا۔

"نہیں میری جان کوئی بات نہیں۔"

مگر اُس رات خدا جانے لومی اور لوٹی نے حنا بھابی سے کیا کہا تھا کہ وہ رات گئے تک روتی رہیں اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر اُسے کوسنے دیتی رہیں۔

"خدایا! کیا محبت کرنا جرم ہے۔"

اُس نے سوچا اور خود کو پتھر کر لیا۔ اب اُسے کسی کے دکھ پریشان نہیں کرتے ___ کوئی بتاتا فلاں مر گیا تو وہ کہتی اچھا۔ عنبرین کہتی، مس شمشاد بالکل اکیلی ہیں۔ دنیا میں اُن کا کوئی نہیں ہے تو وہ کوئی تبصرہ نہ کرتی۔ ماسی بختاں اُس کے پاس آ کر بہو کے ظلم کا رونا روتی تو وہ چپ چاپ سنتی رہتی۔ بیٹے کی مار کے زخم دکھاتی تو مرہم نہ رکھتی۔ حنا بھابی، لومی، لوٹی کو بُرا بھلا کہتیں تو اُنہیں منع نہ کرتی۔ چھٹیوں میں گھر آتی تو کمرے میں گھسی رہتی۔ اور اسکول میں ہوتی تو

اکدل سے آگر ہوسٹل کے کمرے میں چپ چاپ لیٹ کر رسالے پڑھتی یا پھر فرو بھائی اور مانی بھائی کو یاد کر کے روتی۔

اُسے اپنے دکھ سے بڑا کسی کا دکھ نہ لگتا تھا۔ اُس نے سب سے رابطہ توڑ دیا تھا۔ مس نازگل سے، رازی سے مینا سے سب دوستوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اُسے لگتا تھا جیسے اُس کے چاروں طرف کانٹوں کی فصل اُگ آئی ہو۔ وہ ذرا سا اِدھر اُدھر ہوتی تو یہ کانٹے اُس کے جسم میں اُتر جائیں گے۔ وہ نہ تو جھک کر کسی کی آنکھ کے آنسو پونچھتی تھی اور نہ ہی کسی کی راہ کے کانٹے چُنتی تھی۔ اُس کا دل چوٹیں سہہ سہہ کر پتھر ہو گیا تھا۔

"ایک آدمی کا پتھر بن جانا بھی کتنا بڑا المیہ ہے۔"

کبھی کبھی وہ سوچتی۔

"اور اُس پر جتنا بھی رویا جائے کم ہے۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے گڑیا؟"

عنبرین پوچھتی۔

"کچھ تو بولا کرو۔"

"کیا بولوں؟" وہ کتاب اُٹھا لیتی۔

"اپنے ارد گرد لوگوں سے دلچسپی لو۔ کیا اب تمہیں بچوں سے، اڑتے ہوئے پرندوں سے نیلے آسمان سے کسی سے محبت نہیں رہی۔"

"شاید نہیں۔"

وہ اعتراف کرتی۔ اور کتابوں میں گم ہو جاتی۔ اُس کی واحد دوست کتابیں تھیں، یونہی دو سال بیت گئے۔ اور اور پھر اُس کے دل کے پتھر پر پہلی ضرب اُس دن پڑی جب مانی کی دوسری برسی تھی اور اُس کا دل بے حد دکھی ہو رہا تھا۔ وہ دو پیریڈ پہلے ہی مدر جوالس سے اجازت لے کر ہوسٹل آ رہی تھی کہ پائن۔۔۔ کے درختوں کے جھنڈ میں اُسے بیٹھے دیکھ کر وہ بالکل غیر ارادی طور پر رک گئی۔ کئی بار اُس نے اُسے یہاں خاموش بیٹھے دیکھا تھا۔ اور جب وہ گزرتی تھی تو وہ کھڑا ہو کر اُسے گڈ مارننگ ضرور کہتا۔ آج بھی اُسے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

"گڈ مارننگ مس نور!"

"گڈ مارننگ۔"

پہلی بار اُس نے اُس کا غور سے جائزہ لیا۔ اُس کی آنکھوں میں حزن تھا اور چہرے پر ملال کے رنگ۔ "ڈے اسکالر ہیں یا بورڈر؟"

"ڈے اسکالر۔"

"کیا بات ہے آپ کچھ پریشان لگتے ہیں۔"

"کچھ نہیں مس نور۔"

"نہیں کوئی بات تو ہے کیا گھر میں ابو نے کچھ کہ"

"نہیں۔"

اُس نے بیدردی سے ہونٹ کاٹے۔

"میرے ابو کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

"اوہ سوری۔"

وہ انجانے میں اُس کے زخموں کو چھیڑ بیٹھی تھی اب پشیمان سی کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اُسے نومی کی طرح لگا۔

"ابو یاد آ رہے ہیں۔"

"جی!"

اُس نے سر ہلا دیا۔ اُس کی آنکھوں میں دھند پھیل گئی تھی۔ بے اختیار اُس کا جی چاہا وہ اُس کے آنے والے آنسوؤں کو اپنی انگلی کی پوروں سے اور اُس سے کہے۔

"اچھے لڑکے! میں شرمندہ ہوں۔"

مگر الفاظ اُس کے حلق میں ہی پھنس گئے تھے گلٹی فیل کرنے لگی تھی۔

"آئی ایم سوری۔"

بمشکل اُس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ اُسے تسلی کے دو لفظ بھی نہ کہہ سکی تھی۔ عجیب سا اور بے چینی تھی جو اُس کے اندر اُتر آئی تھی۔ میں آ کر اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے بار بار اُس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اُسے نومی اور ٹونی یاد جنہیں کتنے دنوں سے اُس نے نظر انداز کر رکھا تھا۔ باقاعدگی سے اُسے خط لکھتے تھے، فون کرتے تھے تو دیتی تھی بات بھی کرتی تھی مگر مشینی انداز میں۔

اُسے فرباج کا خیال آیا جو ابھی اتنا چھوٹا یہ تک نہیں پتا تھا کہ وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم ہے۔

اُس کا دل چاہا وہ ان سب کو ہاتھ بڑھا کر لے، ٹونی کو نومی اور فرباج کو اور اس بچے کو جس میں حزن تھا اور چہرے پر ملال کے رنگ تھے نے انجانے میں ڈسٹرب کر دیا تھا۔ اور ان سب کو اپنی انگلیوں سے پونچھ لے اور ان سے اتنا پیار کرے اتنی بت کرے کہ وہ اس محرومی کا کرب بھول جائیں۔

"میرے خدا تو چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں سے اتنی اتنی شفیق محبتوں کے سائے کیوں چھین لیتا ہے۔"

اُس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اور اُس کے پتھر دل دراڑیں سی پڑ گئیں۔ اور چشمے پھوٹ پڑے۔ وہ پھوٹ ٹ کر رو دی۔ بہت دیر رونے کے بعد وہ اٹھی اور پھر عرصہ بعد اُس نے اُٹھ کر نماز پڑھی اور دعا کے لیے ہوئے ہاتھوں کے پیالے پر آنسو گرتے رہے۔

میرے خدایا مجھے معاف کر دینا کہ میرا ظرف چھوٹا تھا اور میں آزمائش کے قابل نہ تھی۔ میرے دعوے باطل تھے حوصلے ریت کی دیوار کہ ایک جھونکے سے ڈھے

اور اُسے یاد آیا کہ وہ فرو بھیا سے کہا کرتی تھی۔

"فرو بھائی ہم ایک چھوٹا سا ادارہ بنائیں گے جس میں ہم ان سارے بچوں کو رکھیں گے جن کا کوئی نہیں ہوتا۔ ہم سے نا آشنا ان بچوں سے محبت کریں گے اور محبت کرنا سکھا دیں گے۔

اور فرو بھائی ہم۔ میں اور آپ مل کر زندگی کے آخری لوگوں کے آنسو پونچھتے رہیں گے۔ اُن کے دکھوں کو گے اور راہ کے کانٹے چنیں گے یہ دیکھے اور سوچے کانٹے کن کی راہوں میں پڑے ہیں۔ چاہے ہماری پوریں زخم ہو جائیں مگر فرو بھائی ہم نہیں تھکیں گے ہم نہیں ہاریں گے۔"

لیکن اُس نے ہمت ہار دی تھی جب اُس کی اپنی ذات کی زد میں آئی تھی تو اُس کے قدم اُکھڑ گئے تھے۔ وہ کے اندر ہی ٹکل مار کر بیٹھ گئی تھی اور اُس نے طرح آنکھیں بند کر لی تھیں حالانکہ لوگوں کے دکھ تو دکھ سے کہیں زیادہ بڑے تھے جیسے اس معصوم سے کا دکھ۔

اور وہ ساری رات اُس کے لیے دکھی ہوتی رہی۔ صبح وہ آفس سے باہر آ رہی تھی تو وہ اُسے مل گیا۔ وہ کلاس روم میں جا رہا تھا۔ سر جھکائے، خاموش خاموش۔

"دھر آئیں۔"

اُس نے اشارے سے اُسے بلایا۔

"سوری اچھے لڑکے میں نے کل آپ کو ڈسٹرب کر دیا تھا۔"

"نہیں مس! کوئی بات نہیں، آپ کو کیا خبر تھی کہ۔"

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"چاند۔"

وہ ذرا سا شرمایا اور ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔

"یہ نام میرے ابو نے رکھا تھا۔"

"بہت پیارا نام ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ چاند ساری دنیا میں روشنی پھیلاتا ہے۔ آپ کے ابو کی بھی یہ خواہش ہو گی نا کہ اُن کا بیٹا چاند کی طرح چمکے۔"

"مگر میرا دل پڑھنے کو نہیں چاہتا۔"

"ارے کیوں۔ آپ اتنے کم حوصلہ ہیں چاند۔"

وہ بڑی نرمی اور محبت سے اُسے سمجھانے لگی۔

"موت اور یہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والے لوگوں کا دکھ یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔"

پھر۔ وہ اُسے نومی اور ٹونی کے متعلق بتانے لگی۔

"آپ کو تو ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے چاند۔ آپ اتنے بڑے ہیں اور وہ فرباج تو اتنا چھوٹا ہے۔"

"مگر مس! وہ تو بچے تھے نہیں جانتے کہ باپ کی محبت کیا ہوتی ہے۔ میں تو جانتا ہوں، میں نے اُن کی محبتوں کا ذائقہ چکھا ہے۔ اور میں یہ دکھ برداشت نہیں کر پا رہا مجھے ابو بے حد بے حساب یاد آتے ہیں۔"

حجت کرتا ہوا، وہ بالکل اُسے نومی کی طرح لگا۔

"ارے تم تو بالکل میرے نومی جیسے ہو چاند وہ بھی تمہاری طرح دلیلیں بہت دیتا ہے۔ حجتیں بہت کرتا ہے۔" اُس نے سوچا اور مسکرائی۔

"ٹھیک ہے! میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپ اپنے ابو کو بھلا دیں مگر آپ کے سامنے ابھی بہت عمر پڑی ہے۔ آپ نے آگے بڑھنا ہے، وہ سب کچھ بننا ہے جو آپ کے ابو آپ کو بنانا چاہتے تھے۔ ابھی تو پہلی منزل بھی آپ نے طے نہیں کی اور اگر آپ ابھی سے ہمت ہار بیٹھے تو آپ اپنے ابو کا خواب کیسے پورا کریں گے۔"

وہ ہولے ہولے نرم نرم لہجے میں اُسے سمجھاتی رہی اور اُس کا دل پگھل پگھل کر پانی ہوتا رہا۔

وہ کچھ اُلجھا اُلجھا سا کھڑا تھا۔

"کچھ پرابلم ہے آپ کو۔ پلیز مجھے بتائیں، میں جانتی ہوں

کہ جب کسی گھر میں کوئی ایسا حادثہ ہوتا ہے تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، کوئی معاشی پرابلم ہے۔“

”نہیں۔“ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”دیکھیں چاند! آپ مجھے اپنا دوست سمجھیں میں لومی کی طرح آپ کی بھی آنٹی ہوں۔ مجھے بتائیں ہو سکتا ہے میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔ اور اگر مدد نہ بھی کر سکی تو ہو سکتا ہے کچھ مشورہ دے دوں۔“

”کچھ نہیں مس بس وہ۔“

وہ تھوڑا سا جھجکا۔

”پتا نہیں کیوں امی مجھ سے ہر وقت خفا رہتی ہیں جب سے ابو کی ڈیتھ ہوئی ہے۔ تب سے اُن کا خیال ہے کہ میں بگڑ جاؤں گا۔“

اور حنا بھابی اُس کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ وہ بھی یونہی بچوں سے خفا ہو جاتی تھیں۔

تب اُس نے بڑے پیار سے اُسے سمجھایا۔

”صرف اتنی سی بات۔ آپ امی کا کہنا نہیں مانتے ہوں گے۔ اس لیے امی آپ سے خفا رہتی ہوں گی تو آپ امی کی بات مانا کریں، ماں تو بڑی پیاری شے ہوتی ہے۔ پھر آپ کو تو انہیں دلاسا دینا چاہیے کہ اُن پر غم کا اتنا بڑا پہاڑ آگرا ہے۔“

وہ ہولے ہولے اپنے مخصوص انداز میں اُسے سمجھاتی رہی اور وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

”اچھا چلیں، وعدہ کریں آئندہ آپ امی کی بات مانا کریں گے۔“

”یس مس۔“

”یوں نہیں ہاتھ آگے بڑھائیں۔“

عینی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

تھوڑا سا شرماتے ہوئے اُس نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”پکا وعدہ۔“

”یس مس پکا وعدہ۔“

”تھینک یو۔“

اور پھر اُس روز کے بعد وہ اکثر فری پریڈ میں اُسے بلا لیتی یا وہ خود ہی آجاتا۔ وہ اُس سے اُس کی امی کی ابو کی اور بہن کی باتیں کرتی اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں اُسے بتاتا۔ وہی باتیں جو بچے اس عمر میں کرتے ہیں۔ بے ضرر معصومانہ باتیں جیسے لومی اور ٹونی کرتے تھے۔

اُس کے دل کا پتھر تڑخ تڑخ کر ٹوٹ رہا تھا اور اُسے اپنے اردگرد کے لوگوں کے دُکھ محسوس ہونے لگے تھے۔

مس شمشاد کے لیے، جو اس دنیا میں بالکل تنہا تھیں، اور جان محمد کے لیے۔

وہ سوچنے لگی تھی اور اُسے احساس ہونے لگا تھا کہ اب بھی لوگوں کے دُکھ اُس کے دُکھ سے بڑے ہیں۔ اور خدا اپنے بندوں کو اُن کے ظرف سے زیادہ نہیں آزماتا اور یہ کہ اگر اُس کے اختیار میں ہے کہ وہ کسی کی راہ کے کانٹے چُن سکتی ہے تو اُسے پہلو تہی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ ایک بار پھر پہلے جیسی ہو رہی تھی۔ اور سب کے لیے اس وہ اُس کی شکرگزار تھی، ممنون تھی۔

”ارے تم تو میرے محسن ہو چاند! مگر تم ابھی اتنے چھوٹے ہو کہ اِسے سمجھ نہیں سکتے۔ اور میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔“

اُس روز اُس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا اور عنبرین نے اُسے اُس کی واپسی پر مبارکباد دی تھی۔

”مجھے خوشی ہے عینی کہ تم اِس تکلیف دہ غم کے حصار سے باہر نکل آئی ہو اور تم نے دوسروں کی تکلیفوں کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔“

”ہاں عینو! مکمل طور پر تو نہیں لیکن مجھے لگتا ہے جیسے میں پلٹ رہی ہوں اور یہ کہ میرے اوپر سے بے حسی کی تہہ پرت پرت کر کے اُتر رہی ہے۔ تم یقین کرو گی کہ کل میں ساری رات تمہاری مس شمشاد کے بارے میں سوچتی رہی اور مجھے اُن پر بے حد، بے حساب ترس آیا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو ترازو کے اُس پلڑے میں رکھا تو مجھے اپنا آپ بہت ہلکا لگا۔ میرے تو سب ہیں اماں، بابا، شانی بھائی، ٹونی، لومی اور تم سب میری اتنی اچھی اچھی دوست مجھے چاہنے والی مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ میں کتنی کم ظرف ہوں۔ اور اس سب کے لیے میں چاند کی شکرگزار ہوں۔“

”کون چاند؟“ عنبرین نے پوچھا۔

”اچھا وہ لڑکا جو لومی سے ملتا جلتا ہے۔ ارے تم نے کبھی غور کیا عینو اُس کی کہیں سے مشابہت ہے لومی سے اُس دن تمہارے ساتھ باتیں کرتا ہوا دور سے وہ مجھے بالکل لومی لگا تھا میں نے سمجھا کہ لومی آیا ہے۔“

تب اُس نے غور کیا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ لومی سے تو نہیں لیکن فرو بھائی سے مشابہت رکھتا ہے، شاید اُس کی مسکراہٹ اُن جیسی تھی یا پھر اُس کی پیشانی یا۔ یا۔ جو بھی تھا۔ فرو بھائی کے حوالے سے وہ ایک دم ہی اُس کے دل میں اُتر آیا۔

”کیا سوچنے لگی ہو عینی۔ اُس کی شکل ملتی ہے نا لومی سے؟“

”ہاں شاید۔“ وہ مسکرا دی

”سنو بیٹا! ہم کل جان محمد کے گھر جائیں گے۔ اُس کی بیوی بہت بیمار ہے نا۔ اُس کی مزاج پُرسی کریں گے۔ اور اُس کے بچوں کے لیے کچھ لے جائیں گے اور دیکھیں گے اُس کی بیوی کو کیا بیماری ہے۔ اور ہم اُس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔“

”رائٹ میڈم۔“

عنبرین نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہم تو ہمیشہ سے آپ کے غلام رہے ہیں۔ جو آپ کہیں سو سر تسلیم خم ہے۔“

مگر پھر صبح ہی صبح چاند نے یہ کیا کہہ دیا تھا۔ وہ پی۔ ٹی کے لیے جا رہے تھے کہ اُس نے اُسے روک لیا۔ شاید وہ اُسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اُس کے فرو بھائی سے مشابہت رکھتا ہے اور یہ کہ وہ اُسے بہت عزیز ہو گیا ہے مگر وہ گھبرا سا گیا۔

”سوری مس وہ میرے دوست دیکھ رہے ہیں اور وہ باتیں بنائیں گے میں پھر آپ سے آکر بات کروں گا۔“

”کیسی باتیں؟“

صاف ستھرے ذہن اور سادہ سے دل والی نورالعین مسکرا دی۔

”مس وہ، وہ کہتے ہیں کہ، تم اور مس ن۔“

وہ جھجک گیا تھا، رُک گیا تھا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

یہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا۔

you are like my own children chand.

(آپ میرے بچوں کی طرح ہیں چاند۔)

لفظ از خود بھیگ کر اس کے ہونٹوں سے نکلے۔

”اور میں۔ میں آپ کی ماں کی جگہ ہوں۔ آپ سے پورے تیرہ برس بڑی ہوں۔ I love you like a mother (میں ایک ماں کی طرح محبت کرتی ہوں آپ سے)

آپ۔ آپ آئندہ مجھ سے بات نہ کریں پلیز۔“

اور وہ اسے وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی تھی اور تب سے لے کر اب تک ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی کہ کیا اس نے غلطی کی تھی۔

نہیں یہ غلطی تو نہیں تھی۔

ایک بچے کو رفاقت اور محبت دینا۔

اس کے چھوٹے چھوٹے پرابلمز کو (جو پرابلمز ہرگز نہیں تھے) شیئر کرنا۔

نہیں یہ غلطی نہیں تھی۔

اور اس کا تو نظریہ تھا کہ اگر وہ کسی بات کو غلط نہیں سمجھتی تھی تو اس پر پچھتاتی بھی نہیں تھی پھر آج یہ پچھتاوے سے کیوں اس کے دل میں اتر آئے تھے۔ اس کے اندر تو کہیں کھوٹ نہ تھا۔ وہ بچہ سچ مچ اسے اپنے لومی کی طرح ہی لگتا تھا۔ پھر۔ شاید وہ کمزور ہو گئی ہے۔ اب وہ لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے حوصلے کا سورج گہنا گیا تھا۔ شاید ابھی وہ اندر سے پتھر ہی تھی۔ ابھی اس کا پتھر پوری طرح نہیں ٹوٹا تھا۔ اس لیے تو اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ اس بچے سے بات نہیں کرے گی مگر یہ کیسا کرب تھا جو اس کے دل کو چیرے جا رہا تھا۔

”اور یہ درد۔“

اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

درد کی ایک شدید لہر پھر اُٹھی تھی۔

یہ درد ضرور کسی دن اس کی جان لے لے گا۔ اس نے سر تھامے تھامے عنبرین کی طرف دیکھا۔ وہ شاید سو گئی تھی۔ تب اُٹھ کر اس نے لائٹ جلا دی اور اس ظالم درد کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح وہ اُٹھی تو اس کا سر بہت بوجھل ہو رہا تھا لیکن وہ عنبرین کے منع کرنے کے باوجود اسکول چلی آئی۔

تھکے تھکے بوجھل ذہن کے ساتھ وہ اسٹاف روم میں اکیلی بیٹھی کاپیاں چیک کر رہی تھی کہ نادم نادم سا وہ اندر چلا آیا۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں مس؟“

"نہیں۔"

اُس نے سر اٹھا کر ایک نظر اُسے دیکھا۔ خفا خفا سا اسے بالکل نومی کی طرح لگا۔

"والدین بچّوں سے ناراض نہیں ہوا کرتے۔"

"سوری مس! آپ نہ جانے کیا سمجھی تھیں وہ تو —"

"Mind relax جانے دو چاند۔"

"مس ۔ مس آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں مجھے آپ ی شفقت و محبت کی ضرورت ہے۔ آپ نے خود کہا تھا کہ ں نومی کی طرح تمہاری بھی آنٹی ہوں پھر —"

وہ چپ قلم ہاتھ میں تھامے اُسے تکتی رہی۔

"میرا اس میں کیا قصور ہے مس! اگر میرے دوستوں نے —"

"ہاں واقعی اس میں اس کا کیا قصور ہے۔"

اس نے سوچا اور اس کے دل سے کدورت کا غبار ھٹ گیا۔ اپنی طرف تکتا وہ اُسے بالکل نومی کی طرح لگا ور کیا وہ نومی سے منہ پھیر سکتی تھی۔ کیا وہ اسے دھتکار سکتی تھی۔ نہیں۔ اسے تو ابھی اس محبت کا قرض چکانا تھا جو جو فرو بھائی سے اُسے تھی اور ابھی تو وہ تو اس کا ذرہ بھر ھی ادا نہیں کر پائی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرا دی۔

"لیکن چاند مائی سن ایک بات یاد رکھنا جو رشتے حترم اور معتبر ہوتے ہیں انھیں دوستوں کی محفل میں موضوعِ سخن نہیں بنایا جاتا۔ اور پتا نہیں، مجھے اب آپ سے بات کرتی چاہیے یا نہیں۔ شاید میں نے غلطی کی ہے۔ مجھے اس بات کا خیال نہیں رہا کہ میری نظروں میں آپ بچے ہی سہی مگر You are young boy of class 10th پھر بھی آپ مجھے نومی اور ٹونی کی طرح ہی عزیز ہیں کبھی کوئی مسئلہ ہو تو بلا جھجک میرے پاس چلے آنا۔ مجھے اپنا دوست ہی سمجھنا۔ اور آپ جہاں کہیں بھی جائیں مجھے اپنی کامیابیوں کی خبر ضرور دینا مجھے خوشی ہو گی۔ اور میں آپ کے لیے دُعا کروں گی جیسے مائیں، بہنیں اور آنٹیاں دُعائیں کرتی ہیں۔"

"تھینک یو مس!"

وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا اور وہ کسی حد تک ریلیکس ہو گئی۔

"اصل میں قصور میرا اپنا ہی ہے۔"

اس نے سوچا۔

"چاند ہو یا اس کے دوست سب بچے ہی تو ہیں نا اور چودہ پندرہ برس کی عمر میں آدمی بڑا تو نہیں ہو جاتا نا۔ اور میں یونہی ہر بات کو زیادہ محسوس کرتی ہوں۔" وہ پھر سے سر جھکا کر کاپیاں چیک کرنے لگی۔ کسی حد تک مطمئن اور پُرسکون سی۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ وہی روزمرہ کی مصروفیات، وہی اسکول تھا۔ وہی بچّے تھے اور وہی ہوسٹل۔ وہی مس جانسن اور مس شمشاد تھیں اور مدر جوائنس تھیں۔ لیکن اس کی زندگی میں کہیں کوئی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ اسے لگتا جیسے وہ ٹوٹنے اور بننے کے عمل سے گزر رہی ہو۔

کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ ساری دنیا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے اور کسی سے کوئی ربط کوئی تعلق نہ رکھے اور چپ کی بکل مار کر بیٹھ جائے۔ کبوتر کی طرح اپنے اردگرد سے آنکھیں بند کر لے۔ اور سب سے ۔ ساری دنیا سے نفرت کر کے اُن سے اُن کی زیادتیوں کا بدلہ لے خوب خوب انھیں ستائے، تنگ کرے اور اُن کے راستوں کو کانٹوں سے بھر دے۔ اور جب اُن کے پاؤں زخمی ہو جائیں اور وہ درد سے چیخیں چلائیں تو وہ خوب زور زور سے قہقہے لگاتے ہنسے۔

اور کبھی اسے اپنی اس کمینی سوچ پر غصّہ آتا۔

اور اس کا دل ایک دم سب کی محبتوں سے بھر جاتا پھر وہ عنبرین کو ساتھ لے کر جان محمدؐ کے گھر جاتی اس کی بیوی کے لیے پھل اور دوائیاں خریدتی۔ اس کے بچّوں سے باتیں کرتی اور مس شمشاد کے پاس بیٹھ کر انھیں حوصلہ دلاتی۔ اپریشیٹ کرتی۔ مس جانسن کی کئی بار کی سُنی ہوئی کہانی سنتی اور اور انھیں تسلّی دیتی وہ شاید پرت پرت ٹوٹ رہی تھی بن رہی تھی۔ اس کی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ وہ اکثر چاند سے بھی اُلجھ پڑتی۔ اُسے کہہ دیتی کہ وہ آئندہ اس سے بات نہ کرے۔ پھر فوراً ہی اس سے سوری کر لیتی۔ کبھی وہ اس کے پاس سے سلام کیے بغیر گزر جاتا تو مارے دُکھ کے اس کی آنکھیں چلنے لگیں۔

"وہ مجھے اپنی آنٹی نہیں سمجھتا۔"

اُسے اُس پر غصّہ آنے لگتا اور پھر اگلے دن وہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر اس کے پاس سے گزر جاتی مگر اس پر بھی اس کا دل دُکھتا۔ وہ پریشان سی ہو جاتی۔ پھر وہ سوچتی رہتی کہ اُس نے خوامخواہ اُسے خفا کر دیا ہے۔ ناراض کر دیا ہے۔ اس کے اندر یوں رہ رہ کے درد اُٹھتا جیسے اس نے چاند کو نہیں فرو بھائی کو ناراض کر دیا ہو۔ حالانکہ فرو بھائی اس سے چودہ برس بڑے تھے اور وہ شاید اُس سے اتنا ہی چھوٹا تھا۔

وہ بالکل بچّوں کی طرح باتیں کرنے لگی تھی۔

"تم اتنی پریشان کیوں رہنے لگی ہو عینی؟"

ایک روز عنبرین نے پوچھا تب اس نے اپنا تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔

"شاید میں ٹوٹنے اور بننے کے عمل سے گزر رہی ہوں۔ تم نے کبھی خام مٹی سے کوئی چیز تخلیق کی ہے۔ بینا خام مٹی سے کوئی چیز بنانا بڑا آسان ہوتا ہے۔ لیکن پھر اُسے توڑ کر دوبارہ اسی میٹریل سے وہی شکل دوبارہ دینا بہت مشکل ہوتا ہے بینو۔ اور میں بھی اسی مشکل سے گزر رہی ہوں۔ اور مجھے یہ خوف مارے ڈالتا ہے کہ اس طرح بنائی ہوئی چیز میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خامی نظر آجاتی ہے۔ مجھ میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی خامی رہ گئی ہے۔ میں بھی اپنی سطح سے نیچے آ گئی ہوں۔"

"عینو پلیز فار گاڈ سیک مجھ سے ایسی علامتی گفتگو نہ کیا کرو۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں گڑیا کہ تو خوامخواہ ہلکان ہوتی رہتی ہے اور سارا قصور اس لڑکے چاند کا ہے میں نے —"

"نہیں پلیز، ایسی بات نہ کہنا۔ وہ مجھے اپنے نومی کی طرح ہی عزیز ہے۔ اور پھر اس نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ بس میں خود ہی۔"

"ایسا کرو عینی کچھ دنوں کے لیے گھر چلی جاؤ۔"

"گھر۔" اس نے دُکھی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"وہاں تو چھٹیاں کاٹنی بھی اُسے عذاب ہو جاتی ہیں اُف — وہ افشین بھابھی اور حنا بھابھی کی زہریلی نظریں جیسے وہی فرو بھائی اور مانی بھائی کی قاتل ہو — اور وہ رافعہ بھابھی کے کٹیلے جملے بظاہر ہمدرد لیکن اندر سے کاٹتے ہوئے۔

"بے چاری عینی!"

وہ ٹھنڈی آہ بھرتیں۔

"ارے ہم نے تو بہت چاہا کہ بے چاری کا گھر جائے مگر وہ مانی خدا انھیں جنّت نصیب کرے کے لیے کوئی بہت ہی اچھا بہت ہی نفیس بندہ ڈھ رہے اور اب اٹھائیس سال کی عمر میں بھلا کون گا۔ اے میں تو کہتی ہوں وہ منیر صاحب کتنے اچھے ہیں کیا ہوا جو چار بچّوں کے باپ ہیں اور وہ اپنا بھی تو ہے نا۔ بے چارہ بیوی کے مرنے کے بعد کیسی میں ہے۔"

"ہاں اور اپنی عینی کو تو یوں بھی خدمتِ خلق کا ہے۔" حنا بھابھی بھی زہر افشانی کرتیں۔

"گھر بھی بس جائے گا اور چھ بن ماں کے بچّوں سنبھال کر خدمتِ خلق مفت میں ہو جائے گی۔" اور سارے تیر چُپ چاپ اپنے اندر اُتار لیتی تھی۔

"ایسا کرو عینو! تم چھٹی لے کر لاہور چلی جاؤ۔ ناز گل کے پاس۔"

عنبرین نے اُسے خاموش دیکھ کر مشورہ دیا۔

"وہ تمہاری ضرور help (مدد) کریں گی۔ تمھیں اس کنفیوژن سے باہر لے آئیں گی۔"

لیکن وہ کہیں نہ گئی اور خود سے ہی جنگ کرتی ر اسے یقین تھا کہ ایک روز وہ جیت جائے گی۔ اور ا نے بہت حد تک خود کو سنبھال بھی لیا تھا۔ اور اپنے ارد دیکھنے لگی تھی۔ کبھی کبھی ہاف ٹائم میں وہ اور عنبرین ہوٹ چلی آتی تھیں۔ اس روز بھی وہ اپنے کمرے کی طرف جار تھی کہ عنبرین نے پائن کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"تم نے دیکھا اس لڑکی کو؟"

"ہاں بہت پیاری ہے۔"

"مونا نام ہے اس کا اور میں نے اکثر اسے یہاں ہا ٹائم میں اور کبھی کبھی کسی فری پیریڈ میں اس لڑکے بارو کے ساتھ اور کبھی فرخ کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا ہے

"تو بھئی کیا ہوا کلاس فیلو ہوں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یوں تنہائی میں اکیلے میں

وئی اچھی بات نہیں ہے اور تمھیں پتا ہے مدر جوائنس ہ بات بالکل پسند نہیں ہے۔"

"بچے ہیں دونوں۔ تم سمجھا دینا کہ اس طرح اکیلے کھڑے کر باتیں نہ کیا کریں۔"

"توبہ میں تو انھیں منہ ہی نہیں لگاتی۔ یہ ڈے اسکالر کے اور لڑکیاں تو انتہائی منہ پھٹ ہیں اور پھر یہ لڑکی تو اخہ ہے۔ پچھلے سال میں نے ان کی کلاس لی تھی۔ اور انتہائی فضول لڑکی ہے۔ تمھیں پتا ہے پچھلے سال اس نے ایک لڑکے نعیم کو اسکول سے نکلوا دیا تھا۔ میں تو سوچ ہی ہوں مدر جوائنس سے بات کردوں۔"

"نہیں پلیز نہیں ـــ میں اسے سمجھاؤں گی۔ اس عمر میں کیوں کو ان باتوں میں بڑا گلیمر اور تھرل لگتی ہے لیکن کوئی انھیں سمجھائے تو کوئی وجہ نہیں کہ نہ سمجھ سکیں۔ اگر ہم انھیں چھائی اور بُرائی کا ادراک نہیں دیں گے اس کا فرق نہیں تائیں گے تو انھیں کیسے پتا چلے گا۔ پلیز تم ابھی اس کی شکایت ت کرنا۔"

اور پھر اس نے ایک روز اسے بلا کر سمجھایا تو اس نے عدہ کر لیا کہ وہ آیندہ اس طرح کسی لڑکے سے بات نہیں رے گی۔

"آپ نے میری بات کو مائنڈ تو نہیں کیا؟"

"نہیں تو مس۔ یہ تو آپ کی اچھائی ہے اور میں تو شکر گزار ہوں آپ کی۔"

اور اس کا دل ایک دم خوشی سے بھر گیا۔ یہ عنبرین یونہی اس کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کر رہی تھی۔ کتنی سادہ دل اور معصوم لڑکی ہے اور اب اگر جو وہ مدر جوائنس سے اس کی شکایت کر دیتی تو خوامخواہ میں یہ لڑکی تو اُن کی ڈانٹ کے بعد باغی ہو جاتی جو کام محبت اور نرمی سے ہو جانے اس کے لیے مار یا سزا ضروری تو نہیں۔

اس نے عنبرین کو بتایا لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تاہم وہ دل میں بہت مطمئن تھی اور اس روز اُسے ضروری شاپنگ کرنی تھی۔ چھٹی ہوتے ہی وہ عنبرین کو بتانے کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکلی تو وہ اُسے مل گئی۔

"مس پلیز۔ میں آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔"

"کیا بات ہے مونا تم کچھ پریشان ہو؟"

"یس مس۔"

اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ نے اس روز کہا تھا نا کہ مجھے اپنی بڑی بہن سمجھو یا دوست۔"

"ہاں ہاں کیوں کیا بات ہے؟"

"مس وہ چاند ہے نا۔ مس وہ آپ کا بہت احترام کرتا ہے آپ کی بات مانتا ہے۔"

"ہاں شاید۔"

وہ سوچنے لگی کہ بھلا اسے کیا خبر کہ وہ میرا احترام کرتا ہے۔ آخر دونوں کلاس فیلو ہیں شاید کبھی چاند نے ذکر کیا ہو۔"

"مس وہ مجھے تنگ کرتا ہے۔ مس پلیز خدا کے لیے اُسے سمجھائیں۔ وہ وقت بے وقت فون کرتا ہے۔ میرا پیچھا کرتا ہے اور ـــ"

"نہیں مونا! وہ تو بہت اچھا لڑکا ہے۔"

اسے یقین نہیں آیا کہ چاند ـــ

"آپ کو نہیں پتا اوپر سے وہ معصوم شکل کا لگتا ہے۔ اندر سے بڑا گھنّا اور مکار ہے۔ ہارون کہتا ہے کہ وہ لڑکیوں پر جال پھینکتا ہے۔ معصوم بن کر۔ مس وہ روز مجھے فون کرتا ہے اور آج رات بھی وہ فون کرے گا۔ اس نے کہا تھا اور میرے پیا گھر پر ہیں اور وہ تو مجھے قتل کر دیں گے۔ میرا گلا گھونٹ دیں گے۔ پلیز مس میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ آپ اُسے منع کر دیں مجھے فون نہ کرے اور میرا پیچھا نہ کرے پلیز۔"

وہ التجا کرنے لگی۔

"اچھا پریشان نہ ہو میں اُسے سمجھاتی ہوں بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔"

اور وہ اُسے ڈھونڈتی ہوئی بوائز روم کی طرف آئی لیکن وہ جا چکا تھا۔ وہاں ہی اسے ایک طرف ہارون کھڑا نظر آیا جو شاید اپنی موٹر بائیک کو ٹھیک کر رہا تھا۔

"ہارون پلیز ذرا چاند سے کہیے گا آج ہی کسی وقت آکر مجھے مل لیں۔ بہت ضروری کام ہے۔"

ہارون کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آکر معدوم ہوگئی۔

"مس! وہ میری بات نہیں مانے گا لکھ دیں۔"

اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے چند لائنیں گھسیٹ دیں۔

ہارون کا مسکراتا چہرہ اُسے اپنے اوپر ہنستا دکھائی دیا۔ مگر مونا کی خاطر اُسے نظر انداز کر کے چلی آئی۔ شام کو اس کی توقع کے مطابق وہ آگیا۔ تو اس نے ساری بات بتا کر اُسے سمجھایا۔

"بُری بات ہے چاند! کسی کو تنگ کرنا۔"

"مگر آنٹی میں تو ـــ"

اس کا منہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔

"وہ تو خود ہی ـــ ٹھیک ہے میں اسے فون نہیں کروں گا۔"

اور وہ بے حد مطمئن سی ہو کر اخبار دیکھنے لگی۔

"تم نے یوں اُسے اپنے کمرے میں بُلا کر اچھا نہیں کیا اں۔ وہ مس شمشاد اور مس فرحانہ بڑی عجیب نظروں سے رہی تھیں۔"

"کیوں بھلا وہ بچہ ہی تو ہے نا۔"

"ٹھیک ہے لیکن تم جانتی ہو وہ لڑکی مونا ـــ over clever (ضرورت سے زیادہ چالاک) ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ تم اب بھی اٹھائیس سال کی عمر میں بھی وہی پندرہ سال والی عینی ہو۔ ہر ایک پر فوراً اعتبار کر لینے والی ہو۔"

"نہیں بینو! تم نہیں جانتیں وہ مونا سچ مچ بہت اپ سیٹ تھی اور کسی مدد کرنا اگر غلطی ہے تو مجھے اس غلطی پر رمندگی نہیں ہے۔"

اور عنبرین چپ ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ جب تک ٹ نہیں لگے گی وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرے گی اور ایسا تھا۔ اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ خاص طور پر اگلی صبح مونا نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور اس کی ایک دم سے ہلکی پھلکی ہوگئی تھی مگر یہ سکون بھی چند تھا۔ نسرین نے ایک دم اس کے سینے میں خنجر اُتار دیا تھا۔

نسرین بورڈر تھی اور اس شام اس کے کمرے میں ایک [illegible] کرنے آئی تھی۔ اور جب وہ پڑھ چکی تو اس [illegible] نظر اُسے دیکھا۔

"مس! وہ مونا نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ اُس [illegible] قتل کر دیں گے۔ اس کے مما پاپا تو فارن ہوتے ہیں اور وہ یہاں اپنی دادی کے پاس رہتی ہے۔ اور آپ کو نہیں پتا وہ تو خود ہی چاند کو فون کرتی ہے اور اس سے پہلے وہ ہارون کو اور پھر فرخ کو ـــ"

اُس نے آگے کچھ سُنا نہیں۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور نامعلوم درد کی لہریں سر میں ٹھونگے مارنے لگیں۔

"سوری نسرین! آپ جائیں اور جو کچھ سمجھنا ہے وہ کل کسی وقت سمجھ لیجیے گا۔"

"نہیں مس! اور تو کچھ نہیں سمجھنا۔ وہ مونا کہتی تھی کہ چاند کہتا ہے کہ مس نور مونا سے جیلس (حاسد) ہیں اور یہ کہ اس لیے انھوں نے چاند کو منع کیا ہے کہ وہ مونا کو فون نہ کیا کرے اور ـــ"

"پلیز نسرین! leave me alone (مجھے تنہا چھوڑ دو)۔"

وہ مزید کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے ہی وار اس کے لیے بہت تھے۔ ابھی تو وہ انہی کی شدت سے تڑپ رہی تھی اور نسرین خدا جانے اور کیا کیا کچھ بتانا چاہتی تھی۔ وہ ایک دم ہی بہت مضمحل ہوگئی تھی۔ درد ـــ شدید درد اسے بے حال کر رہا تھا۔ چار دن تک وہ اسکول نہ جا سکی۔ اس کا سر پھوڑے کی طرح دکھتا رہا اور اُسے لگتا جیسے کوئی اس کی رگوں کو بل دے رہا ہو۔ اور بس ابھی وہ ٹوٹ جائیں گی۔

تو عنبرین سچ کہتی تھی۔

درد کی شدت سے وہ تکیے پر سر پٹختی۔

اس لڑکی مونا نے اس کے ساتھ ڈرامہ کیا تھا۔ اُسے بے وقوف بنایا تھا۔ اس کے خلوص کی توہین کی تھی مگر کیوں کیا ملا تھا اُسے کس لیے۔

اور چاند نے۔

چاند نے جسے اس نے لومی کی طرح جانا۔

اسی کی طرح چاہا تھا۔

اور جو اس کے فرد بھائی سے مشابہت رکھتا تھا۔ اور اُسے لگتا تھا جیسے فرد بھائی نے دوسرا جنم لیا ہو۔ اور جیسے پہلے جنم میں وہ بڑے تھے اور انھوں نے اس کے ناز اٹھائے تھے تو اب وہ بڑی تھی تو وہ اُن محبتوں کا قرض چکا رہی تھی۔ اُسے چاہ کر اس سے محبت کر کے۔

اور اس چاند نے۔

اسی کی محبت کا یہ صلہ دیا تھا۔

اس کے بارے میں اتنی چھوٹی، اتنی معمولی باتیں کی تھیں۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا۔

اوہ میرے خدا یہ لوگ کند چھری سے کیوں ذبح کرتے ہیں۔ ایک ہی بار تیز دھار آلے سے وار کیوں نہیں کرتے۔

اور یہ لڑکی مونا۔

اسے نمرین کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یقین نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور جب وہ اسکول گئی تو گیٹ پر ہی اُسے مونا مل گئی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بڑی تشویش سے پوچھ رہی تھی۔

وہ اس سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کوئی گلہ شکوہ نہیں لیکن بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

"میں آپ سے یہ تو نہیں کہوں گی مونا بی بی! کہ آپ نے مجھے بے وقوف کیوں بنایا کیونکہ یہ آپ کی عمر ہے ایسی باتوں کی، ہاں البتہ اتنی درخواست ضرور کروں گی کہ کسی کو یہ مت بتانا کہ تم نے مس نور کو کس طرح بے وقوف بنایا تھا ممکن ہے کل کوئی بچی واقعی مدد کی مستحق ہو اور کوئی محض اس لیے اس کی مدد نہ کرے کہ وہ اُسے بے وقوف بنا رہی ہے۔"

"مس پلیز آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں —"

"سوری۔"

اس نے اُسے بات مکمل نہ کرنے دی اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

کیا ایسے معصوم چہروں کے پیچھے بھی فریبی چہرے چھپے ہوتے ہیں۔

"اگرچہ میری بات آپ کو اچھی نہیں لگے گی۔ تاہم میں یہ کہوں گی کہ یہ عمر بڑی نادان ہوتی ہے۔ اس عمر میں چیزیں بڑی رنگین نظر آتی ہیں۔ بڑا گلیمر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جو کھیل آپ کھیل رہی ہیں۔ وہ آگ کا کھیل ہے۔ شعلے آپ کے دامن تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

"مس پلیز، میری بات تو سُنیں آپ —"

لیکن وہ اس کی بات سُنے بغیر آگے بڑھ گئی۔

وہ ایک دم سے بہت ہرٹ ہوئی تھی۔ سارا وقت چُپ لیٹی کچھ نہ کچھ سوچتی رہی۔

"کیا بات ہے عینو! تم بہت کمزور ہوتی جا رہی ہو"

عنبرین نے ایک دن پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"تم کچھ بتاتی کیوں نہیں ہو۔"

"تمہارے ہاتھ میں کبھی کانٹا چبھا ہے بینی۔ چھوٹا سا کانٹا جو نکلے نہ لیکن مسلسل اٹکتا رہے۔ بس میرے دل میں بھی ایک کانٹا سا چُبھ گیا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن اٹکتا رہتا ہے۔ اذیت دیتا رہتا ہے۔"

اس نے افسردگی سے کہا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے عینی صاف صاف بتاؤ نا۔"

"بابا! مجھے کچھ نہیں ہوا بس تمہیں وہم ہو گیا ہے۔"

وہ عجیب تذبذب میں تھی ممکن ہے نمرین نے جھوٹ بولا ہو۔ مونا نے اُسے بے وقوف نہ بنایا ہو۔ چا نے اس کے متعلق ایسی باتیں نہ کی ہوں۔ اس کے خلا کی یوں توہین نہ کی ہو۔ آخر چاند نے خود ہی تو اس سے کہا تھا کہ وہ اسے اپنی آنٹی ہی سمجھتا ہے اور — اور یہ کہ اس نے تو خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ اس کو ایک اتنی اچھی او محبت کرنے والی آنٹی مل گئی ہیں۔ پھر۔ پھر — اس

"اچھا تو پھر چلو ذرا دلیر خان کے کیبن تک۔ میر شال کو کیڑا لگ گیا ہے۔ پیور اون تھی۔ انڈیا کی ا خوب صورت شال تھی۔ دو تین سوراخ ہو گئے ہیں۔ ر کروا لیتے ہیں۔"

"اچھا۔"

وہ محض اس کی خاطر اُٹھ بیٹھی۔

دلیر خان کا کیبن ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھا۔ ج جگہ سے سوراخ شدہ لوئی کو اچھی طرح لپیٹے وہ سر جھکا کسی کی قیمتی شال رفو کر رہا تھا۔ وہ اس خوب صورتی رفو کرتا تھا کہ پتا تک نہ چلتا تھا۔ ایک بار اس نے بابا کی لال اونی چادر رفو کروائی تھی۔ عنبرین اُسے شال کے سوراخ دکھانے لگی اور وہ اس کی لوئی کو د لگی جس میں بیسیوں سوراخ تھے۔

"دلیر خان چاچا تم دوسروں کے کپڑوں پر رفو کر ہو تو اپنی اس لوئی کو بھی کیوں نہیں رفو کر لیتے۔"

دلیر خان نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور ہولے سے

دیا۔ عجیب سی ہنسی تھی جس میں سینکڑوں جواب پوشیدہ تھے۔ ٹیلے سے اترتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ آخر اس ہنسی سے وہ کیا مطلب نکالے۔ دلیر خان نے تو کوئی جواب ہی نہیں دیا تھا۔

"اور کیا یہ بھی المیہ نہیں ہے بینو کہ ایک رفوگر کی اپنی چادر تار تار ہو اور —"

بات کرتے کرتے اچانک ہی اس کی نگاہ پائن کے جھنڈ کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ دونوں اُن کی طرف پیٹھ کیے کھڑے تھے — چاند اور مونا۔

تو کیا وہ دونوں ابھی تک گھر نہیں گئے۔

اس نے سوچا اور ایک قدم اُن کی طرف بڑھایا لیکن سنسناتے تیروں نے اس کے اٹھتے قدم کو وہیں روک دیا۔

"تم نے مس نور کو خوب بے وقوف بنایا۔"

چاند کہہ رہا تھا۔

"ہاں!" وہ ہنسی۔

"ایک بار تو میں حیران ہی رہ گیا کہ یہ مس نور کیا کہہ رہی ہیں اور اُن کو کیسے پتا کہ ہم دونوں — اور میں تو سمجھا تھا شاید تم نے سچ ہی کہا ہو تمہارے پپا۔"

"دراصل انھیں نصیحتیں کرنے کا بہت شوق ہے نا تو میں نے سوچا۔ وہ ذرا تمہیں نصیحت وغیرہ کر کے شوق پورا کر لیں۔ آخر بے چاری اس عمر میں اور کیا کریں۔ اب خود تو کوئی انھیں فون کرنے سے رہا۔ لہٰذا دوسروں کو منع کرتی پھرتی ہیں۔ خواہ مخواہ خدائی فوجدار بنی پھرتی ہیں۔ ہارون سے نہ ملو، اسد سے بات نہ کرو، چاند کو فون نہ کرو۔"

اس کے لہجے میں کتنی نفرت تھی۔

"نہیں میرے خدا۔"

اس نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور اس کی ٹانگوں سے جیسے جان نکلنے لگی۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

"عینی — عینی گڑیا۔"

عنبرین نے اُسے بے قراری سے پکارا۔

"کیا ہوا؟"

اس نے جیسے عنبرین کی آواز سُنی ہی نہیں وہ ساکت نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھی جو پیچھے دیکھے بنا آگے بڑھ گئے تھے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہنستے مسکراتے۔ پائن کے پتے تیز ہوا سے ہل رہے تھے۔ درد ناقابلِ برداشت درد اس کی رگوں کو توڑنے لگا۔ ایسا درد اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

ہوا کے چرکے تو نہ جانے میں کب سے سہہ رہا ہوں مگر یہ چرکا تو سارے چرکوں سے سخت تر ہے۔ ہوا سے کہنا۔ خدارا اتنی تیز نہ آئے۔

"عینی — عینی۔"

عنبرین کی آواز اسے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ اور لہو اس کے وجود میں پھیلتا جا رہا تھا۔

تم بھی — تم بھی چاند۔

میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا اور میں نے تمہارے ساتھ کیا بُرائی کی تھی چاند — اور مونا تم —

"عینی کیا ہوا۔ ہوش کرو۔"

اس نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

"تم — تم چلی جاؤ۔ یہاں سے مجھے تمہاری ہمدردی، تمہاری محبت یا دوستی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

"مگر مجھے تو تمہاری ضرورت ہے عینی! کیا اچانک درد ہو رہا ہے۔"

اس نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور دلیر خان کی سوراخ شدہ لوئی اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اور اُسے لگا جیسے خود اس کا سارا دامن تار تار ہو۔

I hate you two chand and، مجھے تم سے

محمود خاور کی لکھی ہوئی بچوں کی عمران سیریز کا
ہنگامہ نمبر
عمران کا ہنگامہ
بچوں کی عمران سیریز کا ہنگامہ نمبر ایک یادگار نمبر ہے
دوستو اگر یہ نہ پڑھا تو کچھ نہ پڑھا
فوراً حاصل کریں ورنہ پھر نہ ملے گا
رنگا رنگ کتاب گھر [illegible] کراچی [illegible] ۲۱۶۳۹۱

mona you two نفرت ہے مونا اور چاند)

اس نے زور سے مُٹھیاں بھینچیں اور کھولیں۔

"زندگی میں کبھی کسی سے نفرت نہ کرنا"۔

فرو بھائی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"بُرے سے بُرے آدمی سے بھی نہیں کہ اپنی بُرائی کے لیے تنہا وہ خود ذمّہ دار نہیں ہوتا"۔

"مگر فرو بھائی!" وہ سسکی۔

"لوگ تو ہم سے نفرت کرتے ہیں"۔

"لیکن تم اُن سے محبّت کرو۔ کبھی نہ کبھی تو وہ تمھارے پھولوں کی قدر کریں گے"۔

مگر انھوں نے تو اپنے ہاتھوں میں نظر نہ آنے والے بھالے چُھپا رکھے ہیں اور ــــ

اگر تم اُن کے تیروں کے جواب میں خود بھی تیر برسانے لگو تو پھر ان میں اور تم میں کیا فرق رہ جائے گا۔

"بلا سے کوئی فرق نہ رہے مگر دل کو اور روح کو تو تسکین مل جائے گی، نا"۔

"عینی، یہ تو کہہ رہی ہے تیرا دل تو بڑا غنی تھا بڑی وسعت تھی اس میں"۔

فرو بھائی نے شکوہ کیا تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں

"فرو بھائی مجھے بڑے زخم لگے ہیں اور میرا سارا بدن دریدہ ہے۔ لہو لہو ہے"۔

"عینی۔ عینی پلیز یہ تم راہ میں ہی بیٹھ گئیں۔ تھوڑی سی ہمت کرو۔ اٹھو۔ میں کمرے میں جا کر ڈاکٹر کو بلواتی ہوں"۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں بس اک ذرا سا درد ہے"۔

اس نے یونہی گھٹنے پر سر رکھے رکھے کہا۔

اور دلیر خان اپنی دریدہ لوئی کے باوجود کتنی مہارت اور نفاست سے لوگوں کے کپڑوں کو رفو کرتا ہے۔ اور کیا ہوا جو اس کا بدن دریدہ ہے اور وہ زخم زخم ہے۔ کیا وہ دوسروں کے زخموں پر مرہم نہیں رکھ سکتی اور کیا ہوا جو چاند اور مونا جیسے لوگ اس کے چہرے پر تھپڑ مارتے ہیں۔

وہ اتنی کمزور تو نہیں تھی۔ اُسے لگا جیسے اس کا دل ایک دم وسیع ہو گیا ہو۔ اس نے ایک دم ہی اپنے اندر بڑی تقویت محسوس کی۔ جیسے فرو بھائی اس کے ساتھ کھڑے ہوں۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کو۔

اور ہمت کر کے کھڑی ہو گئی۔

اور میں نے تمھیں معاف کیا۔

مونا اور چاند تم دونوں کو۔ اپنے دل کا خون معاف کیا۔

اور وہ تمام زخم جو تم نے لگائے۔

اور وہ تمام دکھ و کرب جو میں نے جھیلا۔ وہ سب اذیّت جو میں نے برداشت کی۔

معاف کی۔ اور ــ اور یہ کہ میں تم سے نفرت نہیں کرتی۔

مجھے تم دونوں سے محبّت ہے اپنے بچّوں کی طرح۔

"عینو تو اپنا علاج کیوں نہیں کراتی؟"

عنبرین نے روہانسی آواز میں کہا۔

"کل ہی" اس نے ذرا سا توقّف کیا۔

"کل چلیں گے عینی اسلام آباد کمپلیکس میں اور جان محمد کی بیوی کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ یہاں ڈاکٹروں کو اس کی بیماری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے نا۔ اور میں تمھیں غصّہ سے بولی تھی نا اس کے لیے سوری"۔

اور اس نے قدم آگے بڑھایا بڑے اعتماد اور یقین سے۔ اگرچہ دلیر خان کی لوئی کی طرح اس کی چادر میں بھی بے شمار سوراخ تھے لیکن اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح خوبصورتی نفاست اور مہارت سے دوسروں کے زخموں کو رفو کر سکتی ہے۔ کہ ایک بار پھر وہ وہی نور العین تھی جسے رفو کرنے کا ہنر آتا تھا اور محبّت جس کا مذہب تھا ــــ اور وہ عنبرین کے ساتھ بڑے اعتماد سے ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

مجھے یقین ہے جب روزِ محشر سوال و جواب ہوں گے تو میں کہہ سکوں گی کہ اے اللہ میں نے بھی حضرت ابراہیم بن ادہم کی طرح تیرے بندوں سے محبّت کی ہے۔ بے حد، بے حساب، بلا تفریق اور اس کی ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں امید کی روشنی۔

◆

دو کناروں کا سنگم

رخ چودھری

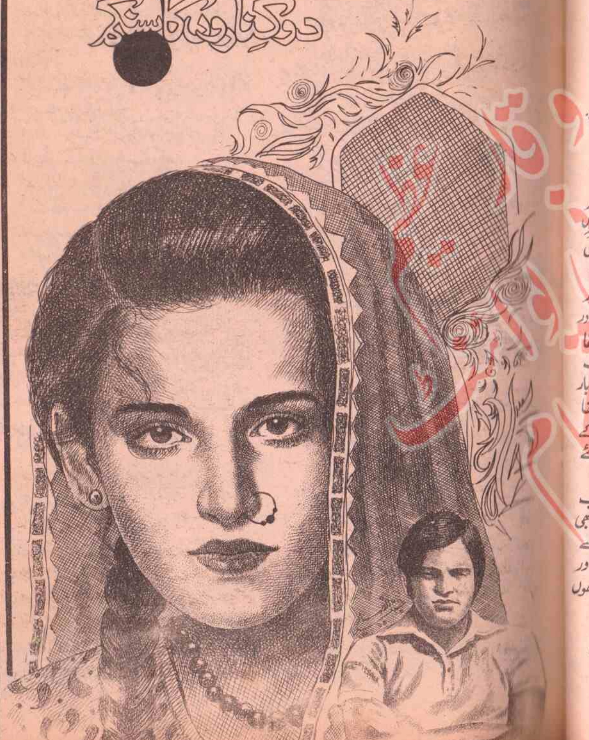

"نانو — نانو جانی! دونی پھر درخت پر چڑھی ہوئی ہے اور کیریاں توڑ توڑ کر ڈھیر لگا دیا ہے۔ دیکھیے نانو —! جلدی سے اٹھ کر دیکھیے، اب وہ جامن کے پیڑ پر چھلانگ مار گئی ہے۔"

بوبی رننگ کمینٹری کرتا ہوا بول رہا تھا۔

"ہائے کتنا کیوٹ نام رکھا ہے آپ نے اپنی بندریا کا، میں بھی دیکھوں گا۔"

"اور اماں جان! میں بھی دیکھوں گی ان کی بندریا۔"

یاسر اور سمیرا نے بندریا کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جس کا نام دونی تھا۔

"ارے چپکے بیٹھے رہو کم بختو —، یہ بہت بری طرح کاٹتی ہے۔" اماں نے دونوں کو ڈرایا۔

"دونی — بندریا کا نہیں میری نواسی کا نام ہے۔"

ذکیہ بیگم نے گھور کر ان سب کو دیکھا۔

"دونی — دونیا!" بوبی ڈرائنگ روم ہی سے چلّایا۔

"مت بلاؤ اسے، بات کر لینے دو۔"

ذکیہ بیگم نے اسے ٹوکا۔

"نہیں نانو جانی! دونی کل کہہ رہی تھی کہ چڑیا گھر چلیں گے بھلا اب چڑیا گھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ سب تو یہاں موجود ہیں۔"

بوبی نے اِن سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اماں جان! اس لڑکے نے ہمیں جانور کہہ دیا۔" سمیرا ٹھنکی۔

"اے اپنے رشتہ داروں کو پہچان لیا گدھے تے —"

اماں جان بھی حساب بے باق کرنا جانتی تھیں۔

"آداب خالہ جان!"

بوبی بھی اپنے نام کا ایک تھا جیسے ہی اماں نے گدھا کہا اس نے ان کو خالہ جان کہہ دیا۔

"اے لڑکے میرے منہ مت لگنا۔"

اماں جان تیز تیز منہ چلاتے ہوئے بولیں۔

"کیوں اُدھار مانگ کر لائی ہیں کیا —؟"

"اے موا اِتنا سا لڑکا اور گز بھر کی زبان۔"

"چھوڑیے بھی خالہ بی! آپ تو بچوں کے ساتھ بچہ ہو جاتی ہیں۔ کام کی بات کریں۔ میرے پاس وقت بھی کم ہے۔ جی تو میڈم بات ہو رہی تھی کچھ شرائط کی۔"

"پہلی یہ شرط ہے ہماری کہ مکان کرائے پر نہیں ملے گا۔"

دونیا سیدھی وجاہت کے سامنے جا کر رُک گئی۔

"سیمی! ہمارا اندازہ درست تھا ناں ان کے بارے میں۔"

یاسر نے دونیا کو دیکھتے ہوئے کہا تو سیمی نے بھی تائید کی۔

"آپ لوگ ہمارا گھر کرائے پر لینے آئے ہیں؟"

دونیا نے براہ راست وجاہت سے پوچھا۔

"جی بد قسمتی سے۔" وجاہت نے منہ بنا کر کہا۔

"اچھا تو جائیے خوش قسمتی کہیں اور جا کر آزمائیے۔"

دونیا تو فوراً لڑنے پر تیار ہو جاتی۔

"دونی! تم ادھر بیٹھو۔ ہاں بیٹا! تم مجھ سے بات کرو۔"

ذکیہ بیگم نے دونیا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"نانو! یہ چاروں اس پنجرے میں رہ جائیں گے۔" دونیا نے آنکھیں پھیلا کر ان کو دیکھا۔

"اگر آپ تینوں اس ڈربے میں رہ سکتے ہیں تو ہم چاروں بھی اس پنجرے میں گزارہ کر لیں گے۔"

"اچھا جی، آپ بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔" دونیا نے یاسر کو دیکھا۔

"جی پوری دو گز لمبی۔ یہ دیکھیں۔"

یاسر نے لمبی سی زبان باہر نکالی۔

"یاسر! اندر کرو زبان، یہ کیا بچکانہ حرکت ہے اور سیدھے ہو کر بیٹھو۔"

وجاہت کو غصہ تو دونیا پر بھی آ رہا تھا مگر وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔

"ہاں بیٹا! تم لوگ جب چاہو سامان لے آؤ۔ کرایہ وغیرہ تو بعد میں طے کر لیا جائے گا۔"

ذکیہ بیگم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نانو جان! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

ذکیہ بیگم چونک کر دونیا کو دیکھنے لگیں۔

"نانو جانی! آپ نے ان کو مکان دے دیا۔ کیا خبر کوئی اٹھائی گیرے ہوں۔ کل کلاں کو ہم سو رہے ہوں۔ یہ پورا گروپ کا گروپ ہمارا قیمتی ساز و سامان سمیٹیں اور چل دیں۔"

"ارے ہٹو لڑکی!"

ذکیہ بیگم کو وجاہت کی شرافت پر بہت اعتبار تھا ورنہ خالہ بی سمیت تو قافلہ واقعی کچھ گڑبڑ تھا۔

آپ کبھی کیوں نہیں نانو جانی۔ یہ بھی چال ہوتی ہے جیسے وں کی کہ ایک بندہ سوبر بنا رہتا ہے اور سارے دوسرے غلط سلط ہوتے ہیں۔ آپ نہیں جانتیں نانو ابھی رات ہی نے ناول میں سیم (SAME) ایسی ہی کہانی پڑھی تھی۔ نانو میری بات ورنہ —"

وہ بڑی رازداری سے بتا رہی تھی اور ان سب کو مشکوک سے دیکھ رہی تھی۔

"پھر۔ پھر تم نے جاسوسی ناول پڑھا۔؟"

ذکیہ بیگم نے سختی سے اس کو جاسوسی ناول پڑھنے سے کیا ہوا تھا۔

"نانو! مجھے وہ ناول اچھے نہیں لگتے کہ ایک سین میں تو دشمن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں دوسرے میں ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھا رہے ہوتے ہیں

میں نے تمہیں ہر قسم کے ناول پڑھنے سے منع کیا ہوا ہے۔"

"بھئی گولی ماریے ناولوں کو۔"

"تو میڈم ہمیں اجازت ہے۔ ہم سامان لے آئیں۔"

وجاہت سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکی اپنی چھوٹی سی پونی کو ہلاتی رہی ہے۔

"ارے واہ۔ خواہ مخواہ لے آئیں۔ پتا بھی ہے ہم تینوں ہیں، کیا خبر آپ ہمیں لُوٹ کر چلے جائیں۔"

اب وہ براہ راست وجاہت سے مخاطب تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ محترمہ؟"

وجاہت نے اس گڑبڑ سی لڑکی کو دیکھا۔

"اتنے بھولے نہ بنیے جناب! میں رات ہی ناول میں سب ہوں۔ اس میں ایسے ہی ہوتا ہے کہ پہلے تو مکان لینے آتے ہیں۔ پھر — پھر —"

"دونیا! جاؤ اپنے کمرے میں اور جاسوسی ناول کو ہاتھ لگانا۔ وجاہت میاں! آپ کو اجازت ہے۔"

ذکیہ بیگم نے دونیا کو ٹوک دیا۔

"نانو تو بس ہماری۔"

"چھلاوا —"

دونیا نے اس آواز پر دیکھا تو یاسر اور سمیرا ہنس رہے

"میری نانو کو چھلاوا کس نے کہا ہے؟"

وہ ان دونوں کی طرف پلٹی۔

"ان کو تھوڑی کہا ہے۔" یاسر کھسیانا سا ہو گیا۔

"تو — تو کس کو کہا ہے؟" وہ غرائی۔

"ظاہر ہے کہ آپ کے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟"

"سمی!" وجاہت نے گھور کر سمیرا کو دیکھا۔

"یہ کیا ہیں؟"

دونیا نے وجاہت کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"انسان ہیں۔" بوبی مسکرایا۔

"کون کہتا ہے؟"

"دونیا اور بوبی! چلو اپنے اپنے کمرے میں۔"

ذکیہ بیگم نے دونوں کو ڈانٹا۔

"اچھا جی! ویسے آپ کان کھول کر سن رکھیں، میں آپ کو آپ کے مکروہ عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔" وہ وجاہت کو آنکھیں دکھاتی ہوئی بولی۔

"دونی —!" ذکیہ بیگم نے اسے تنبیہہ کی۔

"اچھا جی جا رہی ہوں۔" وہ ان چاروں کو گھورتی ہوئی آگے بڑھی۔

"اور سنیے محترم! یہ ردّی وہاں ہی پھینک آئیے گا۔ یہاں جگہ کم ہو گی۔"

وہ جاتے جاتے مڑی اور خالہ بی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اے نوج! مجھے ردّی کہہ رہی ہو۔"

خالہ بی نے چشمے کے پیچھے سے دونیا کو گھورا۔

"شکر کیجیے، کوڑا نہیں کہہ دیا۔"

وہ احسان جتاتی ہوئی بولی۔

"اے لڑکی —! تمہاری زبان ہے کہ —"

"خالہ بی! یہ آپ کو دوسروں کی زبان کی پیمائش کا اتنا شوق کیوں ہے؟" بوبی بھی تیر کھایا ہوا تھا چڑ کر بولا۔

"ارے بہن! آپ بھی لگتا ہے ذہنی اعتبار سے بچوں کے برابر ہیں۔ آؤ وجاہت بیٹے! میں تمہیں گھر دکھا دوں۔"

پھر سب وہیں رہے۔ ذکیہ بیگم اور وجاہت باہر نکل گئے۔

"نانو کو بھی بس جانور پالنے کا بہت شوق ہے۔"

دونیا نے ان لوگوں کو دیکھ کر منہ بنایا۔ ●

"جی ہاں۔ میں بھی آپ سے متفق ہوں۔ آپ کی نانی جان کو واقعی جانور پالنے کا بہت شوق ہے۔ اور اس سلسلے

میں ان کا ذوق بُرا نہیں۔"

یاسر نے دونیا اور بوبی کو دیکھتے ہوئے کہا اور اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی ذکیہ بیگم واپس آگئیں۔

"میں بھی بتا دوں گا کہ ان میں کیا ہے۔"

بوبی نے اپنے بازو چپکے سے یاسر کو دکھائے۔

"ہاں چھٹانک بھر گوشت اور پاؤ بھر شوربہ۔" سمیرا نے منہ بنا کر کہا۔

"نانو جانی! ہم ان کو نیچے والا پورشن دیں گے۔"

"کیوں بھلا۔؟"

ذکیہ بیگم نے حیرانی سے دونیا کو دیکھا۔

اس لیے نانو جان کہ ان دونوں کا بوجھ ہماری چھت برداشت نہیں کر سکے گی۔ اور دھڑام سے اوپر آ رہے گی۔"

دونیا نے بھی بوبی کا بدلہ لے لیا۔

"بھیا ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ کسی فٹ پاتھ پر رہ لیں گے۔"

"جاؤ رہو۔ کمیٹی والے اٹھا کر لے جائیں گے۔"

بوبی نے برجستہ کہا اور باہر نکل گیا۔

"میڈم! میں خاصا برداشت والا آدمی ہوں اور عزت دار بھی ہوں مگر آپ کے بچے۔"

وجاہت نے دبے دبے لفظوں میں شکایت کی۔

"ارے بھیا، تم ملال نہ کرو۔ سب درست ہو جائے گا دونی یہ کیا حماقت ہے۔ یہ لوگ آج ہمارے مہمان ہیں۔"

"کل انشاء اللہ پولیس والوں کے مہمان ہوں گے۔"

دونیا نے جلدی سے کہا اور باہر کھسک گئی۔ نانو کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے۔

"بھیا! انتہا ہو گئی برداشت کی۔"

سمیرا اور یاسر وجاہت کے قریب آگئے۔

"دھیرج — دھیرج مائی ڈیر تمہیں خوش کر دیا جائے گا۔ فی الحال صبر۔" وجاہت نے آہستگی سے کہا۔

"بیٹے کرائے وغیرہ کی فکر نہ کرنا۔ بس تم لوگ آجاؤ۔ مجھے تم جیسے ہی —"

"جانوروں کی ضرورت تھی۔"

باہر کھڑے دونیا اور بوبی کڑھ رہے تھے۔

"ویسے دونیا! مجھے تو یہ وجاہت صاحب خاصی گھنی چیز لگتے ہیں۔"

بوبی نے وجاہت کے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ارے ایسے ویسے اور نانو کو دیکھو جیسے فدا ہو رہی ہیں گھن چکر پر — دیکھنا نانو کا انجام بھی ناول والی بڑھیا جیسا ہوگا۔ اس — بڑھیا نے بھی اپنی نواسی کی بات نہیں مانی تھی مگر میں بھی ان چوروں کو ناکوں چنے چبوا دوں گی۔"

"دونی! ناک کے دانت ہوتے ہیں کیا؟" پتا نہیں بوبی مذاق کر رہا تھا یا واقعی اسے اس محاورے کے بارے میں علم نہیں تھا مگر دونیا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"ہاں دانت بھی ہوتے ہیں۔ کان اور آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔"

اور پھر لاکھ دونیا منہ بناتی اور نانو کو ڈراتی رہی وہ سب رات ہی کو شفٹ ہو گئے۔

"دیکھ لینا، نانو ضرور پچھتائیں گی۔"

دونیا نے فتویٰ جاری کر دیا، وہ سارا وقت ان کے ساتھ رہی۔

"اچھا تو یہ زینہ سیدھا باہر کو نکلتا ہے ناں۔؟"

وجاہت نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ دونیا چونک گئی۔

"جی۔ جی ہاں لیکن ساتھ میں جو دروازہ ہے ناں۔ اس میں سے صاف پتا چلتا ہے کہ کون جا رہا ہے۔"

"ہوں یہ اچھی بات ہے کہ زینہ کافی کشادہ ہے۔"

وجاہت نے کن انکھیوں سے دونیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا مس دونیا! یہ بتائیے کہ چھت پر۔ اچھا خیر رہنے دیں، میں خود جا کر دیکھ لوں گا کہ کام کس طرح ہو سکتا ہے۔"

وجاہت زیر لب مسکرایا۔

"کس قسم کا کام؟" دونیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا مکان کرائے پر لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہر راز کی بات بتائی جائے۔"

وجاہت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کک۔ کک کون سا راز۔؟"

دونیا کا حلق خشک ہو گیا۔

"جب راز بتا دیا جاتا ہے تو راز نہیں رہتا مس دونیا!" وہ بھی پُر اسرار انداز میں مسکرائے جا رہا تھا۔

"ارے آپ کہاں چلیں؟ ابھی تو ہم نے سامان سیٹ بھی نہیں کیا۔"

"جانے دو یاسر، انہوں نے ابھی ہمارے کھانے کا انتظام بھی کرنا ہوگا ناں۔ جائیے مس دونیا اور۔ ہاں رات کے کھانے پر ہیں۔"

"زہر پسند کرتا ہوں۔"

دونیا نے دل میں اس کی بات مکمل کی اور ساری بات سنے بغیر آگئی۔

ذکیہ بیگم کو خدا نے ہر دولت سے نوازا تھا ماسوائے اولاد کی دولت کے پھر کافی عرصے بعد اللہ نے ان کو بیٹی عطا کی۔ عطیہ ان کی ساری جائیداد کی اکلوتی وارث تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد ذکیہ بیگم نے تمام معاملات خود سنبھال لیے تھے۔ زمینوں کی دیکھ بھال وغیرہ وہ خود کرتیں۔ بیٹی جوان ہوئی تو اس کی شادی کر دی، بدقسمتی سے اس کا شوہر بدنیت نکلا اس کی نظر ساس کی جائیداد پر تھی، اور آئے دن اس کا مطالبہ ہوتا تھا کہ ساری جائیداد اپنے نام کراؤ اور بڑھیا کو بے دخل کرو اور یہ بات عطیہ بیگم کی برداشت سے باہر تھی روز روز کی چخ چخ سے تنگ آکر انہوں نے طلاق کا مطالبہ کر دیا جو کہ بڑی مشکل سے پورا ہوا اور یوں عطیہ دو چھوٹے چھوٹے بچے لے کر ماں کے گھر آگئیں۔ طلاق اور شوہر کی بے وفائی کا گھن ان کو اندر ہی اندر چاٹ گیا اور ایک روز چپکے سے آنکھیں موند لیں۔ ذکیہ بیگم غم سے پاگل سی ہو گئیں زندگی سے ان کا دل اُچاٹ سا ہو گیا مگر جب دونیا اور بوبی پر نظر پڑی تو دوبارہ جینے کی رمق پیدا ہو گئی۔ وہ جب سے اکیلی ہوئی تھیں اپنی کوٹھی میں کسی نہ کسی کو ضرور رکھتیں۔ کرایہ تو محض ایک بہانہ ہوتا۔ وہ رونق کے لیے کرائے دار رکھتیں۔ ان سے پہلے کرائے دار بہت اچھے تھے۔ مگر وہ امریکہ سیٹل ہو گئے تو اتنی بڑی کوٹھی ان کو بھائیں بھائیں کرتی لگتی، انہوں نے ان لوگوں کو رکھ لیا جو کہ دونیا کے خیال میں چور ڈاکو تھے اور موقع پاتے ہی وہ لوٹ کر چلے جائیں گے۔ یہ پورا گینگ ہے اور نانو ان کی باتوں میں آگئی ہیں، اور یقیناً دھوکا کھائیں گی۔

"بوبی! ہماری نانو کو کیا ہو گیا ہے۔ سمجھ کے ہی نہیں دے رہیں۔ ادھر وہ جوٹٹ پونجیا ہے ناں۔ لوٹ کر چلتا بنے گا۔ پتا بھی ہے کیا کیا پوچھ رہا تھا۔ یہ سیڑھیاں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ کہاں جاتی ہیں اور چھت کے بارے میں تو وہ بات کرتے کرتے رہ گیا۔"

"پھر۔؟" بوبی بھی چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"پھر کیا ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

وہ بہت فکرمند تھی۔

"مثلاً کیا کریں ہم۔"

"بس نگرانی کریں گے اور زیادہ سے زیادہ اُن کے ساتھ رہیں گے۔"

"دونیا بی بی! اور بوبی میاں — بڑے ڈائننگ ہال میں سب کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"سب کون اور بڑے ڈائننگ ہال میں کیوں۔ اور یہ تم صافی سے پسینہ کیوں صاف کر رہے ہو۔"

دونوں نے حیرانی سے ماجد کو دیکھا جو صافی سے اپنا پسینہ صاف کر رہا تھا۔

"آپ نے وہ محاورہ سنا ہے جی کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔" ماجد نے مسخرے پن سے کہا۔

"کیا مطلب؟" دونیا نے گھور کر اسے دیکھا۔

"مطلب یہ جی کہ سامنے میں نے ذرا صافی سے پسین صاف کر لیا تو آپ نے ٹوک دیا مگر کھانے میں کیا کچھ کھا جاتا ہوں۔ وہ تو بڑے مزے سے کھا جاتی ہیں۔

"بکو مت۔"

دونیا نے ڈانٹا تو ماجد کے دانت اندر چلے گئے۔

اور وہ دونوں ڈائننگ ہال میں آگئے جہاں وہ چار ول بہت سنجیدہ بنے ہوئے بیٹھے تھے۔ وجاہت اپنی لچھے دار باتوں کے جال میں نانو کو پھنسا رہا تھا کم از کم دونیا کا تو ہی خیال تھا۔

"مکار کہیں کا۔" وہ منہ میں بڑبڑائی۔

"پاکستان کا۔" یاسر ایک دم بولا۔

"کیا مکار۔؟" دونیا نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں یہ گلاس۔" وجاہت نے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو دیکھا۔

خالہ بی سب سے بے خبر کھانے میں جتی ہوئی تھیں یوں جیسے ایک عرصے سے بھوکی ہوں۔

"لگتا ہے برسوں بعد کھانا نصیب ہوا ہے۔"

وہ آہستگی سے بوبی کے کان میں بولی۔ اس کی سرگوشی ت نے سُن لی۔

"لیکن اب تو عیش ہو جائیں گے۔ عمر بھر ایسے کھاتے گے۔"

وہ عجیب سے لہجے میں اسے دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں تو وجاہت بیٹے! تم نے کیا فیصلہ کیا ہے میرے نوکری کرنے کے بارے میں۔"

ذکیہ بیگم جو ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ لیٹ میں چاول نکالتی ہوئی بولیں۔

"سوچنا کیا ہے میڈم! ایسا گھر اور ایسے لوگ مجھے ں سے ملیں گے بھلا؟"

وجاہت نے دونیا کو دیکھتے ہوئے کہا جس کے صورت چہرے پر سوچوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔

"ہاں ایسے احمق اور بے وقوف کہاں سے ملیں کہ جو تار ہے ہوں خود کو۔" وہ مسلسل ساتھ ساتھ بڑبڑا رہی تھی۔

"تو میں سمجھ لوں کہ تم نے میری پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔"

"جی بالکل میڈم!"

یاسر، وجاہت اور سمیرا ایک ساتھ بولے۔

"یہاں کورس میں بولنے کی نہیں ہو رہی۔" دونیا چڑ کر ان کو دیکھا۔

"تو یہاں جلنے کڑھنے کی بھی نہیں ہو رہی۔" یاسر نے مزید چڑایا۔

"یہ ہمارا گھر ہے۔ ہم جس طرح چاہیں رہیں۔ آپ یا۔" اس نے گھور کر یاسر کو دیکھا۔

"ہونہہ خوش فہمی ہے آپ کی۔ کہ گھر آپ کا۔"

وجاہت نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا تو اس حلق خشک ہو گیا۔

"شکریہ میڈم! کل سے ہم کھانے کا خود انتظام کر گے۔" وجاہت اٹھتا ہوا بولا۔

"ارے نہیں وجاہت بیٹا! جب گھر ایک ہے تو دو جگہ نے کی کیا ضرورت ہے اور پھر تم بتا رہے تھے۔ تمہاری چلی جائیں گی۔"

"ویزا آگیا کیا اوپر سے ان کا؟"

بوبی خوش ہو کر بولا۔ خالہ بی کو بوبی کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ورنہ وہ اسی وقت ان کی نانو کا ویزا بھی لگوا لیتیں۔

"ہاں میں کہہ رہی تھی کہ تم لوگوں کو کھانے کے بندوبست کی ضرورت نہیں تینوں وقت کا کھانا یہیں سے کھایا کرو گے اور ہاں وجاہت بیٹے تم گاڑی اپنے استعمال کے لیے لے لو۔ چابیاں دونیا سے لے لینا۔" ذکیہ بیگم اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ایسا کریں نانو جانی! کہ ایک ساتھ ہی ساری چابیاں آپ ان کو دے دیجیے۔ تاکہ ان کو زحمت نہ ہو بار بار مانگنے کی۔"

دونیا کا سارا خون ہی تو جل گیا تھا اس بات پر۔

"ارے آپ ناحق پریشان ہوتی ہیں۔ وہ تو میں خود لے لوں گا آہستہ آہستہ۔"

وجاہت اس کے قریب آکر آہستگی سے بولا۔

تو وہ پھر چونک پڑی۔

"ہاں وہ یاسر تم چھت پہ گئے تھے، جائزہ لیا تھا۔"

اب وجاہت یاسر سے مخاطب تھا۔ مارے ڈر کے دونیا کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا، تو وجاہت کو بُری طرح سے ہنسی آگئی۔

"دونیا بی بی! ان باتوں سے کیا حاصل۔ اتنا خوفزدہ نہیں ہوتے۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے پھر ان اندیشوں سے کیا حاصل؟"

وجاہت کا انداز مسلسل ہراساں کرنے والا تھا۔ یا وہ یہی محسوس کر رہی تھی۔

"چوریاں اور ڈاکے اللہ میاں کی طرف سے نہیں ہوتے!"

وہ تڑاخ سے بولی۔ اسے جو خدشہ تھا اس نے بیان کر دیا۔

"یہ کیا فضول باتیں کرتی ہو تم۔ دونی! وجاہت بیٹا بہت سمجھدار ہے۔" ذکیہ بیگم جاتے جاتے مڑیں۔

"ہاں ٹھیک ہے ہمیں کیا۔ جب یہ بیٹا گھر خالی کر جائے گا ناں تو پتا چلے گا۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اور پھر ساری رات دونیا کو طرح طرح کے وہم آتے رہے۔ اس رات پڑھا ہوا ناول حرف بہ حرف درست ہو رہا تھا۔ اسی طرح وہ کرائے دار بھی پراسرار باتیں کر رہے تھے اور اسی طرح رات کو گھر والے سو جاتے ہیں اور صرف وہ لڑکی

ہی جاگ رہی تھی اور اچانک دیوار پر ایک سایہ نمودار ہوتا ہے لڑکی پہلے تو ڈر جاتی ہے اور پھر ہمت کر کے اٹھتی ہے، دروازہ کھولتی ہے اور بڑی بہادری سے اس چور کو پکڑ لیتی ہے، اور چلّانے لگتی ہے۔

"چور۔ چور نانو چور آگئے۔ ڈاکو نانو چور۔"

وہ مسلسل چلّائے جا رہی تھی۔

"دونیا۔ دونیا! پاگل لڑکی! چھوڑو یہ تکیہ ہے، چور نہیں۔"

ذکیہ بیگم اور بوبی نے تکیہ دونیا کے ہاتھ سے چھینا، جس پر وہ اندھا دھند مکہ بازی کر رہی تھی۔

"نہیں نانو! چور۔ نانو! میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ۔ کہ۔"

"دونی کی بچی! کہاں ہیں چور ڈاکو، یہ تو تمہارا تکیہ ہے۔ یہ دیکھو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے تم نے۔ اسے۔"

بوبی نے اس کے ہاتھوں میں پھر تکیہ دے دیا تو اتنی دیر میں وہ بھی ہوش میں آچکی تھی اور تکیہ کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ کیا وہ واقعی خواب دیکھ رہی تھی۔ اس نے تو خود چور کے سائے کو دیوار پر دیکھا اور پکڑا پھر یہ تکیہ کیسے بن گیا۔ بوبی اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ نانو جان اسے جاسوسی ناول پڑھنے پر ڈانٹ رہی تھیں اور وہ شرمندہ ہو رہی تھی کہ ناحق اپنے وہم کو چور بنا کر اس نے دوسروں کی نیند برباد کر دی۔ صبح ناشتے پر وہ سب ہی موجود تھے۔

"سنا ہے مس دونیا! رات آپ کے کمرے میں کوئی چور کود گیا تھا۔"

وجاہت نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

تو وہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی کہ ان کو کیسے خبر ہو گئی۔

"اور کیا کیا چوری ہوا؟"

یاسر چائے کا سپ لیتا ہوا بولا۔

"اور سنا ہے چور کوئی تکیہ تھا۔"

سمیرا بھلا خاموش کیوں رہتی۔

"یہ ساری انفارمیشن آپ کو کس نے پہنچائیں؟"

دونیا نے ان کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"بھئی، ہم نے خود دیکھا اور سنا ہے اور پھر ہمارا بھی تو ایسا ہی کام ہے ناں۔" یاسر نے وجاہت کو دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"جی میڈم! آپ نے کہا تھا کہ آج آپ کچھ کاغذا اور دستاویزات میرے حوالے کر دیں گی۔"

بات سادہ سی ہوتی مگر وجاہت اسے اس اند میں بیان کرتا کہ دونیا کا شک یقین میں بدل جاتا۔ ا وہ چونک جاتی۔

"نانو خدا کے لیے کچھ مت کیجیے گا ان کے حوا دیکھیے پلیز۔"

"لڑکی! تیرا دماغ کیوں خراب ہو گیا ہے۔" ذ بیگم نے ڈانٹا۔

"چھوڑیے میڈم! خراب تو وہ چیز ہوتی ہے کسی کے پاس ہو اور جو۔"

"چپ رہیے آپ آگئے کہیں سے، نانو ضرو پچھتائیں گی۔"

دونیا نے گھور کر وجاہت کو دیکھا جو معصو صورت بنائے کھڑا تھا۔

"اوکے میڈم! میں اب چلوں گا بلکہ آپ مجھے ج دے ہی دیں تو بہتر ہے۔ میرے خیال میں مس دونیا ہمارا یہاں رہنا پسند نہیں تو پھر ہم کیوں۔"

وہ مزید مسکین بن گیا۔

"ارے واہ کمال کرتے ہو بیٹا! یہ تو دیوانی ہے۔

"تو پھر ان کو صحراؤں میں ہونا چاہیے۔" یاسر مسکرا کر دونیا کو دیکھا۔

"میں۔ میں دیکھ لوں گی سب کو، جن عزائم سے لوگ آئے ہو ناں۔ وہ۔"

اس سے قبل کہ وہ مزید بولتی ذکیہ بیگم نے گھورا باہر نکل گئی۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا د

"مجھے تو یہ لڑکی کچھ کچھ کھسکی ہوئی لگتی ہے۔" یا کی رائے تھی۔

"بھیا! ویسے کبھی کبھی تو مجھے غصہ بھی آتا ہے جب وہ ہمیں چور اچکا سمجھتی ہے۔" سمیرا کو واقعی غصہ آتا ت

"بھئی، اس میں غصے والی کیا بات ہے۔ وہی س لڑکی ہے۔ جاسوسی ناولوں سے متاثر ہے اور بس او ہم کون سا چور ہیں کہ ہمیں غصہ آئے بلکہ مجھے تو ہنسی آ ہے اور انجوائے کرتا ہوں۔" وجاہت ہنستے ہوئے

وقار
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"اور اسی انجوائے منٹ میں وہ لوگ چاہے کوئی ری دھر دیں ہمارے ذمے۔"

سمیرا کو بھی وہم سا ہو چلا تھا۔

"ہو ناں لڑکی اسی کی طرح وہمی — بہرحال رہنا ہیں ہے ناں۔"

وجاہت مسکرایا، وجاہت، سمیرا اور یاسر تینوں ن بھائی تھے والدہ تو بچپن ہی میں چھوڑ گئی تھیں۔ الد بھی وفات پا گئے تو سوتیلے چچا نے ساری جائیداد تھیا لی اور یہ لوگ اپنی غریب۔ خالہ کے پاس آ گئے۔ کر اپنے اخلاق کی وجہ سے پہلے ہی اپنے سسرال میں۔ سندیدہ تھیں۔ ان تینوں کے آجانے سے ان کو اور بھی شکلات پیش آئیں تو وجاہت نے اپنا بوجھ خود اٹھانے ا سوچا۔ وہ اکنامکس میں ایم۔ اے تھا۔ اس کا خیال ھا کہ اس کی فرسٹ ڈویژن ڈگری کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے ا مگر ایک عرصے تک سڑکوں کو ناپنے کے بعد یہ خوش فہمی کل گئی تھی کہ قابلیت اور اچھی ڈگری سے نوکری مل جاتی ہے وکری تو کسی بڑی سفارش سے ہی خریدی جا سکتی تھی پھر اسے نے کسی ٹیچر کے توسط سے پرائیویٹ فرم میں جاب مل ئی مگر تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ الگ گھر لے کر رہتے اخبار یں ذکیہ بیگم کے اشتہار پر نظر پڑتے ہی اس نے قسمت آزمائی کی سوچی اور وہ لوگ آ گئے اور یوں ذکیہ بیگم کی شفقت کے سائے میں ان کو جگہ مل گئی تو خالہ بی جان کو اسر اور سمیرا اماں کہتے تھے واپس چلی گئیں۔ مگر اب انہیں دونیا کی جاسوسی کا سامنا تھا۔

"بھیا! میرے خیال میں باہر کوئی ہماری باتیں سن ہا ہے۔"

"دونیا ہو گی، شروع ہو جاؤ۔"

وجاہت چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"ویسے ایک بات ہے، بڑھیا ہے بہت سیدھی آسانی سے کاغذات حاصل — کیے جا سکتے ہیں۔ ور کچھ تو میں نے کر بھی لیے ہیں۔"

وجاہت نے ایسی آواز میں کہا کہ دونیا کا دل حلق میں آ گیا۔

"ہوں مکار کہیں کا، اسی لیے کہہ رہا تھا کاغذات دے دیں۔"

"بھیا ذرا احتیاط سے، وہ لڑکی اور لڑکا خاصے تیز ہیں اور لڑکی تو پوری جاسوسہ ہے۔ ہر وقت تاڑتی رہتی ہے۔"

یاسر دروازے کے قریب آ کر بولا۔

"بجو! یہ تو میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں کیا ہوں۔"

دونیا بھی ساتھ ساتھ بول رہی تھی۔

"بھیا! یہ کوٹھی کوئی خاص نہیں، جب جائیداد ہمارے نام ہو جائے گی ناں تو ہم اپنے لیے نئی کوٹھی خریدیں گے۔"

سمیرا بھی مسکراتی ہوئی بولی۔

"ہونہہ گھسیارن لگتی ہے شکل سے تو، آ گئی کہیں سے کوٹھیوں میں رہنے والی۔"

"اور بھیا میں تو وہ جو گرین ٹویوٹا ہے نا۔ وہ لوں گا۔" یاسر دروازے کے اور قریب آ کر بولا۔

"شکل دیکھی ہے، ٹین کے بندر نے، آ گیا میری گرین ٹویوٹا لینے والا۔"

جوش میں اور غصے میں دونیا نے دروازے پر مکہ مار دیا۔

"کون — ؟ کون ہے باہر؟"

وہ تینوں انجان بن کر بولے۔

"کوئی نہیں۔ کون ہو سکتا ہے بھلا۔"

دونیا خود ہی بلند آواز میں بولی اور جب احساس ہوا تو فوراً بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ تینوں خوب زور سے ہنس دیے۔

"دیکھنا، ابھی پھر آئے گی۔"

اور واقعی ادھر وجاہت کی بات ختم ہوئی ادھر پھر دہلیز کے نیچے سے دونیا کے پاؤں نظر آنے لگے۔

"ایک تو تم لوگ نکمے بہت ہو۔ روز کہتا ہوں چھت کا جائزہ لیا کرو۔ اور سمیرا، یہ نظر میں رکھا کرو کہ یہ لوگ کب سوتے ہیں خصوصاً وہ جاسوسہ۔ یاسر آج رات تم چھت پر آنا میں وہیں پر ہوں گا اور سمی تم اس بڑھیا کا اور ان دونوں پاگلوں کا خیال رکھنا — لیکن احتیاط سے کسی کو شبہ نہ ہونے پائے۔"

وجاہت نے آواز کو پراسرار بناتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ پاجی! مکار کہیں کا، نانو کو کیسے شیشے میں

اتار لیا ہے میں بھی دیکھ لوں گی اس کو۔"

وہ غصے میں دانت پیس رہی تھی۔

"نہیں بھیا! چھت پر ڈر لگتا ہے۔ مجھے تو آسیب زدہ لگتی ہے۔"

یاسر نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

"تم جیسے بھوت تو خود ڈراتے ہیں۔ ڈرتے کیا ہوں گے کسی سے خیر یہ اچھا پوائنٹ ہاتھ لگا ہے۔"

دونیا دل ہی دل میں کچھ سوچ کر خوش ہو گئی۔ اور واپس آ گئی۔

"بوبی۔! بوبی! اٹھو، وہ بھوتوں وغیرہ سے ڈرتے ہیں۔"

اس نے سوئے ہوئے بوبی کی چادر اتارتے ہوئے کہا۔

"کیا مصیبت ہے، ہر ذی ہوش کو جنوں بھوتوں سے ڈر لگتا ہے اور مجھے بھی لگتا ہے۔"

بوبی نے پھر چادر تان لی۔

"بوبی کے بچے! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو، اٹھو، یہ اتنی جلدی تمہیں نیند کیوں آجاتی ہے؟"

اس نے پھر اس کی چادر کھینچ لی۔

"یہ — یہ جلدی ہے، گیارہ بج رہے ہیں۔"

بوبی نے جھلا کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔

"پیارے بھیا! نیند تو تمہاری اکھڑ ہی گئی ہے۔ اب ذرا میرے ساتھ چھت پر چلو۔ وہاں یقیناً وہ تینوں میٹنگ کر رہے ہوں گے۔"

دونیا کو بے چینی ہو رہی تھی۔

"دونی! صرف تمہارا وہم ہے، ورنہ وہ لوگ اچھے خاصے شریف سے لوگ ہیں۔ مجھے تو کوئی گڑبڑ نہیں لگتی۔"

بوبی نیند کے خراب ہونے کی وجہ سے بہت بور ہو رہا تھا۔

"ہونہہ! تمہیں اور نانو کو بس وہ شریف ہی نظر آتے ہیں۔ چلو۔ اٹھو بس۔"

دونیا نے بوبی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ آہستہ آہستہ چھت پر آئے تو وجاہت اکیلا ہی ٹہل رہا تھا۔ تیز ہوا اور بلب کی زرد روشنی میں وہ اور بھی پراسرار لگ رہا تھا۔ دونیا کو تو اچھا خاصا خوف محسوس ہوا۔

"اوہو! آپ لوگ! آئیے۔ آئیے۔ ہوا کھانے آئے ہیں۔"

وجاہت نے دونوں کو آتے دیکھ لیا تھا مگر جان بوجھ کر انجان بنا ہوا تھا۔ اب دیکھ کر خوش ہوتا ہوا بولا۔

"جی نہیں وجاہت بھیا! ہم نے سوچا۔ چلو، چاند کو دیکھ آئیں۔"

بوبی کی اس بے تکی بات پر دونیا کو غصہ آ گیا مگر پھر اس نے سوچا اور کیا بات ہو سکتی تھی بہانہ تو کوئی ہونا ہی چاہیے تھا۔

"چاند۔ ہوں آسمان کا چاند تو آج کل نہیں نکل رہا اور کہیں کوئی کھڑکی کا چاند بھی دکھائی نہیں دے رہا۔"

وجاہت نے شوخی سے پہلے آسمان کی طرف پھر ادھر ادھر اور پھر ان دونوں کو دیکھا۔

"چھوڑیں وجاہت صاحب! یہ تو پاگل ہے۔"

"اچھا صرف یہ؟"

وجاہت نے گہری نگاہوں سے دونیا کو دیکھا۔

"وہ میں۔ وجاہت صاحب آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ نانو نے شاید آپ کو نہیں بتایا کہ۔ کہ یہ اوپر والا پورشن آسیب زدہ ہے۔"

"اچھا مجھے تو نیچے والا پورشن بھی آسیب زہ لگتا ہے۔"

وجاہت نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر ذو معنی سی بات کی۔

"اچھا آپ کو کیسے خبر ہوئی کہ نیچے والا پورشن بھی۔"

بوبی سہم کر رہ گیا اس خبر پر۔

"لو، مجھے تو آتے ہی تم لوگوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا۔" وجاہت دونوں کو شوخی سے دیکھ رہا تھا۔ جو اس وقت بالکل معصوم بچے لگ رہے تھے۔

"آپ مذاق سمجھ رہے ہیں اور میں آپ سے حقیقت کہہ رہی ہوں۔"

دونیا کچھ کچھ کھسیانی سی ہو رہی تھی۔ اسے سارا منصوبہ ہی فیل ہوتا لگ رہا تھا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں مس دونیا، میرا اور آپ کا بھلا مذاق کا کون سا رشتہ ہے۔ میں بھی حقیقت ہی

سمجھ رہا ہوں۔ ہاں تو آپ بتا رہی تھیں۔ یہ پورشن آسیب زدہ ہے۔ کتنا حصہ آسیب زدہ ہے۔ یقین جانیے، مجھے تو بہت ہی ڈر لگتا ہے چڑیلوں سے، بات نہ مانو تو کلیجہ چبا جاتی ہیں۔ اس لیے میں آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔“

دونیا کو بالکل اندازہ نہ ہوا کہ وہ اسے ہی چڑیل کہہ رہا ہے۔

”تو آپ کو یقین ہے ناں۔ آسیب وغیرہ پر۔“

دونیا تصدیق کرتے ہوئے بولی۔

”ارے بھئی، زندہ حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے“

وجاہت نے شوخی سے پھر اسے ہی دیکھا۔

”اچھا تو وجاہت! آپ لوگ ذرا بچ کر رہیے گا وہ جن اور چڑیلیں یہاں اکثر آتے ہیں اور یہاں پر تو کسی کو ایک دن بھی برداشت نہیں کرتے۔ آپ لوگوں کو اب تک جانے کیسے برداشت کر لیا۔ ہو سکتا ہے کل آئیں۔“

”اچھا تو وہ کل آئیں گے۔ کل ان کا پروگرام ہے۔ آپ کو وقت معلوم ہے کس وقت آئیں گے۔“؟

وجاہت نے ایسے پوچھا گویا اس نے ان کا پروگرام سیٹ کیا ہو۔

”مجھے کیا خبر کہ کس وقت آئیں گے؟“

دونیا کچھ چوکس ہو گئی۔

”تو آپ کو یہ خبر ہے کہ کل آئیں گے؟“

وجاہت نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیا بہت خطرناک چڑیلیں ہیں۔“

یاسر اور سمیرا ابھی ابھی آئے تھے۔ وہ بھی شامل ہو گئے۔

”چڑیلیں تو بہت بدصورت ہوتی ہیں۔ ہے نا بھیا!“

سمیرا نے وجاہت کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھا

”جی ہاں بالکل آپ کی طرح۔“

بوبی نے فوراً سمیرا کی طرف اشارہ کیا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

”نہیں بھئی، کچھ خوبصورت بھی ہوتی ہیں۔“

وجاہت دونیا کو دیکھتا ہوا زیر لب مسکراتا ہوا بولا۔

”نہیں بھیا! ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ چڑیلیں ہمیں کھا جائیں گی۔“

یاسر خواہ مخواہ ہی ڈرنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

”ہاں بھیا! ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“

سمیرا بھی خوفزدہ شکل بناتی ہوئی بولی۔

”یہ — یہ لوگ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وجاہت آپ لوگوں کو گھر تبدیل کر لینا چاہیے، چڑیلیں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔“

دونیا جلدی سے یاسر اور سمیرا کی تائید میں بولی۔

اسے یقین ہو چلا تھا کہ چڑیلوں والا حربہ کامیاب ہو جائے گا۔

”شکریہ مس دونیا! آپ نے ہمیں باخبر کر دیا۔ میں صبح ہی میڈم سے بات کروں گا کہ نہ مجھے ان کی جاب چاہیے اور نہ گھر، ہمیں اپنی جانیں بے حد عزیز ہیں۔“

وجاہت نے ایسے کہا جیسے وہ واقعی ایسا کرے گا۔

”ارے وجاہت صاحب! گھر اور جاب چھوڑنے کی کوئی اور وجہ بتائیے گا۔“

وہ ایک دم گھبرا کر بولی۔

”کیوں؟“ وہ تینوں ایک ساتھ بولے۔

”اس لیے کہ ہماری نانو بھوت پریت پر اعتقاد نہیں رکھتیں ناں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، میں کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لوں گا آپ بے فکر رہیے۔“

”شکریہ — بہت شکریہ آپ کا۔“

دونیا بہت خوش تھی کہ اس نے ان لوگوں کو بے وقوف بنا لیا ہے۔ اس طرح اب وہ لوگ ڈر کر چلے جائیں گے۔

”اچھا اب ہم چلتے ہیں چلو بوبی۔“

وہ مطمئن سی ہو کر واپس پلٹی تو وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے اور پھر ساری رات دونیا کو مارے خوشی کے نیند نہیں آئی تھی۔ کہ بعد میں وہ نانو جانی کو اپنا کارنامہ بتائے گی کہ میں نے چوروں کو بھگا دیا ہے اور یہ فائدہ ہے جاسوسی ناول پڑھنے کا۔ لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ چڑیل کا روپ دھارا کس طرح جائے اب اس نے بوبی سے بات کی مگر وہ تو کسی طور بھی بھوت بننے کو تیار نہیں تھا۔ لہٰذا اب اسے ہی ہر حال میں چڑیل بننا تھا۔ اس کے لیے اس

پھر اس نے سارا دن لگا کر ستارے اتارے۔ بے چینی سے رات کی منتظر تھی۔

”دونیا باز آ جاؤ۔ ان لوگوں کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا پٹ جاؤ گی نانو کے ہاتھوں۔“

بوبی اسے مسلسل سمجھائے جا رہا تھا۔

”تم تو ہو ڈرپوک، رہنے دو اور پھر چڑیل میں ہوں تمہیں اس سے کیا۔ اور تمہیں کیا پتا وہ لڑکی ناول میں اسی طرح کرتی ہے اور چوروں کو بھگا دیتی

”لڑکی! ناول اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے اور لوگ چور بھی نہیں لگتے۔“

”تو بس نانو جان کی طرح دیوانے ہوئے جا ان لوگوں کے۔ اور جس روز صفایا کر جائیں گے چلے گا۔ بہرحال مجھ سے تو بربادی نہیں دیکھی اپنے گھر کی، اس روز باتیں سنتے ذرا تم کیسی باتیں تھے وہ لوگ اور نانو کو کس طرح کہہ رہا تھا وہ چکر۔ ہونہہ بڑھیا تو بہت ہی سیدھی ہے۔ دیکھ جلد ہی سب کچھ اپنا ہو گا۔“

دونیا وجاہت کی نقل اتار رہی تھی۔

رات کھانے کے بعد سب ہی خاموشی سے اپنے کمروں میں آ گئے جیسے ہی گیارہ بجے دونیا نے تیار شروع کر دیا۔ سیاہ میکسی اور خوفناک سے — بعد جب اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تو وہ خود ڈر گئی۔ پھر وہ بوبی کے کمرے میں آئی تو وہ چیخ مار کر

”نانو جان! چڑیل!“

”بوبی کے بچے! میں ہوں تمہاری بہن دونیا — تھوڑی ہوں یہ دیکھو۔“

دونیا نے اپنے چہرے پر سے سیاہ نقاب اتارا تو وہ مزید ڈر گیا۔

”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے، جاؤ منہ دھو کر ڈر لگ رہا ہے مجھے۔“

”ہوں! اس کا مطلب ہے کہ میں واقعی چڑیل رہی ہوں۔ اب تو اور بھی مزا آئے گا۔“ وہ اپنے کی کامیابی پر خوش تھی۔

لگ رہا ہے۔“

وہ اس کی منت کرتی ہوئی بولی۔

”ماشاء اللہ۔ یہ تو حال ہے کہ چڑیل بنی ہوئی ہیں اور سیڑھیوں سے خوف آ رہا ہے اور تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ سب تمہیں دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائیں گے اور اسی وقت سامان اٹھا کر چل دیں گے۔“

”بالکل۔“ دونیا وثوق سے بولی۔

”باز آ جاؤ دونی! باز آ جاؤ۔“

”تم اٹھو تو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہوئی بولی۔

”ایک شرط پر جاؤں گا میں، بس چھوڑ کر آ جاؤں گا۔“

بوبی اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔ اور پھر وہ واقعی اسے چھت تک چھوڑ کر بھاگ آیا اور جیسے ہی اس نے چھت پر قدم رکھا۔ لائٹ چلی گئی۔ مارے خوف کے اس کا برا حال تھا مگر اپنے گھر کو چوری سے بچانے کا عزم حوصلہ دے رہا تھا۔ چاند بھی نہیں نکلا تھا۔ بجلی کے جانے سے اس قدر اندھیرا ہو گیا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کانپتے ہوئے قدم آگے بڑھا رہی تھی۔ ڈر کے مارے اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ ذرا کوئی چیز ٹکرا جاتی تو اس کی جان نکل جاتی پھر وہ ایک دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور ان لوگوں کا انتظار کرنے لگی۔

”تم کون ہو؟“

دونیا کو اپنے قریب ہی ایک بھاری سی آواز سنائی دی تو اس کی جان نکل گئی۔

”میں — مم — میں چڑ — چڑیل ہوں۔“

وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

”اچھا تم چڑیل ہو تو میں بھوت ہوں۔ میں کوہِ قاف سے آیا ہوں اور تمہیں بھی کوہ قاف لے جاؤں گا۔ اور شادی کروں گا تم سے — آؤ چلو۔“

کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تو وہ چیخنے لگی۔

”نہیں، میں چڑیل نہیں، میں دونیا ہوں۔ مجھے چھوڑ دو پلیز، میں کوہِ قاف نہیں جاؤں گی۔ میں چڑیل نہیں ہوں۔“

وہ پوری کی پوری پسینے میں نہا گئی۔

”تم کوئی بھی ہو۔ میں تمہیں لے جاؤں گا۔ اپنی دلہن

کسی کا جناتی قہقہہ فضا میں گونج رہا تھا اور اس کے ہاتھ پر گرفت بڑھ رہی تھی۔ اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی اور ان تینوں کی ہنسی کسی طور تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اور جب دونیا کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر پڑی تھی۔ نانو جان اس پر جھکی ہوئی تھیں — وہ تینوں بھی کھڑے تھے۔

"نانو! بھوت، وہ چھت پر بھوت ہیں۔"

"بھوت ہیں تو تمہیں چڑیل بننے کو کس نے کہا تھا؟"

بوبی نے ان کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اور وہ اب اسے ان کے سامنے ڈانٹ رہی تھیں۔

"نانو تو پھر اس کو بھی ڈانٹیں ناں، جو بھوت بنا تھا۔"

دونیا نے مشکوک نگاہوں سے وجاہت کو دیکھا۔

"کمال کرتی ہیں مس دونیا! آپ ہم تو بے خبر سو رہے تھے۔ وہ تو ماجد نے بتایا کہ بی بی چڑیل بن گئیں۔ میرا مطلب ہے بے ہوش ہو گئی ہیں۔ تو ہم بھاگے آئے۔"

وجاہت معصوم صورت بنا کر حیرت سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

"میں سب جانتی ہوں بیٹا۔ تم ملال نہ کرو۔ یہ اس کی جاسوسی جو ہے وہ ہی رنگ دکھاتی ہے۔"

ذکیہ بیگم نے بھی وجاہت کو باعزت بری کر دیا۔

پھر کافی روز تک دونیا اس حادثے سے سنبھل نہ سکی۔ اسے سوچ سوچ کر ہی خوف محسوس ہوتا رہتا۔ اسے یقین تھا۔ اس روز وہ وجاہت ہی بھوت بنا تھا۔ ورنہ اور کون ہو سکتا تھا۔

"مکار کہیں کا۔ نانو کے سامنے کیسا بچہ بنتا ہے۔ معصوم سا بنا رہتا ہے۔ ہماری نانو بھی اس کی باتوں میں آ گئیں۔ جائیداد کے، زمینوں کے سارے حسابات، سارے کاغذات بھی اسے تھما دیے ہیں۔ وہ جو چاہے جو کرتا پھرے۔"

تقریباً ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ مگر دونیا کے ذہن میں ایسا وہم بیٹھ گیا تھا کہ یہ لوگ چور ہیں اور کسی موقع کی تلاش میں ہیں۔ اور پھر وہ لوگ باتیں بھی تو ایسی ہی کرتے تھے اس نے خود اپنے کانوں سے سنی تھیں۔ اور اب تو بوبی اور یاسر کی بھی دوستی ہو گئی تھی۔ پکی والی۔ وہ بھی اس کی کسی بات پر کان نہیں دھرتا تھا۔ سمیرا نے بھی

دکھا دی تھی۔ اور وہ بے چاری پیچھے ہٹ گئی۔

"بداخلاق بندریا۔"

سمیرا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"کون بھئی؟"

وجاہت نے کتاب ایک طرف رکھ کر سمیرا کو دیکھا۔

"وہ آپ کی دونیا۔" "میری دونیا —"

سمیرا کی اس بات پر جانے کیوں ایک لطیف سا احساس اس کے اندر تک اتر گیا۔ اور وہ زیر لب مسکرا دیا۔

"ہوا کیا ہے آخر؟" وجاہت مسکرایا۔

"میں نے کتنی بار دوستی کی کوشش کی تھی۔ مگر اس نے جواب ہی نہیں دیا۔ مغرور کہیں کی۔ بھیا وہ ادھر ہی آ رہی ہے۔"

سمیرا جو دروازہ کھول کر باہر جانے لگی تھی۔ سامنے سے آتی دونیا کو دیکھ کر جلدی سے اندر ہو گئی۔

"ہوں ایسا کرو۔ پردہ سرکا کر تھوڑا سا دروازہ کھلا رہنے دو۔"

وجاہت دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اور جیسے ہی دونیا کا سایہ دروازے کے قریب آیا۔ وہ شروع ہو گیا۔

"ہاں سمیرا! تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"بھیا! مجھے ہیرے کا سیٹ چاہیے۔ میں اتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں۔" سمیرا نے ٹھنک کر کہا۔

"لے دیں گے گڑیا! اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ اب تو سمجھو عیش ہی عیش ہیں۔ اب تو بڑھیا نے سب کچھ میرے اختیار میں دے دیا ہے۔ انہوں نے جب مجھے فرم چھوڑنے کو کہا تھا۔ تو میں ڈر رہا تھا کہ اب گزارہ کیسے ہو گا۔ مگر — مگر بڑھیا تو میرے ارادوں سے بڑھ کر سیدھی نکلی اور وہ دونوں احمق تو بیکار ہیں۔ ان کو تو میں کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔ لفٹ ہی نہیں کراتا۔ دیکھنا ایک دن ان تینوں کو مکھن سے بال کی طرح نکال باہر کروں گا۔ اور پھر ہم تینوں کا راج ہو گا۔"

وجاہت دروازے کے قریب آ کر بولا۔

"ہوں۔ میں بھی دیکھ لوں گی تمہیں آ گئے ہماری جائیداد پر راج کرنے والے میں کتنی احمق ہوں۔ سب بتا دوں گی۔" وہ واپسی کے لیے مڑی۔

وجاہت نے تیزی سے اسے جاتے دیکھا تو پھر اونچی آواز میں بولا۔ تو دونیا الٹے قدموں واپس آ گئی۔

"سمیرا! یہ لیٹر ہے اسے سنبھال کر رکھنا۔ سمجھ لو۔ یہ لیٹر ہی ہماری کامیابی کی کنجی ہے، اسی سے ہم مالک بن سکتے ہیں ہر چیز کے۔"

وجاہت دروازے کے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا کہ وہ کچھ دیکھ نہ سکے اور دونیا اچک اچک کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر لمبے چوڑے وجاہت نے سب کچھ چھپا رکھا تھا۔ اس لیے وہ دیکھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ وہ لیٹر کہاں رکھ رہے ہیں۔

"خیر چھوڑوں گی تو میں نہیں۔ ایک ایک چیز دیکھ کر لیٹر کو ڈھونڈ نکالوں گی۔"

وہ خاموشی سے وہاں سے آ گئی۔ وہ اکیلی ہی کڑھ رہی تھی۔ نانو جان سے تو ان کے متعلق کہنا سننا بھی فضول تھا اور بوبی تو جیسے یاسر کا دیوانہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر وقت اس کی مالا جپتا رہتا۔

"خیر، میں خود دیکھ لوں گی۔ ایک نہ ایک دن تو ان بہروپیوں کا پول کھول کر رہوں گی۔ یہ بھی کیا یاد کریں گے کس سے پالا پڑا تھا۔"

چار بج رہے تھے۔ ابھی سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ اس نے کافی میں دو نیند کی گولیاں ملائیں اور وجاہت کے کمرے میں آ گئی۔ اتفاق سے وہ تھا بھی اکیلا۔ اس نے آہستگی سے دستک دی۔

"کون؟" وجاہت نے ٹیپ ریکارڈر کی آواز آہستہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی میں دونیا۔" وہ بڑی نرمی سے بولی۔

"دونیا!"

دل ایک دم خوشگوار انداز میں دھڑک اٹھا۔ وہ مسکراتا ہوا دروازے تک آ گیا۔

"آئیے چشم ما روشن دل ما شاد۔ وہ آئیں ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے۔"

وجاہت نے آسمانی رنگ کے سادہ سے سوٹ میں پیاری سی دونیا کو دیکھتے ہوئے کہا جس کے دونوں ہاتھوں میں کافی کے مگ تھے۔

"جی حکم، فرمائیے۔ میڈم نے تو یاد نہیں کیا مجھے۔"

گیا تھا۔

"جی۔ جی۔ نہیں۔ وہ تو میں کافی پینے لگی تھی۔ آپ کا خیال آ گیا۔" وہ بوکھلا رہی تھی۔

"اچھا تو آپ کو بھی میرے خیال آنے لگے ہیں کب سے؟"

وہ گمبھیر لہجے میں بولتا سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"جی ایک عرصہ سے آ رہے ہیں۔"

"اچھا جی زہے نصیب۔ ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی کہ ہم کسی کے خیالوں میں ایک عرصے سے آ رہے ہیں۔"

دونیا کو احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے وجاہت کی گہری نگاہیں اور لہجہ ضرور اسے بوکھلا رہا تھا۔ ساتھ میں وہ ٹٹولتی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ بھی لے رہی تھی کہ وہ لیٹر کہاں رکھا ہو سکتا ہے۔

"اور آپ کو کیسے خبر ہوئی کہ مجھے اس وقت کافی پینا پسند ہے۔"

"بس مجھے آپ کی پسند کا پتا ہے ناں۔ اس لیے لیجیے نا میں نے اپنے ہاتھوں سے بڑی لذیذ کافی بنائی ہے"

وہ مگ اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

"چلیے یہ مرحلہ تو آسان ہوا کہ آپ کو میری پسند کا پتہ چل گیا۔ باقی معاملات بھی طے ہو جائیں گے۔"

مسکراتے ہوئے وجاہت نے مگ لے لیا۔ کچھ نہ کچھ ہے یہ تو وہ جانتا ہی تھا۔ اس نے مگ ایک طرف رکھ دیا۔ "آپ ہی لیجیے ناں؟"

دونیا کو جلدی ہو رہی تھی کہ وہ پی کر بے ہوش ہو جائے۔ اور وہ لیٹر تلاش کرے۔

"آپ تلاش کیجیے ناں۔" وجاہت نے ذومعنی اندا میں کہا۔

"آپ کی بک شیلف بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔" دونیا اسی بہانے لیٹر تلاش کرنے لگی۔

"جی ہاں! یہ وارڈروب بھی بہت حسین ہے۔ اس کو بھی چھان لیجیے گا۔"

اسے مصروف دیکھ کر وجاہت نے کافی کا مگ واش روم میں جا کر گرا دیا۔ دونیا نے بھی موقع غنیمت جانا او جلدی جلدی دیکھنے لگی۔

"جی ملا کچھ؟"

یکھ کر پوچھا۔

"جی — جی نہیں۔" وہ بوکھلا گئی۔

"تو پھر ان کو اندر اسی طرح جما دیجیے جیسے پہلے تھے۔" وجاہت نے بکھرے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا اور ہی وہ آنکھیں بند کرنے لگا اور پھر لیٹ گیا۔

میرے خیال میں گولیوں کا اثر اب ہوا ہے۔ اچھا اب میں سکون کے ساتھ تلاشی لے سکتی ہوں۔ سمجھ کیا ہے انہوں نے۔ مذاق ہے ناں کسی کے گھر پر چوری کرنا الا یا جائیداد پر قبضہ کرنا۔ آسان بات ہے ناں۔ مگر ے بدتمیزوں نے پیپر چھپا کر کہاں رکھا ہے۔ مل جائے و جا کر نانو کو کرتوت دکھاؤں گی — ان کے لاڈلوں گر جانے کہاں رکھ دیا ہے۔"

اس نے سارے کمرے کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔

جانے کہاں رکھ دیا ہے؟"

وہ آہستگی سے وجاہت کے بیڈ کے قریب آئی کہ ے نیچے دیکھ سکے۔ جیسے ہی اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ چا ہا۔ وجاہت نے مضبوطی سے اس کی کلائی کو پکڑ لیا۔

"چور کو پڑ گئی مور لی۔ یعنی چور کے گھر میں چوری۔"

"آپ ہوش میں آ گئے؟"

وہ ایک دم زرد پڑ گئی۔ وہ مسکراتا ہوا اس کی کلائی ے بیڈ پر بیٹھا تھا۔

کتنی گولیاں ڈالی تھیں نیند کی؟"

وہ اس کی پھیلی سیاہ آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"دو۔" وہ پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔

بس صرف دو۔ اجی ان سے کیا ہوتا ہے جبکہ وہ بھی ں میں اُلٹ دی گئی ہوں۔" وہ شوخی سے بول رہا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے آپ نے کافی نہیں پی تھی۔"

وہ اس سے اپنی کلائی چھڑاتی — ہوئی بولی۔ تو ہت نے ایک انداز سے مسکراتے ہوئے نفی میں ن ہلائی۔

"میں آپ کو آپ کے مکروہ عزائم میں کامیاب نہیں نے دوں گی۔"

چلو مکروہ عزائم میں کامیاب نہ ہونے دینا مگر عظیم م میں — تو کامیاب کر دینا۔" وہ اسے گہری وں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"مطلب یہ کہ مجھے میڈم کی جائیداد، دولت زمینوں سے کوئی غرض نہیں۔ پھر بھی میں ان کی چوری ضرور کروں گا۔ اور ایسی چیز چراؤں گا — سارے زمانے کے سامنے کہ کیا یاد کریں گی میڈم بھی۔ کس سے پالا پڑا تھا۔"

وجاہت اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مضبوط لہجے میں بولا تو مارے خوف کے دونیا کی جان نکل گئی کہ اب تو وہ سرعام ڈاکے اور چوری کی بات کر رہا ہے جانے نانو کو کیسے عقل آئے گی۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ بوبی بھی اب تو کوئی بات نہیں سنتا تھا۔ اسی دوران ذکیہ بیگم — جائیداد کا بہت بڑا مقدمہ جیت گئیں۔ تو وہ بے حد خوش تھیں۔

"خدا کا احسان ہے اور وجاہت بیٹے کی کوشش اور محنت کہ ہم ہارا ہوا مقدمہ جیت گئے ہیں۔ ورنہ سب کچھ چھن جاتا ہم سے۔"

ذکیہ بیگم دن رات وجاہت کو دعائیں دیتی رہتیں۔

"ہونہہ! میں جانتی ہوں نانو وہ یہ سب کیوں اور کس لیے کر رہا ہے۔ ایک روز آپ کو بھی بے دخل کر دے گا۔"

اب تک کے حالات بالکل اسی ناول کے مطابق جا رہے تھے جو اس نے پڑھا تھا۔

"مسٹر وجاہت! جو کھیل آپ کھیل رہے ہیں ناں اس کا انجام۔"

"بہت اچھا ہوگا۔ کہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔"

وجاہت اس کے شکوک و شبہات کو اور اُبھارتا رہتا۔ "میں آپ کو یہ کھیل جیتنے نہیں دوں گی۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے آپ مجھے اس کھیل میں شکست دے دیں۔ میں آپ کو فتح کر لوں گا۔ ٹھیک ہے ناں۔"

وہ اسے شوخی سے دیکھتا ہوا بولا۔

اور پھر جانے ایک دم ہی کیا ہوا کہ ساری بساط ہی اُلٹ گئی۔ وجاہت نے یہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وجاہت نے اپنے تمام اختیارات، تمام چابیاں وغیرہ ذکیہ بیگم کو واپس کر دیں۔ تو ذکیہ بیگم جو وجاہت جیسے باصلاحیت اور قابل اعتماد نوجوان کو سب کچھ سونپ کر بے فکر ہو گئی تھیں۔ پریشان ہو گئیں اور پھر بوبی نے

"بلاؤ ذرا دونیا کو میرے پاس۔"

انہوں نے غصے سے کہا تو وہ سر جھکائے آ گئی۔ تو انہوں نے وجاہت کی ایک ایک بات تفصیل سے بتائی۔ اور یہ کہ اس کی وجہ سے وہ کن کن سازشوں سے بچی ہیں۔ بزنس بہتر ہوا ہے اور یہ کہ تمہارے فضول ناول اور دونوں نے اتنے اچھے با اعتماد اور قابل بچوں کو ہرٹ کیا ہے کہ اب وہ لوگ جا رہے ہیں۔ آخر کہاں تک کوئی برداشت کرتا۔

"نانو قسم سے میں خود سنتی رہی ہوں ان کی باتیں۔ ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ ان کی باتوں کو دروازے سے کان لگا کر سنا کرتی تھی اور وہ لوگ باتیں ہی ایسی کرتے تھے۔ اب سب کچھ سن کر میں تو انجان نہیں رہ سکتی تھی۔ اور تو اور میں چڑیل بھی بن گئی تھی ان کو بھگانے کے لیے۔" وہ خود ہی سب باتوں کا اعتراف کرتی چلی گئی۔

"اچھا تو یہ سب ہوتا رہا ہے گھر میں۔ مجھے سمیرا نے سب کچھ بتا دیا ہے کہ ان کو جیسے ہی خبر ہوتی کہ تم دروازے سے کان لگائے کھڑی ہو تو یہ لوگ محض تمہیں تنگ کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتے کہ تمہارا وہم اور مضبوط ہو جائے۔"

"تو نانو! پھر اس میں میرا کیا قصور ہے؟" اب وہ باقاعدہ رونے لگی۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم محض فرضی اور خیالی ناولوں پر اس قدر یقین رکھتی ہو کہ حقیقت پر اعتماد ہی نہیں ہے تمہیں۔ جاؤ جا کر سب سے معذرت کرو۔ وہ کسی طور پر بھی رکنے کو تیار نہیں۔ عید کا موقع ہے دو دن بعد عید ہے کہاں مارے مارے پھریں گے۔ بیچارے بچے۔"

وہ نادم سی وہاں سے آ گئی۔ سمیرا اور یاسر نے تو فوراً معاف کر دیا۔ مگر مسئلہ وجاہت کا تھا۔ وہ پکا پکا ناراض ہو گیا تھا۔

"بے وقوف کہیں کے۔ خود ہی مجھے بے وقوف بناتے رہے اور خود ہی روٹھ کر بیٹھ گئے ہیں۔"

وہ بڑے ادب و احترام سے اسے کوستی ہوئی اوپر آ رہی تھی۔ جہاں وہ دیوار سے ٹیک لگائے چاند کو گھورنے جا رہا تھا۔ وجاہت نے کن انکھیوں سے اسے دیکھ

"وجاہت صاحب!" وہ بڑی آہستگی سے بولی۔

"جی فرمائیے۔" وہ کاٹ کھانے کو دوڑا۔

"آپ نہ جائیے پلیز۔"

"کیوں میں کوئی لام پر جا رہا ہوں جو مجھے روک رہی ہیں۔ اور پھر آپ مجھے روکنے کا حق بھی نہیں رکھتیں۔"

وہ مکمل طور پر روٹھا ہوا تھا۔

"تو میں کون سا روک رہی ہوں۔ نانو جان کے کہنے پر کہہ رہی ہوں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"اچھا تب تو اور بھی نہیں رکوں گا۔" وجاہت نے اس کے صبیح رخساروں پر چاند کی کرنوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو مت رکیے۔ ایک تو مجھے بے وقوف بناتے رہے اور اوپر سے رک بھی نہیں رہے۔"

"بنے بنائے کو کون بنا سکتا ہے۔ خیر میں مشروط طور پر رکنے کو تیار ہوں۔"

وجاہت کو وہ اس وقت بالکل معصوم سی بچی لگ رہی تھی۔ بہت اچھی لگی اسے۔

"کس شرط پر؟"

وہ اس کی ہر شرط ماننے کو تیار تھی۔ کیونکہ وہ خود بھی نادم تھی۔

"مانیں گی۔" وجاہت نے اس کی بھیگی پلکوں کو دیکھا۔

"جی ضرور۔ ہر شرط مانوں گی۔"

وہ فوراً تیار ہو گئی۔

"میرے ساتھ کوہ قاف چلنا ہوگا منظور ہے یہ شرط؟"

وجاہت نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تو وہ حیرانگی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ پلکیں لرزیں اور جھک کر رہ گئیں۔

"بتاؤ نا چلو گی میرے ساتھ کوہ قاف؟"

وجاہت نے اس کا جھکا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ تو اس نے اثبات میں سر جھکا دیا۔ وجاہت نے ایک پرسکون گہرا سا سانس لیا۔

"چڑیل اور بھوت کو یہ ملن مبارک ہو۔"

دونوں نے اس آواز پر چونک کر دیکھا۔ یاسر، بوبی اور سمیرا کھڑے مسکرا رہے تھے۔

◆

آ دو گھڑی

آسیہ سلیم قریشی

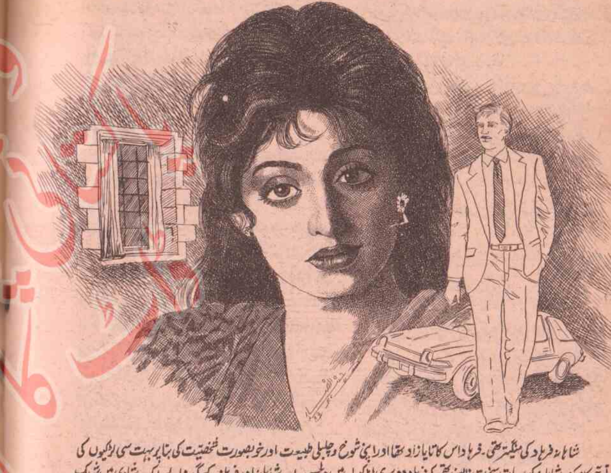

شاہانہ فرہاد کی منگیتر تھی۔ فرہاد اس کا تایازاد تھا اور اپنی شوخ و چلبلی طبیعت اور خوبصورت شخصیت کی بنا پر بہت سی لڑکیوں کی توجہ کا مرکز۔ شاہانہ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ فرہاد دوسری لڑکیوں میں دلچسپی لے۔ شاہانہ اور فرہاد کے گھر والے ایک شادی میں شریک ہونے کے لیے سرگودھا گئے تھے۔ صرف فرہاد گھر پر تھا۔ شاہانہ بھی رک گئی تھی۔ وہ فرہاد سے ملنے کے لیے اس کے گھر گئی تو وہاں فرہاد کے ساتھ اس کے بڑے بھائی زبیر کی منگیتر ناہید کو دیکھ کر چیختی ہوئی بھاگی۔ جاذب جو شاہانہ کی بھابی مونا کا کزن تھا۔ وہ زبیر سے ملنے آیا تھا۔ اس نے شاہانہ کو تھام لیا اور اسے گھر لے آیا۔ گھر آ کر شاہانہ نے احسن اور مونا کو سب کچھ بتا دیا۔ فرہاد کے گھر والے بھی آ گئے تھے۔ وہ بھی یہ سب جان کر غصے سے بے قابو ہو گئے۔ شاہانہ کو غم و غصے کی شدت سے بخار آ گیا۔ جاذب اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔

جاذب بہت مضبوط کردار کا نوجوان تھا۔ اسے ان لڑکوں اور لڑکیوں سے نفرت تھی جو محبت کو وقت گزاری کا ذریعہ یا کھیل سمجھتی ہیں۔ شاہانہ کو دیکھ کر اس کے دل میں پہلی بار محبت کا جذبہ بیدار ہوا۔ وہ مونا پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا کہ شاہانہ کمرے میں آ گئی۔

اس نے فرہاد کو جلانے کے لیے جاذب سے بہت اچھی طرح بات کی۔ فرہاد غصے میں بھناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

فرہاد کے والد زمان احمد گاؤں گئے تو وہاں اپنے منشی کی بیٹی وحیدہ بیگم پر فریفتہ ہو گئے۔ اور اسے بیاہ کر گھر لے آئے۔ اس مدت سے ان کے والد احمد حسین جلد ہی دنیا چھوڑ گئے۔ زمان احمد نے ساری زمینوں اور جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ اور چھوٹے بھائی رضا احمد کو کچھ بھی نہ دیا۔ رضا احمد کی بیوی ثمینہ بہت سمجھدار تھی۔ وہ ساری جائیداد سے دستبردار ہو گئی۔ اور اپنی ساس نسیمہ بانو کو اپنے پاس رکھ لیا۔ رضا احمد کے دو بچے تھے۔ احسن اور شاہانہ اور زمان احمد کے زبیر اور فرہاد۔ ثمینہ اور رضا احمد یہ دنیا چھوڑ گئے تو زمان احمد نے احسن اور شاہانہ کو ان کے حصے کی جائیداد دے دی اور شاہانہ کو فرہاد سے منسوب کر دیا۔

جاذب لاہور سے واپس آیا تو سب لان میں بیٹھے تھے۔ شاہانہ کی سہیلیاں ثنا اور عائلہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ ثنا، جاذب کی طرف بہت مائل نظر آ رہی تھی۔ مسرت کو یہ بات بُری لگی۔ ثنا کے جانے کے بعد شاہانہ نے مسرت پر طنز کیا۔ کہ وہ جاذب سے محبت کرتی ہے۔

دوسرے دن صبح مسرت نائٹی اور گاؤن پہنے جاذب کے ساتھ گھومنے چلی گئی تو شاہانہ نے اسے بھی محسوس کیا۔ تب مسرت نے شاہانہ سے کہا۔ کہ وہ لاشعوری طور پر جاذب کو پسند کرنے لگی ہے۔

شاہانہ اور مسرت جاذب کے ساتھ بازار جا رہی تھیں تو جیپ پر چڑھتے ہیں شاہانہ نے جاذب کا گریبان تھاما تو اس کا بٹن ٹوٹ گیا۔ شاہانہ کی نظر اس کے پھٹے ہوئے گریبان پر پڑی۔

شاہانہ کو مسرت کی بیماری کا پتا چلا تو وہ فوراً اسپتال پہنچی مسرت نے کہا کہ وہ سب کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔

شاہانہ رات کو اپنے کمرے میں تھی کہ فرہاد آ گیا۔ اس نے نقاب ڈال رکھا تھا لیکن اس کی انگوٹھی سے وہ پہچان گئی۔ شاہانہ کی چیخیں سُن کر جاذب آ گیا اس نے فرہاد کو مار کر بھگا دیا۔ احسن اور میمونہ بھی آ گئے انہوں نے جاذب کو مجرم سمجھا لیکن شاہانہ نے صفائی پیش نہ کی بلکہ خاموش رہی نہ ہی فرہاد کا بتایا۔ جاذب نے سارا قصہ بتایا۔ احسن اور میمونہ کو ضروری کراچی جانا تھا وہ جاذب اور شاہانہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

احسن اور میمونہ کے کراچی جانے کے بعد شاہانہ کی جاذب سے دوستی ہو گئی اور شاہانہ کے دل میں جاذب کی محبت نے گھر کر لیا تھا۔ فرہاد ایک دن آیا تو اس نے جاذب اور شاہانہ کو پاس بیٹھے دیکھا وہ بُری طرح دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ شاہانہ جاذب کے ساتھ کھانا کھانے گئی تو جاذب نے گاڑی ہوٹل کے باہر کھڑی کی تھی۔ پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے گاڑی کو توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالا۔ جاذب تھانے گیا —— گاڑی کو توڑنے والے گرفتار کر لیے گئے تھے۔

جاذب نے تھانے جا کر دیکھا تو وہ فرہاد اور اس کے ساتھی تھے۔ زمان احمد نے فون کر کے شاہانہ اور جاذب کو دھمکیاں دیں، تو وہ اور بھی پریشان ہو گئی، احسن ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ ان کا فون آیا تھا کہ وہ ایک دو دن میں واپس آ جائیں گے۔

اچانک شاہانہ کا پھوپھی زاد فاروق شاہانہ کی دادی کے ساتھ آ گیا۔ دادی جان شدید بیمار تھیں، فاروق فرہاد کا طرفدار تھا لیکن جب شاہانہ سے اسے حقیقت کا علم ہوا تو وہ بپھر گیا۔

نسیمہ بانو اسپتال میں تھیں۔ جاذب کو اس کی ایک پرانی دوست شمائلہ مل گئی۔ اسے طلاق ہو چکی تھی، شمائلہ بہت پریشان تھی۔ جاذب نے اسے تسلی دی۔ جاذب شمائلہ کے ساتھ لاہور جا رہا تھا۔ شاہانہ اسے رخصت کرنے گئی تو جاذب نے شمائلہ کے بچے کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔

شاہانہ لرز گئی، جاذب کے جانے کے بعد وہ مسرت سے ملنے چلی آئی، تو پتا چلا کہ مسرت کی لاہور میں اچانک منگنی ہو گئی ہے۔ وہ مسرت کے ہاں تھی کہ اس کا منگیتر سعید اچانک وہاں آ گیا۔ سعید نے زبردست چھچھورپن کا مظاہرہ کیا، شاہانہ کو وہ بالکل پسند نہیں آیا، مسرت نے کہا کہ اپنے محبوب جاذب سے میری شادی کرا دو۔

زمان احمد جاذب کے والد اور بھائی بھاوج کو ان کے گھر سے لے آئے، انہوں نے فرہاد کے خلاف مقدمہ ختم کرا دیا، شاہانہ مسرت کے گھر رہنے چلی گئی تھی، مسرت اور وہ شاپنگ کے لیے گئیں تو راستے میں ڈاکٹر زبیر مل گئے۔

مسرت نے ڈاکٹر زبیر سے کہا کہ انہیں اپنے گھر جانا چاہیے تاکہ حالات سدھار سکیں۔ ڈاکٹر زبیر نے ایک بہت اہم آپریشن کیا تو ٹی وی پر ان کا انٹرویو نشر ہوا۔ سعید رحیم جس سے حمیرا کی منگنی ہوئی تھی وہ آ گیا اور اس نے بہت چھچھورپن کا مظاہرہ کیا۔ ناہید ایک بچی کو لے کر آ گئی اور اس نے بتایا یہ فرہاد کی بچی ہے۔ تبھی فرہاد بھی آ گیا۔

فرہاد نے ناہید کی بیٹی کو اپنی بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ناہید اس بچی کو وحیدہ خانم کے حوالے کر کے چلی گئی۔

ایک رات مسرت نے شانو کو بتایا کہ سعید رحیم آ گیا ہے اور اس سے فوری نکاح کرنا چاہتا ہے۔ شانو یہ سن کر پریشان ہو گئی اور اس نے فون کر کے زبیر کو بلوایا۔ زبیر نے اظہار مدعا کر دیا کہ وہ مسرت سے خود شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ احسن اور میمونہ آ گئے۔

دوسرے دن احسن میمونہ اور زبیر مسرت کے گھر رشتہ لے کر گئے تو وہاں سعید رحیم آیا ہوا تھا۔ سعید رحیم نے وہاں بیہودگی کی۔ تبھی جاذب شمائلہ کے ساتھ آ گیا تو یہ انکشاف ہوا کہ سعید رحیم ہی شمائلہ کا شوہر ہے۔ جس نے شمائلہ کو طلاق دی ہے۔ سعید رحیم کی بے عزتی کر کے اسے نکال دیا گیا۔ زبیر اور احسن جب زمان لاج پہنچے تو وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک شخص عارفین بیٹھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ شاہدہ سے ملنے آیا ہے جو اسے خط لکھتی رہی ہے۔ فرہاد نے اپنی بیساکھی اٹھا کر اسے مارنا شروع کر دیا۔

قسط 31

"میرے اور شمائلہ کے بارے میں لوگ باتیں کر رہے ہیں مگر کیسی باتیں؟ ویسے یہ سب باتیں گھٹیا ذہنوں کی پیداوار ہوں گی۔" جاذب شنارے ایسے بے باک سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا —— تبھی گڑبڑا گیا۔

"جاذب بھائی! کوئی بات ہوتی ہے تو تبھی بات بنتی ہے نا —؟" مسرت نے شکایتی انداز میں کہا۔

"ارے مسرت! تم بھی فضول لوگوں کی باتوں میں آ گئی ہو۔ میں تمہیں تو بہت سمجھدار سمجھتا تھا۔"

"اور میں بھی آپ کو بہت عظیم اور بلند سمجھتی تھی۔ تبھی آپ کو بھائی بنایا تھا اور پھر شانو کی نسبت سے تو آپ زیادہ ہی عزیز ہو گئے تھے۔ مگر یہ کیا کہ آپ نے شمائلہ کو میری سہیلی پر ترجیح دی اور شانو کی زندگی دکھوں سے بھر دی۔" مسرت بالکل ضبط نہ کر سکی اور رو دی تو کمرے میں ایک دم سناٹا پھیل گیا۔ پھر شاہانہ بڑے ضبط سے بڑھی اور سہیلی کو گلے سے لگا لیا۔

"مسرت! مسرت! میں بالکل نارمل ہوں۔ اور خدانخواستہ میری زندگی میں کوئی ایسا دکھ نہیں ہے۔ تم — تم یہ غلط فہمی دور کر لو اور خدارا آنسو مت بہاؤ۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" شانو کا چہرہ زرد ہو گیا۔

"مسرت — ! میرے اور شانو کے درمیان جو باتیں بھی ہوئی ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ شانو کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ تبھی وہ نارملی بی ہیو کر رہی ہیں۔ اور میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہمارے بیچ شمائلہ کی وجہ سے دوری نہیں آئی اور نہ ہی شمی سے ہمارے تعلقات اس نوعیت کے ہیں جیسے بدفطرت لوگ افسانے گھڑ رہے ہیں۔ وہ میرے لیے اتنی ہی محترم ہے جیسے کہ مسرت، تم اور شانو ہو۔" وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"خیر، رہنے دیجیے جاذب صاحب۔ خواہ مخواہ اتنی وضاحتیں دے رہے ہیں آپ ورنہ تو ہم میں اتنا حوصلہ ہے کہ شمائلہ کو اپنے ہاتھوں سے سجا کر آپ کے ساتھ بھیج دیں۔ وہ کیا شعر ہے۔

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

شاہانہ نے بڑے حوصلے سے مسکراتے ہوئے شعر پڑھا مگر مسرت نے تلملا کر باقی شعر پورا کیا۔

"اور — اور آگے بھی تو پڑھو۔ پورا قطعہ پڑھو نا۔ ایک شعر کیا سنا رہی ہو۔" وہ آبدیدہ ہو گئی

سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی

کیوں جاذب آخر شاہانہ نے ایسا کیا قصور کیا ہے جو آپ اس کی زندگی میں تاریکیاں گھول رہے ہیں؟"

"اوہو مسرت۔ بھئی تم کیا شکوے شکایتیں کر رہی ہو۔ جب کہ مجھے پروا بھی نہیں ہے۔" شاہانہ جھنجلا کر کھڑی ہو گئی۔ اور دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر سامنے سے آتے ہوئے زلفی و احسن سے ٹکرانے لگی تھی کہ انہوں نے کاندھوں سے پکڑ کر سنبھال لیا۔ پھر جاذب سے مخاطب ہوئے۔

"جاذب۔ وہ شمائلہ اور مسز عثمان گھر جانے کے لیے تمہاری منتظر ہیں۔ وہ تمہیں بلانے آ رہی تھیں کہ میں نے کہا کہ میں تمہیں بلاتا ہوں مگر بھائی کرنل شکیل کا احسن کا اور خود میرا خیال ہے کہ تم ذرا شمائلہ وغیرہ سے دور رہو۔ ہمیں پختہ یقین ہے کہ تم پر حملہ سعید رحیم نے ہی کروایا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابھی ابھی حمیرا نے ہمیں ایک عجیب و غریب بات بتائی ہے۔ تو اس کی تصدیق کروانے کے لیے کرنل شکیل ہمارے ساتھ ہمارے گھر جا رہے ہیں۔ وہ بابا دلاور ہمارے ملازم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ تم بھی ہمراہ چلو۔" زلفی کے آنے سے بات بدل گئی تھی۔

"اچھا تو پھر آپ لوگ شمائلہ اور فرحت باجی کو گھر بھجوا دیجیے۔ ویسے یہ بھی تو ممکن ہے نا کہ سعید رحیم نے شمائلہ کو ختم کرنے کے لیے حملہ کیا ہو۔ اور اب اگر ان کو اکیلے بھجوا دیا تو وہ دوبارہ کوشش کرے۔" جاذب نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"کرنل شکیل۔ کسی گارڈ وارڈ کو ساتھ بھجوا دیں گے ان کے۔" احسن بولے تو جاذب چپ ہو رہا۔

یوں وہ سب سٹنگ روم میں آ گئے۔ شانو بڑھ کر نورین بھابھی کے والد سے ملی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے پہلو سے لگا کر سر پر پیار کیا۔

"انکل! اب آپ ہمارے ساتھ گھر چل رہے ہیں ناں —؟" شانو نے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں بھئی، ہم لوگ تو ہوٹل میں ٹھہر رہے تھے مگر مونا بیٹی اور احسن خفا ہو گئے اور ہمارا سامان ہوٹل سے منگوا لیا ہے۔"

شانو باتیں تو نورین وغیرہ سے کر رہی تھی مگر اس کی نگاہیں سامنے کھڑی شمائلہ و جاذب پہ جمی تھیں اور کان بھی ادھر لگے تھے۔

"ہاں شمی۔ میں پھر کل چکر لگاؤں گا۔ اب تو کرنل صاحب کے ساتھ جاؤں گا۔ نہ جانے کب فرصت ملے۔ ہاں۔ تم بھی گھر سے باہر مت نکلنا اور بچوں کو بھی اسکول مت بھیجنا۔ جب تک تسلی نہیں ہو جاتی تم سب محتاط رہنا۔" وہ باتیں کرتا ان کے ہمراہ باہر نکل گیا۔

پھر کرنل صاحب بھی سب کو ہمراہ لے کر باہر آ گئے۔ شناء اور رابعہ ہمراہ چلنا چاہتی تھیں مگر کرنل نے منع کر دیا تھا۔ پھر مسرت شاہانہ اور حمیرا زلفی کی کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ جب کہ احسن کی کار میں کرنل شکیل، جاذب، نورین کے والد صمدانی صاحب، مونا اور نورین بیٹھ کر زلفی کے گھر پہنچ گئے تھے اور جاتے ہی خان دلاور کو کرنل اور زلفی نے بلوا بھیجا۔ فیضو بابا جا کر اسے اپنے کوارٹر سے اُٹھا لائے۔

"السلام علیکم چھوٹے صاحب جی! آپ نے بلایا ہے ہم کو۔؟" وہ زلفی سے مخاطب ہوا۔

"دلاور خان! میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ ذرا یہاں آ کر بیٹھیے۔" کرنل شکیل نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ تو وہ جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔

"خان صاحب! مجھے آج حمیرا بی بی نے بتایا ہے کہ سعید رحیم کی گاڑی میں سے آپ نے کلاشنکوف نکالی تھی۔ ذرا وہ تو تفصیل بتائیے گا۔؟"

"سر جی! وہ گاڑی سعید رحیم کی نہیں تھی جی بلکہ جب وہ یہاں سلطان پور آتے تھے تو بڑے صاحب کی گاڑی مانگ کر لے جاتے تھے۔ یا زلفی میاں کی موٹر لے جاتے تھے۔ تو ایک دن وہ آئے اور جمیل صاحب کی گاڑی مانگ کر لے گئے۔ پھر وہ کوئی تین گھنٹے بعد آئے اور کار کی چابی مجھے دی۔ میں نے کار گیراج میں کھڑی کرنے کے بعد اسپیئر وہیل رکھنے کے لیے ڈکی کھولی اور جب ٹائر رکھنے کے لیے جگہ بنانے لگا تو ٹول اور دوسرے وہیل کے نیچے سے کلاشنکوف نکلیں۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی شک ہوا تو میں نے ان میں سے ایک کلاشنکوف نکال کر اندر لا کر سعید صاحب کو دکھائی تو وہ گھبرا گیا اور میرے ہاتھ سے چھین کر دوبارہ کار میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا۔ ویسے صاحب آپ ناراض مت ہوئیے گا۔ چونکہ مجھے شک ہو گیا تھا تبھی میں دوسری گاڑی میں اس کے پیچھے گیا۔ سعید صاحب شادمان کالونی میں پیلی کوٹھی پر گیا۔ پھر دس منٹ بعد وہ گاڑی واپس چھوڑ کر ایئرپورٹ چلا گیا۔ صاحب ہم نے پیلی کوٹھی کے اردگرد رہنے والوں سے پتا کیا۔ وہاں کچھ ٹھیک لوگ نہیں رہتے ہیں جی۔" دلاور جھجکتے جھجکتے بول رہا تھا۔

"دلاور خان! تم وہ گھر ہمیں دکھانا۔ اور یار ابھی تم نے کہا ہے کہ جب تم نے ڈکی سے کلاشنکوف نکالیں تو ان میں سے ایک نکال کر سعید رحیم کو دکھائی تھی۔ تو کیا ایک سے زیادہ تھیں؟"

"جی جی صاحب۔ وہاں تین کلاشنکوف تھیں۔ دو ہم نے چھپا لیا تھا۔ ہم دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے آیا سعید صاحب کو پتا بھی چلتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں پتا چلے گا تو اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ کافی بندوقیں وندوقیں تھیں۔ پھر ہم نے فیضو بابا کو اعتماد میں لے کر سارا قصہ سنایا اور اس کو بولا کہ ہم زلفی میاں کو سب کچھ بتا دیں گے مگر فیضو بابا نے مجھے سختی سے منع کر دیا۔ کہ ہونے والے داماد کا معاملہ ہے۔ تم تو زبان بند ہی رکھو۔ تبھی صاحب میں چپ تھا۔"

"شاباش ہے تم پر دلاور خان! تم نے چپ رہ کر ہم سب کو تو مروا ہی دیا تھا نا۔ نصیبہ ہی پھوٹ جاتا آپ کی مسرت بیٹی کا اگر وہ اس سے بیاہ دی جاتی اور وہ سعید نکلتا کوئی اسمگلر، غدارِ وطن؟ کم از کم آپ مجھے ہی بتا دیتے اس مشکوک آدمی کے متعلق۔ اور وہ دونوں کلاشنکوف کہاں ہیں؟"

زلفی بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دلاور خان اٹھ کر گیا۔ پھر فیضو بابا سمیت واپس آیا۔ انہوں نے چادروں میں لپٹی چمکتی ہوئی کلاشنکوف نکال کر ان کے سامنے کیں۔ تو کرنل شکیل نے اور زلفی نے جھپٹ کر وہ خطرناک ہتھیار اٹھا لیا۔

"جاذب! ذرا ادھر دیکھو۔" کرنل شکیل نے تشویش بھرے انداز میں بٹ پر اُبھرے چند ہندسوں، لفظوں کی طرف اشارہ کیا تو جاذب کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

"شکیل بھائی! یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب شہر میں تخریب کاری کے لیے لایا گیا بھاری اسلحہ پکڑ لیا گیا تھا۔ میر رستم کو خبر ہو گئی تھی اور انہوں نے فوراً چھاپہ مار کر اسلحہ پکڑ لیا تھا۔ چند تخریب کار پولیس مقابلے میں مارے بھی گئے تھے۔" زلفی نے بتایا۔

"یہی نہیں بلکہ ہمارے ایک ڈپو سے بھی اسلحہ غائب کیا گیا ہے جس کی خفیہ طریقے سے تفتیش ہو رہی ہے۔ تو میں ابھی اپنی ہائی کمان سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ یہ کوئی لمبا چکر ہے۔" کرنل شکیل فون کی طرف بڑھے۔ پھر وہ کہیں بات کرنے کے بعد جاذب و زلفی کو ہمراہ لیے چلے گئے۔ مونا اور شانو اجازت لے کر گھر آ گئی تھیں۔ نورین بھابھی کے ہمراہ تھیں۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ تبھی جاتے ہی سب سونے کے لیے چلے گئے تھے۔ پھر صبح ایک نئے ہنگامے نے سر اُبھارا تھا۔ سبھی ناشتے کی میز پر اکٹھے تھے۔ رات کی باتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف باتیں ہو رہی تھیں کہ انا بی ٹرالی میں ناشتا لگائے گزریں۔

"انا بی! دادو سے کہنا ہم ابھی ناشتا کر کے انہی کے پاس آتے ہیں۔ کل سے انہیں دیکھا ہی نہیں ہے۔" مونا نے کہا۔

"دادو! کیا نسیمہ بانو یہاں ہیں آپ کے ہاں؟" نورین حیرت سے بولیں۔

"تمہیں معلوم نہیں تھا کہ دادی اماں ہمارے ہاں تھیں۔" مونا نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ مگر مجھے ایسی بہت سی باتوں کا پتا ہے جس کی آپ کو خبر تک نہیں ہے۔" وہ ہنس کر بولیں۔ پھر وہ اپنی پیالی سنبھالے اٹھ کھڑی ہوئیں اور کہا کہ وہ چائے دادو کے پاس چل کر پئیں گی۔

مونا شانو ابھی اُٹھی ہی تھیں کہ فاروق اندر آ گیا اور وہ نورین بھابھی کو دیکھ کر نہ صرف حیران ہوا بلکہ گھبرا سا بھی گیا۔

"زمان چچا کی طبیعت کیسی ہے۔" احسن اور صمدانی صاحب نے استفسار کیا۔

"کافی بہتر ہے ان کی طبیعت۔ جب سے زبیر بھائی واپس آئے ہیں اور ان کی منگنی مسرت باجی سے ہوئی ہے یوں لگتا ہے جیسے ماموں زمان کو قرار مل گیا ہو۔ اور فرہاد کے نکاح سے بھی وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔" فاروق نے بتایا۔

"ہائیں۔ کیا زبیر اور مسرت کی منگنی ہو گئی ہے۔ اور۔ اور یہ فرہاد کا نکاح کس بدنصیب لڑکی سے ہوا ہے؟" نورین پریشان ہو کر رک گئی تھیں تو میمونہ نے ہنس کر کہا۔

"دیکھا نورین! ہمیں بھی ایسی بہت سی باتوں کا پتا ہے جن کی تمہیں بھی خبر نہیں ہے۔ تو پھر ایسا کیوں نہ کریں کہ۔ جو کچھ تمہیں نہیں معلوم وہ میں تمہیں بتا دوں۔ اور جو کچھ ہمیں نہیں معلوم وہ تم ہمیں بتا دو۔؟"

مونا نے شرط رکھی تو نورین نے ہامی بھر لی۔ پھر وہ لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے نسیمہ بانو کے بیڈ روم کی طرف بڑھنے لگیں۔ مونا نورین کو جو کچھ بتا رہی تھیں وہ ان کے لیے بے حد حیران کن تھا۔ تبھی تو وہ گم صم سی دروازے میں ہی کھڑی رہ گئی تھیں۔ شانو نے انہیں حیرتوں میں گم دیکھا تو نورین کے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑ لی تھی اور میز پر رکھ دی۔ مگر نورین تو۔ فرہاد اور ناہید کے نکاح کی داستانِ ہوشربا سننے میں محو تھیں۔

"مونا بہو! شانو! اندر آ جاؤ۔ یہ اتنی دیر سے دروازے پر کیوں کھڑی ہو؟" نسیمہ بانو نے پکارا۔ نورین کان چھوتی ہوئی توبہ توبہ کرتی اندر داخل ہوئیں تو نسیمہ بانو انہیں دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"ارے نورین بیٹی۔ تم کب واپس آئی ہو۔ بھئی، مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں چاند بلکہ کچھ دیر پہلے میری تمہاری ساس راشدہ سے فون پر بات بھی ہوئی ہے۔" وہ حیران تھیں۔

"بڑی اماں! میں ابو کے ساتھ آئی ہوں شناء کے نکاح کی تقریب میں شریک ہونے کے لیے۔ اور میرے سسرال والوں کو نہ میرے آنے کی خبر ہے اور نہ ہی میں چاہتی ہوں کہ انہیں خبر ہو۔ میں ان ظالم، بے اصول لوگوں سے کوئی تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتی ہوں۔"

نورین ان سے جھک کر ملتے ہوئے افسردگی سے بولیں مگر نسیمہ بانو کو اس کی بات بری لگی تو وہ ٹوک بیٹھیں۔

"نہیں بیٹا! تم سمجھدار ہو، ہوشمند اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ تمہیں ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالنی چاہئیں۔ پھر میاں بیوی کے جھگڑے تو ہر گھر میں ہوتے ہی رہتے ہیں مگر کوئی یوں اپنے حق سے، گھر و شوہر سے دستبردار تو نہیں ہو جاتا ہے نا۔"

"بڑی اماں! شوہر سے جھگڑا تو کم ہی ہوا ہے مگر آپ کی صاحبزادی، ہماری ساس۔ ان سے تو روزانہ ہی جھڑپ ہونے لگی تھی۔ حالانکہ میں تو صبر کیے خاموش ہی رہتی تھی مگر اب تو بات ذاتیات سے میرے والدین کی عزت تک جا پہنچی تھی۔ اور پھر اب تو وحیدہ ممانی اور ان کی لاڈلی صاحبزادی شاہدہ وہ کل کی بچی بھی مجھ زبان درازی کرنے، توہین کرنے لگی تھی۔ پھر باقی کسر فرہاد نے پوری کر دی۔ انہوں نے بلاوجہ میری اتنی بے عزتی کر دی۔ حالانکہ میری ساس مجھ سے جھگڑا کر رہی تھیں کہ میں نے اپنے میاں کو سکھایا ہے کہ الگ گھر لے کر رہو۔ تب تک تو شکیل سے میں نے ایسی کوئی فرمائش کی بھی نہیں تھی نہ جانے کیسے شکیل نے ماں سے تذکرہ کر دیا۔ تو وہ سمجھیں یقیناً میں نے

سکھایا پڑھایا ہوگا۔ حالانکہ میرے میاں پوری طرح سے اپنی والدہ کے تابعدار ہیں، میری بات پر تو کان نہیں دھرتے۔ بس پھر مجھے بھی دکھ ہوا جب راشدہ خالہ میرے والدین کو کوسنے لگیں۔ تب میں نے صبر کرتے ہوئے جل کر کہا کہ پہلے تو میں نے شکیل سے علیحدہ رہنے کو نہیں کہا تھا مگر اب میں سمجھتی ہوں کہ اس روزانہ کی تکرار اور جھگڑے سے بچنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم علیحدہ گھر لے لیں۔ بس یہ سنتے ہی وہ چھوٹے میاں فرہاد چائے کی پیالی پٹخ کر کھڑے ہوگئے۔ اور مجھ سے کہنے لگے "کمینے خاندان کی کم ذات عورت! تم اس گھر سے قدم باہر رکھ کر دکھاؤ، میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اور وہ تمہارا پیلی صاحب انگریز کا بچہ باپ یہاں آیا تو اس کے ہاتھ پاؤں تڑوا کر سڑک پر پھنکوا دوں گا۔" یہ تمیز و لیاقت ہے آپ کے پوتے کی۔

بڑی اماں! میں تو یہ سنتے ہی حیران و ششدر رہ گئی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ فرہاد میری ساس اور بے غیرت شوہر شکیل اور سب گھر والوں کی موجودگی میں میرے ساتھ ایسا لب و لہجہ اور زبان استعمال کرے گا۔ اور حد تو یہ تھی کہ گھر کے کسی بندے نے اٹھ کر فرہاد کے منہ پر طمانچہ نہیں مارا۔ اسے بکواس بند کرنے کے لیے نہ کہا۔ شکیل بھی میری بے عزتی کروا کر چپ بیٹھے رہے۔

تب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور میں نے رابعہ اور کرنل شکیل کو فون کرکے ابو کو لاہور سے فون کروا کر بلوالیا اور میں وہاں اس زنداں سے نکل آئی۔ معاف کیجیے گا بڑی اماں۔ ایک بیوی کو اپنی حفاظت، دفاع خود ہی کرنا ہے تو پھر ایسے اتنے بے غیرت، بے حس شوہر کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پھر تو وہ تنہا ہی بھلی ہے۔ ویسے بھی آپ کی بیٹی نے اپنے بیٹے کی پسند کو کبھی دل سے قبول ہی نہیں کیا تھا۔ شکیل نے اپنی مرضی و ضد میں مجھے پسند کرکے شادی کی تھی۔ آپ کی بیٹی کو یہی صدمہ و غصہ ہے جو ان کے دل سے نکلتا ہی نہیں اور پھر شنار تیار ہی تھی۔ کہ آپ کی صاحبزادی شکیل کے لیے بڑے زور و شور سے دوسری دلہن تلاش کر رہی ہیں۔ اور اسی سلسلے میں وہ شنار کے لیے بھی ان کے گھر گئی تھیں۔ مگر رابعہ بھابھی نے انہیں بے عزت کرکے چلتا کیا۔ مگر وہ بھی ایسی ڈھیٹ ہیں کہ دوسرے ہی دن فون کرکے کہنے لگیں۔ رابعہ بیٹی اگر شنار کا رشتہ ہو چکا ہے۔ تو تم مجھے عمائلہ دے دو۔ وہ بھی اپنی بچی ہے۔ تو رابعہ نے انہیں سختی سے انکار کرتے ہوئے منع کیا کہ آئندہ نہ تو وہ ان کے گھر کا رخ کریں نہ ہی انہیں فون کریں۔ انہیں تو بلکہ خود لحاظ و شرم کرنی چاہیے تھی کہ نورین سے میرا بہناپا ہے، دوستی ہے۔ پھر وہ ہمارے گھر رشتے کی بات چلا رہی ہیں۔"

نورین نے افسردگی سے کہا تو نسیمہ بانو نے بے یقینی سے اسے دیکھا

"فرہاد نے یہ سب تم سے کہا۔ اور راشدہ شکیل کے رشتے تلاش کر رہی ہے؟" انہوں نے دہرایا۔

"ہاں اگر میری بات کا یقین نہیں آرہا تو لیجیے، یہ آگئی ہیں راشدہ خالہ، وحیدہ ممانی اور خود شکیل صاحب تو آپ ان سے تصدیق کروا لیجیے" نورین نے ایک دم دروازے کی طرف اشارہ کیا تو سب نے چونک کر دیکھا۔ واقعی وہ سب لوگ وہاں کھڑے تھے۔ وہ نہ جانے کس وقت آگئے تھے۔ باتوں میں کسی نے کاروں کی آواز ہی نہ سنی تھی۔

"کیوں راشدہ! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ یہ تم لوگوں نے کیا تماشا بنا دیا ہے؟" وہ خفگی سے بولیں۔

"بس اماں، یک طرفہ سن کر فیصلہ صادر مت کریں۔ ویسے تماشا تو ہمارے خاندان کا بن کر رہ گیا ہے۔ عجیب عجیب انہونیاں ہو رہی ہیں" راشدہ منہ بناتی ہوئی اندر آگئیں۔ شکیل بھی غور سے بیوی کو دیکھتا ہوا آکر نانی نسیمہ کے قریب بیٹھ رہا تھا تو نورین اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"کیوں بھئی تم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو سلام دلام نہیں کرو گے؟" نسیمہ بانو نے کہا تو سب خاموش رہے۔

"السلام علیکم۔ ارے یہ تو میری گڑیا بھابھی آئی ہوئی ہیں۔ وہ فاروق نے ابھی فون کرکے بتایا کہ نورین بھابھی اور انکل آئے ہوئے ہیں تو میں سب کو گھیر گھار کر لے آیا۔ میں نے انہیں دھمکی دی کہ اگر یہ ہمراہ نہیں چلیں گے تو پھر میں اکیلا ہی اپنی بھابھی سے ملنے، منانے چلا جاؤں گا۔"

جمیل بڑی گرمجوشی سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ پھر جاکر نورین بھابھی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ نورین نے بھی دیور کی پیشانی پر پیار کیا۔ وہی تو ایک تھا سسرال میں جو دل سے بھابھی کی عزت و پیار کرتا تھا۔ اور اپنی ماں اور بھائی سے بھی الجھ پڑتا تھا۔

"کیا بات ہے۔ آپ کافی دبلی ہو رہی ہیں۔" جمیل ان کے کاندھے کے گرد بازو ڈال کر بولا۔

"میں بہت بیمار رہی ہوں جمیل" نورین نے گلوگیر آواز میں کہا تو شکیل نے ایک دم بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی زرد ہو رہی تھی۔ شکیل کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ آخر نورین ان کی دل پسند بیوی تھی۔ کتنی مشکلات کو دور کرکے کتنی مخالفتوں کو کچل کر شکیل نے اسے شریکِ زندگی بنایا تھا۔ مگر پھر ماں نے ہر وقت کان بھر بھر کر شکیل کو بیوی سے کسی حد تک متنفر کر دیا تھا اور اب جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ۔ کئی ماہ سے ان کی علیحدگی ہوگئی تھی اور معاملہ کچھ زیادہ ہی گمبھیر صورت اختیار کر گیا تھا۔ شکیل کا آشیانہ شعلوں کی زد میں تھا اور کوئی بھی چنگاری اسے بھسم کر سکتی تھی۔

اور اب شکیل کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ نورین حق پر تھی، سچی تھی اور ماں نے وحیدہ کے ہمراہ مل کر۔ محض اپنی انا کی تسکین کی خاطر نورین کو زچ کیا تھا اور اب بھی وہ زبردستی یہاں لائی گئی تھیں ورنہ ان کا تو نورین کو منا کر واپس گھر لے جانے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ پھر احسن اور مسٹر صمدانی بھی نسیمہ بانو کے کمرے میں آگئے۔ انہوں نے مزاج پرسی کی تو نسیمہ بانو نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

"خالہ جی! آپ جدہ سے کب تشریف لائی ہیں۔۔۔؟" وہ حیرانی سے بولے تو نورین جھٹ بولیں۔

"ارے ابو! جس دن میں آپ کے ساتھ ان کا گھر چھوڑ کر آگئی تھی۔ یہ لوگ انہیں لینے تو گئے ہوئے تھے ایئرپورٹ۔ آپ جب کرنل شکیل سے کار لینے گئے تھے اور میں سامان پیک کر رہی تھی تبھی یہ آگئی تھیں مگر میں ان سے ملی نہیں تھی اور دوسری طرف سے نکل کر آپ کے ساتھ آگئی تھی"

نورین نے بھانڈا پھوڑ دیا تھا اور شاہانہ، احسن اور مونا کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

اُف، نسیمہ بانو اور فاروق نے تو کہا تھا کہ وہ سیدھے ہی ایئرپورٹ سے ان کے گھر چلے آئے ہیں۔ اور زمان وغیرہ کو تو ان کی آمد کا علم ہی نہیں ہے۔

اُف اس قدر بڑا جھوٹ اور دھوکا دینے کی کوشش۔۔۔؟ احسن، مونا، انابی سبھی ششدر رہ گئے تھے۔

"نہیں نورین! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی، کیونکہ دادی اماں جب پاکستان پہنچیں تو اس قدر بیمار تھیں۔ انہیں فالج ہوا تھا۔ اور ایمبولینس میں اسٹریچر پر ڈال کر فاروق انہیں سیدھا ہمارے گھر لایا تھا۔ پھر زمان چچا کے گھر تو یہ گئیں ہی نہیں اور تب سے اب تک ہمارے ہاں ہیں۔ اور کافی بیمار ہیں۔"

مونا نے جان بوجھ کر شک مٹانے کے لیے سوال کیا۔

"ہائے خدا کا خوف کریں مونا بھابھی! بھلا مجھے غلط فہمی یا دھوکا کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کی آمد کا فون خود میں نے سنا تھا۔ اور گھر والوں کو بتایا تھا کہ دس تاریخ کو بڑی اماں فاروق کے ساتھ جدہ سے آرہی ہیں۔ دراصل زمان انکل نے بھی انہیں فون کرکے بلوایا تھا۔ اور انہیں بتایا تھا کہ احسن اور شاہانہ سے تعلقات بہت ہی بگڑ چکے ہیں۔ یہاں تک کہ شاہانہ نے فرہاد کو مارا پیٹا ہے اور شادی سے بھی انکار کر دیا ہے۔ تو اب وہی آکر ہی بگڑی صورت حال کو کچھ سنبھال سنوار سکتی ہیں" نورین حیران کن انکشاف کر رہی تھیں۔ اور احسن مونا کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا تھا۔

"پھر احسن بھائی دس تاریخ کو شام چھ بجے کی فلائٹ سے بڑی اماں پاکستان پہنچیں اور ساڑھے سات بجے انہوں نے زمان لاج میں قدم رکھا تھا" نورین ہنس کر بولیں۔

"اور پھر یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تندرست تھیں۔ انہیں تو کوئی فالج والج نہیں ہوا تھا اور مجھے تو یہ سن کر حیرت ہو رہی ہے کہ ایئرپورٹ سے ایمبولینس یا اسٹریچر پر ڈال کر لائی گئی تھیں"

"مگر ہمارے گھر تو دادو ـــــ پندرہ تاریخ کو لائی گئی تھیں۔ یعنی چار دن یہ زمان لاج میں رہیں"

شاہانہ اس وقت تک حساب کر چکی تھی۔ وہ تیوری چڑھا کر بولی۔ اور فاروق بمعہ نسیمہ بانو کے ان کی تو ہوائیاں تو باقاعدہ اُڑ رہی تھیں۔

"دادو! یہ سب میں کیا سن رہا ہوں۔ آخر آپ نے ہم سے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا۔ کیوں یہ ڈرامہ رچایا۔" احسن کی آواز بھرا گئی۔ اور سب گم صم تھے۔

راشدہ بیگم، وحیدہ، شکیل اور فاروق کی حالت تو دیدنی تھی۔

شاہانہ تو سکتے سے اکھڑ گئی تھی۔ وہ تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور خفگی سے دادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو سر جھکائے ہونٹ کاٹ رہی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے دادو۔ میرے والد آپ کی سوتیلی اولاد تھے اور یہ جو آپ نے خاندان بھر میں یہ مشہور کر رکھا ہے رضا آپ کا لاڈلا اور پسندیدہ بیٹا تھا تو وہ بھی ایک ڈرامہ ہی تھا۔" شاہانہ ضبط نہ کر سکی۔ "ارے۔ اگر آپ کو رضا بدنصیب سے محبت ہوتی نا۔ تو پھر ان کی اولاد سے انس ہوتا۔ ان کی محبتوں کا احساس ہوتا۔"

شاہانہ بری طرح سے رو دی تھی۔ بہت سے دکھ اکٹھے ہو چلے تھے۔ ویسے بھی جاذب کے بدلنے اور زندگی سے نکل جانے کے صدمے کو اس نے نہ جانے کس طرح خشک آنکھوں کے ساتھ برداشت کر لیا تھا۔

"السلام علیکم!" تبھی مسرت اندر آ گئی۔ پھر سبھی لوگوں اور شاہانہ کو اس طرح سے بلکتا دیکھ کر بری طرح سے پریشان ہو کر لپکی۔

"شانو! کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" وہ شانو کے کاندھے ہلا کر بولی تو وہ روتی ہوئی اپنی سہیلی سے لپٹ گئی تھی۔ پھر مونا نے مسرت سے کہا کہ شانو کو وہاں سے لے جائیں۔

"یہ کیا کر دیا ہے آپ نے دادو! کیوں کیا ہے ایسا؟" احسن نے رنجیدگی سے کہا۔ پھر وہ بھی اٹھ کر شاہانہ کے پیچھے باہر نکل گئے تھے۔

"اوہو! معاف کیجیے گا بڑی اماں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ لوگوں نے کسی پلان کے مطابق عمل کیا ہے۔ اور کسی مصلحت کے تحت یہ ڈرامہ کیا گیا ہے۔ میں نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے سب کام بگاڑ دیا ہے۔" نورین نے معذرت کی مگر اس کی ساس راشدہ بیگم کو فساد بڑھانے کا موقع مل گیا تھا۔

"بس بس بی نورین۔ میں کیسے مان لوں کہ تم نے پہلے ہی سے میمونہ وغیرہ کو یہ سب کچھ نہیں بتا دیا ہوگا۔"

نورین بھی ضبط نہ کر سکی۔ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی۔ شکیل نے بے چینی سے پہلو بدلا مگر جمیل لپکتا ہوا اپنی لاڈلی بھابھی کے قریب پہنچا اور اس کے گرد بازو ڈال لیے۔ پھر غصے سے اپنے بزدل بے حس بھائی شکیل کی طرف دیکھا۔ مگر وہ ویسے ہی بیٹھا رہا۔

"نورین بیٹی! تم خواہ مخواہ رو رہی ہو۔ اگر تمہارے سسرال والے تمہیں قبول کرنے کو تیار نہیں۔ تمہارے شوہر کو تمہاری ساس کو تمہاری ضرورت نہیں ہے تو نہ سہی۔ مگر میری تم اکلوتی بیٹی ہو۔ مجھے تو تمہاری ضرورت ہے نا۔ چلو اٹھو مسرت تمہیں لینے آئی ہے۔" صمدانی صاحب بڑھے اور نورین کو تھام کر دروازے کی طرف بڑھے۔ تبھی شکیل ایک دم سے اٹھا اور اپنے سسر صمدانی صاحب کے سامنے جا کھڑا ہوا اور جھجکتا ہوا بولا۔

"انکل! میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

"نہیں میاں شکیل۔ باتیں تو بہت ہو چکی ہیں ہمارے درمیان۔ جب تم لاہور آئے تھے۔ تب بہت اچھی طرح سے تمہاری والدہ نے اپنے موقف کو ہم پر واضح کر دیا تھا اور ہم نے بھی اپنے موقف یا مطالبات کو واضح طور پر بتا دیا تھا۔ پھر اب باتوں کی گنجائش نہیں رہی۔ کیونکہ اب تو عملاً تمہیں کچھ کرنا تھا۔ جو کہ تم نے نہیں کیا ہے یعنی اپنے ماموں کے در پر ان کے ٹکڑوں پر پڑے رہنے اور میری بیٹی کو اپنی ممانی اور ان کی اولادوں کے طنز کا نشانہ بنوانے سے تو بہتر تھا کہ تم علیحدہ گھر لے لیتے۔ میاں میں نے تو تمہاری چاہت اور شدید خواہش دیکھ کر تمہیں نورین کا رشتہ دیا تھا مگر صد افسوس کہ تم تو انتہائی بودے اور بزدل کم ظرف انسان نکلے ہو۔ خیر ہمیں اپنی بیٹی نہ بوجھ تھی نہ بوجھ ہے اور اب ہم انتہائی قدم بھی اٹھائیں گے۔" وہ تنبیہہ کرتے ہوئے باہر چلے گئے تو جمیل ان کے پیچھے لپکا۔

"اماں میرا خیال ہے کہ اب آپ ہمارے ساتھ ہی چلیے۔ یہاں تو اب آپ سے کوئی بات کرنے کا روادار نہیں ہوگا۔" راشدہ بیگم تنک کر بولیں۔

"مبارک ہو آپ سب کو کہ آپ کا مشن کامیاب ہو گیا ہے اور نورین بھابھی کے والد وکیل سے مشورہ کرنے گئے ہیں اور وہ شکیل صاحب سے طلاق کے لیے عدالت سے رجوع کریں گے۔" تبھی جمیل واپس آ گیا۔ اس نے اطلاع دے کر گویا بم دے مارا تھا۔ سبھی اپنی اپنی جگہ گم صُم رہ گئے۔ راشدہ بیگم و شکیل کے چہروں پر مردنی چھا گئی تھی۔ معاملہ اس حد تک بڑھ جائے گا انہیں گمان نہ تھا

"اور اماں آپ کو اطلاع دے دوں کہ میری بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر ملتان تقرری ہو گئی ہے اور میں اس ماہ کے آخیر تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔" جمیل غصے سے سلگ کر کہتا باہر چل دیا تو شکیل اسے پکارتا ہوا لپکا۔ پھر نہ جانے دونوں بھائی کیا باتیں کرنے لگے تھے۔ شکیل یکایک بہت پریشان لگ رہا تھا۔

"چلیے اماں! جلدی گھر چلیے۔ میری تو اپنی طبیعت خراب ہونے لگی ہے۔" راشدہ بیگم کمزور لہجے میں بولیں۔

نسیمہ بانو جھجکتی ہوئی پلنگ سے اتریں۔ نہ تو ان کی فالج زدہ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ نہ ہی ہاتھ بے قابو تھے۔ وہ اب بغیر سہارے کے اٹھی کھڑی تھیں۔ تو وہ سب کچھ واقعی ڈرامہ ہی تھا۔ انا بی اور میمونہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور صبر کے گھونٹ بھر لیے۔

"توبہ اللہ معاف کرے بڑی بیگم صاحبہ۔ آپ نے تو حد ہی کر دی۔ ایسا لمبا ڈھونگ ایسی اداکاری کہ اسپتال تک جا پہنچیں۔ سوئیوں سے خود کو چھدوا لیا اور یہی نہیں آپ نے شاہانہ اس یتیم مسکین پر کیا ظلم توڑا ہے کچھ اس کا احساس ہے آپ کو۔ ہائے بی بی! یہ کیسا قہر توڑا آپ نے۔"

انا بی نے ہاتھ ملتے ہوئے دکھ سے کہا تو نسیمہ بانو کا دل گھٹ گیا۔ انہوں نے خوف زدہ نظروں سے انا بی کی سمت دیکھا۔ ایسے پہلے ہی ان کے خلاف اتنے انکشافات ہو گئے ہیں۔ تو اب اگر انا بی نے یہ بتا دیا کہ میرے کہنے سمجھانے پر، رونے پیٹنے پر جاذب شاہانہ سے دستبردار ہو کر یہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے تو پھر تو قیامت ہو جائے گی۔ وہ ڈر گئیں پسینے چھوٹ گئے تھے ان کے۔

"آؤ وحیدہ۔ راشدہ!" وہ سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھیں تو میمونہ نے آواز دے کر روکا۔

"دادی اماں آپ کے کپڑے، چیزیں یہ سب۔" مونا نے اشارہ کیا تو وحیدہ بیگم جھٹ بولیں۔

"انا بی سے کہنا کہ سب چیزیں اکٹھی کر دے گی۔ پھر میں موٹر بھیج کر منگوا لوں گی۔"

جب نسیمہ بانو ٹی وی لاؤنج میں سے گزریں اور وہ بھی اپنے پیروں پہ چلتے ہوئے تو نڈھال سا احسن وہیں ڈاکٹر خالد کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"ارے دادو آپ۔ آپ تو واقعی چل پھر لیتی ہیں؟" ڈاکٹر خالد انہیں یوں توانا، تندرست دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ "میں آپ کو دیکھنے آیا تھا مگر مجھے احسن نے روک کر ساری بات بتائی ہے۔ اللہ کی قسم۔ آپ نے تو ہم ڈاکٹرز کو بھی چکر میں ڈال دیا تھا دادو۔ تبھی تو وہ بڑے بڑے سرجن اور مشہور ڈاکٹر حیران ہوتے تھے اور آپ کے ایکسرے، بلڈ رپورٹ اور دیگر ٹسٹ دیکھ دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ تو بالکل ٹھیک ہیں SHE IS PERFECTLY ALL RIGHT (شی از پرفیکٹلی آل رائٹ)" احسن اٹھ کر سر ہلاتے ہوئے بولے

"واہ دادو! آپ نے تو مجھے میرے ساتھیوں، میرے ہم پیشہ لوگوں میں بھی شرمندہ کر دیا ہے۔ میں تو ان سے لڑتا جھگڑتا رہا تھا۔ کہ وہ لاپرواہی سے کام لیتے ہیں اور آپ کی صحیح تشخیص نہیں کر رہے ہیں۔ پتا نہیں آپ نے ہماری بزرگ ہو کر ہم سے کس چیز کا بدلہ لیا ہے۔" وہ مایوسی سے بولا۔

تو نسیمہ بانو تیزی سے وہاں سے نکل گئیں۔ یہ سب کچھ سننا ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ پھر احسن، شانو اور مونا کی زرد شکلیں دیکھ کر تو انہیں کچھ ہو رہا تھا۔

انہیں شدتوں سے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ بیکار میں وہ وحیدہ۔ فرہاد کی باتوں میں آ کر اس ڈرامے کا ایک اہم کردار بن گئی تھیں۔ مگر اس کے مضر اثرات سے وہ غافل تھیں نا اور اب اپنی آنکھوں سے ان گھائل وجودوں کو دیکھ کر وہ شرم سے گڑی جا رہی تھیں۔

"ہائے یہ میں نے کیا کر دیا!" وہ کار میں بیٹھی ہاتھوں کو ملے جا رہی تھیں۔ پچھتاوے ان کے وجود کو گھیرے جا رہے تھے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ نہ صرف احسن اور ان کے گھر والوں کی نظروں سے بری طرح گر چکی تھیں بلکہ گھر کی ایک پرانی ملازمہ شاکرہ بی بھی انہیں تحقیر آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

کئی دنوں سے احسن لاج میں سناٹوں اور خاموشیوں کا راج تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے نظریں بچاتا لبوں پر قفل لگائے پھر رہا تھا۔ احسن اپنے اسپتال کو بڑھا رہے تھے اور نئے وارڈ کی تعمیر اپنی نگرانی میں کروا رہے تھے وہ رات کو اکثر دیر ہی سے آتے تھے۔ جبکہ مونا جس دن سے جازب شفٹ ہوا تھا بیمار پڑ گئی تھیں بلڈ پریشر اکثر کم رہتا تھا۔ اور احسن نے سختی سے انہیں مکمل آرام کرنے کی تاکید کی ہوئی تھی ان دنوں تو ویسے بھی انہیں خاص احتیاط کی ضرورت تھی تو وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھیں اور انابی ان پر مسلط کر دی گئی تھیں۔ پھر شاہانہ تھی۔ تو وہ یہ بہانہ بنا کر زیادہ تر کمرے میں گھسی رہتی تھی کہ پرائیویٹ طور پر ایم اے کا امتحان دینے کی تیاری کر رہی ہے یا وہ مسرت کی طرف نکل جاتی ورنہ وہ اُن کے ہاں آ جاتی تھی۔ ہاں اگر احسن جلدی گھر آ جاتے تھے تو پھر تین وقت ڈائننگ ٹیبل پر ملاقات ہو جاتی تھی۔ شاہانہ۔ اور مونا کے بیچ جیسے ان دیکھی دیوار سی پڑ گئی تھی جب سے جازب نے شاہانہ سے اپنے تعلقات منقطع کیے تھے۔

مونا جازب کو اس تمام بدمزگی کا ذمہ دار سمجھتی تھیں اور کبھی وہ شاہانہ کی اُداس نگاہوں میں جھانکتے یا زیادہ سامنا کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتی تھیں۔

آج تو صبح ہی سے مونا کی طبیعت بگڑی ہوئی تھی وہ چکروں اور متلی کی وجہ سے بستر سے باہر نکل ہی نہیں سکی تھیں۔۔۔ ناشتے پر احسن نے جلدی جلدی چائے پیتے ہوئے شاہانہ کو تاکید کی۔ کہ وہ بھابھی کی دیکھ بھال کرے وہ خود بھی اسپتال سے جلدی واپس آ جائیں گے۔۔۔ بھائی کے جاتے ہی شاہانہ اُن کے بیڈ روم میں پہنچ گئی۔ میمونہ واقعی زرد ہو رہی تھیں اور آنکھوں پہ ہاتھ رکھے لیٹی تھیں۔

"بھابھی! کیا طبیعت بہت بگڑ گئی ہے؟" شاہانہ نے پاس بیٹھتے ہوئے اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"شانو جان تم آئی ہو۔؟" میمونہ نے ہاتھ ہٹا کر دیکھتے ہوئے اور بیڈ پہ دُور کھسکتے ہوئے اُس کو جگہ دی۔

"ہاں چندا رات پچھلے پہر سے کافی طبیعت خراب ہو گئی تھی، تین بار قے ہوئی مگر میں نے تمہارے بھیا کو نہیں بتایا۔ ورنہ وہ گھبرا جاتے۔" وہ نقاہت سے بولیں۔ تبھی انابی ٹرے میں ابلا ہوا انڈا ٹوسٹ اور چائے لے آئیں۔

"دلہن رانی! اُٹھیے اور یہ انڈا کھا لیجیے۔ احسن میاں جاتے جاتے تاکید کر کے گئے تھے کہ زبردستی کھلانا پڑے بھی تو کھلانا ضرور۔ آپ کا بلڈ پریشر بہت لو ہے۔"

"انابی! ایمان سے بالکل نہیں کھا سکوں گی۔ پہلے ہی جی اتنا اُلٹ رہا ہے۔" میمونہ بے بسی سے بولیں۔

مگر شانو نے انہیں سہارا دے کر اٹھایا اور ضد کر کر کے ـــــ ایک انڈا ٹوسٹ کھلایا اور چائے کے بجائے دودھ پلا دیا تھا۔ پھر اپنے کاندھے کے سہارے ـــــ بٹھا کر مونا کی کمر میں دونوں بازو ڈال کر بڑے پیار سے ان کے کاندھے پہ گال لگا دیے۔

"مونا بھابھی! بھائی کہہ رہے تھے کہ آپ ذہنی طور پر بہت پریشان ہیں۔ تبھی آپ کا بلڈ پریشر ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔ اور۔ اور یہ کہ آپ کی پریشانی کی وجہ میری ذات ہے۔" وہ بھرائی آواز میں بولی۔

مونا کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے لیا انہوں نے گردن گھمائی اور شانو کی پیشانی کو بار بار چوما۔

"میں نے کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولا شانو۔! اور اب بھی کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔ ہاں تمہارے بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ بلکہ میں تو تمہارا سامنا کرنے، تم سے نظریں ملانے کے لائق بھی نہیں ہوں۔" اُن کی آواز بھی بھرا گئی۔

"ہائے۔ بھابھی وہ کیوں بھلا؟ آپ نے میرا کیا بگاڑا ہے؟" شانو حیرانی سے بولی۔

"شانو۔ میرے بھائی نے۔ اُس بدنصیب جازب نے تمہیں جس طرح سے دھوکا دیا نظرانداز کیا ہے نا میں تو نہ صرف حیران و ششدر ہوں بلکہ مجھے تو اپنے بھائی سے نفرت ہو گئی ہے۔ شکل نہیں دیکھنا چاہتی ہوں میں اس بے اصولے شخص کی۔ ہونہہ! تین دن سے مسلسل فون کرتا ہے صبح شام رِنگ کرتا ہے۔ اور انابی کی

منتیں کرتا ہے کہ مونا سے میری بات کروا دیجیے۔ مگر میں نے انابی سے کہا ہے کہ وہ اُسے روک دیں کہ آئندہ مجھے بالکل فون نہیں کرے گا۔" مونا کھٹور انداز میں بولیں تو شانو اُن سے لپٹ گئی۔

"ہائے بھابھی! یہ آپ کس انداز سے سوچ رہی ہیں۔ یہ جازب اور میرے بیچ جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں آپ کا تو کوئی دوش، کوئی قصور یا تعلق نہیں ہے بھابھی۔ پھر آپ اپنے آپ کو اس کی ذمہ دار کیوں سمجھ رہی ہیں؟ اور جبکہ آپ کے بھائی صاحب کے نصیبوں میں شاہانہ کا نہیں بلکہ شمائلہ کا سنجوگ و ساتھ لکھا ہے تو ہم کاتبِ تقدیر سے لڑنے والے کون ہوتے ہیں۔" وہ افسردہ سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"شمائلہ! کیا شمائلہ کی خاطر جازب نے تم سے ناتا توڑا ہے کیا جازب نے یہ بتایا ہے تم کو؟" وہ حیران ہو کر اُٹھ بیٹھیں۔

"واضح الفاظ میں تو نہیں بتایا ہے مگر جب میں نے خود اُن سے پوچھا تو وہ انکار بھی نہ کر سکے بس ٹال مٹول کرنے لگے۔ میں نے جب بہت اصرار کیا۔ اور۔ اور اپنے خدشات کا اظہار بھی کیا۔ اور کہا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ۔ وہ دونوں اکیلے لاہور گئے تھے۔ تو وہاں کہیں کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آ گئے ہوں۔ اور۔ اور۔" شاہانہ نے بات روک کر گہری سانس لی۔

"ارے نہیں نہیں شانو بیٹا! یہ مت سمجھنا کہ میں جازب کی طرفداری کروں گی۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ شمائلہ بھی بہت شریف لڑکی ہے۔ اور میرا بھائی جازب بھی ایک اعلا کردار کا مالک ہے۔ نہیں شانو بات کچھ اور ہی ہے۔ اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارے اور جازب کے اس سارے معاملے میں کسی طور پر یا تو زمان احمد کے خاندان کا ہاتھ ہے یا پھر دادی نسیمہ بانو کا چلایا ہوا کوئی چکر ہے۔ اگر میں نے جازب کو دھتکار نہ دیا ہوتا تو میں اُس سے اگلوا لیتی۔ مگر میں تو اُس کے فیصلے پہ اپنا غصہ ہی ضبط نہ کر سکی اور اُسے گھر سے فوراً نکل جانے کا حکم دے دیا۔" مونا نے دُکھ کے عالم میں کہا۔

"جی آپ نے تو ہمیں نکال باہر کیا تھا گھر سے۔ مگر ہم حکم عدولی کر کے اپنی علینہ بیٹی سے ملنے آ گئے ہیں۔" جازب بھانجی کو اٹھائے اندر چلا آیا تھا۔ شاہانہ ایکدم دل پر ہاتھ رکھے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم مونا! کیسی طبیعت ہے آپ کی۔؟ احسن بھائی سے ملنے اسپتال گیا تھا۔ انہوں نے بتایا آپ کی طبیعت کافی خراب ہے۔ سو میں دوڑا چلا آیا ہوں۔" وہ بہن سے لپٹ گیا۔

"دور ہٹو مجھ سے۔ میری بیماری کی وجہ ہی تم ہو۔" مونا نے جازب کو دُور دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مگر وہ بہن کے کاندھے سے لگ گیا تھا۔

"ہائے جاجی ماموں! میں تو دب گئی ہوں چھوڑیے مجھے، ہائے پھوپھو شان آپ مجھے لے لیجیے۔" علینہ چلا اُٹھی۔

"آؤ میری جان!" شانو نے ہاتھ پھیلا دیے تو علینہ ہمک کر اُس کی گود میں آ گئی اور مضبوطی سے گردن کے گرد بازو ڈال کر شانو سے لپٹ گئی۔ شانو دو قدم پیچھے ہٹی مگر پھر اُسے جھٹکا سا لگا۔ وہ رُکی پھر دروازے کی طرف چل دی۔ مگر اُس کی گردن کھنچی جا رہی تھی۔ یہ کیا وجہ ہے؟ وہ پریشان ہو کر مڑی تو دیکھا اُس کا دوپٹہ جازب کے یونیفارم کے اسٹارز میں اُلجھا ہوا تھا۔ اور وہ گردن موڑ کر چھڑانے کی کوشش کرتا ہوا پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

"اوہو!" شاہانہ کو بھولی بسری سی باتیں یاد آنے لگی تھیں اور دل میں ایک تیز سی درد کی لہر اُٹھی۔

"ذرا رُک جائیے آپ نہ جانے کیسے میرے کاندھے پہ لگے ستاروں سے اُلجھ گئی ہیں۔ ذرا رکیں گی تو آسانی سے دوپٹہ چھوٹ جائے گا اور بغیر پھٹے نکل آئے گا۔" جازب نے آہستہ سے کہا۔

"برائے کرم آپ میرے دوپٹے کو چھوڑ دیجیے۔ میں خود ہی سلجھا لوں گی ورنہ آپ تو پہلے کی طرح پھر اُسے لیر لیر کر دیں گے۔ ویسے بھی آپ کو کچھ بھی سلجھانا نہیں آتا ہے۔" وہ تحمل سے کہتی ہوئی مڑی اور صوفے

کی طرف بڑھی۔ تاکہ علیینہ کو آرام سے بٹھا کر جازب کو شکنجے سے نکالے۔ جو دوپٹے کا کونا تھامے بندھا ہوا پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔

"علیینہ بیٹے! آپ یہاں صوفے پر بیٹھیں، پھوپھو جا کر آپ کے جازی ماموں سے اپنا دامن چھڑا آئیں۔" شاہانہ نے طنزیہ اور معنی خیز انداز میں کہا تو جازب نے چونک کر دیکھا۔

وہ بظاہر بڑے سکون سے بڑھی تھی پھر اپنا دوپٹہ سمیٹتے ہوئے جازب کے سامنے جا ٹھہری۔

"آپ اگر کہیں بیٹھ جائیں تو میرے لیے آسانی رہے گی۔ یوں تو آپ مجھ سے بہت ہی اونچے ہیں اور میرا ہاتھ آپ کے کاندھوں تک پہنچ تو جاتا ہے مگر پلو چھڑانا دشوار ہوگا۔ اور اگر میں نے بے صبری سے کھینچا تو یقیناً پلو پھٹ جائے گا۔ اس بار میں چیر پھاڑ یا اپنا کوئی نقصان نہیں چاہتی ہوں۔"

وہ مسلسل کاٹ دار انداز میں کہہ رہی تھی اور جازب کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا مونا ہونٹ کاٹ رہی تھیں جازب کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ مڑی اور صوفے کی طرف بڑھی۔ جازب پیچھے کھنچا چلا آرہا تھا۔

"یاد ہے شانو! ایک بار پہلے بھی یونہی تمہارا دوپٹہ اُلجھ گیا تھا اور یہ تمہیں اپنے پیچھے کسی بے بس گائے کی طرح کھینچتا لے گیا تھا مگر۔ مگر آج تو معاملہ ہی الٹ گیا ہے۔ آج یہ کسی بے بس بچھڑے کی طرح تمہارے پیچھے ہے۔" مونا نے زہریلے انداز میں کہا۔

"بس بھابھی چند سیکنڈ کا کام ہے، ابھی میں خود کو ان کے ستاروں سے نہ صرف چھڑا لوں گی بلکہ انہیں بھی پروانۂ آزادی مل جائے گا۔" شاہانہ نے کہتے ہوئے جازب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے اپنا دوپٹہ چھڑانے لگی۔ لمحے کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئے تھے۔ نہ جانے شاہانہ جان بوجھ کر ہی زیادہ وقت لے رہی تھی یا واقعی دوپٹہ زیادہ الجھا ہوا تھا۔ جازب نے بے صبری سے گردن گھما کر اپنے کاندھے کی طرف دیکھا تو وہ جانی پہچانی نرم سفید انگلیوں کو مصروف دیکھتا ہی رہ گیا۔ شاہانہ اُس کی بے چینی بھانپ کر بولی۔

"بس کچھ تھوڑا سا تحمل و صبر اختیار کر لیجیے دراصل میں بھی بے صبری سے کام لے کر آپ کو جلدی چھڑا سکتی تھی۔ مگر اب میں نہیں چاہتی۔ کہ اس بار بھی نقصان میرا ہی ہو۔ اور میرا دوپٹہ برباد ہو۔ آہستہ آہستہ خود کو آپ سے الگ و علیحدہ کرنے میں وقت لے رہی ہوں۔

لیجیے مبارک ہو آپ آزاد کر دیے گئے ہیں جازب علی۔ چہ چہ باوجود احتیاط کے میرے دامن میں عیب لگ ہی گیا ہے ایک گہری کھرونچ سی آ ہی گئی ہے۔" وہ سوراخ زدہ کونہ دکھاتی ہوئی بولی۔

"چلیے۔ میں بھی جو نہ جانے کیسے آپ کے ستاروں سے الجھ گئی تھی۔ اب خود اپنے ہاتھوں سے ان ستاروں کی گردش سے بچ کر نکل آئی ہوں۔ میں نے بھی خود کو چھڑا لیا ہے۔" وہ ہنس دی۔

وہ کہتی ہوئی علیینہ کی طرف بڑھی تو مونا کا دل گویا ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔

"شانو میری جان! جب دو مخالف اور ناموافق ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں تو نتیجہ بڑا ہی تباہ کن ہوتا ہے وہ آپس میں ٹکرا کر پاش پاش تو ہوتے ہی ہیں مگر اُن کے اس ٹکراؤ کی زد میں آنے والے آس پاس کے لوگ بھی بُری طرح سے متاثر ہوتے ہیں یا وہ بھی فنا ہو جاتے ہیں۔ تو شاہانہ تم تو شکر کرو کہ تمہارے ناموافق ستارے آپس میں ٹکرائے بنا آس پاس سے بچ بچا کر نکل گئے ہیں۔ اگرچہ اثرات تو ان کے بھی مہلک ہیں مگر جان لیوا تو نہیں ہوں گے نا؟" مونا نے پیار سے کہا تو شانو نے سر ہلا کر تائید کی تبھی انابی کے ہمراہ رابعہ شکیل کمرے میں داخل ہوئیں۔ مونا انہیں دیکھ کر اُٹھنے لگی تھیں مگر رابعہ نے لپک کر ان کو منع کیا اور کاندھے پر زور دے کر واپس لٹا دیا۔ پھر وہ وہیں پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

"السلام علیکم!" جازب نے کھڑے ہو کر سلام کیا تو رابعہ نے ہنس کر جواب دیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

"ارے شانو جان! یہ تم کہاں چھپی بیٹھی ہو؟" رابعہ خود اُٹھ گئیں اور بڑھ کر شانو کو بہت پیار سے گلے لگا لیا۔

"سوری رابعہ بھابھی! میں اُٹھنے ہی لگی تھی مگر یہ علیینہ میری گود میں سو گئی ہے تو اسے اُٹھا کر صوفے پر لٹا رہی تھی۔" شانو نے شرمندگی سے کہا مگر رابعہ اس کا ہاتھ تھام کر مونا کی طرف لیتی آئی تھیں۔

"مونا بھابھی! آپ کی اس چاند سی نند کی وجہ سے ہمارے خاندان میں تو خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا ہے ثناء کے نکاح کے فنکشن پر اسے بہت سے لوگوں نے دیکھا اور بہت ہی زیادہ پسند کیا ہے۔ پھر کبھی احسن کا ایڈریس مانگ رہے تھے۔ کوئی فون نمبر مانگ رہا تھا۔ خود میری اپنی فیملی میں فساد اُٹھ کھڑا ہوا ہے ایک انار سو بیمار والا حال ہے۔" رابعہ نے ہنس کر شانو کو گلے لگا کر کہا۔ تو وہ جھینپ کر ہاتھ چھڑا کر دور ہٹ گئی۔ جازب نے ایکدم چونک کر دیکھا۔

"یہ۔ یہ رابعہ کے خاندان میں بھلا کون ہے جو شاہانہ کا طلبگار ہو بیٹھا ہے۔ بھلا مرد ہی کتنے ہیں رابعہ کی فیملی میں۔ سسرال میں تو دیور سبھی بیاہے ہوئے تھے۔ اور میکے میں صرف یہی ایک ہیرو نما ایکٹر ڈائریکٹر بھائی علی ہی تو بچتا تھا۔ تو کیا۔ کیا علی۔" جازب کے دل کی دھڑکن رُکنے لگی۔

"شانو بیٹا! جاؤ رابعہ کے لیے کوئی ٹھنڈا مشروب لے آؤ آج خاصی گرمی ہو رہی ہے۔" میمونہ نے شانو کو ٹالنا چاہا۔

"نہیں شانو! گرمی ہو یا سردی مجھے تو تم بس چائے ہی پلا دو۔" رابعہ ہنس کر بولیں شانو اُٹھ گئی۔

"کیوں رابی! یہ کس کو نیا ایک شادی شدہ ہونے کا دورہ پڑ گیا ہے؟" جازب نے پوچھا تو رابعہ نے ہنس کر بتایا۔

"اور کسے پڑنا تھا دورہ سوائے تمہارے دوست علی امام کے۔ وہی کھانا پینا چھوڑ کر بیٹھے ہیں۔"

"ارے علی۔ علی شانو۔ میرا مطلب ہے شاہانہ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟" جازب نے حیرت سے کہا۔

شاہانہ جو پردہ ہٹا کر باہر جا چکی تھی۔ وہ دروازے کی دہلیز پر ٹھٹھک کر رُکی اور دروازے کے پٹ تھام کر خود کو گرنے سے بچایا۔

اب یہ کیا تماشا شروع ہونے لگا ہے؛ شاہانہ کا دل تھرا اُٹھا۔

"ہاں بھئی۔ اُسے دراصل ثناء نے بتایا ہے کہ جازب۔ بھئی جازب۔ علی کو دراصل شاہانہ کافی عرصہ پہلے بہت پسند آئی تھی۔ مگر پھر اُسے یہ گمان ہوا تھا کہ شاید تم اُس میں دلچسپی لیتے ہو اور تمہارا بیاہ شانو سے ہو گا۔ تبھی وہ من مار کر خاموش رہ گیا تھا مگر اب اُسے ثناء سے پتا ہے کہ جازب کی شادی یا تو شمائلہ سے ہو گی یا پھر۔ احسن کی چچازاد بہن شاہدہ سے رشتہ طے ہو رہا ہے۔ تو بس علی تو جا کر شکیل صاحب کے پاؤں پر گر گیا۔ کہ بھائی آپ جا کر میرے رشتے کی بات کریں۔

شکیل نے صاف صاف کہہ دیا کہ تمہارا کردار، تمہارے پیشے کو دیکھ کر تو کوئی شریف انسان تمہیں اپنی بیٹی یا بہن کا رشتہ نہیں دے گا۔ تو علی فوراً کہنے لگا۔ کہ وہ سب کچھ چھوڑ دے گا نہ صرف سدھر جائے گا اور کھلنڈرا پن چھوڑ دے گا بلکہ وہ اپنا بزنس شروع کر دے گا اور فلموں میں کام کرنا اور فلمیں بنانا چھوڑ دے گا۔ بھئی اس نے تو سب کو حیران پریشان کر دیا۔ ہمیں اُس سے ایسی اُمید نہ تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اُس پر اعتبار کرتی نہیں تھی۔ مگر شکیل صاحب اُس کے حامی ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس طرح کے کھلنڈرے لوگ اگر تائب ہو کر سدھر جائیں تو اچھے اچھے شریفوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ تو پھر احسن و مونا بھابھی سے بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ سب ذمہ میں لوں گا۔ تبھی مونا ہم لوگوں نے احسن بھائی اور آپ سے بات کی ہے۔ مگر میرے بھائی کو تو نہ چین ہے نہ قرار۔ وہ دھرنا مار کر بیٹھا ہے میرے گھر میں۔" وہ ہنس کر بولیں۔

مونا نے محسوس کیا تھا کہ جازب کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ وہ مضطرب سا ہو کر ہاتھ ملنے لگا تھا۔

"اچھا ہوا بہت ہی اچھا ہو رہا ہے تمہارے ساتھ جازب۔ شکر ہے کہ تمہارے سامنے ہی رابعہ علی کا

کا رشتہ لائی ہیں۔ ہونہ۔ تم کیا سمجھتے تھے کہ شانو کا کوئی طلبگار ہی نہ ہوگا۔"

میمونہ نے بڑے کھٹور سے انداز میں بھائی کی طرف شانو، مگر قہر آلود نظر ہی ڈال کر سوچا تھا۔

"رابعہ جان! تم نے اور شکیل نے ہم سے بات کی تھی شانو کے رشتے کے لیے۔ پھر فون بھی کیے تھے۔ مگر جان ان دنوں ہم لوگ سخت پریشانیوں میں گھر کے رہ گئے ہیں۔ تم تو جانتی ہو احسن کی دادی یہاں خاصے فساد کروا کر رخصت ہوئی ہیں۔ بہت ہی اپ سیٹ رہے ہیں ہم سب لوگ، بس یہ سمجھو کہ آرام و سکون سے مل بیٹھنا ہی نہیں ہوا ہمارا، نہ ہی کوئی بات ہو سکی ہے مگر آج میں ضرور احسن سے تفصیلی بات کروں گی پھر تمہیں فوراً مطلع کر دوں گی۔"

میمونہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا شاہانہ نے یہ سُنا تو گویا بے دم ہو کر دروازے کے پٹ سے اپنا چکراتا سر ٹکا دیا۔

"خدا تم سے سمجھے جاذب! تم نے میرے سر سے سائبان ہی چھین کر مجھے تپتی ہوئی دھوپ میں برہنہ پا و سر کھڑا کر دیا ہے۔ انگارے بھر دیے ہیں میرے وجود میں۔ ہائے جاذب یہ تم نے مجھے کس عذاب کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔ اب میں نئی صورت حال سے کیسے اور کیونکر نپٹوں گی" وہ ہونٹ کاٹتی آنسو بہاتی باہر نکل گئی تھی۔

پھر اُس نے انابی کے ہاتھوں جاذب اور رابعہ کے لیے پر تکلف سی چائے تو بھجوا دی مگر خود واپس کمرے میں نہ گئی اور یہ بہانہ کر دیا۔ کہ اُس کے پاس سہیلیاں آگئی ہیں اور وہ مصروف ہے۔ یوں وہ کتنی ہی دیر کمرے میں بند آنسو بہاتی من کی جلن کو کم کرتی رہی پھر اُس نے کاریں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں سُنیں۔ یقیناً جاذب رابعہ واپس چلے گئے ہوں گے۔ شانو غسلخانے میں منہ دھونے کے بعد ذرا خود کو کمپوز کر کے مونا کے کمرے کی طرف بڑھی۔ احسن بھائی بار بار جو تاکید کرتے رہے تھے مونا کی دیکھ بھال کرنے کی تبھی اُسے احساس تھا مگر جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو صرف رابعہ جا چکی تھیں مگر۔ اُن کی جگہ کرنل شکیل، زلفی بھائی، ڈاکٹر احسن اور جاذب وہیں موجود تھے گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ شاہانہ کی آمد پر وہ سلام دعا کے لیے لمحہ بھر رُکے ضرور۔ مگر پھر تیز تیز باتیں کرنے لگے۔ لمحہ بھر کے لیے شاہانہ کا دل ڈوب کر رہ گیا۔

"کہیں کرنل شکیل، احسن بھائی سے میرے رشتے کی بات تو طے نہیں کر رہے ہیں؟"

وہ سیدھی مونا کے پہلو میں جا دبکی۔ مگر نہیں وہاں تو زیر بحث مسئلہ۔ وہی سعید رحیم والی کلاشنکوف تھیں۔ زلفی بتا رہے تھے کہ میر رستم ایس پی کی ہمراہی میں انہوں نے ایک جگہ چھاپہ مار کر بالکل اسی ساخت کی ایک کلاشنکوف اور دیگر خطرناک قسم کا اسلحہ برآمد کیا ہے۔ اور پھر اُن لوگوں نے ولاور خان زلفی کے ملازم کی بتائی ہوئی کوٹھی کی مسلسل خفیہ نگرانی کروائی تھی اور اُن کے ٹیلی فون بھی ٹیپ کیے تھے۔ اور اب وہ پختہ یقین رکھتے تھے کہ کیپٹن سعید رحیم بھی تخریب کاروں کا شریک کار تھا۔ اور اسلحہ سپلائی کرنے میں اُن کی معاونت کرتا تھا۔ یہ انکشاف بہت تکلیف دہ اور پریشان کُن تھا۔

"غدار، بدبخت، نمک حرام، وطن فروش۔" جاذب تلملاتے ہوئے ہاتھ مل رہا تھا۔

"ہاں، ہماری بد قسمتی اب یہی تو ہے کہ دنیاوی عیش و عشرت۔ کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے ہم بڑے سے بُرا کام کر گزرتے ہیں اپنے ضمیر کا سودا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ جو شخص مادر وطن اور اُس کی مقدس مٹی کا سودا کر سکتا ہے۔ پھر اُس بے غیرت سے کچھ بھی تو بعید نہیں۔ وہ تو نیچ سے نیچ کام کر گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں سعید رحیم کے وجود کو ٹکڑوں میں تبدیل کر دوں۔ اُسے خون میں نہلا دوں۔"

"سر! دنیا کی کوئی کڑی سے کڑی سزا بھی دی جائے مگر۔ وہ سعید رحیم جیسے موذی کمینے ضمیر فروش کے لیے بہت کم ہو گی۔" جاذب بے قراری سے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلتا ہوا ہاتھ پر ہاتھ مار رہا تھا۔

"صبر سے کام لو جاذب! ایسے ایمان و وطن دشمن لوگوں کا انجام بہت عبرت ناک ہوتا ہے۔ وہ بڑی کڑی سزا پاتے ہیں۔ ویسے میں نے اوپر ساری رپورٹ بھجوا دی ہے۔ اور وہاں سے خفیہ انکوائری کا سلسلہ کب کا شروع بھی ہو چکا ہے بلکہ۔ آج کل میں سعید رحیم اور اُس کے ساتھی قانون کی گرفت میں جکڑ لیے جائیں گے۔" کرنل شکیل نے تسلی دی۔

"آج ہی ہمارے حساس اداروں نے اطلاع دی ہے کہ طارق روڈ پر واقع ایک کوٹھی میں خطرناک تخریب کاروں کا اجتماع ہو رہا ہے۔ تو ہم لوگ وہاں ریڈ کرنے والے ہیں تو وہاں ضرور کوئی نتیجہ کُن بات سامنے آئے گی۔ ہمیں ایس پی میر رستم نے الرٹ رہنے کے لیے کہا ہے اب ہم سب اُس کے منتظر ہیں۔"

زلفی نے بتایا۔ تبھی باہر پولیس جیپ کا سائرن سنائی دیا۔ سب اُٹھ کر باہر نکلے اور پھر وہ باہر ہی سے چلے گئے تھے۔

"خدا خیر کرے۔" شانو بے قرار ہو کر اُٹھی اور پردہ ہٹا کر جھانکتے ہوئے بولی۔

"بھابھی! باہر تو بہت سی جیپیں تھیں اور بے شمار پولیس تھی۔ مجھ۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

شانو زرد چہرہ لیے میمونہ کی طرف بڑھی۔

"خداوند کریم ان سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔" مونا بھابھی نے شانو کو پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کارڈ کیسا ہے؟" شانو نے لفافہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ جس پر نمایاں طور پر مسٹر اینڈ مسز ڈاکٹر احسن۔ اور شاہانہ رضا کا نام لکھا تھا۔

"ہاں وہ کرنل شکیل مدعو کر گئے ہیں۔ یوم دفاع کے سلسلے میں آرمی گراؤنڈ میں پریڈ اور فوجی مظاہرے وغیرہ ہوں گے۔ وہ تاکید کر رہے تھے کہ سب لوگ ضرور آئیے گا۔"

مونا نے بتایا۔ "خیر یہ تو بعد کے پروگرام ہیں اس وقت تو میرا دل ہول رہا ہے۔ اور وہ احسن بھی ساتھ چل دیے ہیں۔" وہ دونوں بہت گھبرا رہی تھیں۔

یونہی وقت تیزی سے گزرتا چلا جا رہا تھا اس دوران مونا کو پوچھنے اُن کی بہت سی سہیلیاں آگئی تھیں۔ اور کھوئی کھوئی سی شاہانہ اُن کی خاطر و مدارت میں مصروف تھی۔ اُن میں سے چند ایک سہیلیاں تو رات کے کھانے پر بھی رُک گئی تھیں۔ پھر اُن کی پُر لطف باتوں نے اگرچہ دھیان بٹا دیا تھا مگر دل میں پھانس سی چبھی ہوئی تھی۔ بار بار مونا اور شانو گھڑی کی سمت دیکھتی تھیں۔ پھر ایک دوسرے کو تشویش بھری نظروں سے تکتی تھیں۔ جب مہمان بھی رخصت ہو گئے تو وقت گزارنا دشوار ہو گیا تھا۔

"مونا بھابھی! آپ کرنل شکیل کے ہاں فون کر کے معلوم تو کیجیے۔ کیا خبر وہ لوگ ریڈ (Raid) کے بعد وہاں جا بیٹھے ہوں۔" شانو نے فون اُٹھا کر دیتے ہوئے کہا۔

"شانو! تم خود فون کیوں نہیں کر دیتی ہو؟" مونا نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ۔ وہ کیا خبر وہاں سے فون۔ وہ علی اُٹھا لیں۔ تو مجھے اُن سے بات کرنا اچھا نہیں لگتا ہے۔ وہ خوامخواہ فری ہونے کی کوشش میں بیہودہ اور احمقانہ گفتگو کرتے ہیں اور میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔" شاہانہ نے بے ساختہ کہا تو مونا بھابھی نے چونک کر اُس کی سمت دیکھا۔

"تم علی سے اس حد تک متنفر ہو۔ اور وہ تمہارے حصول کے لیے خود کو داؤ پر لگائے دیوانہ ہوا بیٹھا ہے بار بار رابعہ اور کرنل شکیل سے دباؤ ڈلوا رہا ہے۔" مونا نے انکشاف کیا۔

"نہیں آپ انہیں منع کر دیجیے بھابھی! مجھے کسی علی سے شادی نہیں کرنا ہے۔" وہ ہاتھوں کو مسلتی ہوئی بولی۔

"کیا تمہیں پہلے سے معلوم تھا شانو کہ رابعہ وغیرہ نے تمہارا رشتہ مانگا ہے" مونا کو حیرانی ہوئی تھی کہ شانو نے اس انکشاف پر ذرا بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا تبھی وہ پوچھ بیٹھیں۔

"نہیں، میں پہلے سے تو نہیں جانتی تھی مگر آج جب رابعہ بھابھی نے آپ کے اور جازب کے سامنے بات کی تو میں نے باہر جاتے جاتے سن لی تھی۔" شاہانہ نے پیشانی تھامتے ہوئے بتایا۔

"ہونہہ وہ جازب۔ اُس نے جب سُنا رابعہ تمہارے رشتے کے لیے آئی ہیں۔ تو اُس کا رنگ ایکدم زرد پڑ گیا۔ حیرت سے منہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ اور جب اُس کے استفسار پر رابعہ نے بتایا۔ کہ علی تم میں گہری دلچسپی لیتا ہے اور صرف تم ہی سے شادی کرنے پر بضد ہے۔ تو جیسے اسے سانس لینا دشوار ہو گیا ہو۔ اُس سے چائے بھی نہیں پی جا رہی تھی۔ اس وقت خدا کی قسم میرا دل خوش ہو رہا تھا۔ اچھا ہے اسے سزا تو ملے۔" مونا سفاکی سے بولیں تو شانو نے گہرا سانس لیا۔

"معلوم نہیں کہ سزا کسے مل رہی ہے بھابھی۔ مجھے یا انہیں؟"

باہر کاریں رُکنے کی آوازیں آئیں، پھر احسن و جازب کی آواز آئی، وہ کسی کو خدا حافظ کہتے ہوئے اندر آ گئے تھے شاہانہ اور مونا دونوں نے بیک وقت دروازے کی سمت دیکھا۔ پھر وہ گھبرا کر آگے بڑھیں۔

احسن جازب کی کمر میں ہاتھ ڈالے جیسے سہارا دیتے ہوئے اندر آ رہے تھے اور جازب کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور قمیص کا بازو پھٹا ہوا تھا اور بایاں بازو اوپر سے زخمی تھا جس پر پٹی بندھی تھی جو خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ شانو اور مونا گویا تمام اختلاف و ناراضگیاں بھلا بیٹھی تھیں تبھی گھبرا کر لپکیں۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں ہوا ہے مجھے، آپ دونوں کو گھبرانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے بس معمولی سی خراشیں ہیں۔"

جازب نے انہیں بدحواس سا دیکھا تو جلدی سے خود ہی بولا پھر احسن کے بازوؤں سے باہر نکل آیا۔

"خیر، اب اتنی معمولی سی خراشیں بھی نہیں ہیں، بازو میں سے تو گولی گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی ہے اور پیشانی پر اچٹتا ہوا خنجر لگا ہے۔ شکر ہے بچاؤ ہو گیا۔ مگر خون تو کافی ضائع ہوا ہے۔ تم آرام سے بیٹھو۔"

احسن نے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر جازب خود ہی بڑھ کر صوفے پر بیٹھ رہا پھر مسکرا کر انہیں دیکھنے لگا۔ شاہانہ کے چہرے پر پھیلی زردی و ہراس کو دیکھ کر اس کا دل گداز ہونے لگا تھا ترکِ تعلق کا اعلان تو کر دیا تھا جازب نے۔ مگر اب احساس ہو رہا تھا کہ۔ شانو سے، اُس کی محبت سے دستبردار ہونا کس قدر دشوار۔ بلکہ ناممکن سا فعل ہے۔ جازب کا دم گھٹنے لگا۔

"یہ ہوا کیا آخر تمہیں؟ یہ زخم کیسے آئے ہیں؟" مونا کی خواہرانہ محبت نے جوش مارا۔

"پتا نہیں آج اس احمق لڑکے کو کیسا خبط سوار ہوا کہ اس نے تو سب کو حیران کر دیا۔ بھیا معاف کرنا میں اسے تمہاری بہادری تو نہیں ہاں حماقت سمجھتا ہوں۔ جو تم نے موت کے منہ میں اندھا دھند چھلانگ لگا دی۔ اور اپنے افسر کی حکم عدولی کے مرتکب ہوئے۔ وہ تو شکر کرو کہ تمہارے اس آپریشن کے انچارج کرنل شکیل اور دوسری طرف سے میر رستم زمان تھے۔ تبھی معاملہ دب گیا ورنہ تمہارا کورٹ مارشل ہو جانا تھا۔" پھر مونا کی پریشانی دیکھتے ہوئے احسن نے بتایا۔

"کرنل شکیل وغیرہ کو جہاں چھاپہ مارنا تھا اور اُن کے خفیہ اداروں والے جن لوگوں کے تعاقب میں تھے وہ بھی اُسی کوٹھی میں جمع تھے۔ جہاں پر میر رستم وغیرہ نے چھاپہ مارنا تھا۔ دراصل یہ ایک۔ بڑا گینگ تھا، ہم وہاں پہنچے تو وہاں پر اِن وطن دشمنوں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ پولیس کے مخبر بھی وہاں موجود تھے۔ اور سبھی اُن کی طرف سے ملنے والے اشارے کے انتظار میں الرٹ پوزیشن سنبھالے بیٹھے تھے۔ کافی دیر گزر گئی

اور جب کوئی اشارہ موصول نہ ہوا تو۔ یہ جازب بے قرار ہو کر کرنل شکیل اور میر رستم کے سر ہو گیا۔ کہ ممکن ہے ان تخریب کاروں کو اطلاع ہو گئی ہو۔ تو بہتر یہی ہے کہ آپ مجھے جانے اور کھوج لگانے کی اجازت دیں۔

مگر کرنل نے منع کر دیا۔ اور اسی طرح گھنٹہ گزر گیا۔ تو جازب نے پھر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ کہ بہت دیر ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میٹنگ ختم کر کے وہ لوگ نکل جائیں اور ہاتھ سے نکل جائیں۔ تبھی دروازہ کُھلا اور دو بندے باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے اور جیپ میں بیٹھ کر جانے لگے۔

"سر دیکھا آپ نے۔ وہ لوگ یہاں سے جا رہے ہیں اگر انہیں اب بھی نہ پکڑا گیا تو یہ اور ٹریفک میں گُم ہو جائیں گے۔ ویسے بھی اب اگر ہم نے ان کے باہر نکلنے پر حملہ کیا تو فائرنگ کی آواز سے محلے والے جاگ کر گھروں سے باہر نکل آئیں گے اور کئی بے گناہ شہری مجرموں کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے۔ یہی نہیں، یہ مجرم ان میں سے چند ایک کو یرغمال بنا کر ہمیں مصیبت میں ڈال دیں گے۔" جازب تیزی سے بولا۔

"تم ذرا تحمل و صبر سے کام تو لو جازب کوئی بھی آج یہاں سے بچ کر نہیں جائے گا۔ ہم نے پورا انتظام کر رکھا ہے۔" کرنل شکیل نے وائرلیس پر کسی سے رابطہ قائم کیا۔ پھر وہ جو دو بندے گھر سے نکل کر گئے تھے۔ اُن کی جیپ کا نمبر ان لوگوں کو بتایا پھر راستہ بتا کر۔ انہیں فوراً گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

وہ ایک اور مخبر کو بلا کر اس سے تبادلہ خیالات کرنے لگے۔ چند باتیں پوچھنے کے بعد شکیل صاحب نے اُسے درختوں کے پیچھے پوزیشن سنبھالنے کی ہدایت دی اور خود آگے بڑھ کر میر رستم سے ڈسکس کرنے لگے۔ اور جازب کو موقع مل گیا اُس نے جا کر اُس مخبر کو گھیر لیا جس سے کچھ دیر پہلے شکیل باتیں کر رہے تھے۔ اور اُسی سے پوچھ کر کوٹھی کے اندر باہر کا نقشہ محل وقوع ذہن نشین کر لیا تھا۔ اور پھر سبھی لوگ دم بخود رہ گئے جب انہوں نے جازب کو ایک درخت پر چڑھتے دیکھا ریوالور ——— بیلٹ میں اُڑس کر کلاشنکوف کاندھے سے پیچھے پشت کی طرف کر کے اور جوتے اُتار کر وہ پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔ کوئی اسے روکنے منع کرنے کی پوزیشن میں بھی تو نہ تھا۔

"ڈیم ———" کرنل شکیل نے اپنی کیپ اُتار کر گھٹنوں پر ماری۔

جازب اب پہلی منزل کی کھڑکی تک پہنچ گیا تھا پھر وہ ایک تنے پر آہستہ آہستہ کھڑا ہو کر کھڑکی کے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا تھا کہ اُس کے وزن سے۔ تنے پر زور پڑنے سے زوردار طریقے سے لکڑی چٹخنے کی آواز آئی۔ سب کے سانس رُک رُک گئے۔ جازب جلدی سے لینٹر پر اُتر کر دیوار سے چپک گیا تھا۔ گھر کے اندر موجود لوگوں نے بھی آواز سنی تھی۔ تبھی دو آدمی کھڑکی میں نظر آئے۔ انہوں نے بڑے سے شیشے والی کھڑکی کو مل کر زور لگا کر اونچا کیا۔ پھر سر باہر نکال کر اِدھر اُدھر جھانکنے لگے۔

"اوہو" کرنل شکیل اور میر رستم زمان تو تقریباً تیس چالیس میٹر دُور درختوں کے پیچھے چھپے دوربین لگائے دیکھ رہے تھے بیک وقت اُن کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی تھی۔

بیشک ایک تو سعید رحیم ہی تھا جو اب سگریٹ سلگا کر بے فکری سے باہر دیکھ رہا تھا اور دوسری شخصیت بھی کافی نامی گرامی تھی۔ وہ ملک کا خاصا جانا پہچانا اور مشہور سیاستدان تھا۔ روزانہ ہی تو اُس کی تصویریں بیانات کے ساتھ اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ پھر کیسے نہ پہچانتے۔

"اوہو۔ یہاں تو خاصا بڑا ریکٹ لگتا ہے۔ اچھا تو اس معاملے میں سلمان رضوی جیسے سیاسی لوگ بھی شامل ہیں۔" کرنل شکیل نے میر رستم سے مضطرب انداز میں کہا۔

"کوئی بھی نہیں ہے سر! چلیے اندر چلتے ہیں۔ ویسے سڑک سے ٹرک ورک گزرتے رہتے ہیں تو وہیں سے آواز آئی ہو گی۔" سعید رحیم نے لاپروائی سے کش لگاتے ہوئے کہا تو سلمان رضوی کی آواز آئی۔

"میاں صاحبزادے! میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم خاصے بے صبرے اور لاپروا طبیعت کے مالک ہو میاں ایک تجربے کی بات پلے سے باندھ لو۔ سمجھ لو کہ ہمارے دھندے میں ذرا سی غفلت پھانسی کے پھندے تک

پہنچا سکتی ہے۔"

انہوں نے سرزنش کی۔ پھر خود ایک بار پھر باہر گردن نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا تو جاذب بالکل دیوار سے چپک گیا شکر ہے کہ اُس کے سامنے پتوں سے بھری ہوئی بڑی سی شاخ آ گئی تھی اور بچاؤ ہو گیا تھا۔

سعید اور رضوی دونوں کھڑکی سے ہٹ کر اندر کے کمرے کی طرف چل دیے۔ اور وہ بہت تدبر والا، سمجھدار سلمان رضوی جو چند منٹ پہلے تک سعید کو اُس کی غفلت اور لاپرواہی پر سرزنش کرتے ہوئے وعظ کے رموز سمجھا رہا تھا۔ اب خود بھی ایک سنگین غلطی کر بیٹھا تھا کہ۔ جاتے جاتے کھڑکی بند نہیں کی تھی۔

یا پھر خداوند جو بڑے کی رسی کو ہمیشہ ڈھیل دیتا ہے اُسے اور زیادہ برائیاں کرنے، ظلم توڑنے کی توفیق دیتا ہے مگر پھر اُن گناہ گار لوگوں کی رسی ایک جھٹکے سے کھینچ کر اُسے منہ کے بل گرا دیتا ہے۔ اس طرح کے ظالم مجرموں کا کوئی مجبول، کوئی معمولی سی بھی غلطی انہیں کیفرِ کردار تک پہنچا ہی دیتی ہے۔

جاذب نے ان سب کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جیسے بتا رہا ہو کہ تم لوگ ہوشیار رہو، میں اندر جا رہا ہوں ـــ وہ آہستہ سے اونچا ہوا کھڑکی کو پکڑ کر اُس نے زور لگایا اور پھر وہ اونچا ہوتا گیا جلد ہی وہ کھڑکی سے کود کر اندر چلا گیا تھا۔ اور کرنل شکیل دبی سانسوں میں اُسے صلواتیں سنا رہے تھے۔

"رستم صاحب! آپ اپنے جوانوں کو حکم دیجیے کہ وہ چھپتے چھپاتے کوٹھی سے نزدیک ہوتے جائیں جبکہ میرے بندے ذرا فاصلے پر نگرانی کریں گے اور کچھ لوگ تو گھر کے اندر اور بیرونی دروازے کے پاس جھاڑیوں میں چھپے ہیں۔ اگر جاذب اشارہ دے گا۔ تو وہ فوراً اس کی مدد کو لپکیں گے۔"

تبھی گھر کے اندر سے زبردست قسم کی فائرنگ ہونے لگی تھی۔ کرنل شکیل نے فوراً وائرلیس پر ہدایات دیں۔ اور خود بھی ریوالور سنبھالے آگے بڑھے تھے کہ برآمدے میں کھلنے والا داخلی دروازہ زوردار دھماکے سے کھل گیا اور بہت سے لوگ اندھا دھند بھاگتے ہوئے باہر نکلے ان میں سے تین چار کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور۔ وہ پیچھے مڑ مڑ کر گولیاں برسا رہے تھے۔ زوردار قسم کی چیخیں بلند ہوئیں اور دو بندے چیختے تڑپتے ڈھیر ہو گئے۔ کرنل شکیل اور دیگر لوگوں نے دیکھا کہ کیپٹن جاذب کلاشنکوف کی زد پر دو آدمیوں کو رکھے اُن کے ہاتھ سروں سے اونچے کروائے ہوئے باہر نکلا۔ وہ اس وقت بہت خونخوار نظر آ رہا تھا اُس کی پیشانی سے خون نکل نکل کر اُس کے چہرے اور کپڑوں پر گر رہا تھا۔

"سر! ان میں سے کسی غدار وطن فروش کو بچ کر زندہ مت نکلنے دیجیے گا۔" جاذب نے چلّا کر کرنل کو پکارا۔ تو زوردار طریقے سے گولیوں کا تبادلہ ہونے لگا اور وہ لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ کرنل شکیل نے زوردار آواز میں چلّا کر بھاگتے ہوئے مجرموں کو پکڑنے اور مزاحمت پر شوٹ کرنے کا حکم دیا تھا۔ پھر اس افراتفری کا فائدہ ان دو غداروں نے جنہیں جاذب نے ہینڈز اپ کروایا تھا یوں اُٹھایا۔ کہ ایک دم ہی ایک شخص پلٹا۔ وہ سعید رحیم ہی تھا۔ اور اُس نے اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ سے ریوالور چھینا اور جاذب پر اندھا دھند گولیاں برسا دیں۔ جس میں سے ایک گولی جاذب کا بازو چھیدتی گزر گئی اور وہ پیچھے اُلٹ کر گرا۔ اور سعید رحیم بے تحاشا واپس گھر کے اندر بھاگا۔ سلمان رضوی پیچھے لپکنے لگا تھا کہ جاذب نے گرتے گرتے بھی اس پر فائر کیا۔ تو وہ چیختا چلّاتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔

"جاذب! خبردار وہیں رُکے رہو، اُٹھنے کی کوشش مت کرنا۔" کرنل شکیل نے چیخ کر کہا۔ وہ تو اُسے گرتا گھائل ہوتا دیکھ ہی چکے تھے۔ وہ تیزی سے دشمنوں کا صفایا کرتے بھاگے آ رہے تھے

"سر! وہ سعید رحیم بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے اُسے پکڑیے سر۔" جاذب اُٹھا اور کوٹھی کے اندر بھاگ گیا تھا۔ پھر ہر جگہ تلاش کرنے کے باوجود اس موذی کا پتا نہ چلا۔

سعید رحیم کے علاوہ باقی بہت سے مجرم پکڑ لیے گئے تھے پانچ گولیوں کے تبادلے سے مارے گئے تھے اور اُن میں کافی زخمی بھی تھے۔ ان سب سے نپٹنے، فارغ ہونے کے بعد۔ کرنل شکیل اور میر رستم اپنی فورس کے

یہ چھاپہ انتہائی کامیاب ثابت ہوا تھا۔ وہیں تہہ خانے سے ایک سرنگ باہر کی طرف بھی نکلتی تھی۔ سعید رحیم یقیناً وہاں سے فرار ہوا تھا۔

"سر! سعید رحیم یہیں سے فرار ہوا ہے میرے سامنے وہ موٹر سائیکل پر یہاں سے نکلا ہے۔ افسوس کہ میرے ریوالور میں گولیاں ختم تھیں اور گن، مجھے گولی لگنے کے بعد وہیں گر گئی تھی۔ ورنہ میں اُسے زندہ نہ چھوڑتا۔" وہ مایوسی سے بولا تو کرنل شکیل اُسے تسلی دیتے باہر لے آئے۔ آخر سعید کب تک قانون کی نظروں سے بچ سکتا تھا۔ کبھی نہ کبھی شکنجے میں تو آنا ہی تھا اُسے۔

کرنل شکیل نے جاذب کو زبردستی احسن کے ساتھ واپس بھجوا دیا۔ احسن اسے لے کر اپنے اسپتال گئے تھے۔

اب احسن جاذب کو گھر ہی لے چلے آئے تھے۔ اور ـ ششدر سی مونا اور شانو اسے تکے جا رہی تھیں۔

"اٹھو جاذب! تم جا کر سو رہو۔ میں نے تمہیں سکون آور گولیاں کھلا دی تھیں۔ تم جا کر اب آرام کرو ورنہ کمزوری ہو جائے گی اور شانو بیٹا تم ان کے کمرے میں ضرورت کی ہر چیز پہنچا دو اور ایک دودھ کا گلاس اوولٹین ڈال کر زبردستی پلانا۔"

احسن نے حکم دیا تو شاہانہ نے گھبرا کر جاذب کی طرف دیکھا جو اسے ہی تو دیکھ رہا تھا۔ مگر نظریں ملتے ہی منہ پھیر لیا تھا۔

"نہیں یار احسن! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ بس میں جاتے ہی سو رہوں گا۔ اور دودھ تو ویسے بھی مجھ سے پیا نہیں جاتا ہے۔ تم شانو۔ یعنی شاہانہ کو تکلیف مت دو۔" وہ جلدی سے بولا۔

"کیا بات ہے جاذب! تمہارا انداز، تمہارا لہجہ خاصا اوپرا اوپرا اور تکلف سے بھرپور ہے۔ سچ بتاؤ۔ کیا تمہارا شاہانہ یعنی شانو سے کوئی جھگڑا وگڑا ہوا ہے۔" احسن نے اس کی نقل کرتے ہوئے پوچھا۔

"نن نہیں۔ بھلا شاہانہ سے میرا جھگڑا کیوں ہونا تھا۔" وہ خاصے پُرتکلف انداز میں شانو کو جلدی سے دیکھتا ہوا بولا۔ تو احسن کو اس کا لہجہ کھل گیا۔

"اچھا یار جھگڑا نہ سہی مگر ـ تم نے اس گھر سے اپنی مرضی سے کوچ کیا ہے نا ـــ اب تم یہاں مہمان بن کر آئے ہو۔ تو ـ اس گھر۔ اور گھر کے مکینوں کی روایت ہے کہ ہم اپنے آنگن میں دوست یا دشمن بھی ہوں۔ تو ان کی مہمان نوازی ضرور کرتے تو شانو بھی بحیثیت مہمان تمہاری مدارات کر رہی ہے۔"

احسن کے لہجے کی خفگی چھپی نہیں رہی تھی۔ جاذب نے گھبرا کر مونا پھر احسن کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر تو سنجیدگی پھیلی ہوئی تھی ـ وہ جلدی سے خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے کھسک لیا۔ ورنہ بہن اور بہنوئی کے تیور خاصے خطرناک لگ رہے تھے اسے۔ وہ دونوں مل کر آج جاذب سے بہت کچھ اگلوا اور منوا لیتے۔ اور ـ اور یوں تو قربانی رائیگاں ہی جاتی نا۔

جاذب کو اپنے بیڈ روم میں گئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ غسلخانے میں جا کر تولیہ گیلا کر کے چہرے پر پھیرتا باہر نکلا۔ اب پیشانی اور بازو میں کافی درد ہو رہا تھا۔ ٹیسیں اسے نڈھال سا کر رہی تھیں۔ پھر وہ دروازے سے نکلا تو ایک دم لڑکھڑا سا گیا۔ اس نے جلدی سے دیوار کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا۔ خاصی نقاہت محسوس ہو رہی تھی اور چکر آ رہے تھے۔ تبھی دروازہ کھٹکھٹا کر شاہانہ اندر چلی آئی۔ اس کے بازو پر جاذب کا نائٹ سوٹ اور گاؤن تھا۔ جاذب کو دونوں ہاتھوں سے دیوار تھامے دیکھا تو وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

"جاذب!" شاہانہ تیزی سے بڑھی اور بے اختیار اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیا۔

"شکریہ۔ میں ـ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس سر میں درد ہونے لگا ہے ـــ میں آرام کروں گا تو درد رفع ہو جائے گا۔ تم مجھے چھوڑ دو۔" وہ پھیکی ہنسی ہنس کر آگے بڑھا مگر لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔

"یقین جانیے جاذب میں آپ کو چھوڑ چکی ہوتی اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ میرا سہارا چھنتے ہی آپ بری طرح سے نیچے جا گریں گے اور مزید زخمی ہو جائیں گے ـ تبھی میں کوئی رِسک لینا نہیں چاہتی۔ اور آپ کے انکار کے باوجود آپ کو محفوظ جگہ پہنچا کر دور ہٹ جاؤں گی۔"

وہ خشک انداز سے کہتی ہوئی اسے سہارا دے کر پلنگ تک لے آئی تھی۔ جاذب نے اس کے کاندھے کے گرد سے جلدی سے ہاتھ ہٹایا اور بیٹھ رہا۔

"شکریہ شاہانہ! بہت تکلیف دی ہے آپ کو، یقیناً تھک گئی ہوں گی۔"

"جی ہاں تھک گئی ہوں میں۔" شاہانہ نے بدمزگی و خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

تو یہ کیسا اجنبی سا اور پرایا سا غیر بندہ لگ رہا تھا وہ تو۔

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا

شاہانہ کو بھی وہ عزیز از جان بندہ دل و جان، رگِ دل سے نزدیک تر ہونے کے باوجود خود سے سمندروں، کوسوں دور لگ رہا تھا۔

"یہ میرا اسلیپنگ سوٹ آپ کے پاس کہاں سے آگیا ہے؟" جاذب نے بس یونہی پوچھا۔

"آپ تو اپنی بہت سی چیزیں یہاں چھوڑ گئے ہیں جاذب! دراصل آپ کو جانے کی اتنی جلدی تھی کہ اپنی چیزیں سمیٹنی بھی بھول گئے تھے۔ بہرحال وہ بھی میں نے ایک بیگ میں سمیٹ رکھی ہیں۔ اب جائیے گا تو یاد سے انہیں لیتے جائیے گا۔ اور آپ کے یہ کپڑے اور چند اور جوڑے بھی میں نے استری کر کے اپنی الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ خیر اس وقت تو آپ یہ سوٹ بدل لیجیے۔ آپ کے کپڑے خاصے میلے اور خون آلود ہو رہے ہیں۔ میں باہر جا رہی ہوں۔ آپ اطمینان سے یہاں ہی بدل لیجیے۔ غسلخانے مت جائیے گا ورنہ گرنے پر کوئی سنبھالنے والا بھی نہ ہو گا۔"

شاہانہ تیزی سے باہر چلی گئی تھی۔ جاذب خالی نظروں سے دروازے کو تک رہا تھا۔ پھر کراہتے ہوئے بمشکل اس نے کپڑے بدل لیے تھے اور میلے کپڑے نیچے گرا کر وہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ جاذب نے چونک کر دیکھا۔

"آجائیے۔" جاذب نے بہرحال بلانا تو تھا ہی نا۔

شاہانہ ہاتھوں میں ٹرے سنبھالے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی اندر داخل ہوئی تھی۔

"اٹھیے یہ پی لیجیے۔ میں جانتی ہوں دودھ آپ پسند نہیں کرتے۔ آپ کو مینگو ملک شیک پسند ہوتا تھا کبھی۔ تو اگر وہ پسند بھی بدل نہیں گئی ہے تو۔ پھر اٹھ کر پی لیجیے۔" وہ طنزیہ بولی۔ پھر جھک کر اس کے بکھرے کپڑے اٹھانے لگی۔

"میں ملک شیک پی لوں گا۔ مگر تم یہ میلے کپڑے مت اٹھاؤ۔ میں صبح میں لیتا جاؤں گا۔"

"فکر مت کیجیے۔ میں دھونے نہیں جا رہی ہوں بلکہ مونا بھابھی نے منگوائے ہیں۔ اور وہ ان کا کیا کریں گی، مجھے معلوم نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے کہتی ہوئی بازوؤں پر کپڑے ڈال کر بولی۔

"آپ یہ پی لیجیے۔ احسن بھائی تاکید کر رہے تھے۔" شاہانہ نے گلاس بھر کر جاذب کو پکڑایا۔ تو جاذب کی انگلیوں سے اس کی انگلیاں ٹکرا گئیں۔ مگر شانو نے جلدی سے ہاتھ کھینچتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

پھر کتنے لمحے بیت گئے۔ جاذب سر جھکائے گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں کہہ رہا تھا وہ شانو سے۔ گویا اس کے وجود کی نفی کر رہا ہو۔ اس کی وہاں موجودگی کی اہمیت ہی نہ تھی۔ اب ایسی بھی کیا لاتعلقی۔ انسان کوئی رشتہ، کوئی ناتا چاہے وہ مبہم سا کیوں نہ ہو مگر اسے برقرار ضرور رکھے۔ کہ اس تعلق کے سرے کو تھام کر کوئی بات کرنے، کچھ پوچھنے جوگا رہ جائے۔ بالکل کٹ کر گونگا بے حس نہ بن جائے۔

شاہانہ کو شدتوں سے اپنی توہین کا احساس ہوا تو وہ جھٹکے سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"شاہانہ!" جاذب بے اختیار پکار بیٹھا۔

وہ رک گئی۔ پھر مڑے بغیر گردن گھما کر پریشان سے جاذب کو دیکھا۔

"شاہانہ! تم بہت، بے حد اچھی لڑکی ہو۔ اور میرے دل میں تمہارے لیے بے پناہ، بے حد عزت ہے۔"

"صرف عزت ہے میرے لیے آپ کے دل میں؟" وہ گردن کو خم دے کر بولی۔ انداز سوالیہ تھا۔

"ہاں عزت ہے۔" وہ جھنجھلا ہوا بولا۔ "اور بہت انسیت کے جذبات بھی ہیں۔"

"محبت کے نہیں ہیں۔؟" وہ اب پوری کی پوری مڑ گئی تھی۔ اور طیش کے عالم میں اس کی آنکھوں میں گھور رہی تھی۔

"جاذب۔ چند دن۔ صرف چند دن پہلے تک تو آپ عزت کے ساتھ ساتھ مجھ سے بے پناہ محبت بھی کرتے تھے۔ تو پھر اتنی جلدی وہ محبتیں کہاں فنا ہو گئی ہیں۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"بزدل۔ دھوکے باز، بے وفا۔" شاہانہ نے گویا اس کے سینے پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔

جاذب نے ہونٹ سختی سے دانتوں تلے کچلے اور آنکھیں زور سے بھینچ لی تھیں۔ اب زخموں کی تکلیف سے زیادہ تو۔ شاہانہ کے الزامات و خطابات نے دل پر گھاؤ لگائے تھے۔

"شانو! میں۔ میں بحیثیت ایک بہی خواہ اور دوست کے تم سے یہ درخواست بلکہ التجا کرنا چاہتا ہوں کہ تم بے حد اچھی لڑکی ہو اور کسی صورت بھی علی امام جیسے شاطر، بدکردار اور گھٹیا انسان کے قابل نہیں ہو۔ دیکھو خدارا تم کہیں ایسا قدم مت اٹھا لینا کہ۔ محض مجھے حسد میں مبتلا کرنے کی خاطر علی کو اپنانے۔ اس سے شادی کی ہامی بھر بیٹھو۔ وہ شخص۔ علی تمہیں پوری طرح سے برباد کر دے گا۔" وہ لہجے میں تمام خدشات و خوف بھر کر بولا۔ تو شاہانہ کے وجود میں گویا انگارے بھر گئے۔

"جاذب علی!" وہ لرزتی ہوئی بڑھی۔ پھر جاذب کا گریبان مٹھیوں میں بھینچ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"ہاؤ ڈیر یو کہ تم اس انداز سے میرے بارے میں سوچنے کی جرأت کرو۔ تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ تمہاری محبت سے مایوس ہو کر میں ایسا کوئی مکروہ قدم اٹھاؤں گی کہ علی سے شادی کروں گی۔ وہ بھی تمہیں حسد میں مبتلا کرنے کے لیے۔ نہیں جاذب علی! تم خود کو اس قدر اعلا و ارفع مقام پر مت سمجھو۔ میں سچ کہتی ہوں کہ یہ جو تم خود کو بہت نیک، پاک، باکردار اور با اصول انسان سمجھتے ہو۔ درحقیقت تم ایک کمزور اور پست کردار انسان ہو۔ بدعہد اور جھوٹے ہو اور تمہاری نسبت وہ شخص جسے لوگ آوارہ، بدکردار اور بے اصولا سمجھتے ہیں۔ وہ علی امام سدھرنے پر تم سے کہیں بہتر کہیں اچھا شخص ثابت ہو گا۔ تمہیں میرے لیے بالکل بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی مسٹر جاذب! آپ کا اب مجھ سے رشتہ و تعلق ہی کیا ہے جو آپ میری بھلائی و بہبودی کے لیے اس قدر پریشان ہونے کی کوشش فرما رہے ہیں؟" شاہانہ نے جاذب کا گریبان جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ وہ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔

مگر جاذب ہونٹ کاٹتا ہوا خاموش ہی رہا۔ بھلا کچھ کہنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا۔

"شکریہ جاذب علی! مگر اب آپ میرے بارے میں قطعی فکر مند مت ہوں اور اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالیں۔ میں اچھی لڑکی ہوں یا نہیں۔ آپ کو میری تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی میں اگر ایسی ہی اچھی ہوتی تو یوں بے دردی سے ٹھکرائی نہ جاتی۔"

وہ حسرت سے کہتے ہوئے مڑی۔ پھر جاذب پر گہری نظر ڈالتی باہر چلی گئی تھی۔

شاہانہ نے جاذب کے کپڑے ملازم کے حوالے کرتے ہوئے اسے فوری طور پر صبح لانڈری بھیجنے کی تاکید کی تھی۔ جب وہ واپس سٹنگ روم میں آئی۔ تو احسن کسی سے فون پر باتیں کرتے ہوئے خاصے پریشان لگ رہے تھے۔ شاہانہ نے ہول کھائے ہوئے انداز میں مونا کو استفسارانہ انداز میں دیکھا۔ جنہوں نے کوفت زدہ انداز میں پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"راشدہ پھوپھو کا فون ہے۔ کہہ رہی ہیں کہ دادی اماں کی طبیعت کافی خراب ہے اور وہ ہم سب کو بالخصوص تمہیں بہت یاد کرتے ہوئے روتے روتے نڈھال ہو رہی ہیں۔ تم لوگ فوراً پہنچو۔"

مونا نے بتایا تو شاہانہ نے سختی سے منہ بند کرتے ہوئے گہری سانس لیتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں مونا بھابھی۔! تایا زمان یا ہمارے والد کی والدہ محترمہ ہماری دادی صاحبہ۔ اب ان لوگوں سے کم از کم میں تو کوئی تعلق، کوئی رشتہ قائم نہیں رکھنا چاہتی ہوں۔ ارے اِن لوگوں نے ہمیں اس قدر بے وقوف بنایا۔ شرم بھی نہ آئی انہیں۔ اور آپ یقین کریں۔ اب بھی یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہوں گے۔ پھر سے ڈرامہ کر رہی ہوں گی ہماری دادی صاحبہ۔"

شاہانہ نے نفرت سے منہ پھیرے ہوئے تھا۔ پھر وہ مونا کے قریب بیٹھ کر ان کی باتیں سننے لگی۔

"پھوپھو! آپ زبیر سے میری بات کروائیے۔" احسن نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا! تو پھر جس وقت زبیر اسپتال سے واپس آئیں تو ان سے کہیے گا کہ وہ مجھے فون کر لیں گے۔" وہ حتمی لہجے میں بولے پھر راشدہ پھوپھو نے جانے کیا کہا تھا کہ احسن کی پیشانی کی لکیروں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر وہ ذرا بگڑ کر بولے تھے۔

"کیوں پھوپھو! اس میں بھلا غلط بیانی کیا ہو گئی۔ آپ لوگوں نے کیا خود کو اعتماد کے قابل چھوڑا ہے۔ نہیں پھوپھو، بہت دھوکے کھا چکے ہیں ہم۔ کون جانے اب آپ کیسا ڈرامہ کر رہے ہوں۔"

احسن نے زود رنجے انداز میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ سبھی ان کی شکل تک رہے تھے۔

"کیوں احسن بیٹیا! اب کیا فرما رہی تھیں دیدہ بہو اور راشدہ بی؟" انابی نے پوچھا۔

"کہتی ہیں کہ دادو کی طبیعت سخت خراب ہے اور بار بار ہم سے ملنے کی ضد کر رہی ہیں۔ اور وہ شاہانہ سے کوئی انتہائی ضروری بات کرنے کو بے چین ہیں۔ اور اسے بلا رہی ہیں۔" احسن تھکے تھکے سے بیٹھ گئے تھے۔

"دراصل بڑی بیگم کے ساتھ تو وہی کہاوت والی بات ہو گئی ہے یعنی شیر آیا۔ شیر آیا والی۔ انہوں نے اپنی چھوٹی سی بیماری سے سب کو اتنی بار بے وقوف بنایا ہے کہ اب۔ اگر وہ حقیقتاً بیمار ہیں بھی تو کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں ہو گا —— ویسے اب وہ شاہانہ بیٹی کو کیوں بلا رہی ہیں۔ اب کون سی کسر باقی رہ گئی ہے اس کی بربادی میں۔ پہلے کیا کم زک پہنچا چکی ہیں دادی اماں اپنی پوتی کو۔"

انابی خود کلامی کے سے انداز میں بولیں تو مونا نے چونک کر دیکھا۔

"یہ انابی کوئی گہرا راز اپنے سینے میں چھپائے پھرتی ہیں۔ وہ یقیناً کوئی ایسی بات جانتی ہیں جس کا تعلق شاہانہ اور جاذب کی ذات سے ہے۔" مونا کو یقین آ گیا تھا۔

"تو انابی میں کب ان سے ملنے جا رہی ہوں۔"

شاہانہ تھکے تھکے انداز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے مونا سے اجازت مانگی کہ وہ تھک چکی ہے۔ اور آرام کرنا چاہتی ہے

وہ رات بڑی بے چینی و بے قراری سے گزر گئی تھی۔ شاہانہ تیار ہو کر نیچے ڈرائینگ روم میں آئی تو مونا اور احسن ناشتا کر رہے تھے۔ انابی علینہ کو انڈا کھلا رہی تھیں۔ اور ساتھ ساتھ بڑے زور شور سے گفتگو ہو رہی تھی۔ شانو ان سب کو سلام کرتی بیٹھ رہی تھی۔

"انابی! کیا جاذب ناشتا کر چکے ہیں؟" شاہانہ نے اچانک پوچھا۔ تو مونا اور انابی نے چونک کر دیکھا۔ اسے ابھی بھی اس بے وفا کٹھور کا خیال ہے۔؟

"نہیں، جاذب کو رات میں نے کافی تیز دوائیں دی تھیں۔ وہ کافی دیر تک سوتا رہے گا۔" احسن نے کہا۔

"جی نہیں، دوا کوئی ایسی تیز بھی نہیں تھی کیونکہ میں کافی دیر سے جاگ رہا ہوں۔"

جاذب کی آواز پر سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ بازو کو سلنگ میں ڈالتا قریب چلا آیا۔ پھر سب کو سلام کرتا ہوا مونا کے ساتھ بیٹھ رہا۔ سب نے دیکھا کہ اس کی پیشانی اور آنکھوں پر سوجن آ گئی تھی۔ شاہانہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر چائے بنا کر پیالی جاذب کے سامنے کر دی۔

"یہ صبح صبح ڈاکٹر زبیر کیوں آئے تھے؟ میں نے ان کی آواز سنی تھی۔" جاذب نے پوچھا تو شانو بھی چونک گئی۔

"وہ دادی اماں کی بیماری کی اطلاع دینے آیا تھا۔ کافی طبیعت خراب ہے ان کی اور وہ انہیں اسپتال داخل کر رہے ہیں۔ زبیر کہہ رہا تھا وہ ہم سے ملنے اور معافی مانگنے کے لیے بے چین ہیں۔ تو میں نے سوچا ہے کہ میں مونا کے ساتھ جا کر انہیں دیکھ آؤں گا شانو تو نہیں جائے گی نہ ہی میں ان حالات میں اسے لے جانا پسند کروں گا۔" احسن نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے تو شانو نے سر ہلا کر گویا ان کی بات کی تائید کی۔

"شانو! انابی! آپ لوگ جاذب کا خیال رکھیے گا۔ ہم جلد آنے کی کوشش کریں گے۔"

"مگر احسن میں تو ذرا ایچ کیو (H.Q) تک جاؤں گا۔ آج تو مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ کافی مصروف رہوں گا میں تو۔" جاذب نے جلدی سے کہا۔ وہ دراصل شاہانہ کے ساتھ تنہا رہنے کے خیال ہی سے گھبرا گیا تھا۔ مونا نے بھائی کو گہری نظروں سے دیکھا مگر چپ رہیں۔

"اول تو تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔ مگر اب جب کہ تم بضد ہو تو ایک مہربانی ضرور کرنا اپنے اور ہمارے اوپر۔ کہ کام سے فارغ ہو کر گھر لوٹ آنا۔ ورنہ مونا فکر کرتی رہے گی اور اپنی طبیعت خراب کر لے گی۔" احسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ شاہانہ آپ کے پاس میرے کچھ کپڑے ہوں گے۔ پہننے کے لیے چاہیے ہیں۔" وہ جھجکتا ہوا بولا۔

"میں نے فضلو کے حوالے کر دیا تھا آپ کا بیگ۔ اس نے آپ کے کمرے میں پہنچا دیا ہو گا۔" وہ علینہ کا ہاتھ تھامے واپس اندر چل دی تھی کہ ایک کار پورچ میں آ کر رکی تھی۔

مسرت کو دیکھ کر شاہانہ نے گویا سکھ کا سانس لیا تھا ورنہ تو اس کا سارا دن غارت ہوتا نظر آ رہا تھا —— وہ تیزی سے مسرت کی طرف بڑھی اور اسے لے کر لاؤنج میں آ گئی۔

"شانو! میں تو کل پھوپھو کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ رات کو دیر سے واپسی ہوئی۔ زلفی بھیا نے کل والے چھاپے اور جاذب کے زخمی ہونے کے بارے میں بتایا ہے۔ تبھی میں بھاگی چلی آئی ہوں۔" مسرت نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"کہاں ہے جاذب۔ کیا کافی چوٹیں آئی ہیں۔؟" مسرت نے پوچھا۔

"چوٹیں آئی تو ضرور ہیں مگر زخم میں نے دیکھے نہیں۔ نہ ہی مجھے ان کی گہرائی کا اندازہ ہے۔ مگر وہ گھاؤ اتنے تکلیف دینے والے اور اتنے مہلک نہیں ہوں گے نا تبھی تو وہ کام پر چلے گئے ہیں۔" شاہانہ نے افسردگی سے جواب دیا۔

"شانو! کیا تم دونوں کی آپس میں صلح نہیں ہوئی ہے اور آخر یہ یکایک جھگڑا اور علیحدگی ہوئی کس وجہ سے ہے۔ کیا اس کی وجہ شمائلہ ہی ہے؟" مسرت بے یقینی لہجے میں کہے بول رہی تھی۔

"ہاں! شمائلہ ہی وجہ فساد و جدائی ہے میرے اور جاذب کے بیچ۔ خیر تم یہ تکلیف دہ تذکرہ رہنے دو اور کوئی اچھی سی دوسری بات کرو۔" شانو بے چینی سے بولی۔

"شانو! مجھے یقین جو نہیں آتا۔ کہ جاذب تم سے بے وفائی کرے گا۔ یا وہ بھی ایک عام چھچھورا، بے کار سا بندہ ثابت ہو گا۔ اور شانو! ویسے وہ دسرا اٹاپک بھی خاصا ڈیرپیسنگ ہے۔ وہ زلفی بھائی بتا رہے تھے کہ سعید رحیم واقعی تخریب کاری میں ملوث ہے اور کل وہ جاذب کو زخمی کر کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ورنہ پکڑا جاتا۔"

"ہاں مسرت تمہیں تو شکرانے کے نفل ادا کرنے چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے شر سے بچا لیا ہے۔ ورنہ نہ جانے وہ تمہارا کیا حشر کرتا۔" شانو جھرجھری لے کر بولی۔

"ہاں شانو! وہ جو شاہدہ زمان کا قلمی دوست تھا نا وہ عارفین —— وہ بھی پکڑا گیا ہے۔ وہ بھی کافی بڑے گینگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور کافی مالدار بندہ ہے۔ خوب ساری حرام کی کمائی جمع کر رکھی ہے اس نے۔ اور وہ شاہدہ کے بارے میں بہت بیہودہ بکواس کر رہا تھا۔"

"یہ شاہدہ اور اس جیسی کتنی احمق لڑکیاں خود اپنے لیے تباہی کا سامان پیدا کرتی ہیں اور عارفین جیسے گھاگ مرد ان کو پھنسا کر قابو کر کے جیسا چاہے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ یہ قلمی دوستی کے اشتہار چھپوانے والے لڑکیاں کم اور زیادہ تر مرد حضرات ہوتے ہیں۔ جو نسوانی نام اپنا کر خود کو لڑکی ظاہر کر کے خط لکھتے ہیں اور معصوم لڑکیوں کا شکار کرتے ہیں۔"

مسرت اور شاہانہ نہ جانے کتنی دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی تھیں۔ وہ چونکیں تو اس وقت جب انابی نے انہیں کھانے کے لیے بلایا۔ وہ لوگ کھانا کھا ہی رہی تھیں جب احسن اور مونا واپس آ گئے اور کھانے میں شریک ہو گئے۔ اور انہوں نے بتایا۔ کہ نسیمہ بانو کی طبیعت واقعی بہت خراب ہے اور وہ احسن و مونا کو لپٹا کر چیخیں مار مار کر روتی رہیں اور بار بار معافیاں مانگتی رہیں۔ وہ بے قراری سے تمہیں پکارتی تھیں اور کہتی تھیں کہ انہوں نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔

اور تمہیں بلایا جائے تاکہ وہ تم سے گناہ بخشوالیں۔" مونا نے بتایا۔

"زیادتی۔ صرف زیادتی۔ ارے نسیمہ بیگم نے تو اپنی معصوم پوتی پر ظلم توڑا ہے۔ زندگی خراب کرنے کی کوشش کی ہے شانو کی۔ پھر کیسے نہیں خدا سزا دے گا اور ضمیر کی چوٹ پڑے گی۔" انا بی نے کرختگی سے کہا تو مونا بولے بغیر نہ رہ سکیں۔

"انا بی! آخر آپ ہمیں بتا کیوں نہیں دیتی ہیں کہ آخر دادی اماں نے کیسا قہر توڑا ہے شاہانہ پر اور جاذب پر بھی۔ ہاں میں جانتی ہوں کہ یہاں سے اس گھر سے جاذب کو نکلوانے میں صد فی صد ہاتھ دادو ہی کا ہے اور انہوں نے اور بھی بہت سی ناانصافیاں کی ہیں جن کی آپ کو خبر ہے اور آپ ہمیں تو بتا نہیں رہی ہیں مگر گاہے گاہے دادی کو صلواتیں سناتی چوٹیں کرتی رہ جاتی ہیں۔" میمونہ نے انا بی کا گھیراؤ کیا تو وہ کچھ گھبرا گئیں۔

"لے بچی! میں تو قسموں اور وعدوں کی زنجیر میں بندھی ہوں۔ قسم دے کر اپنی گویائی سے محروم ہو چکی ہوں۔ تم میری زبان مت کھلواؤ۔ بس خدا کی لاٹھی کا کرشمہ دیکھو۔ وہ خود ہی تمام رازوں سے پردے ہٹا رہا ہے۔" انا بی کو جاذب سے کیا وعدہ یاد تھا۔ تبھی وہ بے بسی سے بولیں۔

"تو اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ میرا شبہہ صحیح تھا اور دادو نے ہی جاذب کو یہاں سے نکالا اور اسے شانو سے دستبردار ہونے کو کہا۔" مونا بے صبری سے چلا اٹھیں تو انا بی سر ہلاتی وہاں سے چلی گئیں۔

"پتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جاذب کو دادی اماں نے ہی قسمیں وعدے دے کر اپنا مطلب حل کیا ہے۔" میمونہ پُرجوش ہو کر بولیں۔ تو احسن نے کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ روک لیا۔

"یہ جاذب کا شانو سے دستبردار ہونا، بھلا اس کا کیا مطلب ہے؟" وہ حیران تھے۔

"بتاؤں گی۔ سب بتا دوں گی۔ آپ مجھے تھوڑا وقت دیجیے۔" مونا اب کچھ مطمئن ہو کر کھانا کھا رہی تھیں مگر شانو نے ہاتھ روک لیا تھا۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

شاہانہ مسرت کے ہمراہ اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ مسرت کچھ خفا خفا اور پریشان لگ رہی تھی۔

"شانو! آخر تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتیں کہ جاذب کے ساتھ آخر کیا جھگڑا ہوا ہے اور انہوں نے کن لفظوں میں تم سے قطع تعلق کرنے کی بات کی ہے؟ اور شمائلہ کس حد تک تمہاری بربادی کی ذمہ دار ہے۔ پھر شاہدہ کیا رول ادا کر رہی ہے؟ تم نے بتایا ہے کہ شاہدہ سے رشتہ طے ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ یہ۔ یہ سب کیا ہے۔" مسرت بوکھلا گئی تھی۔

"مسرت! میری بربادی میں سوائے جاذب کے اور کسی کا ہاتھ نہیں ہے۔" شاہانہ نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس نے من و عن تمام گفتگو مسرت کے سامنے دہرا دی تھی۔ دونوں سہیلیاں سخت ڈیپریشن میں مبتلا و غمگین تھیں۔ یوں ہی لمحے بیتتے گئے۔ پھر جب انا بی انہیں چائے کے لیے بلانے آئیں تو دونوں نڈھال سی سوئی ہوئی تھیں۔ انا بی نے بتایا کہ میمونہ احسن کے دوست بمعہ فیملی ملنے آئے ہوئے ہیں تو شانو نے اپنے اور مسرت کے لیے چائے کمرے میں ہی منگوا لی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے چائے پی رہی تھیں۔ کہ فون کی گھنٹی بجی۔ مسرت قریب بیٹھی تھی۔ شانو نے اشارہ کیا تو مسرت نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو جی۔ کون صاحب بات کر رہے ہیں۔؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"جی جاذب تو یہاں نہیں۔ آپ میسج دے دیجیے۔ میں۔ میں کون بول رہی ہوں۔؟" وہ یکایک حیرانی سے بولی

"جی میں مسرت ہی ہوں مگر آپ کون بول رہے ہیں۔؟" مسرت کے چہرے پر تجسس کے سائے ابھرے تو مگر جلد ہی خوف و ہراس و زردی میں بدل گئے۔ "ک۔ کک۔ کک کون؟" وہ گم صم ہو کر بس سنتی ہی رہ گئی تھی۔ پھر اس نے جھرجھری لے کر ریسیور گویا پھینک دیا تھا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے وحشت زدہ انداز میں شانو کو گھورنے لگی۔

"کون تھا۔ کیا کہہ رہا تھا۔ مسرت تمہیں کیا ہوا ہے۔؟" شانو نے اسے جھنجوڑا۔

باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

خواہشوں کا سفر

ناہید چودھری

میں نے گاؤں سے کافی فاصلے پر کچی سڑک کے کنارے بس رکوا دی اور اپنا مختصر سامان سنبھال کر نیچے اتر آیا۔ نیچے اتر کے میں نے طویل اطمینان بھری لیکن تھکی تھکی سانس بھری۔ توبہ کتنا تھکا دینے والا ہوتا ہے راولپنڈی سے سیالکوٹ تک کا سفر۔

میں نے پل بھر کے لیے اپنا بیگ، تھرماس اور دوربین سڑک کے کنارے پہ رکھ دی اور الجھے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیر کر راستے میں پڑنے والی گرد صاف کرنے لگا۔

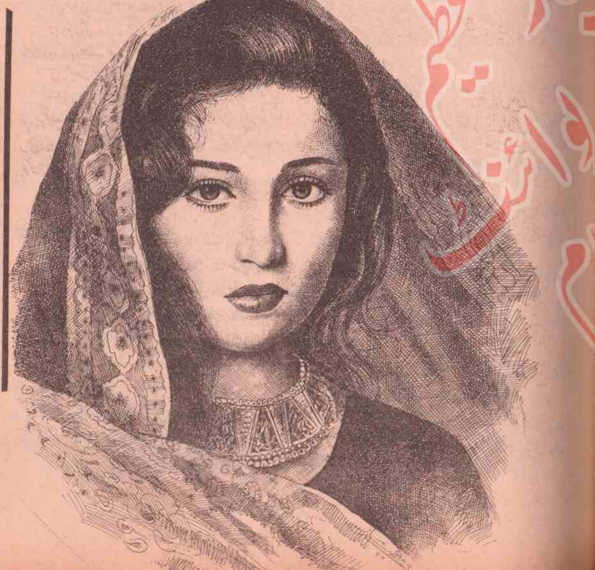

سہ پہر کے سائے لمبے ہو چکے تھے۔

پرندوں کے غول نیلگوں آسمان پہ اپنے رنگین پروں کو تیزی سے ہلاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کی طرف رواں دواں تھے۔

ہرے بھرے کھیت دور دور تک لہلہاتے ہوئے معطر ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی پتلی سی پگڈنڈی جس پر سے ایک وقت میں صرف ایک انسان گزر سکتا تھا۔

دور شام کے دھندلے سائے میں کچے پکے مکانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور ان کی چمنیوں سے نکلتا ہوا سرمئی دھواں ہلکورے لیتا ہوا آسمان پر چھائی شفق کی سرخی میں ضم ہو کر اسے رات کی سیاہی میں بدل رہا تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اپنے اندر اتار لی۔

"میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے اپنے آپ سے کہا اور اپنا سامان اٹھا کر پگڈنڈی پہ چلنے لگا۔ اس اونچی نیچی پتلی سی پگڈنڈی پہ چلتے ہوئے مجھے اسلام آباد کی سیاہ کول تار کی چمکتی ہوئی چوڑی چوڑی سڑکیں یاد آ گئیں۔ ان کی صفائی کا یہ عالم تھا کہ اگر سوئی بھی گر جائے تو آسانی سے مل سکتی ہے۔ لیکن اِس پگڈنڈی پر چلنے کا مزا ہی کچھ اور تھا تیز ہوا سرسراتی ہوئی جسم سے ٹکرائی تو میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

موسم بدل رہا تھا اس لیے ہوا بھی خاصی خنکی لیے ہوئے تھی۔

تھکن اب مجھ پہ پوری طرح حاوی ہو چکی تھی۔ دل چاہ رہا تھا یہیں لمبا لمبا لیٹ جاؤں۔ لیکن پھر کسی سانپ سے ملاقات ہونے کے خوف سے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

اور—— پھر جیسے اچانک میرے قدموں کو بریک سے لگ گئے —— (نہیں نہیں آپ لوگ بے فکر رہیں۔ کوئی سانپ سامنے نہیں آیا) بلکہ اس دشمنِ جاں کا گھر آ گیا تھا جو اتفاق سے میری کزن تھی۔

میرے قدموں کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد میں ماں جی کی پُرسکون گود میں سر رکھے بیٹھا تھا۔

"اس مرتبہ بہت دیر سے آئے ہو۔" ماں جی نے میرے بال ٹھیک کرتے ہوئے محبت سے کہا۔

"اب آئندہ سے بغیر اطلاع کے آیا کروں گا۔ کم از کم آپ آرام سے تو بیٹھیں گی نا۔" میں ان کی تکلیف کے خیال سے بولا۔

"ماں کے لیے اولاد کی غیر موجودگی میں سارے دن ایک سے ہوتے ہیں۔" ماں جی میرے بیگ سے میلے کپڑے نکالتے ہوئے بڑے فلسفیانہ انداز میں بولیں۔

"اچھا ماں جی! باقی باتیں پھر۔ پہلے بتائیں آپ نے پکایا کیا ہے؟" مجھے بھوک تو کوئی خاص نہیں تھی لیکن مجھے پتا تھا کہ ماں جی نے میری پسندیدہ چیزیں بنائی ہوں گی۔ اور خود بھی بھوکی ہوں گی۔

"ساگ اور مکئی کی روٹی۔" ماں جی کپڑے اٹھا کر بتاتی ہوئی چلیں تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ سارے دن کی تھکن کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں بے سُدھ ہو کر سو جاتا۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

دور گاؤں کی سادہ زندگی دھیرے دھیرے رات کی سیاہی پھیلتے ہی سمٹ رہی تھی۔

گاؤں کے معصوم لوگ منہ اندھیرے بستر چھوڑ دیتے ہیں اور اندھیرا پھیلتے ہی اپنی ساری دلچسپیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ سادہ اور معصوم لوگ —— باوجود اس کے —— کہ میں بھی گاؤں کا ہی باشندہ ہوں۔ لیکن مجھ میں ایسی کوئی عادت نہیں تھی۔

میں گاؤں میں صرف اتنا عرصہ رہا کہ جب میں نے چلنا شروع کیا اور اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا تو ابا جی جو خود صرف میٹرک پاس تھے اور تعلیم کے بہت ہی دلدادہ۔ انہوں نے مجھے اسلام آباد اپنے دوست کے پاس بھیج دیا۔ مجھے یاد ہے ماں جی نے کیسے کیسے واسطے دیے تھے لیکن ابا جی نے کہا۔

"یہ میرا بیٹا ہے شیرو۔ شیر افگن۔ یہ بہت سارا پڑھے گا۔"

اس وقت مجھے اپنا نام بہت مشکل لگا تھا۔

"پھر آ کر کھیتی باڑی کرے گا۔" ماں جی غصے سے بولیں۔

"نہ بھئی، یہ ڈی سی بنے گا اپنے علاقے کا۔ یہ کسی معمولی انسان کا بیٹا تھوڑی ہے۔"

ابا جی نے رشید کو میرا سامان اٹھانے کا اشارہ کیا تو میں ماں جی کے پیچھے چھپ گیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔

"ماں جی! میں رات کو کس کے پاس سوؤں گا۔ مجھے ڈر لگے گا۔"

میں نے روتے ہوئے کہا تو ماں جی بھی میرے ساتھ شروع ہو گئیں۔

"اوہ صفیہ! کیوں بدشگونی کر رہی ہو۔ چند سالوں کی تو بات ہے۔" ابا جی نے بڑے معمولی انداز میں چند سال کہہ دیا۔

"میرے لیے تو چند دن بھی بہت بھاری ہیں چوہدری۔" ماں جی نے میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"خیر۔ خیر، یہ درمیان میں آتا رہے گا۔ کبھی تم بھی مل آنا۔"

ابا جی نے تسلی دی۔ اور ساتھ ہی میرا بازو پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

اور پھر ہرے بھرے کھیتوں سے گزرتے ہوئے ہم لوگ سڑک کی طرف رواں دواں تھے۔ تقریباً ایک میل کے فاصلے پہ تھی سڑک —— جب تک ماں جی دروازے پر کھڑی نظر آتی رہیں میں مڑ مڑ کر انہیں دیکھتا رہا۔ آخر فاصلے کی دھند میں وہ بھی چھپ کر رہ گئیں۔

سڑک کے قریب پہنچتے تک میں بے تحاشا تھک چکا تھا۔ رونے سے آنکھیں بھی دُکھ رہی تھیں۔

سڑک پہ جیپ کھڑی تھی۔ ابا جی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے اور ڈرائیور کو پیچھے بھیج دیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے رشید کو کچھ ہدایتیں دیں اور ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

تقریباً دوپہر کو ہم لوگ چلے تھے۔ راستے میں کئی جگہ رکے بھی۔ اس طرح رات آٹھ بجے تک ہم لوگ اسلام آباد پہنچ چکے تھے۔ ان لوگوں کو شاید پہلے ہی اطلاع کر دی گئی تھی کہ وہ اپنے لان میں ہمارے منتظر تھے۔

الیاس ملک، ابا جی کے دوست۔

"آؤ اکبر! کچھ زیادہ دیر نہیں ہو گئی۔ میں تو اب پریشان ہونے لگا تھا۔" انہوں نے ابا جی کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

"چلو، ہم اس سے پہلے ہی پہنچ گئے۔" ابا جی ہنس پڑے "یار! پہلے اِس چھوٹو بھتیجے سے تو مل لو۔" ساتھ ہی "واہ بھئی، یہ تو میرا بیٹا ہے۔ شکر ہے تم پر نہیں گیا۔ بیٹا آؤ۔ اپنے بھائیوں سے ملو۔"

الیاس چاچا نے مجھے پیار کرنے کے بعد اپنے پیچھے کھڑے ان تین لڑکوں کے سامنے کر دیا جن میں سے ایک مجھ سے بڑا تھا۔ ایک چھوٹا اور ایک میری عمر کا تھا۔

بڑے عمیر بھیا تھے۔ وہ دسویں میں تھے۔ پھر زین میرا ہم عمر۔ اس کے بعد حارث تھا۔ تینوں نے مجھ سے ہاتھ ملائے زین نے کچھ زیادہ ہی جوش سے ملایا۔ اس کی آنکھیں ویسے بھی شرارت سے چمک رہی تھیں۔ شاید وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ملانے کی سوچ چکا تھا۔

اس کے بعد سب ہی اندر آ گئے۔ اتنا بڑا اور خوبصورت گھر میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ہماری حویلی بھی بڑی تو بہت تھی، لیکن اسے سجانے والا کون تھا۔ ماں جی ویسے ہی بہت سیدھی سادی تھیں۔

الیاس چاچا نے کافی تعلیم حاصل کی تھی اور وہیں پر شادی بھی کر لی تھی۔

شہلا چچی جنہیں بعد میں زین کی طرح ممی کہنے لگا تھا، بہت اچھی تھیں۔

ابا جی ایک دن رہ کر واپس چلے گئے۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں بھی ان کے ساتھ چلا جاؤں۔ میں سب کی نظر بچا کر ایک کونے میں دیوار سے لگ کر رو دیا۔ اچانک مجھے اپنے کندھے پر ہاتھ کا لمس محسوس ہوا تو میں ایک دم ڈر گیا۔

"کک —— کون؟" میں نے سہمی سہمی آواز میں پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنے بزدل ہو گے۔" وہ زین تھا جو مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں بھی ابا جی کے ساتھ جاؤں گا۔" میں منہ بسور کر بولا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" زین نے پوچھا۔

"اس دن ابا جی نے بتایا تو تھا۔" میں نے اسے گھورا۔

"ہاں بتایا تو تھا لیکن وہ تو بتا رہے تھے کہ تم شیر ہو۔ میرا مطلب ہے تمہارا نام شیر افگن ہے۔ بھلا شیر ایسے ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر رونے والے۔!" زین نے مجھے شرمندہ کرنا چاہا۔

تمہیں ایسے رہنا پڑے تا تب پتا چلے۔" میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا میں تمہاری طرح ہوں۔ میں تو امریکہ جاؤں گا۔" زین نے سینہ پھلا لیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، ہم دونوں چلیں گے۔" میں نے جھٹ پروگرام بنا لیا۔

اور پھر میں نے بڑی بہادری سے اباجی کو خدا حافظ کہا۔ پھر زین مجھے ٹی وی لاؤنج میں لے گیا اور کوئی کارٹون فلم لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد میں بے تحاشا ہنس رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا ہم چاروں بچے (جو کہ اب اتنے بچے نہیں رہے تھے) علم کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ہر سال میں گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے گاؤں چلا جاتا۔ ماں جی کی گویا عید ہو جاتی۔

اس سال بھی میٹرک کا امتحان دے کر میں نے زین اور حارث کو بھی اپنے ساتھ تیار کر لیا کہ وہ بھی گاؤں چلیں۔ میں نے اپنے گاؤں کا کچھ ایسا خوبصورت منظر پیش کیا تھا کہ دونوں بے چین ہو رہے تھے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم تینوں جیپ پر جانا چاہ رہے تھے۔ وہ تو مل جاتی لیکن ہم ڈرائیور کے بغیر جانا چاہ رہے تھے۔

"ایک ہی صورت میں اجازت مل سکتی ہے۔" زین اپنے کپڑے بیگ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" حارث اچھلا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھنے لگا پُر امید نظروں سے۔

"اگر عمیر بھائی بھی ہمارے ساتھ چلیں۔" زین نے ہمیں مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ تو سبھی جانتے تھے کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ عمیر بھائی کے سیکنڈ ایئر کے امتحان ہو رہے تھے۔

"آپ ان سے پوچھیں تو سہی۔" حارث نے منت سے کہا۔

"آؤ یار! تم ہی سفارش کرو۔" زین نے مجھے بلا لیا۔ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ عمیر بھائی وہیں چلے آئے۔

"تم لوگ ابھی تک یہیں ہو۔"

"عمیر بھائی ہمیں جیپ دے دیں نا، آرام سے چلے جائیں گے" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

عمیر بھائی ہم تینوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور بغور ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ہم تینوں ہی اپنی اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئے۔

"کیا ہوا؟ آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ ان دونوں نے کہا ہو گا سفارش کرنے کو۔"

"نن۔۔۔ نہیں۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہا ہوں کہ ذرا انجوائے کریں گے۔" میں گڑبڑا گیا۔

"کیوں شیر افگن! راستے میں کسی شرارت کا ارادہ تو نہیں؟"

"مجھے تو ڈرائیور پہ کوئی اعتراض نہیں، یہ زین ہی۔" میں نے سارے بدلے ایک ساتھ چکا دیے۔

"افگن! بعد میں مجھ سے تنہائی میں ملنا۔" زین نے خوفناک لہجے میں کہا تو عمیر اور بیلا بے ساختہ ہنس پڑے۔

"چلو بھئی اسی بات پہ دے دی چابی۔ گاڑی بہت احتیاط سے چلانا۔ کوئی شرارت نہیں کرنی، بڑے ——"

ایک منٹ عمیر بھائی!" زین درمیان میں بول پڑا۔

"کیوں؟"

"وہ کاغذ پین لے آؤں ہدایات کے لیے۔" زین کہتے ہوئے بھاگ گیا تو سب ہی ہنس پڑے۔

آخر خدا خدا کر کے ہم لوگ گھر سے نکلے۔ ممی نے کئی دعائیں پڑھ کر پھونکیں۔۔۔ زین ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔

اور پھر گاڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند چل پڑی۔

"زینو! آرام سے۔" پیچھے سے ممی کی آواز سنائی دی۔ میں نے کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔ حارث نے بیٹھتے ہی اپنے پسندیدہ مصنف کی کتاب کھول لی۔۔۔ میں۔۔۔ سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر تیزی سے گزرتے درختوں کی آپس میں ملی ہوئی شاخوں کو دیکھنے لگا۔

"یار! مجھے اپنی ماں جی کے پاس ان ون پیس پہنچنا ہے۔" میں نے زین کی تیز رفتاری کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم تو سدا کے بزدل ہی رہو گے۔ اوہ یاد آیا، ابھی تو تم سے بدلہ لینا ہے۔" زین نے کہتے کہتے ایک دم زور سے بریک لگائے

کو بے خیالی میں [illegible] ہوئے حارث کا سر [illegible] ہوئے لوہے کے پائپ سے ٹکرایا۔ "اُف۔" وہ کراہ کر رہ گیا۔

"کیا ہوا۔ آپ لوگ خیریت سے تو ہیں؟" ہم دونوں حارث پر جھکے ہوئے تھے کہ یہ آواز کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔ پیلے دوپٹے کے ہالے میں گلابی چہرے والی سندر سی لڑکی پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

"اِٹس آل رائیٹ۔" میں نے تھرماس سے پانی نکال کر حارث کے منہ سے لگا دیا۔

"ویٹ اے منٹ۔" لڑکی کہہ کر تیزی سے اپنی کچھ فاصلے پہ کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ وہ ہاتھ میں ایک ٹیوب لے کر پلٹی۔

"یہ پلیز ان کی پیشانی پر لگا دیں۔ تھوڑی دیر بعد آرام آ جائے گا۔" کہتے ہوئے اس نے ٹیوب ہماری طرف کی۔ زین نے میکانکی انداز میں ٹیوب پکڑ لی اور اس سے پہلے کہ ہم اس کا شکریہ ادا کرتے وہ کسی نیک پری کی طرح اپنا کام کر کے گاڑی میں بیٹھ کر جا چکی تھی۔ حارث کی ہائے پر ہم پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیا چیز تھی بھئی؟" زین نے حارث کے ماتھے پہ ٹیوب لگاتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تو کوئی اور ہی گمان ہو رہا ہے۔" میں اس اچانک اتفاق پر خائف سا ہو گیا۔

"آپ دونوں اپنی عقلیں گھر کیوں چھوڑ کر آ گئے۔ ظاہر ہے وہ ہمارے پیچھے ہو گی۔ اچانک بریک لگنا اور پھر میری آواز پر گاڑی روک لی۔ اور کیا سمجھنا چاہتے ہیں آپ۔" حارث تکلیف برداشت کرتا ہوا بمشکل بولا۔

"افگن! اب تم چلاؤ۔" زین نے اترتے ہوئے کہا۔

"یار تھی کیسی؟" زین نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

"ابھی دیکھا کہاں تھا غور سے۔ فوراً ہی غائب ہو گئی۔"

میں نے اس کی صورت کے مٹتے ہوئے نقوش ذہن میں لانے کی کوشش کی۔۔۔ بس مجھے اس کی بے تحاشا لمبی چُٹیا یاد رہ گئی تھی۔ ایک دم سیاہ چمکتے بال۔

باقی راستہ ہم نے کافی شرافت سے طے کیا۔ شام ڈھلے گاؤں پہنچے۔

جیپ ہم نے کافی دور چھوڑ دی۔ مجھے پتا تھا رشید آ کر لے جائے گا۔ چاروں طرف مکئی کے کھیت ہوا کے زور [illegible] ہم نے کئی کوئی پیلیاں توڑ لیں۔

"اب بھی خواتین کنوئیں سے پانی بھرنے آتی ہیں؟" زین نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ اس وقت ہم ٹیوب ویل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ صاف شفاف پانی پوری طاقت سے کھیتوں کی طرف رواں دواں تھا۔

"یہ تم کئی سال پرانے گاؤں نہیں جا رہے یار! اب تو دبئی، جدہ وغیرہ نے یہاں کے لوگ کافی بدل دیے۔ اب تو ہر گھر میں وی سی آر ملے گا۔ گیس اور پانی سب گھر بیٹھے حاصل ہوتا ہے۔" میں نے اس کا سارا چارم ختم کر دیا۔ وہ جو پورا فلمی سا تصور اپنے ذہن میں بنائے تھا۔

ہم لوگ جھاگ اڑاتے پانی کی پروا کیے بغیر سامنے بنے ہوئے حوض میں اُتر گئے۔ ٹھنڈا میٹھا پانی پی کر عجیب سا سکون ملا۔

"بھائی! مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔" بھیگنے کے بعد ہوا مزید سرد لگی تو ہم لوگ جھرجھری لے کر باہر نکل آئے۔

کافی سارے بچے حوض کے اردگرد کھڑے ہمیں بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

لڑکیاں سروں پہ سبزیوں کے ٹوکرے رکھے اپنے گھروں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

بچوں کے لئے محمود خاور کا ناول
چچا بہادر
شائع ہو گیا ہے
ہر بک اسٹال پر دستیاب ہے
رنگ رنگ کتاب گھر ۳۷۔ اردو بازار، کراچی فون ۲۱۶۳۴۱

"ہوں۔ سیدھی سادی، شہری دوغلے پن سے قطعی دور۔" زین نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک چھوٹی سی لڑکی کی ٹوکری سے گاجر اٹھاتے ہوئے کہا۔ تو لڑکی ایک دم رک گئی۔

"ہور لے لو جی!" لڑکی نے بڑی فراخ دلی سے آفر کی۔ تو حارث نے بھی دو تین اٹھا لیں۔

"یار! اس کے اچانک رکنے پر میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ کہیں اپنے بھائی وغیرہ کو نہ بلا لے۔" زین گاجر صاف کرتا ہوا مزے سے بولا۔

"اچھا۔ اب ذرا قدم جلدی بڑھاؤ۔ ماں جی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

میں نے سامان اٹھاتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوگ ماں جی سے مل کر بڑی بے صبری سے کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔

"واؤ! کتنے مزے کا کھانا ہے۔" زین نے چٹخارہ لیا۔

"یہ ہے کیا؟" حارث نے بھی مکئی اور ساگ کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ پہلی مرتبہ کسی گاؤں میں آیا تھا۔

"جناب! یہ ہمارا ساگ اور مکئی کی روٹی ہے۔ ویسے یہ افسوس کی بات ہے حارث کہ تمہیں اپنے کھانوں کے نام بھی نہیں آتے۔"

میں نے بتاتے ہوئے حارث کو شرمندہ کرنا چاہا۔

"سوری افگن بھائی۔ اِن فیکٹ ڈیڈی اور ممی خود تو گاؤں چلے جاتے ہیں۔ میں فرسٹ ٹائم آیا ہوں اور اتنا مزا آیا ہے کہ اب ضرور جایا کروں گا۔" حارث بڑے مزے سے بولا تو ماں جی جو قریب ہی بیٹھی تھیں اس کی بات پر ہنس پڑیں۔

"شیرو! آج ہی تمہاری پھپھو بھی آئی تھیں۔" ماں جی نے بتایا۔

"آپ لوگ تو ویسے بھی ملتے رہتے ہوں گے۔" میں نے تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، آج تو وہ میری بات کا جواب لے کر آئی تھیں۔ پتا ہے زین! میں نے اپنے شیرو کی بات پکی کر دی ہے۔" ماں جی نے بڑی خوشی سے بتایا۔

"کیا مطلب ماں جی؟" زین نے مجھ سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

"بھئی! بات یہ ہے کہ میں نے زہرہ کو شیرو کے لیے مانگ لیا ہے۔"

"اوہ ماں جی! اتنی جلدی۔ ابھی تو میں بہت چھوٹا ہوں۔" میں نے منہ لٹکا کر کہا تو زین اور حارث نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

"خاموش رہو تم لوگ۔" میں ان کی طرف دیکھ کر چیخا۔

ع
اچھے بنے مہندی لاون دے
ہریالے بنے مہندی لاون دے

زین بڑے سُر میں گانے لگا تو میں نے زور سے مُکا اس کے بازو پہ رسید کیا۔

"اچھا ماں جی وہ ہے کیسی؟" زین ان کے پاس جا بیٹھا۔

"چاند کا ٹکڑا ہوں گی۔" حارث نے مجھ سے دور ہوتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"ہاں، ہاں بالکل ویسی۔ بڑی خوبصورت ہے۔" ماں جی نے پُرزور تائید کی تو میں جھلا کر رہ گیا۔

"ابھی تو میں نے بہت سارا پڑھنا ہے ماں جی۔"

"تو ابھی کون سا شادی کرنا ہے۔ وہ تو لڑکی اچھی تھی اس لیے میں نے بات پکی کر لی۔ بس تم آرام سے پڑھتے رہو۔" ماں جی لاپروا انداز میں بولیں۔

"ماں جی! ہم انہیں دیکھنے چلیں گے۔" حارث نے اشتیاق سے کہا۔

"وہ یہاں تھوڑی ہوتی ہے، پنڈی اپنے ماموں کے پاس ہوتی ہے۔" ماں جی نے یہ کہہ کر تینوں کے ارمانوں پہ اوس ڈال دی۔

"اچھا وہ پڑھتی ہے کہ نہیں؟" زین نے پوچھا۔

"واہ پڑھے کیوں؟ ہم نے کون سا نوکری کروانی ہے۔" ماں جی بالکل پہلے وقتوں کی عورت بن گئیں۔

"ماں جی! اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ آج کل تو لڑکیاں جہاز اُڑاتی ہیں۔" میں نے انہیں قائل کرنا چاہا۔

"پر اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔" ماں جی اپنی فطری معصومیت کے تحت فوراً ہی مان گئیں۔

"چلیں، بعد میں افگن خود ہی پڑھا لیا کرے گا۔" زین نے مجھے چڑایا تو میں نے تکیہ زور سے اس کی طرف اچھال دیا۔ اس سے پہلے کہ دونوں طرف سے حملے ہوتے ابا جی ہمارے کمرے میں چلے آئے۔

"کیوں بھئی بچو! سونا نہیں۔ نو بج گئے ہیں۔" ابو نے گھڑی کی طرف توجہ دلائی۔

"واٹ صرف نو بجے سو جائیں۔" رات کو بارہ بجے سونے والے زین کو شدید حیرت ہوئی۔

"یہ گاؤں ہے مائی ڈیر! سادہ اور معصوم لوگ ہیں۔ اذانوں کے ساتھ اٹھتے ہیں۔" میں نے اپنے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ماں جی نے ہم تینوں کے بیڈ ایک ہی کمرے میں ڈلوا دیے تھے۔ پھر نہ جانے کب ہم جو اتنی دیر جاگنے والے تھے، شاید تھکن کی وجہ سے فوراً ہی سو گئے۔

اس کے بعد کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم لوگ خوب سیریں کرتے رہے۔۔۔ ہاں سوائے ایک واقعے کے۔ جب ہم لوگ واپس آ رہے تھے تو ماں جی نے سونے کی ایک موٹی سی انگوٹھی میری انگلی میں ڈال دی۔

"ریزرویشن کا ثبوت۔" زین نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ماں جی یہ ضروری ہے کیا؟" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی زین کو کڑے تیوروں سے گھورا۔

"ہاں پُتّر! بہت ضروری ہے۔" ماں جی نے بڑی قطعیت سے کہا کہ میں مزید احتجاج نہ کر سکا۔

واپس آ کر ہم لوگ پھر پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔ زین نے جاتے ہی سب لوگوں کو بتا دیا۔

"اگر تم نے کالج میں اس کا ذکر کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" میں نے زین کو دھمکی دی۔

"بھئی تم! جو سچی بات ہے وہ تو میں ضرور کروں گا۔ اصل میں جھوٹ بولا ہی نہیں جاتا۔" زین خاصی کمینگی سے بولا۔

اور پھر پتا نہیں کیسے زین نے بڑی شرافت کا ثبوت دیا کہ اپنی چونچ بند ہی رکھی۔

ہمارے کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ میں اور زین ان میں خاصے مقبول تھے۔ صبح تیار ہوتے ہوئے ہم لوگ کچھ زیادہ ہی اہتمام کرتے۔ پرفیوم کی آدھی آدھی بوتل انڈیلی جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں ہی ایک دوسرے کو ملامت بھی کرتے رہتے۔

میں سارا دن زیادہ تر لڑکیوں کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتا۔ پھر اچانک ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ غزل ایک بڑے مِل اونر کی بیٹی میرے معاملے میں کچھ سنجیدہ ہو گئی ہے تو میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ میرا یہ مطلب تو ہرگز نہیں تھا۔ میں نے چند دنوں کے لیے لڑکیوں کے قریب جانے سے توبہ کر لی۔

"یار! اپنی منگنی کے بارے میں بتا دو۔" زین نے اکسایا۔

آپ کے گھر کے لئے
۳ خوبصورت کتابیں

بہت سی بہنوں کو یہ پریشانی رہتی ہے کہ آج وہ کیا پکائیں، روزانہ یہی مسئلہ ہے، ظاہر ہے کچھ نہ کچھ تو پکانا ہی ہے، پھر کیوں نہ مزیدار چیزیں پکائی جائیں، اور مزیدار و لذیذ کھانوں کے لئے اچھی کتابوں کی ضرورت پڑتی ہے،

① آپ کا دسترخوان ② چائنیز پکوان ③ خاتون کا دسترخوان،

خاتون کا دسترخوان
آپ کا دسترخوان قیمت ۱۲ روپے
خاتون کا دسترخوان قیمت ۱۲ روپے
چائنیز پکوان
قیمت ۹ روپے

یہ تینوں کتابیں آپ کی مددگار ساتھی ہیں، فوراً آج ہی منگوالیں یا قریبی بک اسٹال سے خریدلیں، ہر کتاب کا ڈاک خرچ ۵ روپے علیحدہ سے ہے، تینوں کتابیں ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ جو ۱۵ روپے بنتا ہے نہیں لیا جائے گا،

منگوانے کا پتہ
رنگا رنگ کتاب گھر، اردو بازار، کراچی،

"کیوں میرا چارم ختم کرنا چاہتے ہو۔" میں نے کالر سے فرضی گرد جھاڑی۔

"آ گئے کہیں سے شہزادہ گلفام۔"

"یار! چند دن کی زندگی ہے۔ انجوائے کرو۔" میں نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"یہ تم نے کب شروع کیے؟" زین چونک گیا۔

"آج بلکہ ابھی سے۔" میں نے بڑی مہارت سے سگریٹ جلایا۔

"کس خوشی میں؟"

"پتا ہے۔ اس دن صدف کہہ رہی تھی۔ اُسے سگریٹ پیتے ہوئے لڑکے بہت اچھے لگتے ہیں۔" میں نے اسے وجہ بتا کر سگریٹ ہونٹوں میں لے کر زور سے اندر کی طرف سانس کھینچا۔ تو اتنے ہی زور کا غوطہ لگا کہ ہوش ٹھکانے آ گئے۔ میں بری طرح کھانسنے لگا۔

"چکھ لیا مزا۔ آئے کہیں سے، صدف کی پسند میں ڈھلنے والے۔" زین نے طنز کیا۔

"تو پھر دوسرے لڑکے کیسے پی لیتے ہیں؟" میں نے کھانسی روکتے ہوئے بمشکل کہا۔

"ڈھٹائی سے۔" زین غصّے سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

امتحان سر پہ آئے ہم اپنی ساری دلچسپیاں چھوڑ کر کتابوں میں گم ہو گئے۔ مجھے ابّا جی کی خواہش کے مطابق آگے پڑھنا تھا۔ اب تو ویسے بھی فائنل امتحان تھے۔ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کافی نمبروں کی ضرورت تھی۔

اس دن بھی میں ریاضی کے پیپر کی تیاری کر رہا تھا کہ حارث اسٹڈی میں داخل ہوا۔

"انگمن بھائی! آپ کا فون ہے۔"

"کون ہے؟" میں نے سر اٹھائے بغیر پین تیزی سے چلاتے ہوئے پوچھا۔

"شاید صدف ہے کوئی۔" صدف کے نام پہ زین نے میری طرف دیکھا۔

"کہہ دو کہ میں گھر پہ نہیں۔" میں نے بے رخی سے کہا۔

"لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ آپ گھر پہ ہیں۔" حارث نے معصومیت سے کہا تو میں جھنجھلا کر اُٹھا۔

محترمہ مکمل ہی ہو گئی ہیں۔

"ہیلو! میرا موڈ کافی بگڑا ہوا تھا۔ اتنا مشکل سوال اتنی محنت کے بعد جواب نکل رہا تھا کہ۔

"کیا ہو رہا ہے؟ سبحان اللہ۔ کلاس فیلو ہونے کے باوجود پوچھا جا رہا تھا۔

"جھک مار رہا تھا۔" میں کچھ زیادہ ہی رُوڈ ہو گیا۔

"جھک مارنے سے فرصت ملے تو مجھے فون کیجیے گا۔" اس نے حکم دینے والے انداز میں کہہ کر شاید فون بند کر دیا تھا۔ میں نے ریسیور پٹخا۔

اب تو ویسے بھی ہمارا ساتھ چھوٹنے والا تھا موڈ ذرا بحال ہوا گزرتے والے وقت میں ہم نے ایف ایس سی شاندار نمبروں سے پاس کر لیا تو الیاس چچا نے ہمارا ایڈمیشن یونیورسٹی میں کروا دیا۔

حارث نے آرمی جوائن کر لی۔ عمیر بھائی بزنس میں مصروف ہو گئے میرا اور زین کا خوشی سے بُرا حال تھا۔

"زین! اب تو خوب مزا آیا کرے گا۔ رنگین چہرے دیکھنے کو ملیں گے۔"

میں نے لان میں امرود کے درخت پہ ٹنگے ہوئے زین سے کہا۔

"تم بہت فلرٹ ہوتے جا رہے ہو شیرو!" زین نے مجھے ٹوکا۔

"کیا مطلب، جسٹ فار انجوائے منٹ۔" میں نے کندھے اُچکائے۔

"تو پھر لڑکیوں سے اس قسم کی باتیں مت کیا کرو کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔" زین نے ایک کچا سا امرود زور سے میری طرف پھینکا۔

"یہ قوم ہوتی ہی بے وقوف ہے۔ فوراً باتوں میں آ جاتی ہیں۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"بے وقوف تم ہو، ساری لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔" زین باتیں کرتا ہوا ساتھ والے گھر کی طرف بھی جھانک رہا تھا۔

"یہ تم دیکھ کدھر رہے ہو بار بار؟" مجھے زین کی حرکت مشکوک کر گئی۔

"کچھ نہیں، یار بس ایسے ہی۔"

"اچھا! اب مجھ سے ہی استادی۔ مجھے بزدل کہتے ہو نا! آج بتاتا ہوں۔" میں نے نیچے سے اس کی ٹانگ گھسیٹی۔

"وہ تو تم ہو لڑکیوں سے دوستی کرتے ہو۔" زین نے خود ہی نیچے چھلانگ لگا دی۔

"اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ بات کرنا کوئی بری بات نہیں۔ میرا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ ایک پھندہ پہن چکا ہوں۔ اگر کوئی اس انداز میں سوچتی ہے تو میں اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہوں۔"

میں نے خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی۔

"تم اس طرح کی باتیں ہی مت کیا کرو کہ۔"

اس سے پہلے کہ زین اپنی بات پوری کرتا میں نے اس کے بال اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

"یہ تم خود اتنے معصوم کیسے ہو گئے؟" میں نے اس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔

"میں نے کسی کو بے وقوف نہیں بنایا۔" زین نے بال چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں تو کروں گا لڑکیوں سے دوستی۔" میں جوش میں آ گیا۔

"جوتے کھاؤ گے، یونیورسٹی میں اچھی میچور لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ منہ کی کھاؤ گے۔" زین آخر بال چھڑانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہی تھی کہ میں لڑکیوں کو صرف وقتی دلچسپی کا سامان سمجھتا تھا کہ چند دن ساتھ رہ کر مزے اُڑاؤ اور بعد میں بھول جاؤ۔ شاید یہ اس لیے بھی ہو کہ میری اپنی کوئی بہن نہیں تھی —— یا ویسے ہی میرے سوچنے کا انداز غلط تھا (یہ بعد میں ہوش آیا کہ سو فیصدی غلط تھا) ہمارے کچے ذہنوں پہ فلموں نے کچھ ایسا ہی اثر کیا تھا ویسے میں نے زیادہ غلط انداز میں لیا تھا سب کچھ۔ ورنہ زین بھی تو تھا۔

مجھے اپنی اسمارٹ نیس کا کچھ زیادہ ہی خیال رہتا تھا ابا جی جتنے بھی پیسے بھیجتے کپڑے خریدنے پہ خرچ کر دیتا۔ پڑھائی میں ہمیشہ رات کے وقت کرتا۔

ویسے اب یونیورسٹی میں آ کر میری ملاقات ایسی لڑکیوں سے بھی ہوئی جو میری بھی استاد تھیں جب میں تیز طرار لڑکیوں کو دیکھتا تو میرے تصور میں ڈری سہمی سلونی سی زہرہ کا تصور آ جاتا۔ جہاں اس کے ان پڑھ ہونے کا افسوس ہوتا وہیں اس کے اِن چالاکیوں سے پاک ہونے پہ خوشی بھی ہوتی۔

زین اور میں لڑکیوں کی طرح اہتمام کر کے یونیورسٹی جاتے۔ ان ہی دنوں ہماری کلاس میں یعنی انگلش ڈیپارٹمنٹ میں ایک نئی ساتھی کا اضافہ ہوا۔ سرخ و سفید رنگت والی سرو قد صنم نے آتے ہی سب پہ اپنی ذہانت کا سکّہ جما دیا تو مجھے چونکنا پڑا۔ باوجود اس کے میں دوسری سرگرمیوں میں زیادہ حصّہ لیتا لیکن پڑھائی میں سب سے آگے میری پوزیشن تھی۔

اب یہ صنم جو نجانے کیوں مجھے دیکھی دیکھی لگتی سب سے آگے جا رہی تھی۔ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتی لڑکوں سے تو بالکل ہی بات نہ کرتی۔

"دیکھا، ایسی بھی ہوتی ہیں لڑکیاں۔" میں اور زین کینٹین میں بیٹھے تھے کہ زین نے کہا۔

"خاص نہیں۔" میں نے دل میں اعتراف کرنے کے باوجود انکار کر دیا۔

"ویسے اُس سے تمہاری دوستی نہیں ہوئی اب تک۔ لفٹ ہی نہیں ملی ہو گی۔" زین مجھے مسلسل چڑا رہا تھا۔

"میں نے خود ہی توجہ نہیں دی ورنہ ایسی کیا بات ہے۔" میرا دماغ گرم ہو گیا۔

"تو پھر ذرا ہو جائے۔" زین نے مجھے چیلنج کیا۔

"ٹھیک ہے ویسے زین یہ دیکھی ہوئی نہیں لگتی۔"

"ہو سکتا ہے، خوابوں میں ملاقات ہوئی ہو۔" زین مسکرا دیا۔

"اچھے خاصے مین ہو تم۔" میں بھی ہنس پڑا۔

ہمارا دوسری یونیورسٹی سے ہاکی کا میچ تھا وہ بھی ہماری یونیورسٹی میں۔ سارے اسٹوڈنٹ گراؤنڈ میں جمع تھے۔ ان کی لڑکیاں خوب خوب شور مچا رہی تھیں۔ ہماری سپورٹ کے لیے بھی لڑکیاں اور لڑکے ہنگامہ کر رہے تھے۔ ہماری یونیورسٹی ایک گول سے جیت رہی تھی۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ دوسری ٹیم کے لڑکوں نے کافی جارحانہ انداز اختیار کیا تھا اور یہ مجھے اندازہ نہیں کہ اتفاق تھا یا دانستہ

حرکت تھی کہ دس نمبر کی ہاکی زور سے میری ٹانگ سے ٹکرائی تو میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔

اور میں بے اختیار زمین پہ گرتا چلا گیا۔ کھیل تھوڑی دیر کے لیے روک دیا گیا۔ زین جلدی جلدی میری ٹانگ پہ مالش کرنے لگا۔ پھر ریفری کے کہنے پر وہ مجھے سہارا دے کر گراؤنڈ سے باہر لے آیا۔

"یہ لیجیے پلیز، ان کی ٹانگ پہ ٹیوب لگائیں۔ فوراً اثر کرے گی۔" اس مترنم سی آواز پہ تکلیف کے باوجود میرا ذہن پیچھے کی طرف گھوما۔ جیپ کے بریک، حارث کی باتیں اور اس نیک پری کی مانند آکر غائب ہونے والی لڑکی۔

زین نے اس مرتبہ بھی میکانکی انداز میں ٹیوب پکڑ لی تو وہ بھی پہلے کی طرح تیزی سے گھومی تو لمبی سی چوٹی لہرائی۔

"زین! تم نے پہچانا؟ صنم وہی نیک پری ہے۔" میں اپنی تکلیف بھلا کر چیخا تو زین نے زور سے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

بے تحاشا شور سے پتا چلا کہ ہماری ٹیم جیت چکی ہے۔ پھر ٹانگ نے اتنا تنگ کیا کہ میں ایک ہفتے کے لیے گاؤں چلا گیا جبکہ میں صنم سے مل کر تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

ماں جی سے پتا چلا کہ دو دن پہلے زہرہ آئی تھی۔ تو مجھے عجیب سی الجھن کا احساس ہوا۔ ماں جی روز ہی میری ٹانگ پہ مالش کرتیں۔ مکمل آرام سے میں بالکل ٹھیک ہو گیا تو مزید رکے بغیر اسلام آباد روانہ ہو گیا۔

"ایک ہفتہ کیا ہوتا رہا؟" رات کو میں نے اپنے کمرے میں جا کر زین سے پوچھا۔

"جو کچھ پڑھایا گیا ہے میں نے سب نوٹ کیا ہے، لے لینا۔" زین نے کتاب کھولتے ہوئے کہا۔

"میں اسٹڈی کے بارے میں نہیں پوچھ رہا۔" میں نے جھلا کر کہا تو زین زور سے ہنس پڑا۔ میں نے تکیے میں سر دے دیا اور پھر زین کے بلانے کے باوجود نہ اٹھا۔

دوسرے دن میں نے کچھ زیادہ ہی اہتمام کیا۔ بلیک جین اور سفید بے داغ شرٹ میں مجھے اپنا آپ بہت اچھا لگا۔

"ایکسکیوز می صنم! آپ سے ایک بات پوچھنا تھی؟" میں نے اُسے لائبریری میں جا لیا۔

"جی کہیے۔" اس نے الماری میں مطلوبہ کتاب کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ پل بھر کے لیے اس کی بے توجہی مجھے ناگوار گزری۔

"آپ نے کبھی راہ چلتے ہوئے، میرا مطلب ہے کہ راستے میں کہیں جاتے ہوئے کسی کی مدد کی ہے؟" میں مناسب لفظوں کا انتخاب نہ کر سکا۔

"کس قسم کی مدد؟" اب وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"وہ اس دن سڑک پہ آپ نے ہمیں ٹیوب دی تھی۔" میں نے اُسے یاد دلایا۔

"اوہ جی ہاں۔ اچھا تو وہ آپ لوگ تھے۔ ان فیکٹ میڈیسن کا تقریباً سارا سامان ہمیشہ میرے بیگ میں رہتا ہے۔ جب بھی کسی کو ضرورت ہوتی ہے۔ مجھ سے رہا نہیں جاتا اس لیے۔ کیا آپ اب میرا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔" بات کے اختتام پہ وہ دھیرے سے مسکرائی تو مجھے کافی حوصلہ ہوا۔ اور پھر یہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا۔ میں باقی ساری لڑکیوں سے دور ہٹتا گیا اور صرف صنم سے ہی۔

میں نجانے کیا کرنا چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ اب تو زین بھی مجھ سے ناراض ہو گیا کہ میں اُسے وقت نہیں دے رہا۔

"تمہاری ہدایت کے مطابق ہی تو دوستی کی ہے۔" میں مسکرایا۔

"چلو، ہار مان لی۔ اب اس سے پیچھا بھی چھڑاؤ۔" زین نے منہ بنایا۔

"اب یہ ناممکن ہے۔" میں نے سامنے دیوار پہ لگی سینری کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"واٹ! یعنی کہ تمہیں وہ۔" زین ہکلا کر رہ گیا۔

"کیا وہ، تمہیں، سیدھی طرح بکو۔" میں نے اُسے ڈانٹا۔

"اتنے ہی ننھے چوزے ہو نا۔ امتحان سر پر پہنچ چکے ہیں اور موصوف کو عشق سوجھ رہا ہے۔" اب زین پوری طرح کھل گیا۔

"دماغ تو درست ہے تمہارا۔ وہ بس میری اچھی دوست ہے۔" میں نجانے کیوں یہ کہتے ہوئے خود کو بھی مطمئن نہ کر سکا اپنے ہی الفاظ کھوکھلے سے لگے۔

"تمہیں یاد ہے کہ تم۔"

"پتا ہے۔ پتا ہے۔" میں نے زین کو ٹوک دیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔

"میں زہرا کو کسی صورت میں بھی دھوکا نہیں دوں گا۔" میرے لہجے میں عزم جھلک رہا تھا۔

"اور صنم کو؟" زین کا لہجہ خاصا چبھتا ہوا تھا۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" میں اس کے پاس سے ہی اُٹھ گیا۔

میں کئی بار اپنا تجزیہ کر چکا تھا۔ صنم سے اب تک میں نے کسی قسم کی بات نہیں کی تھی۔ وہ اگر مجھ سے بات کرتی تو زیادہ تر پڑھائی کے موضوع پہ کرتی۔ اب تو ویسے بھی ہمارا فائنل ایئر تھا۔ وقت کچھ اس تیزی سے گزرا کہ ہمیں پتا ہی نہ چلا۔

ماں جی کو بتایا تو انہوں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر منگنی کی تاریخ بھی رکھ دی۔ میں بہتیرا چیخا چلایا۔ واسطے دیے۔ آخر زین کو مدد کے لیے پکارا۔

"کیا حرج ہے اس میں؟" زین نے لاپروائی سے کہا۔

"یار! ابھی میں نے کیا کیا ہے۔ امتحان دینا ہے اس کے بعد سی ایس ایس پھر ملازمت۔" میں نے کئی کام گنوا دیے۔

"کہیں اس کی وجہ صنم تو نہیں؟" زین نے بغور میری طرف دیکھا۔

"پتا نہیں۔" میری نظریں سامنے سے آتی صنم کی طرف اُٹھ گئیں۔ ہم لوگ سائے میں گھاس پہ بیٹھے ہوئے تھے۔

"ہیلو، کیا ہو رہا ہے؟" وہ بھی وہیں بیٹھ گئی تو زین معذرت کر کے اُٹھ گیا۔

"آج کل آپ بڑے اپ سیٹ لگ رہے ہیں۔" اس نے پہلی مرتبہ میری ذات کے حوالے سے بات کی۔

"بس امتحان کے بارے میں۔" میں نے بات بنائی۔

"سنا ہے دوستوں سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔" وہ نرمی سے بولی۔

"امی میری منگنی کر رہی ہیں۔" میں نے گویا اس سے شکایت کی۔ صنم نے ایک دم پہلو بدلا، پل بھر کو رکی۔

"اور آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے نظریں جھکائے جھکائے پوچھا۔

"ایک لڑکی کو جو ایک پری کے روپ میں میرے سامنے آئی تھی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔

"آپ نے اس سے بات کی کہ آیا وہ کیا چاہتی ہے؟"

"فائدہ نہیں ہے اس سے کہنے کا کہ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اپنے گھر والوں کے سامنے نہیں بول سکتا۔" میں نے گھاس نوچتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تو آپ بہت بزدل ہیں۔" صنم نے اتنے دھڑلے سے کہہ دیا کہ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"اصل میں ماں جی نے میری کزن ہے زہرہ، اس سے بچپن میں ہی۔" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ایک بات میں بتاؤں، مجھے بزدل مرد بہت برُے لگتے ہیں۔" صنم نے کھڑے ہوتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔

"میں نے اس سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا؟" مجھے اندازہ ہے کہ اس وقت میں نے کتنی حماقت کا ثبوت دیا تھا،

"یہ آپ بے وقوف کسے بنا رہے ہیں۔ میں دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں۔ مجھے آپ کے بارے میں کافی ساری باتیں پتا چلی ہیں۔ آپ وقت گزاری کے لیے لڑکیوں سے دوستی کرتے ہیں۔ جیسے ان کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں میں آپ کی فطرت بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔" صنم نے خاصے غصے سے اپنی بات ختم کی۔

"بائی گاڈ صنم! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" میں بری طرح گڑبڑا گیا۔

"آپ جیسے بزدل اور مطلب پرست انسان صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں اور معاف کیجیے، مجھے ایسے لوگ سخت ناپسند ہیں۔ جب آپ اپنے حق کے لیے نہیں لڑ سکتے تو آپ کو اظہار کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

صنم نے میری نادانستگی میں کی ہوئی غلطیوں کا ایک ہی قسط میں حساب چکایا اور مجھے حیران پریشان چھوڑ کر چلی گئی۔

"میں نے کہا تھا نا ایک دن منہ کی کھاؤ گے۔" زین نجانے کب سے چھپا کھڑا تھا۔

"آخر میں نے کیا کیا ہے؟" میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

"نمبر ایک۔ تم پہلے سے ریزرو تھے۔ اس کے باوجود تم نے لڑکیوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا۔ دوسرے صنم سے تمہیں اظہار کرنا ہی نہیں چاہیے تھا جب کہ تم زہرہ ہی کو اپنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔" زین نے غصے سے کہا۔ پھر میں جیسے اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گیا۔ ہر ایک سے رابطہ تقریباً توڑ ہی دیا۔

امتحانات ہوئے تو میں مزید رُکے بغیر اپنے گاؤں آگیا۔ ماں جی بے تحاشا خوش تھیں کہ اب میں ہمیشہ کے لیے ان کے پاس آگیا تھا۔ میں ان کی معصومیت پہ مسکرا کر رہ گیا۔

پتا چلا کہ زہرہ بھی اب گاؤں آگئی ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے خیالات جاننا چاہتا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں زہرہ سے رابطہ قائم کرتا۔ زہرہ نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے اس بات کی ذرا بھی توقع نہیں تھی۔ بھلا وہ بے وقوف سی لڑکی کیا کہنا چاہتی ہے۔ میں حیران حیران سا ان کے گھر کی طرف بڑھتا ہوا سوچ رہا تھا۔

میں صرف ایک مرتبہ ہی ان کے ہاں گیا تھا۔ اب اتنے سالوں کے بعد۔ ان کے گھر میں کافی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اندر کمرے میں قدم رکھا تو ایک بار پھر حیران ہونا پڑا۔ خوبصورت، جدید فرنیچر سے سجے گھر کی اسٹائلش انداز میں ڈیکوریشن کی گئی تھی۔

ایک گاؤں کا گھر جس میں رہنے والے بھی ان پڑھ ہوں۔ وہ بھلا کیسے۔ میں حیران تھا۔

"یہ بھی زہرہ بی بی نے کیا ہے۔ وہ ہر بار کچھ نہ کچھ کر کے ہی جاتی ہیں۔" ملازمہ میری نظروں میں سوال دیکھ کر خود ہی بتانے لگی۔

"زہرہ بی بی ہیں کہاں؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"انہوں نے جی آپ کے بارے میں بتایا تھا کہ آپ جب آئیں تو آپ کو پچھلی طرف جو باغ ہے اُس طرف لے جاؤں۔"

وہ خاصا سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔

"چلو۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

لمبا سا چکر کاٹ کر ہم گھر کی پچھلی سائیڈ پہ آگئے۔ بڑا سا باغ جس میں زیادہ تر آموں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ہری ہری گھاس کافی اونچی ہو رہی تھی۔ شاید بہت دنوں سے اس کی صفائی نہیں کی گئی تھی۔ ملازمہ جا چکی تھی۔ میں ابھی باغ کا ہی جائزہ لے رہا تھا کہ — ایک دم نجانے کہاں سے کسی درخت کی اوٹ سے وہ نکل آئی تھی۔ شاید سبز لباس کی وجہ سے میں اسے پہلے نہ دیکھ سکا تھا۔

یہ۔ زہرہ تو نہیں تھی۔ اور پھر قریب آنے پہ میں حیرت سے اچھل ہی تو پڑا۔ صنم۔ اور وہ بھی۔ زہرہ کے گھر میں تھی۔

گلابی چہرے پہ گمبھیر سنجیدگی لیے وہ میرے سامنے کھڑی بہت عجیب لگ رہی تھی۔

"تم۔ آپ۔ یہاں۔ کیسے؟" میں اس اتفاق سے ہکلا کر رہ گیا۔

"اس لیے کہ یہ میرا گھر ہے۔" وہ بڑے مزے سے پیشانی پر آنے والے بالوں کو پیچھے ہٹاتی ہوئی بولی۔

"لیکن۔ یہ تو۔" میں اس وقت عجیب بونگا سا لگ رہا تھا۔

"آپ مجھے زہرہ کہہ سکتے ہیں۔"

"اوہ۔ واٹ اے ہیپی سرپرائز۔" میں اس حسین اتفاق پہ بے تحاشا خوش ہو گیا۔

"لیکن مجھے اس اتفاق پہ کوئی خوشی نہیں ہوئی۔" زہرہ سنجیدگی سے بولی۔

"کیوں آخر؟ ویسے تم زہرہ سے صنم کیسے بن گئیں؟" میں نے الجھن سے پوچھا۔

"یہ تو آپ کو پتا ہو گا کہ میں ماموں کے پاس گئی تھی۔ جب میں نے ان کی لڑکیوں کو پڑھتے دیکھا تو مجھے بھی شوق ہوا۔ اور میں نے ضد کر کے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اور پوری دلجمعی سے پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ جب میں امی کے پاس واپس آئی

تو انہوں نے منع کیا۔ زمانہ اتنے سال آگے کا سفر طے کر چکا ہے لیکن ہمارے بزرگ وہی پہلے والے محدود ذہن و دل رکھتے ہیں۔ میری اور آپ کی امی دونوں ہی اس کے سخت خلاف تھیں۔

خیر میری ضد اور کھانا چھوڑنے پہ آخر امی کو ماننا پڑا۔ لیکن انہوں نے آپ کی امی سے یہ بات چھپائے رکھی۔ میں نے آپ کی تصویر دیکھی تھی۔ یونیورسٹی میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ اور۔" وہ شاید دانستہ چپ ہو گئی تھی۔

"اور۔ کیا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اور۔ یہ۔ کہ آپ سے مل کر سخت مایوسی ہوئی۔" اس کی اتنی صاف گوئی پہ میں پل بھر کے لیے چپ سا ہو کر رہ گیا۔

"لیکن اب تو سارا معاملہ صاف ہو گیا ہے۔" آخر میں نے دھیمے سے کہا۔

"آپ ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں جو آپ کو پسند نہ ہو؟" اس نے ذومعنی انداز میں کہہ کر استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟" میں جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

"اب آپ اتنے بھی معصوم نہیں۔ مطلب صاف ظاہر ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتی۔" اس کی آواز قطعیت لیے ہوئے تھی۔

"کیا واقعی میں تمہیں پسند نہیں؟ وجہ بھی بتاؤ۔"

"میں نے پہلے بھی آپ سے کہا ہے کہ آپ کی کوئی ایک منزل نہیں ہو سکتی آپ ایسے سیارے کی مانند ہیں جو ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔" زہرہ نے ایک عجیب سی مثال سے مجھے تشبیہ دیتے ہوئے جیسے سب کچھ کہہ دیا۔

"ایک بار میری طرف دیکھ کر کہہ دو کہ۔ میں تمہیں پسند نہیں۔" میں نے بغور اس کی جھکی ہوئی سیاہ پلکوں کی جھالر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے پہلو بدلا۔ رُکی۔ اور پھر آنکھیں اٹھا کر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر بڑی قطعیت سے "نہیں" کہہ کر وہ پلٹی۔

"سنو زہرہ! تم ایسے میری بات سنے بغیر نہیں جا سکتیں۔" میں نے اپنے آپ پہ قابو پاتے ہوئے نارمل آواز میں کہا تو وہ جو چند قدم آگے بڑھ چکی تھی وہیں رُک گئی۔

"جی فرمائیے۔" اس کا انداز خاصا مضحکہ خیز تھا میرا پارہ — ہائی ہوتے ہوتے رہ گیا۔ توہین کے احساس سے میرا رواں رواں جل اٹھا۔

"پہلے میں نے صرف ماں جی کے اصرار پہ ان کا یہ فیصلہ قبول کیا تھا۔ لیکن۔ اب یہ میرا فیصلہ ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے جیسے اپنا بدلہ لینا چاہا۔

"لیکن مجھے ایسی کوئی مجبوری نہیں۔ میں نے کسی کی وجہ سے یہ فیصلہ نہ پہلے قبول کیا تھا اور نہ اب قبول ہے۔" زہرہ کے لہجے میں نفرت تھی۔

"تعلیم نے تمہیں یہی شعور دیا ہے نا کہ تم اپنے بزرگوں کے فیصلے سے انحراف کرو۔" میں نے طنز کر کے اُسے شرمندہ کرنا چاہا۔

"لیکن اسلام نے مجھے یہ حق دیا ہے کہ میں اپنی پسند کے مطابق اپنی زندگی کا فیصلہ کروں۔" وہ تو کیا شرمندہ ہوتی البتہ اُس کی بات نے مجھے ہی قائل کر دیا۔

"زہرہ صفدر! میں نے ہار کبھی قبول نہیں کی۔"

"حالانکہ عظیم لوگ وہی ہوتے ہیں جو اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں۔"

وہ نازک سی لڑکی کسی طرح بھی ہارنے کو تیار نہ تھی۔ اودھر میری مردانہ انانیت اسے جھکانے پہ تلی ہوئی تھی۔

"تم میری مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتیں۔" میں نے دوبارہ مورچہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"خوش فہم لوگ بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔" اس نے ناک سکیڑتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

"یہ وقت بتائے گا کہ کامیابی کس کا نصیب بنتی ہے۔"

"بس آپ کو یہی کچھ کہنا تھا۔ مجھے اپنی پیکنگ بھی کرنا ہے۔" زہرہ کا انداز خاصا غصہ دلانے والا تھا۔

"تم اب واپس نہیں جاؤ گی۔" میں نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے، مجھ پہ حکم چلانے کا؟" زہرہ نے ناگواری سے منہ بنا کر پوچھا۔

"میں سارے کام اپنی مرضی سے کرتا ہوں۔"

"تو پھر اِدھر بھی یہی حال ہے۔ آپ کو آپ کی پہلے والی سرگرمیاں مبارک ہوں مجھے بس آپ معاف رکھیں۔ اب یقیناً ساری باتیں ختم ہو گئی ہوں گی۔ شاید ہی آپ سے دوبارہ ملاقات ہو۔ بائے بائے۔" زہرہ نے مجھے پوری طرح جلاتے ہوئے کہا اور مزید رکے بغیر چلی گئی۔

"اوہ!" میں نے بے بسی کے شدید احساس کے تحت زمین پر زور سے ٹھوکر ماری۔ "خیر میں بھی تمہیں جھکا کر ہی رہوں گا زہرہ صفدر۔" میں نے دانت پیس لیے۔ اور واپس چل پڑا۔ گھر پہنچا تو ملازمہ نے زین کا خط تھما دیا۔ لیکن میں بری طرح بپھرا ہوا تھا اس لیے میں خط پر توجہ دیے بغیر ماں جی کے پاس بیٹھ گیا جو شاید کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔

"ماں جی پلیز، میری طرف توجہ دیں۔" میں جھنجھلا رہا تھا۔

"آرام سے پتر، بس تھوڑا سا رہ گیا ہے۔" ماں جی نے میرا ہاتھ تسبیح سے ہٹاتے ہوئے کہا تو میں اکتا کر زین کا خط پھر سے پڑھنے لگا جو اس نے ابا جی کے ہاتھ بھیجا تھا لکھا تھا۔

ڈیئر افگن!
جلدی پہنچو۔ سی ایس ایس کے امتحان ہونے
والے ہیں اور تم یقیناً پرانی ڈگر پہ چل رہے
ہو گے۔ اب باز آجاؤ اور تیاری کے لیے
میرے پاس آجاؤ۔ فوراً باقی یہاں۔ بھی
ایک خبر ہے تمہارے لیے۔
خدا حافظ زین

"اوہ!" میں نے خط غصے سے پٹخ دیا۔ ایک میں ہی گنہگار رہ گیا تھا۔ اس دنیا میں یعنی سب بڑے کام میرے ہی نام کر دیے تھے۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

ہر ایک کو مجھ میں ہی نقص نظر آتا تھا۔ کیا کیا تھا میں نے سوائے چند لڑکیوں سے دوستی کرنے کے — اور — یہ لڑکیاں خود کون سا اتنی معصوم ہوتی ہیں۔ وعدے کسی سے اور شادی کسی سے۔ میں خود ہی سوال و جواب بھی کر رہا تھا۔

جب کہ ماں جی کافی دیر سے مجھے بلا رہی تھیں۔ آخر وہ خود ہی میرے کمرے میں آگئیں۔

"کیا بات ہے شیرو! اتنی دیر سے بُلا رہی ہوں۔ سنتے نہیں ہو۔" ماں جی خفا سی لگ رہی تھیں۔

"اوہ! معاف کر دیں ماں جی۔!" میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ پر بٹھا لیا۔ وہ بھی نہ جانے کس خیال میں تھیں کہ میرے فوم کے بیڈ پر بیٹھ گئیں ورنہ فوم سے تو انہیں ازلی چڑ تھی کہ وہ آگ کی طرح گرم ہوتا ہے۔

"پوچھ اب۔" وہ کمرے میں لگی انگلش اور پاکستانی پاپ سنگرز کی تصویروں سے گویا منہ چھپاتی ہوئی بولیں۔ میں نے ہنسی کو مشکل سے چھپایا۔ جب اپنے سوال یاد آئے تو سچ مچ سنجیدہ ہو گیا۔

"آپ نے زہرہ کو پڑھنے سے منع کیوں نہیں کیا؟"

"لو مجھے کس نے بتایا کہ وہ پڑھتی ہے۔" ماں جی سوالیہ نشان بنی مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"تو کیا آپ کو نہیں پتا کہ وہ اسلام آباد میں کیا کرتی رہی ہے؟" میں نے جھلا کر پوچھا۔

"پتر! میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ اب بھلا تم بتاؤ، میں یہ بتا سکتی ہوں کہ تم اسلام آباد میں کیا کرتے رہے ہو؟" ماں جی کی بات پہ میں چور سا بن گیا۔ یعنی ہر پھر کر سب مجھے ہی قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔

"تو میں تو آپ سب کی اجازت سے پڑھنے گیا تھا۔" میں نے بڑی شان سے کہا۔ گویا زہرہ کوئی جرم کر کے آئی تھی۔

"تو پھر اس نے بھی بھابھی جی سے اجازت لی ہو گی۔" ماں جی نے زہرہ کی صفائی پیش کی۔

"تو آپ پڑھائی کے خلاف نہیں؟" ان کی سوچ نے مجھے حیران کر دیا۔

"ہمارا زمانہ اور تھا پتر! یہ بھی آج کی ضرورت ہو گی، جبھی تو ساری دنیا اپنی اولاد کو پڑھاتی ہے۔" ماں جی نے میرے ارادے پہ بالکل پانی پھیر دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ناراض ہوں گی۔

"اچھا! اب وہ اگر آپ سے ملنے آئے تو آپ اس سے کہہ دیں کہ وہ اسلام آباد نہیں جائے گی۔ ہم نے اس سے نوکری نہیں کروانی۔" میں — پوری طرح دقیانوسی مردوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔

"ہاں یہ تو مجھے بھی پسند نہیں۔" اس سے پہلے کہ ماں جی یا میں مزید کچھ کہتے وہ ماں جی کو آوازیں دیتی ہوئی دروازے تک آئی۔ اور پھر وہیں رک گئی۔ شاید مجھے دیکھ کر — میں پھر سے جل اُٹھا۔

"آجاؤ زہرہ! اپنا شیرو ہی ہے۔"

"مامی جی! آپ ذرا میری بات سُن لیں۔" ماں جی کی بات کے جواب میں اس نے کہا۔

"اچھا آتی ہوں!" اس سے پہلے کہ ماں جی اُٹھتیں میں نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"آپ یہاں سے باہر نہیں جائیں گی، اس کو اندر بلائیں۔" میں نے ان کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"پتر! کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیا فرق پڑتا ہے۔ میں ہی چلی جاتی ہوں۔" ماں جی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"آپ مامی جی کو کیوں روک رہے ہیں۔ اگر آپ نے ذرا بھی اخلاقیات کا سبق پڑھا ہوتا تو مجھے بھی اندر آنے کی دعوت دیتے۔" زہرہ نے آکر مجھے دوسری مرتبہ شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہی۔

"سوری۔ آؤ بیٹھو۔" میں نے خجل ہو کر کہا۔

"نہیں، میں بیٹھنے نہیں آئی بلکہ مامی جی سے ملنے آئی ہوں۔ صبح اسلام آباد جا رہی ہوں۔" اس نے کچھ جتانے والے انداز میں کن اکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پر زہرہ اب کیوں جانا ہے وہاں؟ پڑھ تو لیا ہی ہے تم نے۔" ماں جی پوری طرح میرے خیالات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔

"جی، اب میں نوکری کروں گی وہاں۔" میں جو سر جھکائے کالی چپل میں قید اس کے گورے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا، اچانک اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تفاخر جھلک رہا تھا۔

"تمہیں نوکری کی کیا ضرورت ہے پتر؟" ماں جی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے ایک دم منہ پھیر لیا۔

"مامی جی! کچھ لوگوں کو میری ضرورت ہے۔"

"کن لوگوں کو؟" میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

"نہیں کچھ۔" اس کے ہونٹوں کے گوشے مسکرا رہے تھے غصے کے باوجود وہ کافی بھلی لگی۔

"اچھا مامی جی! اب اجازت دیں۔ خدا حافظ۔ ویسے میں آتی رہوں گی۔" یہ اس نے نہ جانے کس سے کہا تھا — پھر وہ چلی بھی گئی اور ماں جی میری طرف دیکھ کر رہ گئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔

"پتر! جب اولاد جوان ہو جائے تو پھر ماں باپ زبردستی ان پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتے۔" ماں جی نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا اور باہر نکل گئیں۔

میں نے باقی کا غصہ کمرے کی چیزوں پر نکالا۔

پھر میں بھی وہاں ٹھہر نہ سکا اور زین کے پاس چلا آیا۔

تقریباً — شام کے سائے ڈھلنا شروع ہو گئے تب میں وہاں پہنچا سارے گھر میں گھومنے کے بعد زین کو کتابوں کے ڈھیر میں گم پایا

"تم تو واقعی سیریس ہو گئے ہو۔" میری آواز پر وہ اچھل کر میری طرف لپکا۔ میں سمجھا شاید گلے لگے۔ میں نے بھی جوش میں بازو پھیلا دیے۔ مگر کہاں جی۔ اس نے تو زور سے میرا گریبان پکڑ لیا۔

"یہ تم اب آ رہے ہو؟"

"یار! گلا چھوڑو تو جواب دوں۔" میں نے بمشکل آواز نکالی۔

"اتنے دنوں سے بلا رہا تھا۔ یہ اتنی تیاری تمہارے فرشتے کریں گے نا۔" زین ایک جھٹکے سے کالر چھوڑ کر بیٹھ گیا۔

"مت پوچھو یار! کیا ٹریجڈی ہوئی میرے ساتھ۔" میں تھکا تھکا سانس لے کر اپنے بیڈ پر گر سا گیا۔ اور پھر چھت کو گھورتے ہوئے ساری بات بتا دی

"دل تو چاہ رہا ہے تمہارا کچومر نکال دوں مگر تمہاری حالت پہلے ہی اتنی مخدوش ہو رہی ہے۔ ویسے شیو نہ کر کے زیادہ غم کا اظہار ہوتا ہے۔"

"پلیز زین! بی سیریس۔ مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں۔" میں اس کے بے وقت مذاق سے اُکتا گیا۔

"سوسائیڈ (خود کشی)" زین نے چڑ کر کہا۔

"اگر یہی بکواس کرنا تھی تو بلایا کیوں تھا۔" میں غصے میں کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"اور یہ جو کل پیپر ہے وہ کون دے گا؟" زین کے اگلے الفاظ میرا دماغ چکرانے کے لیے کافی تھے۔

"واٹ! کل پیپر ہے؟" میں چیخا۔

"جی نہیں، بکواس کر رہا ہوں۔" زین نے منہ پھلا لیا۔ پھر میں نے سب کچھ بھلا دیا۔ میرا اور اباجی کا جو خواب تھا اسے پورا کرنے کے لیے اپنے آپ کو پڑھائی میں گم کر دیا۔ زین کبھی درمیان میں سے کھسکتا تو میں فوراً ہی اسے خوفناک سوالوں سے ڈراتا واپس لے آتا۔ ایسے میں وہ اکثر گنگناتا۔

ع صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے، زندگی یونہی تمام ہوتی ہے۔

میں اسے حوصلہ دلاتا کہ اس کے بعد ایک خوبصورت زندگی ہماری منتظر ہوگی۔

"پتا ہے شیرو، آج میں نے صنم کو دیکھا تھا۔ یار وہ بھی تو سی۔ ایس۔ ایس کا امتحان دے رہی ہے نا۔" زین نے پل بھر کے لیے رک کر استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"وہ ایک عدد بہت ہی سوبر سے بندے کے ساتھ جا رہی تھی۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے بظاہر لاپروا بن کر کہا۔

"تو گویا اب تم دونوں پوری طرح مقابلے پر اتر آئے ہو۔ دیکھتے ہیں کون کسے ہراتا ہے مگر دلائل کے ساتھ۔" زین مجھے بغور دیکھتا ہوا بولا۔

زہرہ کو جھکنا ہوگا زین!" میں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"چاہے وہ اپنی جگہ درست ہی کیوں نہ ہو۔" زین نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ ضروری نہیں کہ برائی کو ختم کرنے کے لیے خود بھی انسان برا راستہ اختیار کرے۔" میں کتابیں ایک طرف رکھ کے بحث پر آمادہ ہو گیا۔

"کیا مطلب۔؟ زہرہ نے کون سا برا راستہ اختیار کیا ہے؟" زین نے ماتھے پہ بل ڈال کر پوچھا۔

"خود ہی تو کہہ رہے تھے وہ۔" میں دانستہ رک گیا۔

"ہو سکتا ہے ان کو ایک دوسرے سے کوئی کام ہو۔" زین نے پھر — زہرہ کی طرف داری کی تو میں بری طرح چڑ گیا۔

"تم تو ایسے زہرہ کی سائیڈ لیتے ہو جیسے پچھلے جنم میں لڑکی رہ چکے ہو۔" میں نے ایک مرتبہ پھر کتابوں کے ڈھیر میں گم ہوتے ہوئے غصے سے کہا۔

"لینگویج پلیز۔" زین منمنایا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔

زبردست تیاری کے بعد پیپر بھی زبردست ہوئے آخری پیپر والے دن — میں زین کے انتظار میں گاڑی کا ڈیک کھولے سن رہا تھا کہ۔ اس بلڈنگ سے زہرہ کو نکلتے دیکھا پرنٹڈ چادر اچھی طرح لپیٹے اپنی کسی دوست کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی اسی سائیڈ پہ آ رہی تھی۔

میں نے بے ساختہ گھڑی کی طرف دیکھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ اوائل جنوری کے دنوں میں اچھا خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ وہ بھلا یہاں کیا کر رہی تھی۔

میں نے سر اٹھایا تو وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی نظریں ملتے ہی اس نے منہ پھیر لیا۔

"پتا ہے افگن! میں کیا دیکھ کر آ رہا ہوں۔" زین میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتا ہوا پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔

"بندر کا تماشا۔" میں سمجھ گیا کہ وہ کیا بتانا چاہتا ہے۔ اس لیے فضول بول گیا۔

"جی نہیں بلکہ زہرہ کو جو ہمارے ساتھ ہی امتحان دے رہی تھی۔ ویسے یار اس سے پہلے تو نظر نہیں آئی۔" زین کی بات پہ مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ اس ضدی لڑکی سے مجھے یہی توقع تھی۔

"ویسے دوسری کون سی خبر میری منتظر ہے؟" امتحان سے آزادی ملی تو ذہن میں خط کے الفاظ دوڑ گئے

"چلو ان کا پیچھا کرتے ہیں۔" زین نے ان کو نیلے رنگ کی کار میں بیٹھتے دیکھ کر کہا۔

دماغ تو درست ہے۔؟" میں نے اسے ڈانٹا۔

"اچھا آج سہ پہر کیا ہوا؟" زین ایک دم بات پلٹ گیا جب کہ میری نظریں نادانستہ طور پر نیلی ٹیوٹا کے تعاقب میں تھیں جسے کوئی اور ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ کون۔ شاید وہی اسمارٹ اور سوبر سا بندہ۔ میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں

میں نے زین کی طرف دیکھا۔ وہ فل آواز میں ڈیک کھولے آنکھیں بند کیے سیٹ پہ نیم دراز تھا۔

"ارے رومیو! یہ خاموشی چہ معنی دارد؟" میں نے اپنی آواز میں بشاشت بھرتے ہوئے کہا۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

"یار! کبھی کبھی ویسے ہی بلاوجہ خاموش رہنے کو دل چاہتا ہے۔" زین خاصے فلسفیانہ انداز میں آنکھیں موندے ہوئے بولا۔

"بلاوجہ تو نہیں، صاف صاف بات بتاؤ۔" میں نے اسپیڈ کم کرتے ہوئے رعب سے کہا۔

نتھنگ یار!" زین بڑبڑایا۔

"کہیں ایسا تو نہیں۔

ع اک اجنبی حسینہ آنکھوں کو بھا گئی ہے

میں آخر میں ہنس پڑا تو وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو گیا۔

"نن — نہیں — تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔" زین کی گھبراہٹ مجھے بہت کچھ سمجھا گئی۔

"کون ہے وہ؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"محض تمہاری غلط فہمی ہے ورنہ —" زین میری گرفت میں آنے سے کافی بچ رہا تھا۔

"تو پھر میں ہی بے وقوف گھامڑ ہوں جس کی زندگی کھلی کتاب کی مانند تمہارے سامنے ہے۔" میں نے ایک دم ہی زوردار آواز میں بریک لگاتے ہوئے غصے سے کہا

"میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کہانی کو عنوان دوں یا ادھورا ہی چھوڑ دوں۔" زین الجھن سے پر آواز میں بولا۔

"یہ — تم ہو زین اتنی گاڑھی اردو کہاں سے سیکھی۔" میں نے حیرت سے زین کی طرف دیکھا۔

"پلیز افگن بی سیریس!" زین نے منہ بنایا۔

"اچھا تو پھر آگے پھوٹو۔" میں اس کی طرف پورا پورا گھوم گیا۔

"دفع کرو سب کچھ بھاڑ میں جائے وہ —" زین ایک دم ہی آؤٹ ہو گیا۔

"بہت افسوس ہوا تمہاری دماغی حالت کو دیکھ کر۔" میں نے ہاتھ سے اس کے بال بکھیرتے ہوئے کہا۔

"شائزہ نام ہے اس کا۔ بہت اچھی لگتی ہے مجھے لیکن — مصیبت یہ ہے کہ وہ ہر روز ایک نئے لڑکے کے ساتھ نظر آتی ہے جیسے —" زین شاید دانستہ چپ ہو گیا۔

"کہ جیسے میں۔" میں نے اسے گھورا تو وہ نظریں جھکا کر رہ گیا۔ کہ اس کا مطلب بھی وہی تھا جو میں نے کہا۔

"تم نے اس سے پوچھا یا خود سے ہی رائے قائم کر لی؟" میں نے پہلی مرتبہ کسی لڑکی کی طرف داری کی۔

"نہیں۔ نہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میں نے آج تک اس سے بات نہیں کی۔" زین نے گمبھیر سی آواز میں کہا۔

"عجیب گھامڑ ہو تم۔ بات تو کرنی چاہیے۔" میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

"لیکن وہ لڑکوں سے کافی فری ہے۔" زین پرسوچ انداز میں بولا۔

"ہو سکتا ہے یہ اس کی ضرورت ہو۔" میری بات پر زین نے مجھے گھورا۔

"ویسے بات کیا ہے۔ بڑی حمایت ہو رہی ہے؟"

"شائزہ!" میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر دہرایا۔ اس کے بعد میں نے کوئی بات نہیں کی۔ زین بھی چپ ہی رہا اور میں نے گاڑی فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی۔

امتحانوں میں تیاری کے دوران جاگنے کی وجہ سے تھکن نے بھرپور حملہ کیا۔ گھر پہنچے تو حارث آیا ہوا تھا۔

"اتنی دیر سے آپ لوگوں کے انتظار میں بھوکا بیٹھا ہوں۔" حارث نے گویا احسان جتایا۔

"مجھے ذرا بھوک نہیں اور میں سونے جا رہا ہوں۔" زین نے مصنوعی تھکن خود پہ طاری کر لی۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ آج میں اور حارث کچھ باتیں کریں گے۔" میں نے حارث کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا تو زین نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ممی کہاں ہیں؟" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وقت دیکھا ہے آپ نے، بیچاری تھکن کے باوجود ہمارے لیے کھانا لگا رہی ہیں۔" حارث نے منہ بنایا۔

"تو پھر ممی سے کہو نا کہ دونوں بڑے بیٹوں کے ہاتھ پیلے

کر دیں۔" میں نے شرارت سے زین کی طرف دیکھا۔

"افگن! باز آجاؤ۔" زین نے مکا لہرایا۔

"آپ لوگ کتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگ گئے ہیں۔" حارث اتنی معصومیت سے بولا کہ ہم دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔ اصل میں حارث ہم سے جلد ہی جدا ہو کر فورس میں چلا گیا تھا۔ ورنہ ہماری حرکتوں کا عادی ہو جاتا۔

"یار! اب بوڑھے ہو رہے ہیں۔ اب تو کرنے دو ایسی باتیں۔" میں نے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آجاؤ بچو! کھانا لگ گیا ہے۔" ممی کی آواز پر ہم لوگ ڈائننگ روم میں چلے آئے۔

"اوہ سویٹ ممی۔ آپ اب سوئیں جاکر۔ ہم کھانے کے برتن کچن میں رکھ دیں گے۔ ویسے آپ خود ہی نوکر رکھنے کے خلاف ہیں۔" میں نے ممی کے شانے پہ بازو رکھتے ہوئے آخر میں شرارت سے کہا تو ممی تھکی تھکی مسکراہٹ کے ساتھ میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر شب بخیر کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

"تو افگن بھائی! کون سی باتیں آپ کرنا چاہتے ہیں؟" حارث نے پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے پوچھا۔

"تم بھی لو نا۔" میں نے زین کو ہاتھ پہ ہاتھ رکھے دیکھ کر کہا اور پھر خود ہی پلیٹ چاولوں سے بھر کر ڈھیر سارا سالن ڈال کر اس کے آگے رکھ دی۔ جب کہ زین بس بس کا شور ہی مچاتا رہ گیا۔

"میں انسان ہوں۔" زین نے جتایا۔

"اچھا۔ نئی اطلاع ہے۔" میں نے چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"افگن بھائی!" حارث زور سے بولا۔

"اوہ یاد آیا۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔" میں نہ جانے کیوں اتنا شوخ ہو رہا تھا۔ شاید اپنا اور زین کے دل و دماغ پر چھایا غبار کم کرنا چاہتا تھا۔

"جی ابھی آپ نے ابتدا کرنی ہے۔۔؟" حارث نے جل کر کہا۔

"یار! تمہیں میری مدد کرنی ہے کسی کو ڈھونڈنے کے لیے۔" میں نے کن انکھیوں سے زین کی طرف دیکھا جو خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔

"مثلاً کسے؟" حارث نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہ کل بتاؤں گا۔ ویسے چھٹی کتنی ہے تمہاری؟" میں نے آخری نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک مہینہ۔" حارث نے حساب لگایا۔

"اوں کافی ہے۔" میں اٹھ گیا۔ زین بھی واش بیسن کی طرف بڑھ گیا۔

"اور یہ برتن کون اٹھائے گا؟" حارث چیخا۔

"تم اور کون۔" میں اور زین ایک آواز ہو کر بولے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ حارث کے زور زور سے بولنے کی آواز ہمارے کمرے تک آ رہی تھی۔ ہم ہنستے ہوئے بستر پہ ڈھیر ہو گئے۔

صبح میں خلافِ معمول جلد ہی اٹھ گیا۔ حارث کا مجھے پتا تھا اکیڈمی میں جلد اُٹھنے کی عادت نے اسے یہاں بھی سونے نہ دیا ہو گا۔ کھڑکی سے دیکھا تو وہ لان میں ایکسرسائز میں مصروف تھا۔

میں ننگے پاؤں ہی چلا آیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس سکون بخش گئی۔ ہلکی ہلکی خنکی بھی اچھی لگ رہی تھی۔

"ہیلو!" میں نے ابتدا کی جب کہ وہ منہ پھلائے اپنے کام میں مصروف رہا۔

"یار! غصہ تھوک دو۔ پرامس آج لنچ کے سارے برتن میں سمیٹ کر دھو بھی دوں گا۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو حارث پسینہ صاف کرتا ہوا ہنس پڑا۔

"چلیے آئیے۔ شروع ہو جائیں۔" وہ گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہوا بولا تو میں بھی گاؤن کی ڈوریاں کس کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"یار! بات یہ ہے کہ ایک لڑکی کو ڈھونڈنا ہے۔" میں نے گھاس نوچتے ہوئے کہا۔

"افگن بھائی!" حارث ناراض ناراض نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا۔۔؟ اوہ!" پہلے حیران ہونے کے بعد پھر سمجھ کر زور سے ہنس پڑا۔ وہ جو لڑکیوں سے الرجک تھا ہم اکثر اسے گھسیٹ لیتے۔

"اب اتنے ننھے چوزے بھی نہیں رہے۔ آگئے کہیں سے شریف۔" میں نے جھنجلا کر کہا تو وہ بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا۔

"ہاں تو آج ہمیں ایک لڑکی کی تلاش میں نکلنا ہے۔ اس کا نام شائزہ ہے۔" میں نے جلدی جلدی اس ڈر سے کہا کہ کہیں وہ دوبارہ انکار نہ کر دے۔

"لڑکی کی تصویر ہے آپ کے پاس؟" حارث بادلِ ناخواستہ بولا۔

"نہیں۔ بلکہ میں نے آج سے پہلے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"تو پھر کیا الہ دین کا چراغ رگڑیں گے؟" حارث پھر غصے پر قابو نہ پا سکا۔

"یار! ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔" میں اس کے غصے سے محظوظ ہو کر بولا۔

"کیا واقعی حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ موویز اور ناولز ہی میں ایسا ہوتا ہے۔" حارث حیرت سے کہہ رہا تھا۔

"کوئی بھی قصہ یا کہانی اپنے آپ سے وجود میں نہیں آجاتے۔ ہر بات کا کوئی نہ کوئی وجود ہوتا ہے تو وہ افسانہ بنتا ہے۔ ہر چیز کی بنیاد ہوتی ہے۔" میں نے اپنی طرف سے بڑے مناسب الفاظ کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ کو ــــ وہ بہت اچھی لگتی ہے؟" حارث نے جھجک کر پوچھا۔

"کون ــ؟ شائزہ؟" میں نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"اوہ نو نو یار اسے تو کسی اور کے لیے ڈھونڈنا ہے۔" پھر میں نے اس کے بارے میں بتا دیا۔

"افگن بھائی! مجھے تو اس کا کیریکٹر کچھ ـــ" حارث دانستہ چپ ہو گیا۔

"دیکھو حارث! بند کتاب کو دیکھ کر تم اس کی کہانی نہیں بتا سکتے۔ جب تک کہ تم اسے پورا نہ پڑھ لو۔ ہم اس سے ملیں گے اور حقیقت کا پتا چلائیں گے۔" میں کہتے کہتے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آؤ ناشتا کریں۔ اس کے بعد روانگی۔" ہم دونوں اندر کی طرف بڑھ گئے۔

ناشتے کے بعد زین ہم سے پوچھتا ہی رہ گیا کہ کہاں جا رہے ہو۔ میں بھی چلوں گا۔ ہم نے اسے ہری جھنڈی دکھائی اور حارث کی بائیک پر بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔

یونیورسٹی میں زین نے اسے دیکھا تھا۔ اب یہ پتا چلانا تھا کہ وہ کون سی کلاس میں تھی۔ سب سے پہلے ہم اپنے ڈیپارٹمنٹ میں گئے۔ کلرک کے کمرے میں۔

"ایکسکیوز می جی! ہمیں مس شائزہ کے بارے میں پتا کرنا تھا۔" میں نے تکا چلایا اور حیرت انگیز طور پر اس کا سراغ ملا بھی تو ادھورا۔ کلرک کا جواب تھا کہ۔

"جی کچھ عرصہ پہلے انہوں نے یہاں جاب کی ہے اور اب حال ہی میں وہ ریزائن دے گئی ہیں۔"

"آپ کو ان کے موجودہ ایڈریس کا پتا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"سوری جی ہمیں معلوم نہیں۔"

ہم مایوس سے واپس لوٹ آئے۔

"اب کیا کریں گے؟" حارث نے صوفے پر گرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر ذرا سا بھی آئیڈیا مل جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دباتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"کہاں سے آ رہے ہو تم دونوں۔؟" ہم دونوں نے چونک کر دیکھا۔ زین ایپرن باندھے فرائی پین ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اس کے حلیے پر ہمیں ہنسی آگئی۔

"ممی کہاں ہیں؟" حارث نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"مسز رضوی کے گھر۔ بارہ بج رہے ہیں اور میرا بھوک سے بُرا حال ہے۔"

"میں نے تو سنا تھا کہ ان دنوں میں بھوک نہیں لگتی۔" زین کی بات پہ حارث معصومیت سے بولا تو میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بے تحاشا ہنس دیا۔

"یہ کن دنوں کا ذکر ہے؟" زین نے اسے گھورا۔

"مجھے کیا پتا۔ افگن بھائی سے پوچھیں۔" حارث شرارت سے کہہ کر باہر بھاگ گیا تو زین میرے سر پہ آ کھڑا ہوا۔

"شرافت سے بتاؤ کیا کہا ہے حارث سے۔ ورنہ فرائی پین میں ابھی بھی گھی گرم ہے۔" زین دہاڑا۔

"تمہارے دل میں ہی چور ہو گا ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا تو پل بھر وہ مجھے گھورتا رہا۔

"اگر کچھ ٹھونسنا ہے تو کچن میں آجاؤ۔" خفگی سے کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا تو میں بھی ہنستا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔

اس کے بعد کافی دن بغیر کسی ہلچل کے گزر گئے۔ حارث بھی واپس چلا گیا۔ لیکن اس کے بعد ہم نے شاید دانستہ یا نادانستہ شائزہ کا ذکر نہیں کیا۔ زین کئی مرتبہ مجھے بتائے بغیر نہ جانے کہاں کہاں گیا۔ میں نے دو تین چکر گاؤں کے بھی لگائے۔

ماں جی اب شادی کے لیے زور لگا رہی تھیں۔ میں

عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

”آپ نے پھپھو سے بات کی تھی۔؟“ میں نے سارا معاملہ زہرہ پر ڈالنا چاہا۔

”لے ان کو کیا اعتراض ہے۔ بچپن کی جو بات پکی ہے تم ۔۔ راضی ہو جاؤ تو ان سے کہہ کر تاریخ رکھ لوں۔“ ماں جی خفگی سے بولیں۔

”آپ نے بات کی تھی یا نہیں؟“ میں نے پھر اپنی بات دہرائی۔

”ہاں کی تھی۔ وہ مجھے ہی کہہ رہی ہیں کہ دن رکھ لو۔“ ماں جی زور سے بولیں ۔۔ ہوں تو ابھی تک زہرہ نے انکار نہیں کیا۔ یہ بھی وہ میرے پلّے ڈالنا چاہتی ہے۔ میں نے جھنجلا کر سوچا۔

میں نے ماں جی کو کچھ عرصہ مزید انتظار کے لیے کہہ دیا۔ کہ زہرہ کا فیصلہ بدلنے میں اسے جھکانے میں ابھی کچھ وقت لگتا تھا۔ رزلٹ کے انتظار نے تھکا سا دیا۔ اس سے پہلے کہ مزید بوریت کا شکار ہوتے کہ خوشگوار مثبت رزلٹ نے ساری شکایتیں دور کر دیں۔

”یار! مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔“ زین خوشی سے بے قابو ہوتا ہوا بولا۔

نالائق جو ہو ورنہ تو اپنی محنت اور اللہ کی رحمت سے پوری امید تھی۔“ میں اسے چڑاتا ہوا خوش دلی سے بولا تو زین میرے بازو پہ مُکا مار کر ہنس پڑا۔

اس کے بعد کافی ساری کارروائیاں ہوئیں جب کہ ہم امتحان کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے۔ خیر جی کئی مرحلوں سے گزر کر میں ڈی سی بن کر اپنے ہی علاقے میں چلا گیا تو اس دن میرے ابا جی کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔

”دیکھا آمنہ! تھوڑے دن کی جدائی نے کتنا اچھا پھل دیا ہے۔“ وہ ماں جی کی طرف دیکھ کر بولے۔ تو وہ میری پیشانی چوم کر بھیگی آنکھوں سے مسکرا دیں۔

اپنی منزل پر پہنچ کر عجیب سا سکون حاصل ہوا تھا تھوڑا فراغت ملی تو شائزہ اور زہرہ دو نام ذہن میں روشن ہو گئے۔ اب میری اور زین کی ملاقات زیادہ تر فون پر ہی ہوتی یا پھر ویک اینڈ پہ۔ اس مرتبہ پھر ہم نے ملنے کا وقت طے کیا۔ کافی عرصے سے ہم لوگ کسی تفریحی مقام پر نہیں گئے تھے۔

میں نے زین کو شکر پڑیاں چلنے کے لیے کہا۔

”اوں۔ پھر وہی بور جگہ۔“ زین کی اکتائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”جگہیں تو ساری بور ہوتی ہیں۔ اس میں رنگ تو انسان بھرتے ہیں اپنی نئی شگفتہ باتوں سے۔ یہ تو پتا ہے نا۔ او کے۔ اب کوئی بات نہ کرنا اور کل مجھے گھر پہ تیار ملنا۔“ میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر فون رکھ دیا۔

میں نے موسم کے تیور دیکھے۔ رواں وقت کا چکر ایک بار پھر سرد موسم لے آیا تھا۔ میں نے رات کو ہی ماں جی کو اپنا سارا پروگرام بتا دیا۔ صبح جلد اٹھانے کی تاکید کرتا نرم گرم لحاف میں گھس گیا۔

صبح جب چھ بجے ماں جی نے اٹھایا تو مارے کوفت کے برا حال ہو گیا۔ ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا گرم بستر چھوڑنے کو آخر نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔ نماز سے فراغت کے بعد اپنا سیاہ تھری پیس سوٹ پہن کر تیار ہو گیا۔

جب میں چابی لے کر گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تو ماں جی ۔ چلی آئیں۔

”آج میں جاؤں گی بات کرنے آپا جی کے پاس۔ بہت انتظار کر لیا۔“ ان کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا۔

”ماں جی پلیز۔ صرف تھوڑے دن اور انتظار کر لیں۔“ میں گھبرا گیا اور منت سے کہا۔

”آج تیرے ابا جی سے بھی بات کروں گی۔“ ماں جی ذرا بھی نہ پگھلیں۔

”اچھا یہ بتائیں زہرہ ہوتی کہاں ہے آج کل؟“ میں نے لہجے کو لاپروا بنا کر پوچھا۔

”یہاں آئی تھی ایک دن۔ اب اس نے وہیں نوکری کر لی ہے۔“ ماں جی نے آہستہ سے بتایا۔

”آپ نے منع نہیں کیا؟“ میرا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا۔ یہ لڑکی شروع سے نہ جانے ایسی تھی یا اب میری وجہ سے ۔

”میں نے آپا جی سے کہا تھا ان بے چاری کو بھی کچھ پتا نہیں۔ وہ تو ان کے بھائی نے ہی زہرہ کو لے لیا تھا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی بیٹی کی ساری خواہشیں پوری کریں گے۔“ ماں جی کی بات پہ میں کھولتا ہوا کوئی بات کہے بغیر گاڑی اڑا لے گیا۔

اسلام آباد پہنچنے تک میں اپنے موڈ کو بحال نہ کر سکا۔ نو بجے میں زین تک پہنچ سکا۔ اس کی دو تین باتوں کے جواب میں نے خاصے غصے سے دیے۔

”اگر دماغی حالت اتنی خراب تھی مجھے تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ اب زین غصے سے بولا۔

”چپ کر کے گاڑی میں بیٹھو۔“ میں نے نیچے اترے بغیر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا۔

”اگر تمہارا موڈ ٹھیک نہیں تو پروگرام کینسل۔“ زین نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم بیٹھو تو سہی، راستے میں بتا دوں گا۔“ میں نے اکتا کر کہا تو زین چوکیدار سے کچھ کہہ کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

”کہو۔“ تب میں نے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے گاڑی کو ہلکی اسپیڈ پہ رکھنے کے بعد اسے زہرہ کی نئی سرگرمی کے بارے میں بتا دیا۔

”تو اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے۔ آج کل کا دور ایسا ہے کہ اکثر لڑکیاں جاب کرتی ہیں۔“ زین نے حسبِ سابق اس کی طرف داری کی۔

”اگر ضرورت ہو تب نا۔ شوقیہ جاب کرنے والی ضرورت مندوں کا حق مارتی ہیں۔“ میرا لہجہ خاصا تلخ ہو رہا تھا۔

”تمہارے اندر تو کسی ہزار سالہ انسان کی پسماندہ روح سمائی ہوئی ہے۔“ ۔۔ زین تیزی سے کہہ کر باہر دیکھنے لگا ۔۔ اس کے بعد دونوں نے کوئی بات نہ کی۔ تھوڑی دیر بعد ہم شکر پڑیاں پہنچ گئے۔ خاصے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ہنستے کھیلتے زندگی کو انجوائے کر رہے تھے۔

ہم بھی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے میری نظریں نیچے اترتی زہرہ پر جم گئیں جو گلابی کپڑوں پہ سیاہ کوٹ پہنے ہمیشہ کی طرح منفرد لگ رہی تھی۔

”انگن! دیکھا تم نے؟“ زین پُرمسرت نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہوں۔ زہرہ ہے۔“

”اس کے ساتھ شائزہ بھی تو ہے۔“

”اوہ!“ اب میں نے دوبارہ غور سے دیکھا۔ سبز کپڑوں میں زہرہ کے ساتھ خاصی جاذبِ نظر لڑکی تھی۔ وہ لوگ اب ہمارے خاصی قریب آ چکی تھیں۔ دونوں کے چہرے بجھے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے پاس سے گزر جاتیں زین نے انہیں بے ساختہ پکار لیا۔

زہرہ نے حیران نظروں سے ہماری طرف دیکھا —— اور اس کی پیشانی لاتعداد شکنوں سے بھر گئی۔

”مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ میری نگرانی کے لیے یہاں تک پہنچ جائیں گے۔“

زہرہ کی غصیلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ محض آپ کی خوش فہمی ہے مس زہرہ ۔۔ ہمیں ان کی تلاش تھی اور یہ۔ اتفاق ہے کہ وہ آپ کے ساتھ ملی ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ زہرہ مخروطی انگلیوں والے ہاتھ مروڑ کر رہ گئی۔

”مم ۔ میری کیوں تلاش تھی۔ میں تو آپ کو جانتی بھی نہیں۔“ شائزہ کی آواز گھبراہٹ سے لرز رہی تھی۔

”میرے خیال میں تو آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب کہ آپ کی کمپنی میں زیادہ تعداد ہم جیسوں کی تھی۔“ میں نے بغور شائزہ کی سرخی ملی گندمی رنگت والے چہرے کو دیکھا۔

کرن بیوٹی بکس

خوبصورت بنیے

خوبصورت بننے کے لیے بہترین مشوروں پر مبنی قیمتی کتاب

بہت سی تصاویر کے ساتھ شادی بیاہ کے میک اپ کے لیے بہترین کتاب

ہر بک سٹال پر دستیاب ہے یا ہم سے براہِ راست منگوا لیں

قیمت — 24 روپے، ڈاک خرچ 5 روپے

رنگا رنگ کتاب گھر، ۳۔ اردو بازار کراچی

"یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں شائزہ سے؟" زہرہ بگڑی۔

"ویٹ اے منٹ۔ اس طرح کوئی بھی کچھ نہ سمجھ سکے گا۔ ہم اس کیفے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہیں ساری باتیں ہو جائیں گی۔" زین نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی طرف سے بڑا درست مشورہ دیا تب میں نے زہرہ کی طرف دیکھا۔ — زہرہ اور شائزہ نے ایک دوسرے کی طرف کچھ دیر دیکھنے کے بعد شاید ہمارے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا۔ ہم چاروں خاموشی سے چلتے ہوئے کیفے کے باہر پڑی ہوئی کرسیوں پر سنہری دھوپ میں بیٹھ گئے۔

زین نے کافی کا آرڈر دیا۔ ہم لوگ بالکل کلاس روم میں کسی سخت ٹیچر کے خوف سے سہمے ہوئے بچے لگ رہے تھے۔

زہرہ اپنے چرمی بیگ کی زپ سے کھیل رہی تھی۔ البتہ شائزہ گھبرا گھبرا کر ہماری طرف دیکھتی۔ اس کے یوں گھبرانے اور کترانے سے مجھے لگا زین نے اس کے بارے میں جھوٹ کہا ہے۔

کافی آنے تک سب خاموش ہی رہے۔ جیسے ہی بیرا کافی کے مگ رکھ کر گیا چاروں ہی نے کوئی نہ کوئی بات کرنے کی کوشش کی اور پھر بے اختیار ہنس پڑے۔ میں نے پہلی مرتبہ زہرہ کو ہنستے دیکھا تھا۔

ہنستے میں اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت جھلک اٹھی تھی۔ مجھے پہلے سے زیادہ اچھی لگی۔

"تو پھر شائزہ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں" میں نے کاسپ لیتے ہوئے ابتدا کی۔

"کیا مطلب؟" اس نے نوکیلی سیاہ پلکیں اٹھا کر حیرت سے مجھے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ زین نے جس شائزہ کو دیکھا وہ آپ ہی تھیں یا۔ جب کہ آپ میں اس جیسی ایک بھی عادت نہیں" میں نے بڑی کوشش سے مناسب بات کرنے کی کوشش کی۔

"پلیز زہرہ جی! آپ ہی ان سے بات کریں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

شائزہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتی ہوئی کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرا خیال تھا کہ شاید آپ نے اپنا پرانا مشغلہ چھوڑ دیا ہو لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ مسلسل شائزہ کو پریشان کر رہے ہیں۔" زہرہ مجھے گھورتی ہوئی بولی۔

"زین! منہ سے پھوٹتے کیوں نہیں، خواہ مخواہ میری پوزیشن آکورڈ کر رہے ہو۔" میں غصے سے زین پر الٹ پڑا۔ تو زین نے گلا صاف کرتے ہوئے بتایا کہ شائزہ اسے اچھی لگتی ہے دوسرے شائزہ کے دوستوں کے بارے میں۔

"وہ — وہ میری ناسمجھی تھی۔" شائزہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"ہاں — بتاؤ شائزہ بی ایزی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" زہرہ نے اس کا ہاتھ تھام کر تسلی دینے والے انداز میں دبایا۔

"کیوں، تم پولیس گارڈ ہو؟" میں نے تمسخر سے اسے دیکھا تو زہرہ نے پل بھر مجھے دیکھنے کے بعد اپنے بیگ سے ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ جس پر ایس۔ پی۔ زہرہ صفدر کا نام کالے حروف میں موٹا موٹا لکھا ہوا تھا۔ اوہ تو یہ ہے وہ نوکری — میں نے کارڈ اس کی طرف اچھال دیا۔

"چلیے جی! مس شائزہ شروع ہو جائیں۔ اب تو ہم واقعی آپ کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔" میرا نہ جانے کیوں لڑنے کو دل چاہ رہا تھا۔ نتیجہ آپ ہی طنزیہ ہو گیا۔ زہرہ میری طرف توجہ دیے بغیر شائزہ کے ساتھ لگی رہی۔

"تو پھر شائزہ بولو نا۔" زہرہ نے کہا تب شائزہ رُکتے ہوئے بولی۔

"شروع سے امی ابو نے ہماری پرورش لڑکوں کی طرح کی تھی کیونکہ ہم صرف تین بہنیں تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ امی ابو کی وفات کے بعد اور آزادی مل گئی۔ میرے ذہن میں کبھی لڑکی ہونے کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں جتنی بے تکلفی سے لڑکیوں سے ملتی تھی اسی بے تکلفی سے لڑکوں سے بھی دوستی کرتی۔ ان کے ساتھ گھومتی پھرتی۔ یہ احساس کہ میں لڑکی ہوں اس دن بیدار ہوا جب کچھ لڑکوں نے بری نیت سے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے انہیں ڈانٹا تو انہوں نے طعنہ دیا کہ تم اتنے لڑکوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔ تمہارے کردار کا کیا اعتبار۔ اس دن سے میں نے سارے دوستوں کو خیر باد کہہ دیا۔

تب مجھے پتا چلا کہ ہمارے معاشرے میں رہ کے لڑکیوں کے آزادانہ میل جول کو کس قدر برا سمجھا جاتا ہے۔ اب میں باوجود کوشش کے کسی کو اپنی پاکبازی کا یقین نہیں دلا سکتی۔"

شائزہ بتا رہی تھی اور میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا مجھ میں اور شائزہ میں ایک قدر مشترک تھی کہ ہم نے مخالف جنس سے دوستیاں کیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں لڑکا تھا۔ سب کچھ کرنے کے بعد بھی نیک نام اور وہ لڑکی تھی جو ناکردہ گناہ کی مجرم بن گئی تھی۔

میں نے زہرہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی انگلیوں سے گلابی کیوٹیکس اتارنے میں مصروف تھی۔ شاید یہ میری نظر کی تپش ہی تھی کہ اس نے ایک دم نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ صرف چند لمحے — پھر اس کی پلکیں جھکتی چلی گئیں

"اب آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے شائزہ؟" زین نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اگر دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں۔ اور اگر سمجھا جائے تو بہت بڑا۔ شائزہ پرسوچ آواز میں بولی۔

"ایک غلطی اگر لڑکا کرے تو کوئی برائی نہیں اور اگر وہی کام لڑکی کرے تو سارا زمانہ اس کا دشمن بن جاتا ہے" شائزہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"تو لڑکی وہ غلط کام کرے ہی کیوں؟ لڑکی کا مقام اس کا گھر ہے۔" میں بحث پر آمادہ ہو گیا۔

"یہ تو میں جانتی ہوں۔ کیونکہ جہاں میری آپی کی شادی ہو رہی تھی انہوں نے صرف اس وجہ سے رشتہ ختم کر دیا ہے کہ لڑکی کی بہن لڑکوں سے ملتی ہے لڑکوں سے دوستی ہے۔" شائزہ نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

"خیر، اب یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ ہم سب مل کر سارے کام کریں گے۔" زہرہ نے پروگرام طے کر لیا۔

"مائی گاڈ! مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میری یہ ذرا سی بھول اتنے غلط نتائج پیدا کر دے گی۔" شائزہ رو دی۔

"پلیز شائزہ! زہرہ نے کہا ہے کہ ہم لوگ مل کر سب کریں گے۔" اب کے زین بولا۔

"کون ہم لوگ؟" میں نے اسے گھورا۔

"میں، زہرہ اور تم۔" زین نے وضاحت کی۔

"میرے پاس تو ٹائم ہی نہیں۔" میں صاف مکر گیا۔

"آپ کوئی تو اچھا کام کریں۔" زہرہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب۔ سارے برے کام میں ہی کرتا رہا ہوں؟" میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"سارے تو خیر نہیں البتہ۔" زہرہ نے مسکراہٹ لبوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"مثلاً ہیروشیما پر بم میں نے ہی گرایا تھا" میں دہاڑا تو تینوں ہی زور سے ہنس پڑے۔

"ویسے بات کیا ہے۔ میرے پچھلے فعل تم بھول گئی ہو شاید" میں نے ہنستی ہوئی زہرہ کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھولی تو خیر نہیں — لیکن بھولنا پڑے گا۔" زہرہ نظریں جھکائے شوخ آواز میں کہہ رہی تھی۔

"یعنی میرے گناہوں کا پلڑا ابھی ہنوز بھاری ہے" میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ پچھلی باتیں بھلا دیں۔" زین نے تجویز پیش کی۔

"تم شروع ہی سے اس کے چمچے رہے ہو۔" میں زین کی طرف پلٹا۔

"اور آپ شروع سے لڑاکے۔"

"اگر میں کہوں افگن بھائی تو تب تو آپ مانیں گے؟" شائزہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تب — مجھے تمہاری زہرہ کو معاف کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے بڑے شاہانہ انداز میں کہا۔

"ہم اپنی ناسمجھی اور جلد بازی میں بہت سے کام غلط کر جاتے ہیں۔" زہرہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔

"ہم کے بجائے اگر میں کہو تو زیادہ مناسب ہے گا" میں نے اسے چڑایا۔

"یار اب تو سیز فائر کر دو۔" زین اکتا کر بولا۔

"تو پھر میں ڈائریکٹ زہرہ سے پوچھتا ہوں کہ اسے اب بھی میرا ساتھ بخوشی قبول ہے کہ۔" میں دانستہ چپ ہو گیا۔

"ضروری نہیں کہ ہر بات کو لفظوں کا روپ دیا جائے۔ بعض باتیں ان کہی اچھی اور خوبصورت لگتی ہیں۔" زہرہ نے سیاہ پلکیں جھکاتے ہوئے شرم آگیں لہجے میں دھیمے سے کہا تو میں خوش دلی سے ہنس پڑا۔

* * *

یہ شام بھی نہیں آئے گی

ہما کوکب بخاری

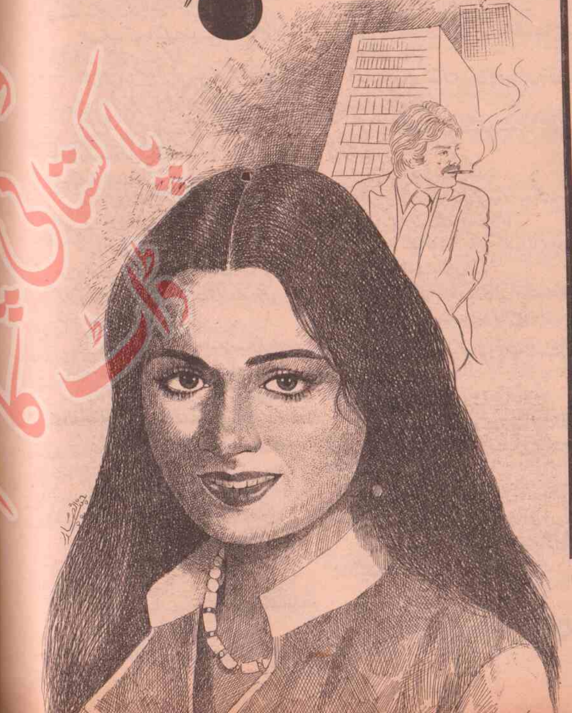

بی بی جی! بی بی جی! میرا مطلب ہے مس صاحبہ ظاہر ہے ایسے رنگ روپ بیبیوں کے نہیں مسوں کے ہوتے ہیں۔ میں بھی کتنا کوڑھ مغز ہوں۔ مس صاحبہ کو بی بی کہہ رہا تھا، پھر آخر وہ رُکتی کیوں"

یمنیٰ کے لیے اس پھیری والے کی باتیں اب ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھیں۔ پچھلے دو مہینے سے وہ روز کالج سے واپسی پر یہاں سے گزرتی تھی لیکن چار دن قبل یہ پھیری والا نجانے کہاں سے نمودار ہوگیا تھا اور اگر نمودار ہو ہی گیا تھا تو اس کی بلا سے۔ اسے کیا تھا، کوئی جہاں مرضی پھیری لگاتا اور کماتا اور پھر اپنا پیسہ اُڑاتا۔ بالکل اس پھیری والے کی طرح۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ چار دن سے یمنیٰ کے لیے یہاں سے گزرنا تقریباً ناممکن ہوگیا تھا۔ وہ ہر بہانے سے یمنیٰ کو کچھ خریدنے پر رضامند کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ پہلے دن تو اسے بیچارے پر ترس آگیا تھا۔ اچھا بھلا چھ فٹ کا بندہ تھا لیکن جو تہمد اور بنیان پہن رکھی تھی، وہ — بے حد میلی تھی اور پہنتا بھی بے حد بینڈو طریقے سے تھا۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

"کیا کرے بیچارہ، ہے ہی پینڈو۔" اسے ہنستا دیکھ کر یمنٰی نے سوچا تھا لیکن اس کے میل کچیل سے اٹے ہوئے کپڑے یمنٰی کے جمالیاتی ذوق پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کپڑے جس دن سے بنے ہیں اس دن سے لے کر آج تک پھیری والے نے انھیں اپنے سے علیحدہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور ان پر لگا میل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ ایک دو دن کی نہیں چار یا پانچ سالوں کی جان توڑ محنت اور کوشش سے کپڑوں پر جمنے میں کامیاب ہوا ہے۔

"مس صاحبہ، بہت خوب صورت چیزیں ہیں میرے پاس، یہ سب تو آپ کو لبرٹی اور فورٹریس میں بھی نہیں ملیں گی۔"

"کہہ جو دیا ہے، نہیں لینا کچھ۔" اس نے جھلا کر کہا تھا۔

"مس صاحبہ! لے لیں کچھ۔ میرے چھوٹے چھوٹے ماں باپ آپ کو دعائیں دیں گے۔"

"کتنے چھوٹے چھوٹے ہیں تمھارے ماں باپ؟" اس نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"ابا جی یہی کوئی ساٹھ ستر سال کے ہیں اور اماں جی پورے پچاس سال کی۔"

"ساٹھ اور ستر کے درمیان پورے دس سال ہوتے ہیں۔"

"مس صاحبہ! میں حساب میں بہت کمزور ہوں اسی لیے مولا بخش سے بچنے کے لیے پانچ مرتبہ اسکول سے بھاگا تھا۔ ویسے ابا جی بتاتے ہیں کہ وہ پہلی گول میز کانفرنس سے ایک یا دو برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔"

"یعنی تقریباً ۱۹۲۸ء میں۔ اور اب وہ ہو گئے پورے اکسٹھ — سال کے۔" یمنٰی بولی۔ "پھر وہ چھوٹے تو نہ ہوئے نا۔"

"اجی مس صاحبہ! بچے اور بوڑھے میں فرق ہی کہاں ہوتا ہے۔ دونوں کے منہ میں نہ دانت ہیں اور نہ پیٹ میں آنت۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ پُرخیال انداز میں بولی۔

"آج یہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے کیا؟" تانیا، یمنٰی کی خالہ زاد بہن جو اس کے ساتھ ہی جاتی تھی بولی۔ اب تک وہ انتہائی تحمل سے دونوں کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"تو کیا فرق پڑتا ہے اگر آج ادھر ہی کھڑے ہو جائیں تو۔" پھیری والا ایک دم بولا۔

"چلو تانیا!" یمنٰی اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"مس صاحبہ! کچھ لیتی جائیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے والدین پر رحم کریں۔ ان کے جوان بیٹے پر تھوڑا سا ترس کھائیں۔ میں نے اپنے ابا جی کی عمر کا حساب لگانے کے لیے تو آپ کو نہیں روکا تھا۔" وہ نان اسٹاپ بول رہا تھا۔

"اچھا بابا! کیا چیزیں ہیں تمھارے پاس؟" اس نے تنگ آ کر پوچھا۔

"چوڑیاں، لونگ، انگوٹھی، چھلّے، سبھی کچھ ہے۔"

"اس کے علاوہ کچھ؟"

"ایک میٹھا سپنا بھی ہے۔"

"کیا؟" وہ تقریباً چیخ پڑی۔ "دماغ تو درست ہے تمھارا؟"

"جی میں نے نہیں کہا، یہ نیرہ نور نے کہا ہے۔ بس میرے پاس یہی کچھ ہے۔" پھیری والا بوکھلا کر بولا۔ "ویسے آپ کے ہاتھ میں یہ رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں اچھی لگیں گی۔"

"ایک شرط پر لوں گی۔"

"کیا مس صاحبہ؟" اس نے چوڑیاں سفید کاغذ میں لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ تم ان پیسوں سے صابن خرید کر اپنے کپڑے دھوؤ گے۔"

"کیا فضول بحث کرتی ہو، وہ جو مرضی کرے ان پیسوں کا۔" تانیا نے دھیمے سے کہا۔

"نہیں میں اس سے اسی وقت چوڑیاں لوں گی جب یہ کپڑے دھونے کا وعدہ کرے گا۔" یمنٰی بھی اپنی بات پر اَڑی ہوئی تھی۔

"جی مس صاحبہ جیسا آپ کا حکم۔"

اور یوں یمنٰی چوڑیاں خرید کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔

"تم تو خواہ مخواہ اس سے باتوں میں وقت ضائع کر رہی تھیں۔"

"اسے وقت ضائع کرنا نہیں کہتے، نفسیات کی طالبہ ہوں آخر۔ اس طرح سے لوگوں کی نفسیات سمجھ میں آتی ہے۔ ان سے مل کر، ان سے باتیں کر کے۔"

"کسی دن لوگوں کی نفسیات سمجھنے کی کوشش میں خود نفسیاتی کیس بن جاؤ گی۔" تانیا ٹی۔ وی کا چینل بدلتے ہوئے بولی۔ "ویسے یمنٰی ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

"پھیری والے کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں اور قد بھی بہت اچھا تھا اور میرا خیال ہے کہ تمھارے رکنے کی وجہ بھی یہی تھی، نفسیات تو بس بہانہ ہے۔"

"تمھارا دماغ وہ بات سوچتا ہے جو کوئی بھی دوسرا نہیں سوچ سکتا یہاں تک کہ پھیری والے سے بات کرتے وقت میں بھی یہ بات نہیں سوچ سکی تھی۔" وہ پکوڑوں کی پلیٹ سے اپنے لیے آلو والے پکوڑے الگ کرتی رہی۔

"کیوں خوب صورت آنکھیں اور لمبا قد تمھاری کمزوری نہیں ہیں؟"

"بالکل ہیں، لیکن پھیری والے سے بات کرتے وقت میں نے اس کی آنکھیں غور سے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔" وہ بدستور پکوڑے علیحدہ کرتی رہی۔ "اور خاص طور پر اس کی بےہنگم سی ہنسی سننے کے بعد تو میں اس کی آنکھوں پر بالکل توجہ نہیں دے سکتی تھی کیونکہ خوب صورت مسکراہٹ بھی میری کمزوری ہے۔"

یمنٰی اور تانیا خالہ زاد بہنیں تھیں۔ یمنٰی کے والد پاک فوج میں کرنل تھے۔ ان کی پوسٹنگ جہلم سے لاہور ہوئی تھی۔ یمنٰی کو بی۔ اے میں داخلہ لینا تھا اس لیے اسے پہلے خالہ کی طرف بھیج دیا گیا۔ اب چند دن میں ابو اور امی بھی آنے والے تھے۔ یمنٰی کا بھائی وقاص پاک فوج میں کیپٹن تھا اور آج کل سیالکوٹ ہوتا تھا۔ بی۔ اے کے بعد والدین کا ارادہ تانیا اور وقاص کی شادی کرنے کا تھا۔

"امی اور ابو کے آنے میں پورا ایک ہفتہ — باقی ہے اور پورے ڈیڑھ دن سے ان کا فون نہیں آیا۔" وہ اپنی عادت کے مطابق امی اور ابو کے لیے پریشان تھی۔

"تو تم خود کر لو فون۔"

"پتا نہیں وہ گھر پر ہوں گے بھی یا نہیں۔ آنے سے پہلے یونٹ کے ہر آفیسر نے انھیں ڈنر دینا ہے اور اس ڈنر کی خوشبو مجھے یہاں تک آ رہی ہے۔" یمنٰی نے زور سے ہوا کو سونگھا۔

"یہ اُس ڈنر کی نہیں بلکہ اِس ڈنر کی خوشبو ہے جو ڈائننگ ٹیبل پر چُنا جا چکا ہے اور اب تمھاری تشریف آوری کا منتظر ہے۔" نعمان نے اعلان کیا۔

"یہ پھیری والے کے پاس ہجوم سا کیا ہے؟" یمنٰی غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کچھ لوگ ہیں، خریداری کر رہے ہوں گے۔" تانیا بھی وہیں کا جائزہ لے رہی تھی۔ "ویسے اسمارٹ لڑکے ہیں۔"

"ہیں تو اسمارٹ، لیکن پھیری پر تو صرف چوڑیاں، لونگ، انگوٹھی اور چھلّے پڑے ہیں، یہ لڑکے یہاں سے کیا خریدنے آئے ہیں؟"

"جو کچھ پڑا ہوا ہے، وہی خریدیں گے اور کیا خریدنا ہے۔"

"اف خدایا! دیکھو اس پھیری والے کو۔" یمنٰی حیرت سے بولی۔

"خیریت تو ہے نا، کیا ہوا اسے؟"

"ہوا کچھ نہیں۔ اس کے ہاتھ میں دیکھو۔"

"میری طرف سے وہ دکھائی نہیں دے رہا۔ تم بھی پہیلیاں بجھوا رہی ہو، سیدھی بات کیوں نہیں کرتیں۔"

"اس کے ہاتھ میں گولڈ لیف کا پیکٹ ہے اور کپڑے اسی طرح میلے چیکٹ۔ اُف اسی لیے اس نے مجھ سے چوڑیوں کے اٹھارہ روپے لیے تھے کہ گولڈ لیف پیے۔ ٹھہرو میں ابھی اس کا دماغ درست کرتی ہوں۔"

"یمنٰی! رُکو۔" تانیا نے اسے بمشکل روکا۔ "تم نے دنیا کو ٹھیک کرنے کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔ وہ جو کرتا ہے، کرتا ہے، تمھیں کیا۔"

"خود سوچو تانیا! کل اپنے چھوٹے چھوٹے ماں باپ کی دہائی دے رہا تھا اور خود سب کمائی اِدھر اُڑا رہا ہے۔ ایسے بندے کے تو ہوش ضرور ٹھکانے لگانے چاہییں۔"

"اف یمنٰی! ایک تو میں تم سے سخت عاجز ہوں۔ تمھیں تو تھانیدار ہونا چاہیے تھا۔" بادل نخواستہ وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔

"آئیں مس صاحبہ!" پھیری والے نے جو اپنے اسٹول پر بڑے اطمینان سے براجمان تھا اور پچھلے پانچ منٹ سے انتہائی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زور زور سے ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ ایک دم زمین پر چھلانگ لگائی۔

"کیا خدمت کروں مس صاحبہ! آپ کی۔ کل آپ کی وجہ سے میرے چھوٹے چھوٹے والدین نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور آپ کو بہت سی دعائیں دیں۔"

"دعائیں تو میں دیتی ہوں تمھیں۔ میں نے اس لیے پیسے دیے تھے تمھیں کہ ان سے گولڈ لیف کے سگریٹ پیو۔ بجائے اس کے کہ تم صابن خرید کر کپڑے دھو لیتے۔ تم نے سب پیسے سگریٹوں میں اُڑا دیے۔ مجھے پورے ساڑھے سترہ روپے کی چوڑیاں دیں۔ میں نے تمھیں سترہ کی جگہ اٹھارہ

روپے دیے۔ تم نے پچاس پیسے مجھے واپس بھی نہیں کیے کہ کھلے نہیں ہیں۔ واپس کرو مجھے میرے اٹھارہ روپے ابھی اور اسی وقت اور مجھے تمھاری چوڑیاں رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اپنے بیگ سے چوڑیاں نکالیں جو کل سے اسی میں پڑی ہوئی تھیں۔ "رکھو یہ وہاں پر۔" اس نے پیکٹ تقریباً پٹخ دیا۔

"کیا کر رہی ہو؟" تانیا نے اسے دھیمی آواز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ "ایسے نہیں کرتے نا۔ وہ جو چاہتا ہے اسے کرنے دو، ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔"

"آج کے بعد کوئی لینا دینا نہیں ہوگا لیکن کل کا حساب تو مجھے بے باق کرنا ہی ہوگا۔" پھر وہ پھیری والے سے مخاطب ہوئی۔ "واپس کرو مجھے میرے پیسے۔"

پھیری کے پاس کھڑے چاروں لڑکے ان کے آنے پر تھوڑا سا ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں ان کے چہرے سُرخ ہو رہے تھے۔

"مس صاحبہ! میری بات تو سُنیں۔"

"کچھ نہیں سُننا مجھے، سمجھے۔ میرے پیسے واپس کرو۔"

"پیسے تو نہیں رہے، البتہ میرے والدین کی دعائیں ہیں وہ لے لیں۔"

"رکھو اپنے پاس اپنی دعائیں اور پیسے نہیں ہیں تو ـــ" اس نے سگریٹ کا پیکٹ جو ٹھیلے پر پڑا تھا اٹھا لیا۔ "تو میں یہ لے جا رہی ہوں۔ میرے پیسے مفت کے نہیں ہیں کہ تم لوگوں پر خرچ کروں ـــ آؤ تانیا۔"

"مس صاحبہ! میرے چھوٹے چھوٹے والدین کے جوان بیٹے پر رحم کریں۔" لیکن وہ سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ گئی۔

اور آج پورے چار دن گزر چکے تھے۔ ہر روز کالج سے واپسی پر پھیری والے سے سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ "مس صاحبہ مس صاحبہ" کہتا اس کے پیچھے آتا لیکن وہ ایسی خون آشام نظروں سے اُسے گھورتی کہ کوئی اور ہوتا تو مڑ کر اس کی طرف دیکھتا بھی نا۔ لیکن یہ عجیب ڈھیٹ شخص تھا اور یہی بات یمنیٰ کو ناگوار گزرتی تھی۔

"نعمان! آیندہ سے کالج واپسی پر تمھیں ہم دونوں کو گھر چھوڑنا ہوگا۔" یمنیٰ نے کہا۔

"یہ کس جرم کی سزا ہے؟"

"کالج لے جا سکتے ہو تو واپس کیوں نہیں لا سکتے؟"

"بات یہ ہے کہ میں تمھاری اور تانیا کی طرح نکمّا تو ہوں نہیں۔ چھوڑ اس لیے دیتا ہوں کہ میرا ڈیوٹی کا اور تمھارا کالج کا ٹائم اور راستہ ایک ہی ہے۔ ویسے بھی دو منٹ کی واک ہے یہاں سے۔"

"میں جو کہہ رہی ہوں کہ تمھیں واپسی پر بھی ہمیں لے جانا ہے آیندہ سے۔"

"آیندہ سے ایسے کہہ رہی ہو جیسے ساری عمر تمھیں یہیں رہنا ہے۔ دو دن بعد خالہ، خالو آئیں گے تو تم شادمان سے کینٹ شفٹ ہو جاؤ گی۔"

"شکر ہے جان چھوٹے گی تم جیسے کنجوس انسان سے۔ کیا تھا جو کالج سے واپسی پر لے جاتے۔ دو ہی دن کی تو بات تھی۔"

"ایسا کیوں نہ کروں کہ میں تم لوگوں کو کالج پہنچانے کے بعد وہیں بیٹھا رہوں اور واپسی پر گھر چھوڑ دوں۔ بس اتنا کرنا کہ ڈرائیوروں والا یونیفارم سلوا دینا۔"

"توبہ ہے تم سے تو ـــ" وہ پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔

اور پھر اگلے دن کالج سے واپسی پر وہی مسئلہ تھا۔ پھیری والا گویا سارا دن اسی انتظار میں رہتا تھا کہ یمنیٰ وہاں سے گزرے اور وہ اسے پکارنا شروع کر دے۔

"بی بی جی! بی بی جی! میرا مطلب ہے مس صاحبہ۔ جی میری عرض سُن لیں ـــ"

"عرض کے بچے۔" یمنیٰ بھی اب تنگ آ چکی تھی۔ "مصیبت کیا ہے تمھیں۔ کون سی زبان سمجھتے ہو تم۔ آیندہ مجھے آواز دی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ ایک دفعہ بتا دیا ہے کہ کچھ نہیں خریدنا تم سے۔ میرے پیسے اتنے فالتو نہیں ہیں کہ تم انھیں سگریٹ میں اڑا دو۔ ابھی تو مجھے ان پچاس پیسوں کا حساب بھی تم سے لینا چاہیے تھا جو تم نے بہانے سے مجھے واپس نہیں کیے۔ میں اس لیے چُپ ہو گئی تھی کہ میرا خیال تھا کہ تم سدھر جاؤ گے لیکن تم ـــ"

"چھوڑو بھی۔ تم کیوں اُلجھتی ہو خواہ مخواہ۔" تانیا پریشان ہو کر بولی۔

"آج مجھے اس کا دماغ درست کرنے دو۔ میں تنگ آ گئی ہوں اس سے ـــ"

"مس صاحبہ! میں غریب بندہ ہوں۔ اس دن بس ایسے ہی تھوڑی سی عیاشی کر لی تھی۔ میری توبہ۔" پھیری والے نے

کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "میرے باپ کی توبہ، میرے دادے کی توبہ، میرے دادے کے دادے کی توبہ جو میں نے یہ حرکت دوبارہ کی۔ بس اب معاف کر دیں۔"

"اچھا اس دفعہ معاف کر دیتی ہوں۔" یمنیٰ بہت نرم دل تھی۔ "آیندہ ایسا نہ کرنا۔"

"تو پھر آپ چوڑیاں لے رہی ہیں نا؟"

"نہیں آج میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" آج واقعی اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ کالج میں سہیلیوں کو ٹریٹ دینے کے بعد وہ اب بالکل کنگال تھی۔

"اچھا آپ چوڑیاں لے لیں پیسے کل دے دینا۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ "ایسے کوئی چیز نہیں لی جاتی۔"

"لے لیں مس جی! میرا دل رکھنے کو۔"

اس کی یہ بات سُن کر تانیا مسکرا دی۔ "اچھا چلو تمھارا دل رکھنے کو تمھاری مس صاحبہ لے لیں گی۔"

"کیا کر رہی ہو، بُری بات ہے۔" یمنیٰ بوکھلا کر مزید ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"بُری بات یہ نہیں بلکہ کسی کا دل توڑنا بُری بات ہوتی ہے۔" تانیا نے بھی اسے مزید ستایا۔ "آپ دو درجن چوڑیاں دے دیں، پیسے کل لے لینا۔"

پھیری والے نے یمنیٰ کے احتجاج کو نظرانداز کرتے ہوئے خوب صورت سُرخ چوڑیاں بے حد بد سلیقگی سے سفید کاغذ میں لپیٹ کر تانیا کے حوالے کر دیں۔

"ویسے یہ آپ کی نہیں مس صاحبہ کی ہیں۔" وہ اپنے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا بولا۔ "اور دو درجن نہیں تین درجن ہیں۔ ان کے پیسے بنے تیس روپے۔"

"اتنی مہنگی چوڑیاں مجھے نہیں لینی۔" یمنیٰ نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"اب تو جی یہ خریدی جا چکی ہیں۔" پھیری والے نے ڈھٹائی سے کہا۔ "کل یاد سے پیسے دے جانا۔"

یمنیٰ کو سارا غصہ تانیا پر تھا۔ پتا نہیں اسے اچانک کیا ہو گیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ـــــــ کہ تین درجن چوڑیاں پھیری والے سے لے لیں کہ کہیں بیچارے کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ گھر پہنچ کر بھی اس نے منہ پھلائے رکھا۔

"یہ صبح سے تمھارے منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" نعمان نے لان میں گھاس پر بیٹھی پڑھتی ہوئی یمنیٰ سے پوچھا۔

"تم تو بات نہ کرو مجھ سے۔"

"خیریت تو ہے نا؟" نعمان نے گھسیٹ کر لان چیئر یمنیٰ کے قریب ہی کر لی۔

"صرف اتنا کہا تھا کہ کالج سے واپسی پر گھر چھوڑ جانا۔ کون سا ساری عمر کا کام تھا۔ دو ہی دن کی تو بات تھی، لیکن تم تو اتنے کنجوس ہو کہ بس بات ہی نہ کرو مجھ سے۔"

"اس میں کنجوسی کہاں سے آ گئی؟"

"مجھے پتا ہے تمھیں سارا غم پٹرول ڈلوانے کا ہے۔ آخر کتنا خرچ ہو جاتا پٹرول میری وجہ سے۔ ادھر ساتھ ہی تو ہے تمھارا ہسپتال لیکن تم ٹھہرے سدا کے کنجوس۔"

"اچھا اس لیے کنجوس بنا دیا تھا۔" نعمان ہنس پڑا۔ "بات یہ ہے یمنیٰ میں نوکری کر رہا ہوں تمھاری طرح کالج میں نہیں پڑھ رہا کہ جس وقت دل چاہا اُٹھ کر گھر چلے آئے۔"

عمران ڈائجسٹ آپ کے لئے

عمران ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے آپ کی فرمائش پر کتابی شکل میں شائع کر رہا ہے

یہ وہ سلسلے ہیں جن کو پڑھنے کے لیے آپ یقیناً بے چین ہوں گے!

مہاراجہ	بانگڑو	سلابو
چمپا کلی	شکستِ آرزو	اپسرا
پُراسرار قوتوں کا ماہر	نی تیکا	ماضی کے تجزیے
وحشی	سلاسیہ	صمورالہ
راجکماری	جلاوطن	پُراسرار علوم کا ماہر
اُس کا سایہ	ترسول کنڈ کی داسی	ایر ہوسٹس
کوبرا	مہارانی	سیاہ نیولا
نروان کی تلاش	طوفان	ماضی کی کُہر

مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۷ - اُردو بازار - کراچی

"جی کالج میں پڑھنا کس قدر مشکل کام ہے تمھیں کیا پتا۔ صبح سے جو پڑھائی شروع ہوئی بس بغیر کسی کامے، فل اسٹاپ کے رات کے بارہ بج جاتے ہیں۔" اس نے کتابیں ایک طرف پٹخیں۔

"اچھا چھوڑو اس بحث کو، یہ بتاؤ کہ آخر دو منٹ کا فاصلہ تمھارے لیے پل صراط کیوں بنا ہوا ہے؟"

"میں بتاتی ہوں۔" تانیا جو پودوں کو پانی دے رہی تھی، پائپ چھوڑ کر آگئی۔ پھر اس نے سب بات حسبِ ذائقہ مرچ مصالحہ لگا کر نعمان کو بتائی۔

"اچھا یہ بات ہے۔" نعمان نے 'اچھا' کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے اس پھیری والے کے ذوق پر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" یمنٰی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ وہ ایک ایسی لڑکی پر مرا جا رہا ہے جس کے سر پر بال نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آنکھیں یوں ہیں کہ لگتا ہے ابھی یہیں گر کر سو جائے گی۔ صحت ایسی کہ لگتا ہے پاکستان میں قحط پڑ چکا ہے اور سب سے بڑھ کر زبان جو کم از کم دو گز لمبی ہے۔"

"نعمان!" یمنٰی کتابیں ایک طرف پھینک کر اس کی طرف بڑھی لیکن وہ ایک ہی جست میں موٹر بائیک پر بیٹھ کر یہ جا اور وہ جا۔

وہ اکثر یمنٰی کو یونہی تنگ کرتا تھا۔ اس کے خوب صورتی سے کٹے ہوئے بالوں کی تعریف وہ اسی پیرائے میں کرتا تھا۔ اور خوب صورت خوابیدہ آنکھوں پر بھی اس کا تبصرہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

"تمھیں ضرورت کیا تھی یہ سب کچھ نعمان کو بتانے کی؟" اس کے جانے بعد یمنٰی تانیا پر برس پڑی۔

"تاکہ وہ کل کالج سے واپسی پر ہمیں کار میں گھر چھوڑے اور ہم راستے میں پھیری والے کا قرض بھی چکا دیں۔"

"پھیری والے کا قرض تم چکاتی رہنا، مجھے نہیں دینے اُسے تیس روپے۔"

یمنٰی کی بات ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ گیٹ پر ہارن کی آواز سنائی دی۔

"یہ تو ہماری کار کا ہارن ہے۔" یمنٰی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "امی ابو آگئے۔"

وہ یہ کہتے ہی گیٹ کی طرف بھاگی۔ خلافِ توقع امی اور ابو کے ساتھ وقاص بھائی بھی تھے۔ کافی دیر تک سب ایک دوسرے سے گرمجوشی سے ملتے رہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہوا تو یمنٰی نے پوچھا۔

"وقاص بھائی! آپ کو تو اس وقت سیالکوٹ میں ہونا چاہیے تھا؟"

"میں نے چھٹی لے لی تھی۔ پہلے جہلم گیا تاکہ امی اور ابو کے ساتھ ہی لاہور آؤں۔ ویسے بھی سامان لوڈ اور ان لوڈ کروانا تھا۔ میں نے سوچا ابو کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔ اس لیے چلا آیا۔"

"چلیں مان لیتے ہیں کہ آپ کو ابو کا خیال تھا۔ ویسے آپ لاہور آنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے۔" یمنٰی نے تانیا کو تنگ کرنے کے لیے کہا۔ گو وقاص اور تانیا کی منگنی نہیں ہوئی تھی لیکن بزرگوں کے درمیان یہ بات طے ہو چکی تھی کہ بی۔ اے کے بعد ان دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔ خود وقاص اور تانیا بھی یہی چاہتے تھے۔ وقاص کو جب بھی موقع ملتا وہ لاہور ضرور آتا۔ یہاں خالہ کے علاوہ اور کوئی رشتہ دار تھا ہی نہیں اور یہ بات اس کے حق میں بہت اچھی تھی۔

"کتنی چھٹی لے کر آئے ہیں؟" تانیا نے پوچھا۔

"بس تین دن اور ہیں ہفتے کو چلا جاؤں گا۔"

"تین دن تو گھر سیٹ ہونے میں لگ جائیں گے۔ آپ سے تو ڈھنگ سے بات چیت بھی نہیں ہو سکے گی۔" یمنٰی نے کہا۔ "میری تو خیر ہے لیکن ——"

"یمنٰی۔" تانیا نے یمنٰی کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے اسے تنبیہہ کی۔

"اگلے ویک اینڈ پر آؤں گا تو خوب گپ شپ کریں گے۔"

اگلے روز یمنٰی وغیرہ صبح ہی کینٹ چلے گئے تاکہ گھر اپنی نگرانی میں سیٹ کروایا جا سکے۔ تانیا بھی وہیں آگئی تھی۔ سارے گھر کی سیٹنگ انھیں دونوں نے مل کر کروائی تھی۔ مالی کو پودوں کے بارے میں ہدایات دیں۔ نئے بیٹ مین کو مرغیوں کے دانہ ڈالنے کے اوقات بتائے۔ جمعدار کو گھر کی صفائی کے متعلق تفصیلی ہدایات دیں۔ اسی کام میں صبح سے رات ہوگئی۔ تھکن کی وجہ سے اگلے دن دونوں نے کالج سے چھٹی کرلی۔

"میرا خیال ہے اب گھر جاؤں۔" تانیا نے اگلے روز کہا۔

"یہاں تمھیں کیا ہو رہا ہے؟"

"نہیں، خیر ہونا کیا ہے۔ امی اکیلی ہیں اور نعمان کا تو تمھیں پتا ہی ہے۔ سارا گھر اُلٹا کر رکھ دیتا ہے۔ امی بیچاری کہاں تک اکیلی سب کام کریں گی۔"

"شاداں بھی ہے گھر میں۔ آدھے سے زیادہ کام تو وہی کرتی ہے۔" یمنٰی نے کہا۔

"وہ بہت ڈنڈی مارتی ہے۔ سر پر کھڑے رہو تو کام ٹھیک کرتی ہے۔ ذرا اِدھر اُدھر ہو جاؤ تو سارا کیا کرایا چوپٹ ہو جاتا ہے۔"

"ایک آدھ دن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وقاص نے کہا۔

"بس اب انکار کی گنجائش نہیں، جمعہ تک تو تمھیں ہر حال میں یہیں رہنا ہے۔" یمنٰی نے بھی فیصلہ صادر کر دیا۔

"آج ذرا آؤٹنگ کا موڈ ہو رہا ہے۔ کہیں چلنا چاہیے۔ صبح سے گپیں لگا لگا اور جوس پی پی کر میں تو بالکل بے حال ہو گئی ہوں۔"

"ہاں باہر موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔" یمنٰی پردے سرکا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ "کتنے دن سے ٹینس نہیں کھیلا۔ میرا خیال ہے سروسز کلب چلتے ہیں۔ وقاص بھائی بھی وہیں گئے ہوئے ہیں۔"

"چلو اٹھو پھر۔"

یمنٰی کار کی چابیاں اور ٹینس ریکٹ لے کر باہر گیراج میں نکل آئی۔

"یمنٰی! کہتے ہیں کہ قرض کبھی معاف نہیں ہوتا، مرنے کے بعد بھی۔" تانیا کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" مونا نے کار بیک کر کے گیٹ سے نکالی۔

"ویسے تمھیں اچانک کیسے خیال آیا قرض کا؟"

"خیال ایسے آیا کہ تم پر بھی تو قرض ہے نا کسی کا۔"

"مجھ پر؟"

"ہاں ہے تو۔"

"کس کا؟"

"اسی غریب پھیری والے کا۔ تمھیں اس کے تیس روپے دینے ہیں۔"

"مجھے نہیں، تمھیں دینے تھے۔ میں نے کوئی نہیں خریدی تھیں چوڑیاں اور نہ ہی میں نے اب تک وہ پہنی ہیں۔ تمھی کو شوق تھا کہ کہیں بیچارے کا دل نہ ٹوٹ جائے تو پیسے بھی تم ہی دیتیں۔"

"اس نے مجھے نہیں دی تھیں چوڑیاں اور نہ ہی مجھے روز روکتا تھا۔ اب میرے سر تیس روپے کا قرض نہ ڈال دو نا۔" تانیا نے ایک دم سے اپنا دفاع کیا۔ "ویسے جب میں دو دن بعد وہاں سے گزری تو اس جگہ پھیری والے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔"

"تو کیا مجھے سچ مچ گناہ ہوگا؟" یمنٰی ایک دم پریشان ہو کر بولی۔

"وہ تو ظاہر ہے ہوگا۔" تانیا نے اسے مزید ڈرایا۔

"لیکن میں نے تو اس سے چوڑیاں نہیں خریدی تھیں اور اب تک پہنی بھی نہیں ہیں۔"

"یہ تاویلیں نیکی بدی لکھنے والے فرشتے نہیں سمجھتے۔"

"اب میں پورے لاہور میں اسے کہاں تلاش کروں گی؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" تانیا نے کندھے اُچکائے۔

"کچھ سوچنا پڑے گا۔" یمنٰی کار پارک کرتے ہوئے بولی۔ "خیر اس مسئلے کو تو بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے وقاص بھائی کو بتا دیں کہ ہم آگئے ہیں۔ کسی دوست کے ساتھ جانے کے بجائے ہمارے ساتھ ہی گھر چلے چلیں۔"

دونوں بلیئرڈ روم کی طرف چل دیں۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ سامنے ہی وقاص اپنے کسی دوست کے ساتھ سنوکر کھیل رہا تھا۔ ان کی جانب دوست کی پشت تھی اور سامنے ہونے کے باوجود وقاص کھیل میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے ان کی آمد کا بالکل علم نہ ہوا۔ یہ دونوں بھی چپ چاپ کھڑی وقاص کے متوجہ ہونے کا انتظار کرتی رہیں۔ اتنے میں وقاص کے دوست نے سٹرائک کے لیے اپنی پوزیشن تبدیل کی۔ کیلون کلائن کی نیلی جینز اور کرانتی کی آف وائٹ قمیص میں ملبوس وقاص کا دوست بے حد اسمارٹ لگ رہا تھا۔

"لگتا ہے اسے کہیں دیکھا ہے۔" یمنٰی نے دماغ پر زور دیا۔

"تم ضرور کسی نہ کسی سے شکل ملانے بیٹھ جاتی ہو۔"

"نہیں غور سے دیکھو، کتنا جانا پہچانا چہرہ ہے۔"

"مجھے تو بالکل نہیں لگ رہا۔" تانیا نے اس کی طرف

بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور وہ جو اس طرف تین آفیسر کھڑے ہیں وہ بھی۔"

"ارے یہ تو بالکل ــــ" تانیا کہنے ہی لگی تھی کہ یمنٰی نے اس کے منہ پر زور سے ہاتھ رکھ دیا۔

"چلو باہر چلیں۔" اس نے تانیا سے سرگوشی کی اور دونوں چپ چاپ باہر نکل آئیں۔

"اُف یہ تو بالکل پھیری والا لگ رہا تھا اور وہ تین آفیسر جو اس طرف کھڑے تھے، سو فیصد وہی تھے جو اس دن پھیری والے کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔" تانیا حیرانی سے بولی۔ "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہیں پھیری والا اس کا گمشدہ جڑواں بھائی تو نہیں ہے۔ دونوں میں بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ کہ وہ بیچارا اپنی غربت کی وجہ سے کپڑے تک نہیں دھو سکتا تھا اور تھا بھی بالکل پینڈو۔ جب کہ یہ ــــ یہ تو بالکل پینڈو نہیں ہے۔ یقین کرو یمنٰی یہ ضرور گمشدہ بھائی ہوں گے۔"

"اگر یہ گمشدہ جڑواں بھائی ہیں تو کیا دوسری طرف کھڑے ہوئے آفیسرز کے بھی کوئی گمشدہ جڑواں بھائی ہیں؟"

"ہاں یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔" تانیا نے پُر خیال انداز میں کہا۔ "ویسے یہ تو بالکل ویسے ہی لگتے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"تمھیں اپنی سمجھ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔" یمنٰی مسکرائی۔

"تو مجھے بھی بتاؤ نا۔"

دونوں لان چیئر پر بیٹھ گئیں۔

"یہ ہے کوئی آفیسر۔"

"اور وہ تھا پھیری والا، یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔" تانیا نے اس کی بات کاٹی۔

"سنو تو۔" وہ بولی۔ "آرمی میں انٹیلیجنس کا ایک کورس ہوتا ہے۔ اس کورس میں آفیسرز مختلف قسم کے چھوٹے موٹے کام کر کے کمائی کرتے ہیں۔ مثلاً مختلف چیزوں کی پھیری لگاتے ہیں۔ انھیں اپنا حلیہ بھی بالکل ویسا ہی بنانا پڑتا ہے جیسے وہ کام کرنے والے کسی بھی شخص کا ہو سکتا ہے۔"

"سمجھ گئی اب۔" تانیا پُر خیال انداز میں بولی۔ "یعنی وقاص کے دوست نے بھی اسی کورس کے سلسلے میں پھیری لگائی تھی اور اب یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ اس نے اٹھارہ روپے کا صابن خرید کر اپنے کپڑے کیوں نہیں دھوئے تھے اور یہ کہ وہ گولڈ لیف، کیوں پی رہا تھا۔"

"بالکل۔ اور اس نے بہت دن تک ہمیں بے وقوف بنایا۔ میرے اٹھارہ روپے کے سگریٹ پینے کا گھناؤنا منصوبہ بنایا جسے میں نے پورا نہیں ہونے دیا۔ مجھے تیس روپے کا مقروض بنانے کی کوشش کی۔ اس سازش کو بھی میں نے بری طرح ناکام بنا دیا اور اب دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ اس کے چودہ طبق روشن نہ کر دیے تو میرا نام بھی یمنٰی نہیں۔"

"میں تم سے پوری طرح متفق ہوں۔"

"دیکھو، اب وقاص بھائی کی وجہ سے اس سے سامنا تو ہو گا ہی۔ ہم ایسے شو کریں گے جیسے ہم نے اسے پہچانا ہی نہیں اور ہم اسے کسی قسم کی لفٹ بھی نہیں کرائیں گے۔ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو، سب اسکرو کس دوں گی اس کے دماغ کے۔"

"اس نیک کام میں میری خدمات حاضر ہیں۔" تانیا نے جھک کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد وقاص اور اس کے دوست باہر آگئے۔

"ارے تانیا، یمنٰی تم؟"

"جی ہیں، گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرانے لگا تھا اس لیے سوچا، یہاں آجائیں۔ موسم بھی اچھا تھا۔" بات تو وہ وقاص سے کر رہی تھی لیکن کن انکھیوں سے ساتھ کھڑے اس کے پھیری والے دوست کا تفصیلی جائزہ بھی لے رہی تھی۔ ابھی بھی اس کی قمیص کی جیب سے گولڈ لیف کا پیکٹ جھانک رہا تھا۔ آنکھوں میں شناسائی کی چمک اور بیتے ایام کی تحریر تھی۔ اچانک مل جانے کی خوشی بھی تھی اور بے حد حیرت بھی۔ آج اتنے شاندار کپڑوں میں اس کی شخصیت بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ کہاں پھیری والے کی میلی چیکٹ تہہ بند اور بنیان اور کہاں کیلون کلائن کی جینز اور کرانتی کی شرٹ، لیکن ایک چیز جو دونوں شخصیات میں مشترک تھی۔ وہ اس کا چھ فٹ لمبا قد تھا۔

"ان سے ملو، یہ ابھی کچھ نہیں اور مستقبل میں میری سب کچھ ہے، تانیا اور یہ میری چھوٹی اور بے حد لاڈلی بہن یمنٰی ہے۔" وقاص نے تعارف کی ابتدا کی۔ "اور تانیا یمنٰی یہ ہیں میرے بہترین دوست اور کورس میٹ کیپٹن ارم، کیپٹن عثمان اور کیپٹن علی رضا۔"

"کیپٹن علی رضا۔" یمنٰی نے دل ہی دل میں کہا۔ "اب منانا اپنی خیر۔"

"پلیز آپ لوگ تشریف رکھیں۔" تانیا نے میزبانی کرتے ہوئے کہا۔

"یمنٰی! یہ علی رضا وہی ہے جو منگلا میں ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ بریگیڈیر حسن رضا کا بیٹا۔"

"انکل حسن کا بیٹا؟" یمنٰی کو بھی خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا جسے اس نے بڑی صفائی سے چھپا لیا۔

"جی بالکل وہی۔"

بریگیڈیر حسن رضا اور یمنٰی کے ابو بہت گہرے دوست تھے لیکن فوج کی زندگی میں یہ بہت مشکل ہے کہ دو بہترین دوست ایک ہی شہر میں رہیں۔ ایسا ہی ان کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ یہ لوگ صرف منگلا میں اکٹھے رہے تھے۔ وہ بھی تب جب بچے چھوٹے تھے۔ بعد میں اِدھر اُدھر پوسٹنگ ہونے کی وجہ سے رابطہ کم ہو گیا۔ اب ملاقات صرف ایسے ہوتی کہ بریگیڈیر حسن اور ان کی وائف اگر یمنٰی وغیرہ کے شہر میں آ گئے تو ان سے ضرور ملتے اور اسی طرح یمنٰی کے امی اور ابو ان کے شہر میں جاتے تو اُن سے ضرور ملتے۔ پھر وقاص ملٹری کالج جہلم گیا تو وہاں اس کی ملاقات علی رضا سے ہوئی۔ ان کی دوستی روز بروز مستحکم ہوتی گئی۔ اس کے بعد جے۔ سی۔ بی اور پی۔ ایم۔ اے میں بھی ان کا ساتھ رہا لیکن پاسنگ آؤٹ کے بعد یہاں بھی وہی مسئلہ ہوا۔ اکیڈمی سے نکلتے ہی دونوں کی پوسٹنگ مختلف شہروں میں ہو گئی اور تب سے اب تک دونوں کسی ایک شہر میں تعینات نہیں ہو سکے تھے۔

یمنٰی ان دونوں سے چھ برس چھوٹی تھی۔ جب یہ لوگ منگلا میں تھے ان دنوں وقاص اور علی رضا مل کر یمنٰی کو بے حد تنگ کرتے تھے لیکن وہ اکیلی ہی بعض اوقات ان کی ساری اسکیم چوپٹ کر دیتی۔ کبھی کبھار یمنٰی ان دونوں کی شرارت کا ہدف بن جاتی لیکن ایسے میں وہ تہیہ کر لیتی کہ ان سے بدلہ لے کر ہی رہنا ہے اور پھر وہ دونوں کو ایسا تنگ کرتی کہ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے۔

"یہ ابھی تک ویسی ہی جنگلی ہے جیسی بچپن میں ہوتی تھی۔" علی رضا نے اسی انداز میں کہا جیسے وہ اسے بچپن میں تنگ کرنے کے لیے کہتا تھا۔

"اگر میں اس وقت جنگلی تھی تو اب اس سے دو قدم آگے ہوں۔" اس نے جل کر کہا۔ "ویسے تم بھی بچپن میں انتہائی بدتمیز ہوتے تھے۔"

"شاید۔" وہ سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ "لیکن ماہ و سال نے مجھ پر ذرا مختلف اثر ڈالا ہے۔ میں اب نہایت تمیز دار اور ڈیسنٹ شخص ہوں۔" اس نے اسی چڑانے والے انداز میں کہا۔

"ہونہہ تمیز دار اور ڈیسنٹ۔" یمنٰی نے دل میں سوچا۔ "اتنی تمیز تو ہے نہیں کہ سگریٹ ہم سے پوچھ کر پیتا۔ یہ ہے تمیز۔"

"ویسے آج کل کیا کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔ "کچھ ڈھنگ کا کام کر رہی ہو یا ابھی تک کرکٹ اور فٹ بال کھیلتی ہو؟"

"اُف ایسے بن رہا ہے جیسے اسے پتا ہی نہ ہو کہ میں کہاں پڑھ رہی ہوں۔ روز تو کالج سے واپسی پر منہ اٹھائے مس جی، مس جی کرتا تھا۔" یمنٰی نے چڑ کر سوچا پھر اونچی آواز میں بولی۔ "کرکٹ اور فٹ بال بھی ویسے ہی چل رہا ہے اور پڑھائی بھی۔ میں بی اے کر رہی ہوں لاہور کالج سے۔ تمھیں پتا ہے لاہور کالج کس طرف ہے؟"

"ہاں پتا تو ہے لیکن اس طرف جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا لیکن یمنٰی نے یہی ظاہر کیا جیسے اس نے علی رضا کی باتوں کو سو فیصد تسلیم کر لیا ہو۔

"مضامین کیا ہیں تمھارے؟"

"میرے پاس سائیکالوجی اور انگریزی ادب ہیں۔"

بات چیت اب رسمی رُخ اختیار کر رہی تھی۔ علی رضا اب تک یہ بات نہیں سمجھ سکا تھا کہ یمنٰی اُسے پہچان چکی ہے یا نہیں۔ کالج کے متعلق پوچھنے سے یوں لگتا تھا کہ وہ اسے پہچان چکی ہے لیکن نہیں۔ اچانک سامنے آ کر بھی اس کے تاثرات ویسے ہی تھے جیسے وہ پہلی مرتبہ ملی ہو۔ آنکھوں میں ویسی ہی اجنبیت جیسے پہلی ملاقات پر عموماً ہوتی ہے۔ بعد میں اس نے بچپن کے حوالے سے پہچانا۔ ویسے بھی ایک پھیری والا اسے کہاں یاد ہو گا اب۔ اس کی تو بچپن کی عادت تھی ہر ایک کو

سدھارنے کی اور سدھارتی بھی تھی لڑائی جھگڑا کر کے۔ پتا نہیں تب سے اب تک نجانے کتنے لوگ اس کی اسی "سدھار مہم" کا شکار ہوئے ہیں۔ اس نے بھلا کسے یاد رکھا ہوگا۔ خیر میں بھی اسے سرپرائز دوں گا۔"

"میں اب چلتی ہوں۔" یمنیٰ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"تھوڑی دیر بیٹھو پھر میں بھی ساتھ چلا جاؤں گا۔" وقاص نے کہا۔

"آپ کی کمپنی بہت بور ہے۔ ویسے بھی مجھے کہیں اور جانا ہے۔"

"خیر میرے فرینڈز بور تو بالکل نہیں ہیں۔" وقاص نے دوستوں کی سائیڈ لی۔ "ویسے اگر تمھیں کہیں جانا ہے تو اس کے لیے تم کسی بہانے کے بغیر بھی جا سکتی ہو۔"

"مجھے بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو جو تجزیہ کیا وہ کہہ دیا۔" وہ بے رُخی سے بولی۔

"جانے دو یار۔" علی رضا بولا۔

"تھوڑی دیر مزید بیٹھی تو اللہ جانے کہاں کہاں سے سائیکالوجی کے نکتے نکال نکال کر ہماری سوچ کا تجزیہ کرنے لگے گی۔ آخر تین سال ہو گئے ہیں نفسیات پڑھتے ہوئے۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمھاری سوچ کا تجزیہ کرنے کی۔ اور نہ ہی تمھارا تجزیہ کرنے کے لیے مجھے نفسیات کی کھوپڑیاں کھنگالنے کی ضرورت پڑے گی۔ تمھارے متعلق بچپن میں جو رائے میں نے قائم کی تھی تم اب بھی بالکل ویسے ہی ہو۔"

"یہ خفا بہت جلدی ہو جاتی ہے۔" ان کے جانے کے بعد وقاص نے کہا۔

"پتا نہیں مجھے کس طرح برداشت کرتی ہے جب میں اسے تنگ کرتا ہوں۔ گھر کے باہر تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ پڑتی ہے۔"

"کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا اس میں۔ وہی بچپن کی عادت ہے۔" علی رضا نے کہا۔

"دیکھا کیسے بول رہا تھا۔" کار میں بیٹھتے ہی یمنیٰ پھٹ پڑی۔

"تم بھی کم تو نہیں رہیں۔"

"ابھی تو میں بھائی کی وجہ سے چپ رہی ہوں کہ ان کا دوست ہے ورنہ مجھے تو اتنا غصہ تھا اس کے اوپر کہ دل چاہ رہا تھا اس کا حشر نشر کر دوں۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ انکل حسن کا بیٹا ہے۔ انکل اتنے ڈیسنٹ ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس میں کچھ اثر تو انکل کا آیا ہوگا۔ لیکن کہاں؟ ویسی ہی عادتیں ہیں جیسی بچپن میں تھیں بلکہ اضافہ ہی ہو گیا ہے ان میں۔ کچھ اثر تو بورڈنگ ہاؤس نے بھی ڈالنا تھا نا اس پر۔"

"میرا خیال ہے تم نے اپنا دو سیر خون ضرور جلا لیا ہے۔"

"ابھی تو روز ہی اس کی شکل دیکھ کر نجانے اور کتنا جلانا پڑے۔ مجھے یقین ہے کہ ہر دوسرے تیسرے دن گھر پہنچ جائے گا ہمارے۔ ویسے بھی بچپن میں امی اور ابو کا بہت لاڈلا تھا۔"

"ویسے شکل اس کی ایسی تو نہیں کہ انسان اسے دیکھ کر خون جلائے۔"

"ایسی ہی ہے۔" یمنیٰ نے زور دے کر کہا۔ "اور باتیں تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے۔ خیر میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں، سمجھ لوں گی۔"

"ویسے ایک بات ہے یمنیٰ۔"

"کیا؟"

"تمھاری طرف وہ ذرا ٹیڑھا ہو کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا دکھائی دے رہا ہے۔"

"جب دال پکائی جاتی ہے تو سب تیلے کالے باہر پھینک دیتے ہیں۔" وہ بولی۔ "امی بتا رہی تھیں کہ انکل حسن پچھلے چھ مہینے سے لاہور میں ہی ہیں۔ سچی انکل آنٹی اتنے اچھے ہیں۔ پتا نہیں یہ کس پر گیا ہے۔"

"بس تو پھر لگتا ہے اس مرتبہ دال کالے سمیت ہی پکائی جائے گی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" اس نے تانیا کو گھورا۔

"میرا خیال ہے کوئی ملنے والا آیا ہوا ہے۔ باتیں کرنے کی آواز آ رہی ہے۔" ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے تانیا نے کہا۔

"پتا نہیں کون ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "فی الحال تو کمرے میں چلو میں ذرا جائزہ لوں کہ علی رضا کو کیسے تنگ کیا جا سکتا ہے۔"

"یمنیٰ بیٹے!" اتنے میں ڈرائنگ روم سے امی کی آواز آئی۔

"اُف اب مہمانوں سے ملنا پڑے گا۔ ایک تو یہ بھی بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔" وہ انتہائی بیزاری کے عالم میں اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔" چھپانے کے باوجود اس کی آواز میں بیزاری کا عنصر نمایاں تھا۔ "ہائے یہ تو انکل حسن اور آنٹی ہیں۔" وہ یکدم کِھل اٹھی۔

"ہم نے کہا ہماری بیٹی تو ہمارے پاس آتی نہیں، خود ہی مِل کر آنا ہوگا اس سے۔" آنٹی نے کہا۔

"یو آر موسٹ ویلکم ــــــ آنٹی لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ لوگ کہاں رہتے ہیں۔ ویسے ابو نے بتا کرایا تھا لیکن تب انکل چھٹی پر تھے۔ میرا خیال ہے لاہور سے باہر۔"

"ہاں ہم کشمیر کی طرف گھومنے چلے گئے تھے۔ ابھی پرسوں رات ہی واپس آئے ہیں۔ کل کا دن آرام کیا۔ آج شام میں پودوں کو پانی دے رہی تھی جب تم کار پر کہیں باہر گئیں تب مجھے پتا چلا کہ سامنے والا مکان تم لوگوں کا ہے۔ میں نے اسی وقت حسن کو بتایا اور ملنے آ گئے۔"

"اچھا تو آپ لوگ سامنے والے مکان میں ہیں۔"

"ہاں پہلے ذرا دُور تھا مکان، پھر تبدیل کیا ہے کچھ دن پہلے۔ علی، یہیں ہوتا ہے آج کل، اسی کے ذمے یہ کام لگایا تھا۔ وہ ہم سے پہلے یہاں پوسٹ ہوا تھا۔ اب ہم آ گئے ہیں تو میں نے اس سے کہا کہ بی او کیوز یا میس میں کیا رہنا جب اپنا گھر موجود ہے۔ بس وہ بھی کل صبح ہی یہاں شفٹ ہوا ہے۔" آنٹی نے بتایا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ لوگ اتنے قریب آ گئے۔" یمنیٰ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "ابھی میں کلب گئی تھی، وہاں علی سے بھی ملاقات ہوئی لیکن اس نے بتایا نہیں کہ آپ لوگ اتنے قریب آ گئے ہیں ہمارے۔"

"اس وقت تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ کیوٹ سی لڑکی یمنیٰ ہوگی۔" رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے علی رضا نے سوچا۔ "کتنا خوب صورت اور افسانوی اتفاق ہے۔ ابھی دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں ممی ڈیڈی سے کتنا لڑا تھا کہ مجھے نہیں کرنی کسی یمنیٰ سے شادی۔ شادی میں اپنی پسند سے کروں گا اور پھر میں اپنی پسند کی لڑکی کا نام تک انھیں نہیں بتا سکا تھا کہ اس سے ملاقات کے لمحے ہی اتنے مختصر تھے۔ لیکن یہ مختصر سے لمحے ہی میرے لیے سب کچھ تھے۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ تیس روپے دینے آئے گی تو میں اس کا گھر دیکھ لوں گا لیکن اگلے دن نہ وہ آئی اور نہ تانیا اور اس کے بعد کورس بھی ختم ہو گیا۔

پھر آج اچانک اسے دیکھ کر اور یہ جان کر کہ یہی وہ یمنیٰ ہے جسے ممی اور ڈیڈی بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ نہ اس نے نہ تانیا نے، ورنہ حیرت کے کچھ تاثرات تو ان کے چہرے پر بھی ہوتے یا پھر شناسائی کی کوئی رمق ـــ نہیں انھوں نے واقعی مجھے نہیں پہچانا، پھر ظاہر ہے اس نے تب سے اب تک اتنی شاپنگ کی ہوگی کہ وہ پھیری والا، اس کا حلیہ اور اس کی شکل بھول ہی گئی ہوگی۔"

اور دوسری طرف ممی اور ڈیڈی اپنی خواب گاہ میں یمنیٰ کے متعلق ہی گفتگو کر رہے تھے۔

"اتنی پیاری بچی ہے یمنیٰ۔ خدا جانے آج کل کے لڑکوں کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ نہ دیکھا، نہ بات کی اور کہہ دیا وہ مجھے اچھی نہیں لگتی، بالکل جنگلی بلی کی طرح ہے۔ اب آپ بتائیں کیا وہ جنگلی بلی کی طرح ہے؟"

"نہیں یمنیٰ بیٹی تو بہت اچھی ہے اور کسی بھی معزز اور شریف گھرانے کی بہو بننے کے لائق ہے۔" ڈیڈی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ایک مرتبہ علی اس سے مل لے تو اپنا فیصلہ بدل دے گا۔"

"آپ کو اس کی ضد کا نہیں پتا، اس دن کہہ رہا تھا مجھ سے کہ اسے کوئی اور لڑکی پسند ہے۔ میں نے پوچھا کہ کون ہے، کہاں رہتی ہے۔ ماں باپ کون ہیں، خاندان کیسا ہے؟ لیکن اس نے ایک سوال کا بھی جواب نہیں دیا۔ بس سب باتیں گول کر گیا۔"

"میرا نہیں خیال کہ اسے کوئی اور لڑکی پسند ہوگی ورنہ کچھ تو بتاتا۔ ایسے ہی ٹالنے کو کہہ دیا ہوگا۔"

"چلیں مان لیا کہ ٹالنے کو کہہ دیا ہوگا اس نے لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ یمنیٰ کے لیے ہامی بھرے تو میں بات چلاؤں، ایسے میں کرنل صاحب یا بھابھی سے بات کروں اور بیٹا ہمارا عین وقت پر انکار کر دے تو کیا ہوگا۔"

"ابھی اتنی جلدی کیا ہے، یمنیٰ بیٹی پڑھ رہی ہے اور کون سی دونوں کی عمریں نکلی جا رہی ہیں۔ آرام سے بات

کرلیں گے۔"

"اتنی اچھی لڑکی ہے میں انتظار نہیں کرنا چاہتی۔ کہیں ماں باپ کسی اور جگہ رشتہ طے نہ کر دیں۔"

"ایک تو تم ہر کام طوفانی رفتار سے کرنے کی عادی ہو۔ پہلے یہ تو پتا کرو کہ کہیں کسی اور جگہ بیٹی کی بات تو نہیں چل رہی۔"

"وہ میں نے سب معلوم کرلیا ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن ان کاموں میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں آپ علی کے کان کھینچیں، یہ ساری ڈھیل اسے آپ نے دے رکھی ہے۔ ہر کام ہمیشہ اس نے اپنی مرضی سے کیا ہے لیکن بہو میں اپنی مرضی کی لاؤں گی۔"

"میں تو اب تھک گیا ہوں۔ صبح علی سے بات کریں گے۔"

صبح ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ کرتے ہوئے علی رضا نے محسوس کیا کہ ممی ڈیڈی اس سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر ممی تو اس سلسلے میں بہت بے چین لگ رہی تھیں۔

"میں نے آپ کو رات کو کیا کہا تھا۔" ممی نے ڈیڈی کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں میں بات کرتا ہوں۔" ڈیڈی نے اپنے کپ سے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "علی بیٹے ہمیں ابھی آفس کے لیے نکلنے میں کتنی دیر ہے؟"

"بات کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔" علی نے سوچا، خطرے کی گھنٹی اس کے کانوں میں بجنے لگی تھی۔ "جی پندرہ بیس منٹ ہیں۔"

"پندرہ بیس منٹ میں ہم بات کرسکتے ہیں۔"

"آپ تو سارا وقت تمہید میں ہی گزار دیں گے، مجھے بات کرنے دیں۔" پھر ممی علی کی طرف مڑیں۔

"لڑکے شادی کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟"

"جی جب آپ کر دیں۔ آپ کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔" اتنی سعادت مندی اور فرمانبرداری وہ اس لیے کر رہا تھا کیونکہ کل شام ہی اس پر انکشاف ہوا تھا کہ جس سے ممی ڈیڈی اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں، وہ وہی ہے جو پچھلے دو ڈھائی ماہ سے اس کے خوابوں میں چھم سے اتر آئی تھی۔

لیکن ممی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا علی۔" انھوں نے بے حد تشویش سے پوچھا۔

"جی طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ بھی ایک دم گڑبڑا گیا۔

"لیکن برخوردار تمھاری ممی اپنی پسند کی بہو لانے پر مُصر ہیں۔"

"ہاں میں مینی کو بہو بناؤں گی، یہ میرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے۔" انھوں نے اٹل لہجے میں کہا۔

علی نے فوراً خود کو "ممی دی گریٹ" کا نعرہ مارنے سے روکا ورنہ ممی کو یقیناً اس کی دماغی صحت پر شبہ ہو جاتا کہ کل تک تو مینی کے نام تک سے یہ اتنا الرجک تھا کہ میری جان کو آتا تھا۔ آج خوشی میں نعرہ لگا رہا ہے۔ بس یہی سوچ کر اس نے خود کو روکے رکھا۔

"ہاں تو علی بیٹے آپ کو یہ فیصلہ منظور ہے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"اس جنگلی بلّی سے؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھو میری ہونے والی بہو کو جنگلی بلّی کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔" ممی بولیں۔

"اچھا ممی اب تو ٹائم ہو رہا ہے، انہی باتوں میں آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے۔ میں تو بمشکل یونٹ پہنچ سکوں گا۔"

"میری بات کا جواب دے کر جاؤ۔" ممی نے پھر سخت لہجے میں کہا۔

"آپ نے کوئی سوال تو کیا نہیں، جب فیصلہ کرلیا ہے تو پھر مجھ سے کیا پوچھنا۔ چلیں ڈیڈی لیٹ ہو رہے ہیں ہم۔"

"بیٹا ناراض ہو کر تو نہیں کہہ رہے؟" ممی نے پوچھا۔

"ارے نہیں ممی۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ڈیڈی مالی کو پھولوں کے لیے ہدایات دے رہے تھے۔

"میں تو آپ کی بات مان لوں لیکن ہوسکتا ہے اس کی پسند کچھ اور ہو۔"

"لگتا تو نہیں ہے لیکن خیر تم بھی اس سے مل لو، میں بھی دیکھتی ہوں۔ بیٹا میری بڑی خواہش ہے اُسے بہو بنانے کی۔"

"تو آپ کو روکا کس نے ہے۔ بس مجھے جو خدشہ تھا وہ میں نے بتا دیا۔"

"اُف خدا خدا کر کے کام ختم ہو ہی گیا۔ ایک مصیبت ہے یہ بھی۔ صبح سے پڑھنا شروع کرو تو یہ وقت آجاتا ہے۔ بندہ نہ ڈھنگ سے سو سکتا ہے، نہ کھا پی سکتا ہے ٹینس کھیلنے کا وقت بھی گزر گیا اور اب باقی کا وقت کیسے گزرے گا۔" مینی خود سے ہی بولے جا رہی تھی۔ "امی ابو کو بھی آج ہی شاپنگ پر جانا تھا۔ تانیا بھی گھر پر نہیں ہے ورنہ اسی سے فون پر بات کرلیتی۔ کچھ وقت ہی گزر جاتا۔ وڈیو فلم بھی کوئی نہیں ہے اور ٹی وی پر تو صبح سے جو خبریں شروع ہوتی ہیں تو رات بارہ بجے تک چلتی رہتی ہیں۔ اب باقی وقت کا گزارنا بھی مسئلہ ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کام ختم نہ ہوتا، کم از کم وقت گزارنا اتنا مسئلہ تو نہ ہوتا۔"

اتنے میں باہر گھنٹی بجی۔

"اس وقت کون آگیا۔ رمضان دیکھنا باہر کون ہے۔ چلو مہمان ڈھنگ کے ہوئے تو کچھ وقت اچھا کٹ جائے گا۔"

"بی بی جی! وہ سامنے والے کپتان صاحب آئے ہیں۔ میں نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

"اچھا سامنے والے کیپٹن صاحب!" اس نے 'اچھا' کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ "وقت کا اس سے بہتر مصرف اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ کیپٹن صاحب کے اسکرو کس دیے جائیں۔" وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی۔

"آداب۔" اس نے اپنے لہجے میں چھپی ہوئی شرارت کو حتی الامکان چھپاتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیں۔"

"میں آج صبح دیکھنا بھول گیا تھا۔ تمھیں پتا ہے آج سورج کس سمت سے طلوع ہوا تھا؟"

"آج اچانک سورج کہاں سے یاد آگیا؟" اس نے ہموار لہجے میں پوچھا۔

"اس دن تو بالکل جنگلی بلّی لگ رہی تھیں سروسز کلب میں لیکن آج کافی سعادت مندی کا ثبوت دے رہی ہو۔"

"ہاں ابھی تو مجھے اپنی سعادت مندی کے بہت سے ثبوت دینے ہیں۔ صرف تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔" اس نے دل میں سوچا۔

"رمضان! صاحب کے لیے چائے لانا۔" اس نے اونچی آواز میں کہا۔ پھر علی سے مخاطب ہوئی۔ "آج یہاں آنے کا خیال کیسے آگیا؟"

"انکل آنٹی سے ملاقات کرنی تھی۔"

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"تو کوئی بات نہیں، تھوڑی دیر بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔ ویسے بھی اب تم نے چائے منگوا لی ہے خوامخواہ ضائع ہو جائے گی۔"

"جی درست کہا، چائے سنک میں پھینکنے سے تو بہتر ہے کہ تم پی لو۔"

تھوڑی دیر تک دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

"اوہو میں سگریٹ تو گھر ہی چھوڑ آیا۔" باتیں کرتے کرتے علی کو یاد آیا۔

"کوئی بات نہیں میں ابھی آتی ہوں ایک منٹ میں۔" تھوڑی دیر بعد مینی نمودار ہوئی تو اس کے ہاتھ میں گولڈ لیف کا پیکٹ تھا۔

"یہ لو۔" اس نے پیکٹ علی کی طرف بڑھایا۔

پیکٹ کا ایک کونہ تھوڑا سا پھٹا ہوا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے اس پیکٹ کا جو وہ پھیری پر بیٹھا پی رہا تھا۔

"کہاں گم ہو گئے؟" اس نے علی کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"آں کہیں نہیں، میں کچھ سوچ رہا تھا۔" اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا۔ دوسرا سگریٹ مینی نے نکالا۔ پھر بنسن اینڈ ہیجز کا لائٹر علی کی طرف بڑھایا۔ جب علی نے سگریٹ سلگا لیا تو مینی نے بھی بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگایا۔

"مائی گاڈ، یہ سموکنگ کرتی ہے۔" علی نے دل میں سوچا۔

"اُف تنگ کرنے کو سگریٹ نکال تو لیا ہے لیکن سُنا ہے کہ پہلی مرتبہ سموکنگ کرنے سے بہت کھانسی آتی ہے۔ خیر اب تو جو ہوگا سو ہوگا۔ بس اللہ میاں اس دفعہ معاف کر دینا اور عزت بھی رکھنا کھانسی نہ آئے۔ اس کے بعد پھر ایسا کیا تو جو مرضی چاہے سزا دے دینا۔ چاہے دوزخ میں پھینک دینا۔ بس ایک دفعہ پلیز۔" وہ دل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔

"تم سموکنگ کرتی ہو؟" آخر کار علی کی سوچ اس کے لبوں تک آ ہی گئی۔

"ہاں۔" اس نے بہت سہولت سے کہا۔

"کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب، بس دل چاہتا ہے تو کر لیتی ہوں۔ تم بھی تو کرتے ہو، کیوں کرتے ہو؟"

"میں"؛ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ "میری بات مختلف ہے اور تمھاری مختلف، پتا ہے طبی نکتہ نگاہ سے یہ کتنا خطرناک ہوتا ہے؟"

"میرے لیے ہوتا ہے تمھارے لیے نہیں ہوتا۔ واہ جی عجیب منطق ہے۔" وہ ساتھ ہی ساتھ دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کر رہی تھی کہ اسے اب تک کھانسی نہیں آئی۔

"آنٹی انکل کو پتا ہے؟"

"پتا نہیں، میں نے آج تک نہ چھپایا ہے نہ ہی بتایا ہے۔" گو کہ وہ اس سوال کے لیے تیار نہ تھی پھر بھی اس نے بے نیازی سے کندھے اُچکا کر کہا۔

"تم بالکل جنگلی ہو۔ پھینکو اسے۔"

"واہ واہ میں کیوں پھینکوں، اتنے مہنگے لیے تھے سگریٹ۔ پتا ہے ساڑھے سترہ روپے کا پیکٹ ہے اور میں نے دیے تھے پورے اٹھارہ روپے۔ پچاس پیسے بھی واپس نہیں کیے کہ ریزگاری نہیں ہے۔"

"کس نے واپس نہیں کیے؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"تھا ایک پینڈو سا دکاندار۔ دکاندار کیا تھا بس ایک پھیری تھی اس کی۔ شاید دیکھا ہو تم نے اُسے۔ وہ کالا سا ٹھنگنا سا، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے۔"

علی نے ایک گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ "کیا یہ مجھے بالواسطہ طور پر یہ بتانا چاہ رہی ہے کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔" وہ سوچ رہا تھا۔ "ایک تو اس کی شکل سے بالکل پتا نہیں چلتا کہ یہ سچ کہہ رہی ہے یا ایکٹنگ کر رہی ہے۔ ایسی معصومیت سے بات کرتی ہے کہ۔۔۔"

"یہ تم کدھر گم ہو جاتے ہو؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ شاید اس پھیری والے کو میں نے کہیں دیکھا ہوا ہے۔ کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے شادمان میں، لاہور کالج کے آس پاس کہیں دیکھا ہے۔"

"اچھا شاید وہاں بھی جاتا ہو یہ۔ میں نے تو اُسے راحت بیکری کے پاس دیکھا تھا۔ یہیں کینٹ میں۔" وہ انتہائی معصومیت سے بولی۔

"یہ تیر بھی نشانے پر نہیں لگا۔ شاید مجھے وہم ہوا ہے کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔"

"بہرحال اب آیندہ تم سموکنگ نہیں کروگی۔" اس نے لہجے میں سختی پیدا کی۔

"واہ ایسے رعب سے کہہ دیا کہ سموکنگ نہیں کروگی۔ میں نے کبھی کچھ کرنے سے تمھیں روکا ہے۔ جو چاہے جو مرضی کرو لیکن میں اپنی مرضی سے کوئی کام نہ کروں۔ میں تو ضرور کروں گی۔"

"تم واقعی جنگلی بلی ہو۔ میں نے کہہ دیا ہے تم آیندہ یہ حرکت نہیں کروگی۔"

"اور اگر میں نے کی تو تم کیا کر لوگے؟"

"میں۔ میں آنٹی انکل کو بھی بتا دوں گا اور وقاص کو بھی۔"

"خود کچھ نہ کر سکے تو چل پڑے شکایتیں لگانے لیکن میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ میں اسی صورت میں تمھارا کہا مانوں گی اگر تم بھی سموکنگ چھوڑ دو۔"

"اچھا یہ لو۔" اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"ٹھیک ہے پھر میں مان لیتی ہوں۔" اس نے بھی سگریٹ بجھا دیا۔

"اللہ کا بڑا شکر ہے کہ اس نے عزت رکھ لی۔" اس نے سوچا۔ "کتنا مشکل ہو رہا تھا مزید سموکنگ کرنا۔ پتا نہیں انھیں کیا مزہ ملتا ہے۔ کالا کالا دھواں اپنے اندر ڈالنے میں۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آنٹی انکل آئیں تو بتا دینا کہ میں آیا تھا۔ پرسوں مجھے سیالکوٹ جانا ہے۔ اگر وقاص کو کچھ بھجوانا ہو تو مجھے بتا دینا۔"

"سیالکوٹ جانا ہے تمھیں۔ مجھے کچھ چیزیں بھجوانی ہیں بھائی کو۔"

"ایسا کرو کل آ جانا ہماری طرف، ممی ڈیڈی سے بھی مل لینا اور چیزیں بھی دے دینا۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔"

اگلے دن مینی بڑا سا پیکٹ اٹھائے ہوئے علی رضا کے گھر میں داخل ہوئی۔ بیٹ مین نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اطلاع دینے اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم بے حد خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ وہ ابھی جائزہ لے ہی رہی تھی کہ آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"آداب۔" اس نے بہت ادب سے کہا۔

"جیتی رہو۔ بیٹھو۔"

"میں زیادہ دیر بیٹھوں گی نہیں، دراصل مجھے یہ علی کو دینا تھا۔ وہ کل سیالکوٹ جانے کو کہہ رہا تھا۔ یہ چیزیں مجھے وقاص بھائی کو بھجوانی تھیں۔"

"ارے ایسی کیا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آئی ہو۔ دو منٹ تو بیٹھو۔ بریگیڈیر صاحب سے تو مل لو۔" وہ بولیں۔ پھر انھوں نے اونچی آواز لگائی۔ "علی بیٹے، دیکھو تمھارے ڈیڈی کیا کر رہے ہیں۔ ان سے کہو مینی بیٹی آئی ہے۔"

اپنے کمرے میں وار اینڈ پیس پڑھتے ہوئے علی نے یہ آواز سنی تو ٹالسٹائی کو چھوڑ چھاڑ کر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈیڈی ممی کہہ رہی ہیں کہ مینی آئی ہے۔" اس نے ڈیڈی کی اسٹڈی میں آ کر بتایا۔

"بیٹے آپ لوگ بیٹھیں اس کے پاس، میں یہ چند فائلیں نمٹا کر آتا ہوں۔"

ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ کر علی کو خیال آیا کہ سگریٹ کا پیکٹ اس کی جیب سے جھانک رہا ہے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور پیکٹ اپنے کمرے میں چھوڑ کر واپس آیا۔

"مجھے یہ پیکٹ بھائی کو بھجوانا تھا۔" تھوڑی دیر کی رسمی بات چیت کے بعد مینی نے کہا۔

"اتنے بڑے پیکٹ میں بند کیا ہے؟"

"کچھ کپڑے ہیں بھائی کے۔ ایک سوٹ ڈرائی کلینر کو دیا ہوا تھا وہ ہے۔ کچھ نئے کپڑے ہیں جو وہ جاتے جاتے حسبِ معمول بھول گئے تھے۔ چار کتابیں ہیں اور اسی قسم کی کچھ اور چیزیں ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ویسے تم واپس کب آؤ گے وہاں سے؟"

"شاید ڈیڑھ ہفتے بعد۔"

"کوئی کورس ہے کیا؟"

"نہیں کورس تو نہیں ہے البتہ انٹیلی جنس۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"تم انٹیلی جنس میں ہو؟" اس نے ایسے پوچھا جیسے اسے علی کے انٹیلی جنس میں ہونے کی خبر ہی نہ ہو۔

"ہاں۔" علی نے مختصراً کہا۔

"تم لوگوں کے تو بہت مزے ہیں، نہ یونیفارم پہننا، نہ ہیرکٹ آرمی اسٹائل کا اور" وہ تھوڑا سا رکی "کورس تو بہت ہی مزے کے ہوتے ہیں۔"

"دُور سے ہر چیز مزے کی لگتی ہے۔ کرنے والے کو پتا لگتا ہے۔"

"خیر تمھیں کیا پتا چلتا ہوگا، تم تو بچپن سے لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے تھے، یہ اور بات ہے کہ بنا سکتے نہیں تھے۔"

"ایسا کون سا کورس ہے جس میں بقول تمھارے لوگوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے؟"

"وہی پھیریاں لگانے والا۔ لوگ سوچتے ہیں کہ وہ کسی جاہل اور گنوار پھیری والے سے سامان خرید رہے ہیں حالانکہ اصل میں جاہل اور گنوار دکھائی دینے والا کوئی آرمی آفیسر ہوتا ہے اور انتہائی کامیابی سے لوگوں کو بے وقوف بنا رہا ہوتا ہے۔"

"تم کبھی ایسے بے وقوف بنی ہو؟"

"میں؟" اس نے میں کو سوالیہ انداز میں کچھ زیادہ ہی طویل کر دیا۔ "میں نفسیات کی طالبہ ہوں اس طرح بے وقوف بننے والی نہیں ہوں۔ ویسے بھی میں پھیریوں سے چیزیں نہیں خریدتی۔ بس ایک مرتبہ ایک کالے سے ٹھنگنے سے پھیری والے سے کچھ چیزیں خریدی تھیں۔"

"کیا خریدا تھا۔؟"

"ایک پیکٹ لیا تھا سگریٹ کا۔ میرے پچاس پیسے بھی اس نے واپس نہیں کیے تھے۔ اس کے علاوہ تو جب بھی مجھے شاپنگ کرنی ہو میں فورٹریس سٹیڈیم (Fortress Stadium) ہی جاتی ہوں۔"

"کیا پتا وہ پھیری والا بھی۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ارے نہیں وہ تو شکل سے ہی اتنا احمق لگتا تھا اور ہنستا بھی تھا اتنے پینڈو طریقے سے، وہ تو کبھی آفیسر ہو ہی نہیں سکتا۔ ویسے بھی وہ اتنے چھوٹے قد کا تھا کہ اس کے آرمی میں جانے کا سوال ہی نہیں۔" مینی نے یہ کہتے ہوئے اپنی مسکراہٹ بہت مشکل سے قابو کی۔ اسے پھیری والے کے روپ میں علی یاد آیا۔ اتنی شاندار پرسنیلٹی رکھنے والے علی کو وہ انتہائی بے رحمی اور بیدردی سے کالا، ٹھنگنا، احمق اور پینڈو کہہ رہی تھی۔

اتنے میں بریگیڈیئر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں اور علی میں بہت مماثلت تھی۔ دونوں کی پرسنیلٹی زبردست تھی۔ بریگیڈیئر حسن تو بہت گریس فل تھے۔ ان کی خوبی تھی کہ ہر عمر کے شخص کو بہت اچھی کمپنی دیتے تھے، خواہ کوئی ان سے کم عمر ہو، ان کے برابر ہو، یا بہت بوڑھا، ان کی کمپنی سے بور نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیسی ہے میری بیٹی؟" انہوں نے یمنیٰ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں انکل۔"

"ابو، امی کیسے ہیں؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔"

انکل کے آنے کے بعد یمنیٰ علی کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر علی کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس دوران یمنیٰ اور انکل کے درمیان حالاتِ حاضرہ، شاعری اور آرٹ پر خوب بحث ہوئی۔ اسی اثنا میں علی پھر کمرے میں آگیا۔

"انکل، دہلی گول میز کانفرنس کے وقت آپ کی عمر کیا تھی؟" اس نے کن انکھیوں سے علی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایکدم انکل سے پوچھا۔

علی ایک لمحے کو ٹھٹھک کر وہیں رک گیا۔ پھر آرام سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"پہلی گول میز کانفرنس کا حال تو میں نے بھی تاریخ کی کتابوں میں ہی پڑھا ہے۔ البتہ جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی، اس وقت میں تین سال کا تھا۔"

"اچھا۔" یمنیٰ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یعنی ۱۹۲۴ء میں۔"

"تمہیں اچانک ڈیڈی کی تاریخ پیدائش سے کیا دلچسپی ہوگئی؟" علی نے پوچھا۔

اسے یمنیٰ سے اپنی پہلی گفتگو اچھی طرح یاد تھی جس میں اس نے بتایا تھا کہ اس کے چھوٹے سے والد پہلی گول میز کانفرنس سے ایک سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔

"نہیں اب یہ ایسا اچانک بھی نہیں ہے۔" وہ قدرے بے پروائی سے بولی۔ "میں ابّو سے تقسیم کے وقت حالات سنتی ہوں۔ ابو ان دنوں لوچھ کے ایک اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ میں نے سوچا شاید انکل کے پاس بھی کوئی کہانی ہو۔" یمنیٰ اچانک علی کو احساس دلاتی تھی کہ وہ اسے پہچان چکی ہے لیکن پھر بات کا زاویہ بالکل ہی تبدیل کر کے اسے احساس دلاتی تھی کہ یہ محض اتفاق تھا۔ وہ اسے بالکل نہیں پہچان سکی۔

"اتنی دیر ہوگئی ہے۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اب چلتی ہوں۔"

"ایسا کون سا دور جانا ہے، تھوڑی دیر ٹھہر جائیں۔" ممی بولیں۔

"آنٹی کچھ پڑھنا بھی تھا اس لیے جلدی ہے۔ پھر کبھی آجاؤں گی۔"

"کتنی نفاست سے پیکٹ کور کیا ہوا ہے۔" علی نے میز پر دھرے پیکٹ کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "کل مجھے چلے جانا ہے اور اتنے دن یمنیٰ سے دور رہنا ہے۔ یہاں کم از کم دن میں دو تین مرتبہ دکھائی تو دے جاتی ہے، کبھی کالج جاتے ہوئے، کبھی مالی کو ہدایات دیتے ہوئے اور کبھی انکل کے ساتھ ٹینس کھیلتے ہوئے۔ اب تک میری زندگی میں وصال اور فراق کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن یمنیٰ کے آجانے کے بعد۔ خیر فوجیوں کی زندگی تو ایسی ہی ہوتی ہے کیونکہ جو فرض ہمیں ادا کرنا ہے وہ محبت سے زیادہ اہم اور دلکش ہے۔ میں جلد ہی خود کو اس کا عادی بنا لوں گا۔"

اور یہ ٹھیک ہی تھا۔ فوجیوں کے دو دن گھر گزرتے ہیں تو دو مہینے کورس کرتے ہوئے یا ایکسرسائز ایریا (esercise Area) میں جنگی مشقیں کرتے ہوئے اور بعض اوقات تو ادائیگی فرض کا مقام اپنے گھر والوں سے ہزاروں میل دُور ہوتا ہے جہاں محبتوں کی نامہ بر صرف بادِ صبا ہوتی ہے۔ علی نے بھی اس زندگی کا انتخاب خوب سوچ سمجھ کر اور اپنی خواہش کے مطابق کیا تھا۔ اسے اپنے پیشے سے عشق تھا۔ وہ اب بھی یہی زندگی چاہتا تھا۔ بس یمنیٰ سے دوری اس کے لیے تکلیف دہ تھی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی خود کو اس کا عادی بنا لے گا۔

"آج تو بالکل جنگلی بلّی نہیں لگ رہی تھی وہ۔ حسین تو خیر وہ ہمیشہ سے ہی تھی لیکن آج باتیں بھی ڈھنگ سے کر رہی تھی۔ کم از کم کسی کو مرنے مارنے پر تلی ہوئی نہیں تھی۔ میرون رنگ اس پر کتنا سوٹ کر رہا تھا۔ ویسے اب تک میں سمجھ نہیں سکا کہ اس نے مجھے پہچانا ہے یا نہیں۔

وہ سب کچھ اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ لیکن پہلے سگریٹ کا وہ پیکٹ، پھر پھیری والے کا ذکر، پھر گول میز کانفرنس کا تذکرہ، یہ سب اتفاق تو ہونے سے رہا۔ اور اسے وہ ٹھگنا سا، کالا سا، احمق اور بینڈو پھیری والا تو یاد ہے جو اسے راحت بیکری کی طرف ملا تھا تو پھر اسے میں کیوں یاد نہیں؟ اور پھر اچانک اسے ڈیڈی کی تاریخ پیدائش یاد آگئی وہ بھی گول میز کانفرنس کے حوالے سے۔ خیر اس کی تو اس نے وجہ بھی بیان کر دی تھی۔ اور لول وہ ایسے رہی تھی جیسے اس کے کہنے کا مطلب واقعی وہی ہو جو وہ کہہ رہی تھی۔ اگر یہ ایکٹنگ تھی تو اس پر اسے آسکر ایوارڈ مل جانا چاہیے اور اگر واقعی اسے یاد نہیں تو اسے یاد کیوں نہیں؟"

ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس۔" اس کی سوچوں کے تانے بانے بکھر گئے۔

دروازے پر ممی تھیں۔

"آئیں بیٹھیں ممی، آپ کیوں آئیں، مجھے بتا دیتیں میں آجاتا۔"

"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی اس لیے خود ہی آگئی۔"

ممی کے انداز سے لگتا تھا کہ یمنیٰ کے متعلق بات کرنا چاہتی تھیں۔

"جی۔" وہ انتہائی سعادت مندی سے بولا۔

"یمنیٰ سے تم مل چکے ہو، کتنی پیاری بچی ہے، خوبصورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی۔ ایسی بہو تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔ میں نے جب اسے منگلا میں دیکھا تھا تو اسی وقت سوچ لیا تھا کہ میں اسے ہی اپنی بہو بناؤں گی۔ اس وقت میں نے اپنی خواہش کا اظہار اس لیے نہیں کیا تھا کیونکہ یہ باتیں قبل از وقت تھیں لیکن اب وقت آگیا ہے خاندان بھی دیکھا بھالا ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکیں اور معمول کے مطابق جذباتی تقریر کرنے لگیں۔ "اس زندگی کا کیا بھروسا، بس یہ خواہش ہے کہ تمہارے سہرے کے پھول کھلتے دیکھوں، اپنے پوتے پوتیوں کو کھلاؤں۔ باقی سب تو اللہ تعالیٰ نے بہت دیا ہے بس یہی خواہش رہ گئی ہے۔"

"ممی میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"دیکھو بیٹا میں زبردستی نہیں چاہتی، اس لیے میں نے تمہیں یمنیٰ سے ملنے کے لیے کہا تھا۔ اگر تمہیں وہ پسند آگئی ہے تب تو ٹھیک ہے۔" ممی نے کہا۔ "اصل میں تم نے پہلے کسی اور لڑکی کا تذکرہ کیا تھا جو کورس کے دوران تم نے دیکھی تھی، اگر چاہو تو میں اس سے بھی مل لوں۔"

"ارے نہیں ممی! اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ "ہے تو جنگلی بلی لیکن چل جائے گی۔"

"تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ تم صرف مجھے خوش کرنے کے لیے اپنی محبت قربان کر رہے ہو۔ شادی ساری زندگی کا معاملہ ہے، میں نے سوچا ہے کہ مجھے اس سلسلے میں زبردستی نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں تم چاہو، میں وہیں تمہاری شادی کر دوں گی۔ اگر یمنیٰ تمہیں جنگلی بلی لگتی ہے تو رہنے دو، وہاں نہیں کرتے جو تمہیں پسند ہے وہاں شادی کر دیتے ہیں۔"

"ارے ارے ممی۔" وہ بوکھلا گیا۔ "اب تو وہ بالکل جنگلی بلّی نہیں ہے، اب تو بہت اچھی ہوگئی ہے۔ آج بہت اچھی لگ رہی تھی، ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے، خوبصورت ہے، خوب سیرت ہے، سلیقہ شعار ہے، گھرداری کر لیتی ہے۔" اپنی بوکھلاہٹ میں اس نے یمنیٰ کی وہ سب تعریفیں تیزی سے کر ڈالیں جو ممی وقتاً فوقتاً اس کے سامنے کرتی رہتی تھیں۔

"خیر گھرداری تو اسے بالکل نہیں آتی۔" ممی نے علی کے بیان پر تبصرہ کیا۔ "برتن اور کپڑے اس لیے نہیں دھوتی کہ ناخن نہ ٹوٹ جائیں۔ کھانا بھی پکانا نہیں آتا۔ میں نے پوچھا کچن کا کیا کام آتا ہے تو بولی کہ آنٹی بس پانی ابال لیتی ہوں، وہ بھی انڈے کے بغیر۔ یعنی خیر سے انڈا ابالنا بھی نہیں آتا۔"

"تو ممی ہم نے کون سا اس سے برتن اور کپڑے دھلوانے ہیں یا انڈے ابلوانے ہیں۔ ان سب کاموں کے لیے تو نوکر اور دھوبی وغیرہ ہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ویسے بھی اس کے ہاتھ اتنے خوبصورت ہیں کہ یہ کام کر کے خراب ہو جائیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" ممی نے صوفے پر پہلو بدلا۔ "ویسے وہ اتنی سلیقہ شعار بھی نہیں۔ ابھی چند دن پہلے میں اس کی طرف گئی تو اسٹڈی (study) میں پڑھنے کے بجائے ڈرائنگ روم میں کتابیں بکھیرے پڑھ رہی تھی۔ اب اچانک کوئی مہمان آجائے تو اچھا معلوم ہوگا کیا؟"

"ممی میں اس سے کہہ دوں گا کہ آئندہ وہ صرف اسٹڈی میں پڑھے۔ میری بات مان جائے گی وہ۔" اس نے فوراً ہی مسئلے کا حل پیش کر دیا۔

"ویسے کہتے تم ٹھیک ہو کہ بالکل جنگلی بلّی ہے وہ۔ کل ڈانٹ رہی تھی مالی کو سب پودوں کا ستیاناس کر دیا ہے اس نے اور گھاس دیکھ کر لگتا ہے جیسے افریقہ کے جنگلوں میں گھس گئے ہوں۔ وہ بیچارا کہتا رہا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ابھی ٹھیک کر دیتا ہوں لیکن وہ ایک نہیں مانی اور خود ہی مشین چلانے لگی۔ آخر نوکر بھی انسان ہوتے ہیں ایسے تھوڑا ہی ڈانٹا جاتا ہے میرے خیال میں تو وہ ایسی کوئی خوب سیرت بھی نہیں۔"

"ارے نہیں ممی ایسا تو نہیں ہے۔ دیکھیں مالی نے کام چوری دکھائی تو اس نے خود اپنے ہاتھ سے تمام لان ٹھیک کر ڈالا۔ یہ تو اچھی بات ہے ناں۔" اس نے جلدی سے یمنیٰ کی صفائی پیش کی۔

"خیر اسے تو چھوڑو۔ میرا خیال ہے کہ دلہن بنی وہ کوئی ایسی خوبصورت تو نہیں لگے گی۔"

"وہ کیوں؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے اس کی ناک ٹیڑھی ہے اور آنکھیں تو اس کی ایسی ہیں جیسے کبھی بھی نیند پوری نہ ہوئی ہو۔"

"اس کی آنکھیں۔" علی نے تصور میں یمنیٰ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کی خوابیدہ آنکھوں کو دیکھ کر تو فیض کا مصرع پڑھنے کو دل چاہتا ہے، اگر میں شاعر ہوتا تو۔" وہ بات کرتے کرتے ایک دم رُک گیا اور پھر جلدی سے بولا۔ "ممی آپ نے اسے عینک کے بغیر دیکھا ہوگا اس لیے اس کی ناک آپ کو ٹیڑھی لگی ہوگی، وہ تو بہت خوبصورت ہے، خاص طور پر اس کی یاقوت والی لونگ تو اسے بہت سوٹ کرتی ہے۔ آپ نے شاید کبھی غور سے نہیں دیکھا۔"

"تم نے اسے غور سے دیکھا؟" ممی نے اسے گھورا۔

"نہیں اتنے غور سے تو نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"تم نے کورس کے دوران پھیری کہاں لگائی تھی؟"

"جی شادمان میں۔"

"لاہور کالج کی طرف؟"

"جی ہاں، اس کے سامنے، اندر کی طرف جو اسٹریٹ جاتی ہے ناں وہاں۔"

"اور یمنیٰ کی خالہ کہاں رہتی ہیں؟"

"جی وہ بھی وہاں ہی رہتی ہیں۔" علی نے ایسے کہا جیسے کسی بہت بڑے جرم کا اعتراف کر رہا ہو۔ ممی ایکدم مُسکرا دیں۔

"خیر میں یمنیٰ کی امی سے بات کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

"کیا کہتا ہے وہ؟" ڈیڈی نے ممی سے پوچھا۔

"کہنا کیا ہے، ظاہر ہے مان گیا ہے۔ وہ شروع سے یمنیٰ کو ہی پسند کرتا تھا، پھر اسے اعتراض کیا ہونا تھا؟"

"یمنیٰ ہی تھی میں سمجھا نہیں؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ اس معاملے میں علی آخر اتنی سعادت مندی کیوں دکھا رہا ہے اگر اس کے مزاج کے خلاف اس کی شادی کی بات چلتی تو اس نے اپنی اور میری جان ایک کر دینی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ جب اس نے پھیری لگائی ہوئی تھی اس وقت اسے ایک لڑکی پسند آ گئی تھی اور علی نے کہہ دیا تھا شادی ہو گی تو صرف اس سے، ورنہ کسی سے بھی نہیں اور آپ کو تو اس کی ضد کا پتا ہی ہے۔ بعد میں یمنیٰ کے ذکر پر وہ ایک دم سے مان گیا۔ میں سمجھ گئی کہ اتفاق سے علی کو بھی یمنیٰ ہی پسند آئی ہے۔ جن دنوں علی کا کورس تھا، ان دنوں یمنیٰ شادمان میں اپنی خالہ کے گھر رہ رہی تھی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" ڈیڈی بولے۔ "لیکن وہ تو ابھی بھی اسے جنگلی بلی کہتا ہے۔"

"صرف بن رہا تھا۔ اب نہیں کہے گا ایسے۔" پھر ممی نے اپنے اور علی کے درمیان ہونے والی گفتگو ہنستے ہوئے ڈیڈی کو سنا دی۔ ڈیڈی بھی یہ سب سُن کر بہت ہنسے۔ پھر طے یہ ہوا کہ پہلے ممی، یمنیٰ کی امی سے سرسری تذکرہ کریں گی، اگر ان کا جواب حوصلہ افزا ہوا تو پھر باقاعدہ بات چلائی جائے گی۔

اس دن یمنیٰ کلب سے ٹینس کھیل کر گھر لوٹی تو ڈرائنگ روم میں اپنا نام سُن کر ٹھٹھک کر رُک گئی۔

"تو ابھی ایک سال رہتا ہے یمنیٰ کے بی۔ اے کرنے میں؟" یہ آواز آنٹی حسن کی تھی۔

"جی لیکن وقت کا پتا ہی نہیں لگتا جیسے پر لگ گئے ہوں۔ ابھی لگتا ہے کل کی بات ہے جب یہ ہر طرف سے بے خبر کرکٹ اور فٹ بال کھیلتی رہتی تھی اور آج میں دیکھتی ہوں کہ ماشاءاللہ اتنی بڑی ہو گئی ہے، اللہ زندگی دے اسے۔"

"مجھے تو اس وقت بھی یمنیٰ بہت پسند تھی اور آج بھی بہت اچھی لگتی ہے۔" آنٹی حسن آہستہ آہستہ مطلب کی بات پر آ رہی تھیں۔ "اور سچ پوچھیں تو بیٹیاں ہی گھر کی اصل رونق ہوتی ہیں۔ میری بہت خواہش تھی بیٹی کی۔ بس پتا نہیں کیا مصلحت تھی کہ اتنے عرصے تک اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے محروم رکھا۔ اب تو بس یہی حسرت ہے کہ بہو لے آؤں۔ وہ بھی تو اپنی بیٹی کی طرح ہی ہوتی ہے۔"

"تو اب دیر کیا ہے۔ ماشاءاللہ علی برسرِ روزگار ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ علی کے لیے پڑھی لکھی اور خوب سیرت دلہن لاؤں۔ اس کا بیک گراؤنڈ بھی آرمی کا ہو۔"

"ادھر اردگرد کی (حلقہ احباب) میں کافی بچیاں ہیں۔ دیکھیں کوئی نہ کوئی آپ کو پسند آ ہی جائے گی۔"

"دیکھی ہیں کافی بچیاں میں نے۔ بہت اچھی ہیں وہ بھی لیکن میری نگاہ میں بہت پہلے سے ایک لڑکی ہے۔"

"تو پھر دیر کاہے کی ہے۔" امی نے کہا۔ "آپ کے لیے اور چائے ڈالوں؟"

"نہیں بھابھی، اس کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے کپ پرے کیا۔ "بھابھی آپ نے یمنیٰ کی بات کہیں طے تو نہیں کی؟"

یمنیٰ جو باہر کھڑی بڑے مزے سے ان کی باتیں سن رہی تھی اور نئی صورتِ حال کے مطابق علی کو تنگ کرنے کے منصوبے ترتیب دے رہی تھی، اچھل ہی پڑی۔

"نہیں، رشتے تو کافی آئے ہوئے ہیں لیکن ابھی کچھ طے نہیں کیا۔" امی بولیں۔ "ہم چاہتے ہیں کہ بیٹی کسی دیکھے بھالے گھر میں دیں جو اس کی قدر بھی کر سکیں۔ ہماری ایک ہی تو بیٹی ہے۔ یمنیٰ کے ابو کا خیال ہے کہ کسی آرمی فیملی میں ہی بیٹی دیں۔ بس لڑکا شریف ہو، ساس، سسر محبت دیں اور کیا چاہیے۔"

"مجھے یمنیٰ کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے جیسے اپنی بیٹی کو دیکھ رہی ہوں۔"

"آپ اپنی ہی بیٹی سمجھیں اسے۔"

یمنیٰ یہ سب سنتے ہی وہاں سے کھسک گئی اور کمرے میں صوفے پر گر کے لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ واقعی اس نے یہی باتیں سنی ہیں یا اس کے کان بج رہے ہیں۔ ایسے میں اسے تانیا کا خیال آیا وہی تھی جس سے کچھ کہہ سُن کے یمنیٰ جی ہلکا کر سکتی تھی۔ اس نے تانیا کو فون کیا۔

"فوراً یہاں پہنچو۔" اس نے چھوٹتے ہی تانیا سے کہا۔

"کیا بات ہے اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں ہو؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"مت پوچھو کہ کیا بات ہے، میرے خلاف چھپ کر اتنی بڑی سازش ہو رہی تھی۔ بس تم فوراً پہنچو۔"

"سنو یمنیٰ نعمان سے میری لڑائی ہو گئی ہے اس لیے میں اسے لے جانے کا نہیں کہہ سکتی۔"

"بس مجھے کچھ نہیں پتا تمہیں آنا ہوگا۔ ایسا کرو میں تمہارے لیے کار بھیج دیتی ہوں، تم آ جاؤ۔"

"کار بھیجنے سے بہتر یہ نہیں ہوگا کہ تم خود یہاں آ جاؤ، یہیں بات کر لیں گے۔"

"اُف تمہیں تو میری بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی۔" یمنیٰ پریشانی سے بولی۔ "خود سوچو میرے خلاف ہونے والی سازش کے تانے بانے ادھر بُنے جا رہے ہیں، ایسے وقت میں، میں گھر سے باہر کیسے جا سکتی ہوں۔ اس وقت تو امی اور ابو کی کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔"

"اچھا گھبراؤ نہیں تم کار بھجواؤ میں آ رہی ہوں۔"

"کچھ کپڑے بھی ساتھ لے آؤ اور یونیفارم بھی تمہیں سازش کے بے نقاب ہونے تک یہیں رہنا ہوگا۔"

"لگتا ہے بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے تمہیں میں فوراً پہنچ رہی ہوں، کار بھجواؤ۔"

یمنیٰ فون کریڈل پر پٹخ کر ابو کے کمرے کی طرف بھاگی۔

"ابو ڈرائیور کو بلوائیں۔"

"خیریت ہے ناں۔" ابو اس کی اُڑی ہوئی رنگت دیکھ کر گھبرا گئے۔

"جی خیریت ہے۔ تانیا کو یہاں آنا ہے اس کے لیے گاڑی بھجوانی تھی۔" اس نے اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کی۔

"آج اس وقت تو ڈرائیور ملنا بہت مشکل ہے۔ آپ خود چلی جائیں ناں تانیا کی طرف۔"

"اُف ایک تو میری بات کسی کو سمجھ ہی نہیں آتی ابو جان مجھے وہاں نہیں جانا، تانیا کو یہاں آنا ہے اور نعمان سے اس کی لڑائی ہو گئی ہے۔ بس مجھے نہیں پتا آپ کہیں

سے ڈرائیور اریج کریں۔" وہ ضدی بچے جیسے بولی۔

"ارے میری بیٹی تو ناراض ہونے لگی۔ میں بریگیڈیئر حسن سے پتا کرتا ہوں، ان کا ڈرائیور ہو تو اسے بھجوا دیتے ہیں۔ اب تو خوش ہو ناں۔"

"جی بہت خوش ہوں۔" وہ بولی۔ ظاہر ہے وہ خوش کیوں نہ ہوتی۔ اپنی دانست میں یہ بھی اس کی کامیابی تھی کہ وہ اپنے خلاف سازش کرنے والوں کے خرچ پر ہی اپنی ساتھی کو بلوا رہی تھی۔ بریگیڈیئر حسن نے فوراً اپنا ڈرائیور بھیجا تھا اور اب عینی لان میں کھڑی بہت بے چینی سے تانیا کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے ہی کار گیٹ میں داخل ہوئی عینی لپک کر آگے بڑھی۔

"چلو تانیا میرے کمرے میں۔"

"معاملہ سنگین نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔ نہ سلام، نہ دعا۔ خیر چلو اندر۔" وہ اندر کی جانب بڑھی "خالہ اور خالو کہاں ہیں؟"

"ابو جان یہیں کہیں ہوں گے اور امی جان تو آنٹی حسن کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کا ایسا جال بُن رہی ہیں کہ مجھ ایک مرتبہ میں پھنس گئی تو پھر ساری زندگی اسی میں پھنسی رہوں گی۔"

"خالہ جان سازش کر رہی ہیں تمہارے خلاف؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا۔"

"بس کر لو۔ اب یقین۔" وہ دھم سے صوفے پر بیٹھی "اصل میں میری امی جان تو ٹھہریں سدا کی معصوم۔ ذرا آنٹی نے چکنی چپڑی باتیں کیں — اور امی اطمینان سے اُتر گئیں شیشے میں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصل سازش آنٹی کر رہی ہیں۔ اب کیا ہوگا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" تانیا پر گھبراہٹ سوار تھی۔ "او ہو تم نے ابھی تک یہ تو بتایا نہیں کہ سازش کیا ہے؟"

"آنٹی علی کا رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں۔"

"کیا؟" تانیا چیخی۔

"جی ہاں، اور ذرا دیکھو، رشتہ ایسے ڈھونڈ رہی ہیں جیسے ساری ذمہ داری ان کی ہو۔ مجھے تو پکا یقین ہے کہ ان سے پہلے خود علی اپنے لیے رشتہ ڈھونڈ کر بات پکی بھی کر چکا ہوگا۔"

"اف ایسا بھی کر سکتا ہے وہ۔ نہیں شکل سے تو بالکل ایسا نہیں لگتا۔"

"بس شکل پر ہی تو امی بھی مار کھا گئیں۔ آنٹی سے کہنے لگیں کہ ماشاء اللہ علی اتنا اچھا ہے برسر روزگار ہے۔ پھر دیر کس بات کی۔" وہ بولی "لیکن مجھے پتا ہے ناں کہ وہ کس قسم کا ہے۔ میں اپنے ان اٹھارہ روپوں کا زخم تو کبھی بھول ہی نہیں سکتی۔"

"کدھر پہنچ گئی ہو تم، مجھے سازش بتاؤ جو تمہارے خلاف ہو رہی تھی۔"

"اب بھی نہیں سمجھیں تم۔ بھلا مجھے کیا غم ہونا تھا اس بات کا کہ آنٹی علی کا رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں، میری بلا سے کسی کی بھی قسمت پھوڑ دیں اس کے ساتھ۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ آنٹی علی کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔"

"کیا؟" تانیا صرف اسی قدر کہہ سکی۔

"جی تو اور کیا۔ کسی اور کے ساتھ کر دیتیں تو میں بیچاری لڑکی کی قسمت پر فاتحہ پڑھ کے اپنے میں مگن ہو جاتی۔ اب تو میری بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟"

"تم سے بڑا پاگل میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" اب تک تانیا اس شاک سے سنبھل چکی تھی۔ "کیا خرابی ہے علی میں کہ تم اس سے شادی نہیں کر سکتیں اتنا تو اچھا اور ہینڈسم ہے۔"

"آہ بروٹس تم بھی۔" عینی نے بے یقینی سے تانیا کی طرف دیکھا۔ "یعنی تم بھی ان کی حمایت کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں اپنی مدد کے لیے بلایا تھا اور تم۔ خیر ویسے مجھے کسی مدد کی ضرورت تو نہیں، ان سب کے لیے تو میں اکیلی ہی کافی ہوں۔ لیکن مجھے تم سے کم از کم اس کی توقع نہیں تھی۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔"

"کیا؟"

"علی میں خرابی کیا ہے؟ اگر تم ایک بھی وجہ بتا دو تو میں تمہارے ساتھ ہر قسم کا تعاون کروں گی۔"

"خرابی؟ کوئی ایک خرابی ہے اس میں؟ اس نے مجھے پھیری والا بن کر دھوکا دیا۔ مجھے اتنی مہنگی چوڑیاں دیں اور پھر وعدے کے باوجود اپنے میلے کپڑے نہیں دھوئے بلکہ ان پیسوں کے سگریٹ اُڑائے۔ بعد میں مجھے تیس روپے کا مقروض کرنے کا منصوبہ بنایا۔ شکر ہے میں نے اب تک وہ چوڑیاں پہنی نہیں ہیں۔ اس کی فرد جرم اتنی طویل

ہے کہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ اس میں کوئی اچھائی بھی ہے؟"

"اچھائی؟ سوچنا پڑے گا۔" پھر وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بولی "ایک بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی ذاتی خصوصیات میں سے ایک بھی نہیں۔ باقی رہ گیا کہ وہ بالکل ملز اینڈ بون کے ہیروز کی طرح ہے۔ لمبا قد اور بے حد ہینڈسم۔ تو ظاہر ہے یہ اس کی اپنی خصوصیات نہیں ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ نے دے دی ہیں اسے کسی اور کو بھی دی ہوں گی۔"

"شادی تو تمہیں کرنی ہی ہے پھر علی سے کر لینے میں کیا حرج ہے اور سچی بے اتنا اچھا سا تو ہے وہ بیچارا۔ پتا نہیں کس وقت غلطی سے اس نے وہاں پھیری لگا لی تھی اور اس پر بھی ستم یہ کہ تم اس راستے سے گزریں، خواہ مخواہ بیچارے کی شامت آ گئی۔"

"ابھی آئی کہاں ہے شامت، ابھی تو آنی ہے۔ تم میرا ساتھ نہیں دے سکتیں تو بیشک نہ دو میں خود ہی منصوبہ بناؤں گی اور خود ہی اس پر عمل بھی کروں گی۔"

"اچھا علی تمہیں پسند نہیں تو اور پرپوزل بھی تو ہیں، ان میں سے تو کوئی پسند ہوگا ناں۔"

"نہیں سب ہی ایویں ہی ہیں۔ ایک بھی مجھے پسند نہیں ہے ان میں سے۔"

"تو پھر بیٹھی رہو یونہی، مت کرو شادی اور یہ بھی سن لو کہ میں تم سے کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گی بلکہ اگر مجھے ذرا بھی شک ہوا کہ تم علی کے خلاف کوئی سازش کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہو تو میں خالہ جان اور خالو جان سے سب کچھ کہہ دوں گی۔"

"تمہاری یہ گیدڑ بھبکیاں مجھے نہیں ڈرا سکتیں۔" وہ چڑ کر بولی "کروں گی تو میں وہی جو میرا دل کہے گا۔"

* * *

"آج مسز حسن آئی تھیں۔" امی نے قہوے کی پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے ابو کو بتایا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے رات کے کھانے سے فارغ ہوئے تھے، کھانا کھانے کے بعد تانیا اور عینی چہل قدمی کرنے کے لیے لان میں چلی آئی تھیں اور امی اور ابو ڈرائنگ روم میں قہوہ پینے لگے تھے۔

"ان کا ارادہ جلد ہی علی کی شادی کر دینے کا ہے۔" امی نے مزید کہا۔

"اچھا ہے ان کے گھر میں بہو آ جائے، رونق ہو جائے گی۔"

"ہاں ایک ہی تو بیٹا ہے ان کا، وہ بھی سدا بورڈنگ ہاؤس میں ہی رہا۔ بیٹی کی خواہش تھی، وہ تو پوری نہیں ہوئی اب بہو لا کر سب ارمان پورے کرنا چاہتی ہیں۔"

"کب کر رہی ہیں شادی؟"

"یہی میں نے بتانا تھا۔ آج بھابی نے سرسری انداز میں عینی کے لیے بات کی ہے۔"

"عینی کے لیے؟ کیا کہہ رہی تھیں؟" ابو کی دلچسپی اب مزید بڑھ گئی۔ امی نے انہیں تمام بات بتا دی۔

"اچھا۔" ابو پُرخیال انداز میں بولے "گھرانہ تو ان کا بہت اچھا ہے لیکن سب سے زیادہ اہم بات عینی کی مرضی ہے۔ ظاہر ہے اس کی شادی وہیں ہوگی جہاں وہ چاہے گی۔"

"اس لڑکی کی مرضی تو بس ٹینس کورٹ میں کودکڑے لگانے کی ہے۔ ہر وقت نان سیریس رہتی ہے اور یہ ڈھیل اسے آپ نے دے رکھی ہے۔ اب مجھے یقین ہے کہ اسے علی میں بھی کوئی نہ کوئی خرابی ضرور دکھائی دے گی۔"

"اس لیے میں کہہ رہی تھی کہ امی اور ابو کی کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔" کھڑکی کے پاس کھڑی عینی نے تانیا سے سرگوشی کی۔ "اب تو امی بھی اس سازش میں برابر کی شریک ہیں۔ اُف میں کیا کروں، سب مجھنے

عمران ڈائجسٹ کی مقبول کہانی
مہارانی
اب کتابی شکل میں مکمل ۳ حصے
فی حصہ ۲۰ روپے، مکمل ۶۰ روپے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، ۳۷ اردو بازار کراچی

ہیں کہ میں نان سیریس ہوں۔ انھیں کیا پتا کہ اس معاملے میں کتنی سنجیدہ ہوں لیکن یہاں میری بات سمجھتا ہی کون ہے۔"

"چپ کرو، خالہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" تانیا نے اسے آہستگی سے ڈانٹا۔

"خیر آخری فیصلہ تو میرا ہی ہوگا نا۔"

"ابھی تو انھوں نے سرسری بات کی ہے، جب تفصیل سے کریں گے تب دیکھا جائے گا۔" ابّو نے کہا۔

"بھابھی کو جلدی ہے شادی کی، وہ دیر نہیں کریں گی۔ تفصیلی بات کرنے میں اتنے عرصے میں آپ مزید دیکھ بھال کرلیں۔"

"جلدی انھیں ہے ہمیں تو نہیں اور پرپوزل بھی ہیں انھیں بھی دیکھنا ہوگا۔"

"اچھے ہیں باقی لڑکے بھی لیکن میرا ووٹ تو علی کے لیے ہی ہوگا۔ اس کی تو بات ہی اور ہے۔"

"ابھی تو وقاص سے بھی ڈسکس کرنا ہوگا۔"

"وقاص اور علی اتنے گہرے دوست ہیں۔ میرا خیال ہے وہ بھی علی کو ہی ووٹ دے گا۔"

"اور میں سب کے ووٹوں کو ویٹو کردوں گی۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "چلو تانیا چلیں، اب تو مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا۔ امّی میرے گرد جال تنگ سے تنگ کرتی جارہی ہیں۔"

"یمنیٰ میری اچھی بہن ہو نا۔" تانیا نے کمرے میں آکر بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہوں تو۔"

"دیکھو میں جانتی ہوں کہ تمھیں فی الحال کوئی لڑکا پسند نہیں۔ اگر تو تمھیں پسند ہوتا، تب کی بات مختلف تھی۔ جب کوئی خاص شخص پسند نہیں تب پھر امّی ابّو کی پسند سے شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟"

"اچھا تو اس لیے تم مجھے بہن کا رشتہ یاد دلا رہی تھیں۔" اس نے تانیا کو گھورا۔

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ بہن تو تم ہو ہی میری۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ میری بات پر غور کرو۔"

"غور کروں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو۔"

"اور علی اتنا بُرا بھی نہیں۔" تانیا نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور چوٹ لگائی۔

"ہاں یہ بھی ہے لیکن میں یہ کیسے بھولوں کہ اس نے میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا تھا۔"

"ایک تو میں اس دھوکے سے بہت تنگ آگئی ہوں۔" تانیا نے سر پکڑ لیا۔

"پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" یمنیٰ نے بھی تنگ آکر کہا۔

"شادی کرلو علی سے۔"

"وہ تو میں کرلوں لیکن خود سوچو کہ اس کے سکرو کسے بغیر میرا اس کے ساتھ گزارا کیسے ہوگا؟"

"بعد میں سب کے سکرو کسے جاتے ہیں۔"

"نہیں ایسے نہیں، اس نے پورا ایک ہفتہ میرا جینا حرام کیے رکھا تھا۔ تھوڑا سا تنگ کرنے کا تو میرا بھی حق بنتا ہے۔"

"اچھا تو پھر تھوڑا سا تنگ کرنے میں میں تمھارا تھوڑا سا ساتھ دے دوں گی، زیادہ نہیں۔"

فون کی گھنٹی زوروشور سے بجی۔ اپنے کمرے میں ٹیسٹ کی تیاری کرتی یمنیٰ ایک دم سے فون ریسیو کرنے کے لیے ڈرائنگ روم کے ساتھ والی گیلری کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ اردگرد کی تمام چیزیں نیست ونابود کرکے جب وہ فون تک پہنچی تو وہ تیسری گھنٹی بجانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔ پھر وہ ابّو سے مخاطب ہوئی جو فون سننے کے لیے ڈرائنگ روم سے نکلے تھے۔ "ابّو جان میرا فون ہے۔"

"تو بیٹا آرام سے آکر فون سن لیتیں۔ اتنی طوفانی رفتار سے آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"سوری ابّو!" اس نے کہا پھر فون کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ابّو ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ دروازے کے بالکل ساتھ والے صوفے پر علی بیٹھا ہوا تھا اور یمنیٰ کی نگاہوں سے علی کے علاوہ ڈرائنگ روم کے سب افراد اوجھل تھے۔

"ہاں میں بھی تمھارے بغیر بہت بور ہو رہی ہوں۔" علی کے کان میں یمنیٰ کی آواز پڑی۔ "نہیں اس وقت کلب آنا بہت مشکل ہے۔ ریس کورس کے باہر سے؟ پھر ڈنر بھی ہوگا تمھاری طرف سے۔ او کے میں ابھی دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں لیکن پہلے طے کرلو کہ ڈنر کہاں دوگے، بعد میں مکر گئے تو مجھے بھوکے ہی گھر آنا پڑے گا۔ نہیں نہیں وہاں نہیں، طباق میں چلیں گے۔ انتظار کرو۔ میں آرہی ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا اور فون بند کردیا۔

"امّی جی میں باہر جا رہی ہوں۔ ڈنر باہر ہی کروں گی خدا حافظ۔" کہہ کر وہ آندھی اور طوفان کی رفتار سے گیراج کی طرف گئی اور گاڑی نکال کر ریس کورس پارک سے نعمان کو لینے چل دی۔

"بڑے صحیح وقت پر فون کیا نعمان نے۔ انتظار تھا تانیا کے فون کا اور آگیا نعمان کا۔ اچھا ہی ہوا ایکٹنگ نہیں کرنی پڑی۔"

"ہاں تمھاری فوٹوگراف اس وقت میرے سامنے ہے۔ بس ذرا اُلٹا کر رکھی ہوئی ہے۔" یمنیٰ نے فون پر تانیا سے کہا۔ ابھی اس کے اور تانیا کے درمیان رسمی بات چیت اختتام پذیر ہوئی ہی تھی جب علی ان کے گھر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں وہ کتابیں تھیں جو یمنیٰ کے ابّو نے اس سے پڑھنے کے لیے منگوائی تھیں۔ یمنیٰ نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ اس کی پوری توجہ فون پر مرتکز تھی۔

"اُلٹا کر کیوں رکھی ہے؟" تانیا نے پوچھا۔

"اُلٹا کر کیوں رکھی ہے؟" اس نے دہرایا۔ "اس لیے کہ یہ تو میرے دل پر نقش ہے۔ سیدھا یا الٹا رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ایسے ڈائیلاگ تم نے اس سے پہلے تو کبھی نہیں بولے کس کا افسانہ پڑھ لیا ہے؟"

"پہلے ضرورت نہیں پڑی تھی نا۔ ویسے اپنے دل کی آواز تم تک پہنچانے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں مجھے۔"

"تم ضرورتاً ڈائیلاگ بول رہی ہو؟"

"ہاں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ساتھ کہیں علی موجود ہے۔"

"بالکل درست کہا۔"

"ویسے شرم کرو تھوڑی سی۔"

"میں تمھاری ہر بات مان سکتی ہوں بلا جھجک لیکن یہ ماننا تھوڑا سا مسئلہ ہے۔ خیر کوشش کرلینے میں کیا حرج ہے۔ اچھا اب میں تھوڑا ڈراما کرنے لگی ہوں۔" آخری بات یمنیٰ نے بہت آہستگی سے کہی اور ساتھ ہی کرسی کی پشت سے ٹیک لگانے کو پیچھے کی جانب ہوئی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نگاہ ساتھ کے صوفے پر بیٹھے ہوئے علی پر پڑی۔

"ارے تم کب آئے؟" اس نے اپنے اوپر گھبراہٹ طاری کرنے کی بہترین کوشش کی۔ اور ساتھ ہی ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

"کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی — ویسے آئی ایم سوری کہ تم میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئیں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اوہ نو، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے بدستور گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔ "میں ابّو جان کو بھیجتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔

"نہیں ابھی نہیں، وہ ٹھیک پچپن منٹ بعد اپنے لان میں نکلے گا۔ اس وقت آکر ایک زوردار ہارن بجانا۔ میں جلدی سے آکر کار میں بیٹھ جاؤں گی۔"

"اس پر تمھاری اِن اسکیموں کا کچھ اثر بھی ہوا یا نہیں۔" نعمان نے پوچھا۔

"ہوا تو ہوگا۔" یمنیٰ پُرخیال انداز میں بولی۔ "کل سوری کر رہا تھا کہ اس کے آنے کی وجہ سے میں ٹھیک سے فون نہیں سن سکی۔"

"اس کے انداز سے کچھ محسوس ہوا؟"

"نہیں، کہہ تو بہت اطمینان سے رہا تھا لیکن یقیناً اس کا موڈ آف ہوا ہوگا۔"

"خیر میں آرہا ہوں، خدا حافظ۔"

خدا حافظ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

تیار تو وہ پہلے سے تھی۔

شاکنگ پنک شلوار قمیص اور میچنگ جیولری کے ساتھ —— اور اسی طرح کے میک اَپ میں وہ بے انتہا خوب صورت لگ رہی تھی۔ وقتِ مقررہ پر ہارن کی آواز سُن

کر وہ اپنے شولڈر کٹ بالوں میں برش پھیرتی، آندھی طوفان کی رفتار سے باہر نکلی۔ سامنے اپنے گھر کے لان میں علی گیٹ کے قریب لگے ٹیوب روز کے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔

"ہیلو ڈیر کیسے ہو؟" وہ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

"فائن۔" وہ بولا۔ "کہاں چلیں؟"

"جہاں تمھاری مرضی۔" وہ ادا سے بولی۔

اس کی بات کے اختتام کے ساتھ ہی نعمان نے تیزی سے کار آگے بڑھا دی۔

"یمنیٰ۔" اس کے کمرے میں داخل ہو کر بات شروع کرنے سے قبل امّی نے تمہید کے طور پر اس کا نام لیا۔ اس وقت یمنیٰ اور تانیا اپنے اردگرد کتابیں ڈھیر کیے بیٹھی کسی اخباری خبر کو زور شور سے ڈسکس کر رہی تھیں۔

"جی امّی جان۔"

"یہ کتابیں سمیٹو اور میری بات سُنو۔"

"مجھے کسی سازش کی بُو آرہی ہے۔" اس نے فضا کو سونگھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے میں تمھارے خلاف سازش کروں گی۔" امّی نے اسے گھورا۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے لیکن بات خاص ضرور ہے ورنہ آپ کا انداز اتنا مشکوک نہ ہوتا۔"

"اچھا اچھا اب زیادہ باتیں نہ کرو، میں واقعی تم سے خاص بات کرنے آئی ہوں۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" وہ واقعی فرمانبردار دکھائی دینے کی کوشش کرنے لگی۔

"تمھارے لیے بہت سے پروپوزل آئے ہوئے ہیں۔ تمھارے ابّو چاہتے ہیں کہ تم ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو۔ ویسے بھی تم سب کو ذاتی طور پر جانتی ہو۔"

"مگر امّی میں ابھی پڑھ رہی ہوں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمھارے بی۔اے کرنے تک رُکا جا سکتا ہے۔ صرف علی کی ممّی کو جلدی ہے لیکن وہ شادی کے بعد بھی تعلیم پر کوئی پابندی نہیں لگا رہیں۔"

"یہ علی کب امیدواروں کی فہرست میں شامل ہوا؟"

"تمھیں کوئی دلچسپی ہو تو پتا چلے کہ کب کون سا پروپوزل آیا۔" امّی کا موڈ آف ہو گیا۔

"آپ لوگوں نے کسے منتخب کیا؟"

"میں تو چاہتی ہوں کہ —" وہ بات ادھوری چھوڑ کر ایک لمحہ کو رُکیں۔ "یمنیٰ بیٹے علی بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس کے ممّی اور ڈیڈی بھی بہت قدر کرنے والے لوگ ہیں۔"

"علی کا کیا خیال ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ یقیناً کسی اور کو پسند کرتا ہوگا۔"

"نہیں، اس کا کہنا ہے کہ شادی کرے گا تو صرف تم سے ورنہ کسی سے نہیں۔"

"کیا؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ "اُسے اتنی بڑی دنیا میں کوئی اور لڑکی دکھائی نہیں دی۔ صرف مجھ سے اور کسی سے نہیں۔ مجھے تو آج تک اپنے اوپر کوئی ہیرے لگے دکھائی نہیں دیے۔"

"واقعی پاگل ہے وہ جو تم سے شادی کرنا چاہتا ہے، خالہ جان آپ صاف جواب دے دیں انھیں کہ اُسے نہیں کرنی شادی علی سے۔" تانیا غصّے سے اخبار پٹخ کر بولی۔ "نہ علی سے نہ کسی اور سے۔ اور یمنیٰ۔" اب وہ یمنیٰ کی طرف مڑی۔ "اب جو تم نے نام لیا نا شادی کا تو میں نے تمھارا گلہ دبا دینا ہے۔ ظاہر ہے تم میں کون سے ہیرے لگے ہوئے ہیں۔ قسمت پھوٹے گی اس بیچارے کی جو بھی تم سے شادی کرے گا۔"

"تم تو ناراض ہو گئیں۔" یمنیٰ گھبرا کر بولی۔

"ہاں میں ناراض ہوں اور ابھی خالہ جان کو سب کچھ بتاتی ہوں،" تانیا نے کہا۔ "سُنیں خالہ جان —" ابھی وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ یمنیٰ نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہو؟ بچّی کا دم گُھٹ جائے گا۔" امّی گھبرا گئیں۔

"امّی مجھے علی سے شادی قبول ہے۔ بے شک آپ ابھی اور اسی وقت میری اس سے شادی کر دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ تانیا کے منہ پر ہاتھ رکھے بولتی گئی۔ "پلیز تانیا کچھ نہ کہنا۔ دیکھو اب میں مان گئی ہوں۔ اب

کبھی انکار نہیں کروں گی۔ ٹھیک۔"

تانیا نے بمشکل ہاں میں سر ہلایا تب یمنیٰ نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا۔

"آج تو تم نے مجھے قتل کرنے کی پوری کوشش کر ڈالی تھی۔" تانیا بولی۔

"اگر تمھیں بولنے دیتی تو میں قتل ہو جاتی امّی کے ہاتھوں۔"

"یہ تم لوگ کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔" امی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"امّی آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے کہ پیڑ گننے سے۔ میں نے کہا نا کہ میں علی سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"مجھے تمھاری کچھ سمجھ نہیں آتی۔" امّی نے بے بسی سے کہا۔ "ہر وقت نان سیریس رہتی ہو، یہ پوری زندگی کا معاملہ ہے اور تم ہنسی کھیل میں اسے ٹال رہی ہو۔"

"خالہ جان اس نے ہاں کہہ تو دی ہے۔"

"اس کا بھروسہ ہے کوئی۔" امّی جان بولیں۔ "مجھے تو ڈر ہے کہ عین نکاح کے وقت اُٹھ کھڑی ہوگی کہ قاضی صاحب میں تو مذاق کر رہی تھی، آپ سچ مچ نکاح پڑھانے آگئے۔"

"ایک تو امّی آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں کبھی سنجیدہ نہیں ہو سکتی۔ یقین کریں اگر آپ علی کے علاوہ کسی کو پسند کرتیں تو میں کبھی ہاں نہ کرتی۔"

"کیا؟" تانیا چیخی۔ "تم نے آج تک اتنی بڑی بات چھپائے رکھی۔ میں تم سے ساری زندگی بات نہیں کروں گی۔

ایک تو تم ہر بات جلیبی کی طرح سیدھی کرتی ہو۔ اگر علی پسند تھا تو پہلے کہہ دیتیں۔"

"اچھا اب پلیز آپ لوگ ناراض نہ ہوں۔" وہ ہنس کر دونوں کو راضی کرنے لگی۔

آج علی کے ممّی اور ڈیڈی کو یمنیٰ کے گھر جواب لینے آنا تھا۔ امّی صبح سے اس سلسلے میں مصروف تھیں۔ تانیا کو بھی انھوں نے اپنی مدد کے لیے بلایا ہوا تھا۔ وہ بار بار یمنیٰ کو بھی کام میں ہاتھ بٹانے کو کہہ رہی تھیں لیکن کیا مجال کہ اس نے اُٹھ کر ایک کام کو بھی ہاتھ لگایا ہو۔

وہ صبح سے اپنے کمرے میں قالین پر کیسٹوں کے انبار کے درمیان لیٹی ڈیک پر گانے سُن رہی تھی۔

"اٹھو یمنیٰ تم بھی کام کر لو گی تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔" امی نے اسے بیسویں مرتبہ ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کام بھی تو ہو کوئی کرنے کو۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"اُٹھ کر دیکھو گی تو کام بھی نظر آجائیں گے۔"

"کیا کام ہیں کرنے کو، صفائی روز ہوتی ہے، آج کوئی نئی بات تو نہیں، کھانا روز پکتا ہے۔ آج بھی میرے بغیر پک جائے گا۔ رمضان مرغیوں کو روزانہ دانہ ڈال دیتا ہے۔ آج بھی اس نے ڈال دیا ہے، مالی پودے درست کر چکا ہے۔ مجھے بتائیں میرے کرنے کو کیا کام رہ گیا ہے؟"

"مت کرو کچھ، ایسے ہی پڑی رہو۔"

وہ گانے سنتی رہی اور سوچتی رہی۔ علی کے متعلق، ان شرارتوں کے متعلق جو اس نے علی کو تنگ کرنے کے لیے کی تھیں۔

"بے فائدہ بات تھی۔" اس نے سوچا۔ "اب اگر عین وقت پر علی نے سوچا کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں تو پھر کیا ہوگا؟ میرا خیال تھا کہ جب تک امّی مجھ سے پوچھیں گی تب تک علی سے بات کلیئر ہو چکی ہوگی۔ لیکن پتا نہیں علی نے اس کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی۔ میں نے کتنی مرتبہ علی کے سامنے یہ پوز کیا کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ اوہ گاڈ۔ میری شرارت کچھ اور گڑبڑ بھی کروا سکتی ہے۔ ایک تو میں ہر کام سوچے سمجھے بغیر کرتی ہوں۔ کیا اور کم طریقے تھے اسے تنگ کرنے کے کہ میں نے یہ طریقہ اپنا لیا۔ اگر آج عین وقت پر کچھ ہو گیا تو پھر؟ اور مجھے یقین ہے کہ آج گڑبڑ ضرور ہوگی۔ علی کے ممّی اور ڈیڈی کہیں گے کہ وہ یہ رشتہ نہیں کر سکتے، پھر امّی اور ابّو کے اصرار پر انھیں بتانا پڑے گا کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں جس کے ساتھ فون پر باتیں کرتی ہوں اور پورے شہر میں گھومتی پھرتی ہوں۔ اب بھلا امی اور ابّو کو کیا پتا کہ وہ کوئی غیر نہیں نعمان تھا جس کے ساتھ میں کار پر گھومتی تھی اور فون پر باتیں کرتی تھی۔ اُف ابّو اور امی کو کتنی شرمندگی ہوگی۔ بعد میں پتا چل بھی گیا کہ یہ صرف مذاق تھا تب

بھی جو شرمندگی اس وقت تک ابّو اور امّی اُٹھا چکے ہوں گے۔ امی کہیں گی کہ میں نان سیریس ہوں۔ اب میں کیسے سمجھاؤں گی انھیں کہ میں بالکل نان سیریس نہیں تھی۔ پتا نہیں ہر معاملہ مجھ سے اُلٹ کیوں ہو جاتا ہے۔ ساری گڑبڑ صرف میرے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اس ساری شرمندگی کا ازالہ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ جیسے ہی گھنٹی بجے میں کسی صورت میں خودکشی کر لوں۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی اور اس طرح امّی اور ابّو بھی شرمندگی سے بچ جائیں گے۔ لیکن امّی اور ابّو کو یہ کیسے پتا چلے گا کہ میں نے انھیں شرمندگی سے بچانے کی خاطر خودکشی کی ہے۔ کچھ سوچنا پڑے گا۔“

اور پھر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آگئی۔ میں ایک خط میں ساری بات لکھ دوں گی۔ اس نے چٹکی بجائی۔ پھر اپنے کالج بیگ سے کاغذ اور قلم لے کر قالین پر پڑے کشن پر بیٹھ گئی۔

میرے بہت پیارے امّی ابّو اور وقاص بھائی

آپ لوگ مجھے ہمیشہ بہت نان سیریس لڑکی سمجھتے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن اس وقت میں بالکل سیریس ہو کر خودکشی رہی ہوں۔ جب تک آپ کو یہ خط ملے گا میں اس دنیا سے بہت دُور جا چکی ہوں گی۔ شاید جنّت میں کیونکہ میں نے بہت سی نیکیاں بھی کی ہیں۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کو میری نیکیاں پسند آ جائیں۔

پیارے امّی ابّو اور وقاص بھائی، آپ لوگوں سے دور جانے کو میرا دل تو نہیں چاہ رہا لیکن کروں مجبوری ہے۔ اگر آنٹی اور انکل نے اس رشتے سے انکار کر دیا تو بالکل شرمندہ نہ ہونا۔ میں کبھی کسی غیر شخص کے ساتھ شہر نہیں گھومی پھری اور نہ ہی میں نے کبھی کو فون کیے ہیں۔ وہ سب تو میں نے علی سے دھوکے کا بدلہ لینے کے لیے شرارت سے کیا تھا۔ فون پر میرے ساتھ تانیا یا نعمان باتیں کرتے تھے اور کار پر تو میں صرف نعمان کے ساتھ جاتی تھی۔ میں نان سیریس بالکل نہیں تھی۔ پتا نہیں ساری گڑبڑ میرے ساتھ کیوں ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ان سب باتوں سے پہلے ہی علی مجھ سے بات کلیئر کرے گا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ظاہر ہے اسے کیا ضرورت پڑی تھی اس کی۔ وہ سیدھے سیدھے اس رشتے سے انکار کر دے گا۔ اُف پھر آپ کو کتنی شرمندگی ہوگی۔ صرف میری وجہ سے۔ خیر میں بھی اب اتنی گئی گزری نہیں ہوں کہ آپ کو شرمندہ ہو جانے دوں۔ بس اسی لیے خودکشی کر رہی ہوں۔ میرے جنّت میں جانے کی دعا کرنا۔ میری موت کے بعد آپ کو یقین آ جائے گا کہ میں نان سیریس بالکل نہیں تھی۔

خدا حافظ

آپ کی بیٹی یمنیٰ

خط لکھ کر اس نے ایک مرتبہ اسے پڑھا اور پھر مطمئن ہو کر تہہ کر دیا۔ اب مسئلہ تھا خط کو کسی ایسی جگہ رکھنے کا جہاں وہ آسانی سے ابّو اور امّی کو نظر آ سکے لیکن اس سے بھی پہلے مسئلہ خودکشی کرنے کے لیے طریقہ ڈھونڈنے کا تھا۔

”ایک تو مجھے ان کاموں کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔ اب اگر عین وقت پر مجھے خودکشی کرنے کا طریقہ نہ سُوجھا پھر کیا ہوگا؟“ اس نے سوچا۔ ”خیر کوئی نہ کوئی ترکیب تو سمجھ میں آ ہی جائے گی۔ ارے ہاں خط تو میں ہاتھ میں ہی پکڑے رکھوں گی تاکہ امّی اور ابّو کو نظر آ جائے۔ لیکن علی کو یہ کیسے پتا چلے گا کہ کسی اور کو نہیں صرف اسے پسند کرتی تھی۔ لو یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔“

وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس گئی اور دراز سے وہ چوڑیاں نکالیں جو علی نے تیس روپے کی تین درجن زبردستی اسے دی تھیں۔ اور جن کے پیسے آج تک اس نے علی کو ادا نہیں کیے تھے۔ سُرخ چوڑیاں سفید کاغذ میں لپٹی اب تک ویسے ہی پڑی تھیں۔ انھیں کے ساتھ گولڈ لیف کا پیکٹ بھی پڑا ہوا تھا۔ اس نے دونوں چیزیں نکال لیں۔ چوڑیاں پہن لیں اور گولڈ لیف کا پیکٹ اپنے سامنے رکھ لیا۔ اتنے میں گھنٹی کی

آواز سنائی دی۔ اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”اب مجھے مرنے کی تیاری کرنی چاہیے لیکن کیسے؟ دماغ بھی ناکارہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کچن سے چھری لے آؤں۔ لیکن اس سے تو بہت درد ہوگا۔ اس دن گنّا چھیلتے ہوئے میرا ہاتھ کٹا تھا تو کتنی تکلیف ہوئی تھی۔ ابّو کے کمرے سے ریوالور لے آتی ہوں۔ بس ایک گولی ٹھائیں سے چلے گی اور کام تمام۔ لیکن ابّو کا ریوالور ہمیشہ خالی ہی ہوتا ہے، گولیاں ابّو بیڈ سائیڈ ٹیبل میں بند کر کے رکھتے ہیں۔ کتنی مرتبہ کہا ہے کہ چور آ کر آپ سے یہ گزارش نہیں کریں گے کہ جناب عالی! پہلے بیڈ سائیڈ ٹیبل چابی کی مدد سے کھولیں پھر گولیاں نکال کر ریوالور میں بھریں اور آخر میں ٹھائیں سے ایک فائر کر دیں۔ سب چوروں کا قلع قمع ہو جائے گا۔ اب اگر آج ریوالور بھرا ہوا ہوتا تو کتنا فائدہ ہوتا۔ ہاں گولیاں ٹھیک رہیں گی، نہ درد، نہ تکلیف، بس ایک منٹ میں کام تمام۔“

وہ جلدی سے ابّو کے کمرے سے میڈیسن باکس اٹھا لائی۔ گولیوں کی شیشی میں صرف سات گولیاں تھیں۔ ”مرنے کے لیے اتنی کافی ہوں گی۔“ اس نے سوچا پھر پانی کا گلاس اُٹھایا۔ ”میرا خیال ہے مرنے میں چند منٹ کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کون سا آنٹی انکل نے آتے ساتھ ہی انکار کر دینا ہے۔ پہلے تو یقیناً کچھ رسمی باتیں کریں گے وہ لوگ۔ اتنی دیر میں میں اپنی زندگی کا ایک آخری گیت ہی سن لوں۔“

اس نے کیسٹوں کے انبار سے ایک کیسٹ منتخب کی اور اپنا پسندیدہ گیت لگا دیا۔

”یہ شام پھر نہیں آئے گی
اس شام کو، اس ساتھ کو
آؤ۔ امر کر دیں — امر کر دیں“

”چلو اب مرنے کی تیاری پکڑنی چاہیے۔“ اس نے آنکھیں بند کر کے سات کی سات گولیاں اپنی ہتھیلی پر رکھ لیں۔ دوسرے ہاتھ میں پانی کا گلاس پکڑا۔ گولیاں نگلنے کے لیے جیسے ہی اس نے ہاتھ اُٹھایا اس کا نازک ہاتھ کسی کی آہنی گرفت میں آ گیا۔ یمنیٰ نے چیخ مار کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے علی کھڑا تھا۔

”تم — تم کب؟ کیسے؟“ اسے سمجھ نہ آیا کہ کیا سوال کرے۔

”یہ کیا حرکت کر رہی تھیں؟“

”کک۔ کچھ نہیں، میں تو بس ویسے ہی — میرا ہاتھ چھوڑو۔“

”میں پوچھ رہا ہوں کیا کر رہی تھیں تم؟“ اب کے علی نے کچھ سختی سے پوچھا۔

”تمھیں نظر نہیں آ رہا کہ خودکشی کر رہی تھی۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”اور تمھاری وجہ سے ہی کر رہی تھی۔ اب جاؤ یہاں سے میرا موڈ مزید آف نہ کرو۔ مجھے جلدی سے خودکشی کرنی ہے۔“

”تم خودکشی نہیں کرو گی بلکہ میرے ہاتھوں قتل ہو گی۔“ علی نے بھی تیزی سے کہا۔ ”پھینکو یہ گولیاں ہر الٹا

عمران ڈائجسٹ کا سنسنی خیز سلسلہ
اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

ماضی کی کہر

زمانۂ قدیم کے ایک نوجوان نے جب نئی دُنیا میں آنکھ کھولی تو حیران رہ گیا، دیوی دیوتاؤں، کی سازش کے شکار کی انوکھی داستان، وہ اپنے دور کا نامور بہادر تھا، شروع سے آخر تک حیرت ہی حیرت،

مکمل ایک حصہ قیمت/۱۵ روپے ڈاک خرچ ۵ روپے
منگوانے کا پتہ

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ
۳۷- اُردو بازار، کراچی،

کام سے شروع ہوتا ہے۔"

"میرا ہاتھ چھوڑ دو گے تو پھینکوں گی کہ ایسے ہی پھینک دوں۔"

علی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اپنے ہاتھ کو سہلانے لگی۔

"اب وجہ بتانا پسند کرو گی اپنے اس نامعقول کام کی۔"

"ایسے بن رہے ہو جیسے کچھ پتا ہی نہیں۔"

"تمہاری باتیں میرے دماغ کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟"

"یہ ہے مسئلہ۔" اس نے خط علی کی طرف بڑھایا۔

"اف خدا یہ لڑکی۔" علی نے بیچارگی سے کہا۔ "پتا نہیں اللہ تعالیٰ نے جب سب انسانوں کو عقل بانٹی تھی اس وقت یہ کہاں تھی ــ جنگلی بلی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا، کیا تم انکار کرنے نہیں آئے تھے؟"

"فی الحال تو میں تمہارا دماغ درست کرنے آیا ہوں۔ خود ہی پہلے الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہو۔ پھر کچھ مسئلے گھڑ لیتی ہو اور آخر میں خود ہی نتائج اخذ کر کے مسئلے کو مزید الجھانے کے لیے اپنی طرف سے اس کا کوئی حل بھی سوچ لیتی ہو۔"

"کیا میں نے سب کچھ غلط سوچا تھا؟"

"تمہارا کیا خیال تھا کہ مجھے علم نہیں تم کس سے فون پر باتیں کرتی تھیں اور کس کے ساتھ جاتی تھیں۔ اپنے سگے بھائی نعمان کے ساتھ ــ جسے تمہاری خالہ نے ایڈاپٹ کر رکھا ہے۔"

"لیکن ــ لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میں انٹیلی جنس میں ہوں، سمجھیں ــ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم عرصے سے مابدولت کو چپکے چپکے ــ" اس نے مسکرا کر جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جی اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے ــ" وہ جھینپ گئی۔

"اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر کانچ کی یہ چوڑیاں اور سگریٹ کا پیکٹ، یہ کیا ہے؟"

"سگریٹ کا پیکٹ تو میں نے ایک پھیری والے سے، اسے دھوکے کی سزا دینے کے لیے چھینا تھا۔ یہ مالِ غنیمت ہے۔ اور یہ چوڑیاں ــ ہاں ان کی قیمت ادا کرنی ہے۔"

"ان کی قیمت اس پھیری والے سے ساری زندگی کا ساتھ ہے، ادا کرنا چاہو گی؟"

"ویسے تو یہ چوڑیاں پھیری والے نے زبردستی دی تھیں لیکن تانیہ نے بتایا تھا کہ اب ان کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے ورنہ یہ قرض بن جائے گا اور قرض واپس نہ کرنا گناہ ہوتا ہے۔" یمنیٰ نے ہمیشہ کی طرح بات گھما پھرا کر کی۔

"میں نے ہر قرض معاف کیا۔" اس نے کہا۔ "لیکن پلیز اب سیدھی بات کرنا۔ پھیری والے کے ساتھ ساری زندگی گزارنا چاہو تو یہ چوڑیاں پہن لو۔"

اس نے سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں آگے بڑھا دیں۔ یمنیٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ وہی چوڑیاں تھیں جو علی نے اسے ساڑھے سترہ روپے کی دی تھیں اور جس کے یمنیٰ نے اٹھارہ روپے ادا کیے تھے۔ بعد میں علی کو گولڈ لیف کے سگریٹ پیتے دیکھ کر اس نے وہ چوڑیاں پھیری پر پٹخ کر اس کا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا لیا تھا۔ زور سے پٹخنے کی وجہ سے آدھی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ علی نے اپنا ہاتھ اب تک آگے بڑھایا ہوا تھا۔

"اگر اس پھیری والے کو میرے ساتھ کی اس قدر خواہش ہے تو وہ خود ہی مجھے یہ چوڑیاں کیوں نہیں پہنا دیتا۔" یمنیٰ نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔

علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے یمنیٰ کا ہاتھ تھام لیا اور ڈیک کی آواز اونچی کر دی۔

ایک دوجے میں گم
اس طرح ہم جیئں
ہاتھ میں ہاتھ ہوں
لمحہ لمحہ بنیں!
آنکھوں آنکھوں میں
باتوں باتوں میں
آؤ سحر کریں ــ امر کریں۔

*

حمیرا راحت

غم دوراں ہارے

"کیا یہ سچ ہے شعیب بھائی؟"

میرے لہجے میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سینے میں دھڑکتا ہوا دل کانچ کے بلوریں گلاس کی طرح زمین پہ گر کے کرچیوں کی صورت تقسیم ہو گیا ہو۔ شعیب بھائی نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔

"ہاں فارحہ! کاش یہ سب سچ نہ ہوتا، مجھے خود یقین نہیں آتا۔ کہ یہ سب کس طرح ہو گیا۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔

"زارا آپی! اتنی جلد بھولنے والی شے تو نہ تھیں۔ وہ آپ کی دیوانگی، وعدے، قسمیں، کیا، کیا وہ سب جذبے سارے خواب ریت کی دیوار تھے؟"

میں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

"فرّو! میں مجبور کر دیا گیا ہوں۔"

"جھوٹ نہ بولیں۔ مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا۔ مجبوری کی آڑ میں فرار کے راستے تلاش کرتا ہے۔" میں غصے کے جوش میں گستاخی کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی۔

"فارحہ! ادھر آؤ؟"

پردے کے اس پار سے زارا آپی کی لرزتی ہوئی آواز ابھری تو میں نے ایک پل کے لیے شعیب بھائی پر نگاہ ڈالی اور پھر پردہ اٹھا کر برابر والے کمرے میں چلی آئی۔

"میں بہت اپ سیٹ ہو رہی ہوں آپی! پلیز، مجھ سے بات نہ کریں۔" میں سر تھام کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے شعیب بھائی سے سخت لہجے میں بات کرنے پر ڈانٹیں گی۔

"فارحہ! میری جان۔ یوں حوصلہ ہارا نہیں کرتے، زندگی میں آدمی کو پتا نہیں کن کن حادثات سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے، جانے کیا کچھ سہنا پڑتا ہے۔" وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنے مسیحا صفت لہجے میں مجھے سمجھانے لگیں تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"آپی! آپ جیسا حوصلہ میں کہاں سے لاؤں۔ میں جانتی ہوں کہ جو قیامت صرف میرے قریب سے گزر گئی ہے۔ وہ آپ کے دل آپ کے خوابوں اور آپ کے ارمانوں پر بجلی بن کر گری ہے۔ آپ کا دکھ میرے دکھ سے دوگنا ہے۔ لیکن آپ جیسا ضبط اور تحمل مجھ میں نہیں ہے۔" میں تڑپ کر بولی۔

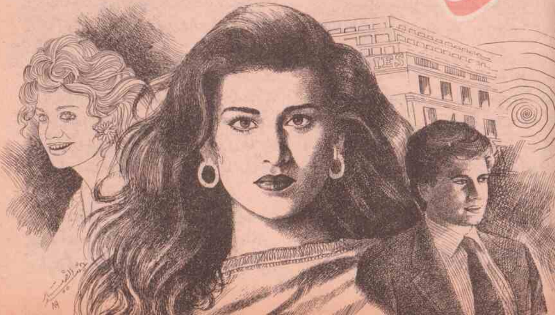

"اچھا اچھا۔ میری تعریف بعد میں کر لینا پہلے انہیں جا کر چائے دے آؤ۔" وہ میرے سامنے بیٹھ گئیں۔

"چائے!" میں نے انہیں حیرت سے دیکھا۔

"میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں ان کی شکل تک نہ دیکھوں۔"

"فارہہ! بہت بری بات ہے۔ وہ تم سے بڑے ہیں اور تمہارے رشتے دار ہیں، جب مجھے ان سے شکایت نہیں ہے۔ تو تم کیوں میری حمایت میں ان سے اتنی الرجک ہو رہی ہو۔" آپی نے ملامت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں کچھ کھسیا کر اور کچھ خفگی کے عالم میں اٹھ کر چائے بنانے چل دی۔

زارا آپی میری پھوپھو کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ پھوپھو اگرچہ ابو کی سگی بہن نہ تھیں لیکن ہم لوگ ان سے سگی پھوپھی جیسی ہی محبت کرتے تھے۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑے فرید بھیا، پھر زاہد بھائی۔ میں یعنی فارہہ بیگم اور مجھ سے چھوٹی صبا پروین۔ پھوپھو ہمارے پڑوس میں آکر کب آباد ہوئیں۔ یہ تو مجھے یاد نہیں، یہ میری پیدائش سے بھی بہت پہلے کی بات تھی۔ پھر جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا تو ابو نے انہیں اپنی بہن بنا لیا اور ہمارے گھر سے انہیں مالی تعاون کے ساتھ ساتھ بہت محبت بہت پیار، اور ڈھیر ساری چاہتیں ملیں۔ جن کے لیے وہ ہر وقت احسان مند رہتی تھیں۔

میں بچپن ہی سے پھوپھو کے گھر میں گھسی رہتی تھی۔ اپنے گھر میں ہر وقت بھائی بہنوں کی چیخ و پکار چیزوں کی بے ترتیبی اور بھائیوں کی شرارتوں سے گھبرا کر میں صبح ہوتے ہی چپکے سے دروازہ کھول کر پھوپھو کے گھر میں گھس جاتی۔

یہاں ہر چیز صفائی اور سلیقے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی نظر آتی، صاف ستھرے لباس میں ملبوس پھوپھو کا مسکراتا ہوا شفقت برساتا وجود اور دبلی پتلی نازک سی زارا آپی جو ہمیشہ میز کرسی پر بیٹھ کر بڑی نفاست سے بوائل انڈے اور سلائس پر مشتمل ناشتا کرتی نظر آتیں۔

پھر وہ بیگ اٹھا کر اپنے اسکول چل دیتیں اور میں پورے گھر پہ راج کرنے کے لیے اکیلی رہ جاتی۔ کبھی میں اپنے گھر کی طرح آپی کے کھلونے اور گڑیاں وغیرہ نکال کر ادھر ادھر پھیلا دیتی لیکن پھوپھو نے مجھے اس حرکت پر کبھی بھی نہ ڈانٹا بس خاموشی سے وہ میری پھیلائی ہوئی ساری چیزیں سمیٹتی رہتیں۔

اور انہیں کام میں مصروف دیکھ کر میں شرمندہ سی ہو جاتی اور جلدی جلدی خود بھی چیزیں اٹھا کر ان کی اصل جگہ پر رکھ دیتی۔ مجھے پھوپھو بڑی اچھی لگتی تھیں اور زارا آپی تو میری جان تھیں نازک سی من موہنی سی۔ زارا آپی کو میرا بس چلتا تو پل بھر کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔

پھر آہستہ آہستہ بچپن بیت گیا۔ زارا آپی نے میٹرک کا امتحان فرسٹ پوزیشن میں پاس کر لیا اور پرائیویٹ طور پہ انٹر کی تیاری کر رہی تھیں۔ جب کہ میں میٹرک میں پہنچ گئی تھی۔

اب میری پھوپھو کے ہاں پہلے جیسی آمد و رفت تو نہ رہی تھی۔ کیونکہ کچھ پڑھائی کی مصروفیت اور کچھ گھر کے کاموں کی ذمہ داری امی نے میرے سپرد کر دی تھی۔ لیکن پھر بھی جب موقع ملتا، میں پھوپھو کے گھر پہنچ جاتی۔ اور گھنٹوں زارا آپی سے باتیں کیا کرتی وہ خود بہت کم گو تھیں۔ مجھ سے تو پھر بھی تھوڑی بہت بے تکلف تھیں ورنہ کسی کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہونے دیتی تھیں۔

بہت عرصے تک تو مجھے بھی خبر نہ ہو پائی کہ زارا آپی کے من آنگن میں کس کا نام گلاب بن کر مہک رہا ہے لیکن ایک روز مذاق مذاق میں شعیب بھائی نے یہ راز کھول دیا۔

شعیب ہمارے تایا کے بیٹے تھے بھائی جان کے ساتھ ہی کالج میں پڑھ رہے تھے۔ لہٰذا بے تکلفی سے گھر میں آنا جانا تھا۔

کچھ اتفاق سا تھا کہ جس روز شعیب بھائی آتے زارا آپی ہمارے گھر موجود ہوئیں یا ان کے آتے ہی آ جاتیں، میں نے بھی یہ بات محسوس تو کی تھی مگر میں اسے محض اتفاق سمجھ رہی تھی۔ شعیب بھائی جب تک بیٹھے رہتے آپی کو اپنے گھر کی یاد نہ ستاتی۔ بس چہرے پر گلابوں کا رنگ بکھیرے اور آنکھوں میں دھنک کا حسن سمیٹے وہ شعیب بھائی کی باتوں پر ہنستی رہتیں۔

پھر یوں ہوا کہ اچانک زارا آپی بیمار ہو گئیں۔ انہیں فلو ہو گیا تھا۔ اور بخار کی وجہ سے پھپھو نے انہیں بستر سے اٹھنے نہ دیا تھا۔

شعیب بھائی آئے تو خاصے بے چین سے تھے بار بار وہ ادھر ادھر دیکھتے اور ان کی نگاہیں دور تک بھٹک کر واپس آ جاتیں۔

میں بڑی دیر سے ان کی بیقراری کو محسوس کر کے حیران ہو رہی تھی آخر کار پوچھ ہی بیٹھی۔

"کیا بات ہے شعیب بھائی؟ آپ کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ پریشان۔ تو خیر میں نہیں ہوں۔ مضطرب کہہ سکتی ہو تم شاعرانہ زبان میں جیسے کہا جائے کہ جیا بیقرار ہے۔ وہی کیفیت ہے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولے۔

"لیکن معلوم تو ہو کہ آپ کا جیا کیوں بیقرار ہے؟" میں ہنس کر بولی۔

"انتظار میں۔ وہ تمہاری زارا آپی آج نظر نہیں آ رہی ہیں نا۔" وہ رازدارانہ انداز میں بولے تو میں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

"زارا آپی۔! تو۔ کیا آپ۔! اوہ سچی شعیب بھائی!" میں اچھل پڑی۔

"دیکھیے آپ کو میری قسم ہے بالکل سچ بتائیں۔ آپ نے مذاق میں کہی ہے یہ بات یا سچ مچ آپ زارا آپی کو پسند کرتے ہیں۔" میں سیریس ہو گئی۔

"کون کم بخت اتنی خوبصورت بات مذاق میں کہے گا۔ میں تو زارا کو اسی روز سے پسند کرتا ہوں، جب میں نے پہلی بار اسے یہاں دیکھا تھا۔ میں اسے اپنانا چاہتا ہوں فرو۔ تعلیم پوری کر کے جب میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہو جاؤں گا تو سب سے پہلا کام یہی کروں گا کہ زارا کو دلہن بنا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔" شعیب بھائی خواب ناک سے لہجے میں بولے۔

"اللہ کتنا مزہ آئے گا۔ سچ آپ دونوں کی جوڑی اس قدر پیاری رہے گی کہ۔ کہ۔" جلدی میں مجھے کوئی مناسب تشبیہہ نہ سوجھ سکی۔

"جیسے دو ہنسوں کا جوڑا۔" شعیب بھائی نے جملہ مکمل کیا۔

"ویسے کیا زارا آپی کو بھی معلوم ہے آپ کی پلاننگ۔" میں سوچ کر بولی۔

"جی جناب۔ وہ اس معاملے میں اس خاکسار ہی جتنی سنجیدہ ہیں۔ بلکہ ناچیز کے گھر آنے کے لیے سخت بے چین و بے قرار ہیں۔"

"زارا آپی!" مجھے پھر حیرت نے آ گھیرا۔ کتنی گھنی ہیں۔ مجھے ہوا تک نہ لگنے دی اپنے دل کی۔ میں پل بھر کے لیے دل ہی دل میں زارا آپی سے روٹھ گئی۔

شعیب بھائی اس روز جلد ہی واپس چلے گئے۔ لیکن میں اس روز حیرت اور مسرت کے درمیان گھری مسلسل انہی دونوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

اب میں زارا آپی اور شعیب بھائی کے عشق کی واحد رازدار تھی۔ ان دونوں کے والہانہ انداز دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی تو میرا بھی دل چاہتا کہ کوئی ہو، اپنی آنکھوں میں شعیب بھائی کی طرح محبت کے ڈھیر سارے چراغ جلا کر میری طرف دیکھے اور دیکھتا رہے۔ دیکھتا رہے۔

اور کبھی کبھی میرے خوابوں میں ایک انجانی شبیہہ جگمگانے لگتی ایک خوبصورت ——— پیکر، دلنواز لہجہ۔ وہ مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتا رہتا خوبصورت اور مدھر باتیں۔

مگر جب آنکھ کھلتی تو میرے اپنے وجود کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ اور میں خود ہی اپنی سوچوں اور خوابوں پر جھینپ سی جاتی۔

زارا آپی نے بی اے کر لیا تو پھوپھو کو ان کی شادی کی فکر ہوئی زارا آپی کسی چیز میں کم نہ تھیں۔ تعلیم، سلیقہ، ہنرمندی، صورت شکل اور خاندان سبھی کچھ بہترین تھا پھر اکلوتی بیٹی پھوپھو ایک عرصے سے ان کے لیے کچھ نہ کچھ جوڑ رہی تھیں اور اب ان کا جہیز تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ رشتے لے کر آنے والیوں ——— کی لائنیں لگ گئیں

زارا آپی اس صورت حال سے بوکھلا گئیں، ابھی تو ان کو بی اے پاس کیے صرف دو ماہ ہی گزرے تھے۔ اور ابھی سے پھوپھو انہیں گھر سے نکالنے پر کمربستہ ہو گئی تھیں۔

ایک دن وہ صبح ہی صبح آ گئیں۔

میں کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

وہ بہت بجھی بجھی سی تھیں چہرہ اترا ہوا تھا۔

"کیا ہوا خیریت؟" میں نے استری ایک طرف رکھ کر پوچھا۔

"خیریت کہاں فری! آج پھر شام کو مہمان آرہے ہیں" وہ اُداس لہجے میں بولیں۔

"مہمان؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"کیسے مہمان؟"

"ارے وہی جو میرے لیے وبالِ جان ہیں۔ امی کو نہ معلوم کیا ہو گیا ہے۔ میری شادی کے علاوہ انہیں کوئی فکر ہی نہیں رہی ہے" وہ اُکتائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"ہوں تو یہ مسئلہ ہے" میں میز پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اور دونوں ہاتھوں سے میز کو بجانے لگی۔

"پلیز فارہہ! سنجیدگی سے مجھے کوئی حل بتاؤ۔ کیا کروں میں؟ کیا ان سے بات کروں؟" وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔

سمجھ تو میں گئی تھی مگر اس وقت انجان بننے میں لطف آرہا تھا۔

"ان سے؟ کن سے۔ کیا پھوپھو سے؟" میں نے مصنوعی حیرانی ظاہر کی۔

"میں ان کی بات کر رہی ہوں۔ وہ جو ہیں تمہارے شعیب بھائی" وہ کھسیا گئیں۔

"اچھا اچھا شعیب بھائی کی بات کر رہی ہیں آپ" میں مسکرائی۔ میں میز سے اُتر کے ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"آپ بات کر لیں گی ان سے؟ ہمت ہے اتنی؟" میں نے انہیں ٹٹولا۔

"ہاں یہی تو پریشانی ہے۔ میں کس طرح بات کروں گی۔ یہ تو انہیں خود سوچنا چاہیے فری! اب تو ان کی تعلیم بھی ختم ہو گئی ہے اور جاب بھی مل گئی ہے انہیں"

زارا آپی مایوسی سے بولیں۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔ اچھا میں بات کر لوں آپ کی طرف سے؟" میں نے تجویز پیش کی۔

"تم؟" وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم میرے ہاں کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں انہیں سب کچھ بتا دینا اور کہنا کہ۔ جو کچھ کرنا ہے، جلد از جلد کر لیں ورنہ۔ ورنہ سارے خواب بکھر کر رہ جائیں گے۔ اور اور معلوم، نہیں فارہہ اتنا بڑا دُکھ پا کر میں زندہ بھی رہ سکوں گی یا نہیں؟" ان کی آنکھوں میں دُکھ کے ساگر بہہ رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ تھیں اور مجھے ایک لمحے کے لیے ان کی سنجیدگی سے ڈر سا لگا۔

اور اس لمحے میں نے صدقِ دل سے زارا آپی کے سدا خوش رہنے کی دعا مانگی۔ خُدا کرے میری نازک سی پیاری سی آپی کو کبھی کوئی دُکھ نہ ملے۔ میرے دل میں اس وقت ان کے لیے بے تحاشا محبت اُمنڈ پڑی تھی۔ اور ہونٹوں پہ ان کے لیے دعائیں ہی دعائیں تھیں۔

اتفاق ایسا ہوا کہ شعیب بھائی جو روز ہی آجاتے تھے مسلسل ایک ہفتے تک نہ آئے۔ زارا آپی بہت بیقرار تھیں اور روز ہی بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کیا کرتی تھیں۔

خُدا، خُدا کر کے ایک ہفتے بعد وہ آئے تو میں باقاعدہ طور پہ ان سے ناراض ہو چکی تھی۔

"ارے فری گڑیا! پتہ ہے کیا ہوا تھا؟ میرے ایک دوست کی شادی تھی۔ وہ بس مجھے اپنے ساتھ ہی گھسیٹ کر لے گیا۔ حیدر آباد۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک دو دن بعد نجات مل جائے گی مگر اُف یہ شادی کی رسمیں۔ سخت واہیات ہوتی ہیں بھئی۔ ایک دن مایوں کا، ایک دن مہندی کا، ایک نکاح، ایک ولیمہ ایک چوتھی ایک پانچویں اور جانے کیا الابلا۔"

"مجھے آپ کی اس دُکھ بھری کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے" میں روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

"کیوں بھئی؟ بڑی مزے دار خبریں ہیں میرے پاس" انہوں نے لالچ دی۔

"ہوا کریں۔ میرے پاس بہت دردناک خبریں ہیں آپ کے لیے" میں سنجیدگی سے بولی۔

"کیا ہوا خیریت؟" شعیب بھائی بھی سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے"

میں نے مختصراً انہیں زارا آپی کے آنے والے رشتوں اور ان کی امی کے عزائم سے آگاہ کیا۔

اب وہ کچھ رنجیدہ سے نظر آنے لگے اور خلافِ توقع سوچ میں ڈوب گئے۔

"شعیب بھائی! ایک بات بتا دوں زارا آپی اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہیں اور وہ عام لڑکیوں سے ایک مختلف لڑکی ہیں" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں جانتا ہوں" انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

پھر کہیں گم ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا۔

"سنو فری! تم زارا سے کہو کہ وہ ایم اے میں ایڈمیشن لے لے اور کہہ دے کہ میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں" انہوں نے تجویز پیش کی۔

"اس گھر میں حکم زارا آپی کی امی کا چلتا ہے۔ آپی ایک مشرقی لڑکی ہیں۔ آپ تائی جان سے بات کیوں نہیں کرتے" میں چڑ کر بولی۔

"میں کروں گا بات۔ میں فی الحال کی بات کر رہا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ جب تک گھر والوں کو تیار کروں، اس کی انگیجمنٹ ہو جائے کہیں"

"گھر والوں کو تیار کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

"بس یہی کوئی ایک دو ماہ۔ اصل میں امی کی طرف سے خطرہ ہے۔ انہوں نے بچپن سے میرے لیے خالہ زاد بہن کو منتخب کر رکھا ہے۔ وہ ہمارے ہی گھر میں رہتی ہے۔ خالہ خالو کا انتقال ہو چکا ہے"

"اچھا وہ ربیعہ" میرے ذہن میں دبلی پتلی سانولی سی ربیعہ گھوم گئی، کئی سال پہلے جب ہم ان کے گھر گئے تھے تو وہاں پر ربیعہ سے ملاقات ہوئی تھی۔

"ہاں وہی!" شعیب بھائی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا! میں چلتا ہوں پھر دو ایک دن میں آؤں گا" میں انہیں روکتی ہی رہ گئی۔ اور وہ اُٹھ کر چل دیے۔

اور پھر جیسے انتظار زارا آپی کے نصیب کی پیشانی پر لکھ دیا گیا۔ روز سورج طلوع ہوتا اور ڈوب جاتا مگر شعیب بھائی نہ آتے۔ اُمید کے پودے سرسبز ہو اور مرجھا جاتے۔

نہ جانے کس کس جتن سے زارا آپی نے پھوپھو کو آگے پڑھنے پر آمادہ کر لیا تھا اور یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت تو نہ مل سکی تھی مگر پرائیویٹ طور پہ ایم اے کرنے کی منظوری ضرور دے دی تھی۔

مگر جوں جوں دن گزرتے گئے، زارا آپی کی بے تابی بڑھتی گئی اور پھر ایک دن تائی جان جو ہمارے گھر آنا اپنی کسرِ شان سمجھتی تھیں اور جنہیں اپنے بنگلے اور گاڑی پہ بے حد غرور تھا، ہمارے گھر شعیب بھائی کے نکاح کا کارڈ لے کر آگئیں۔

گھر بھر میں سب بے حد خوش تھے اور تائی جان کو مبارک باد دے رہے تھے لیکن میں دکھ سے چور دل لیے بالکل ساکت بیٹھی تھی۔

شعیب بھائی سے مجھے خواب میں بھی اس حرکت کی اُمید نہ تھی۔ میرا احساس دل زارا آپی کے دُکھ کو محسوس کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا مگر میں اپنے خشک ہوتے لبوں پر چُپ کی مہر لگائے ایک جانب بیٹھی تھی۔

تائی جان چلی گئیں۔ زارا آپی آئیں تو امی نے انہیں یہ خبر سنانا ضروری سمجھی کیونکہ آج کافی عرصے کے بعد ان کی امیر جیٹھانی نے ان کے گھر میں قدم رکھا تھا۔ اور پھر یوں بھی شعیب بھائی اتنے اچھے مزاج کے تھے کہ گھر کے سبھی لوگوں کو ان سے انسیت سی ہو گئی تھی اور ان کے نکاح کی خبر سبھی کی خوشی کا باعث بنی تھی۔

"فری!"

آنسو بھری آواز پہ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کا پٹ تھامے زارا آپی بے حد اُجڑی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ چہرہ سفید ہو رہا تھا اور آنکھوں کے دیئے ٹمٹما رہے تھے۔

"فری! کیا یہ خبر سچ ہے؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"زارا آپی!" میں نے ان کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے چہرے سے لگائے اور رونے لگی۔

بڑی دیر تک نہ میں نے کچھ کہا نہ زارا آپی نے بس میرے آنسوؤں نے جیسے ساری کہانی انہیں سنا دی تھی پھر اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا بلکہ تھوڑی دیر بعد چُپ چاپ واپس لوٹ گئیں لیکن ان

کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اور سفید پڑتا چہرہ میں نے دیکھ لیا تھا۔ اور اس روز کے بعد آج جب شعیب بھائی زاہد بھائی کے ہمراہ کچھ نادم نادم سے گھر میں داخل ہوئے تو اتفاق سے زارا آپی گھر آئی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے سامنے نہیں گئی تھیں نہ ہی ملامت کا ایک لفظ منہ سے نکالا تھا۔ بلکہ مجھے بھی شعیب بھائی سے زیادہ بات نہیں کرنے دی ورنہ میرے دل میں بڑا ارمان تھا کہ ایک بار۔ شعیب بھائی کو خوب آڑے ہاتھوں لوں۔ اور کہوں کہ

"محبت اسے کہتے ہیں شعیب بھائی؟"

"ایک معصوم لڑکی کے مقدس خوابوں کی بے حرمتی کرکے کیا پالیا آپ نے؟"

"آپ کے لیے جو وقت گزاری کا ایک کھیل تھا وہ کسی مجبور و بے کس کے لیئے زندگی بھر کا روگ بن گیا ہے۔"

لیکن میں تو شعیب بھائی سے کچھ بھی نہ کہہ سکی اُن سے کچھ کہنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ شاید زارا آپی نے اچھا ہی کیا جو مجھے روک لیا لفظوں کو بے وقعت کرنے سے کیا فائدہ جذبے تو رسوا ہو ہی چکے تھے۔

زارا آپی بالکل مٹی کی مورت بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ ہمارے گھر بہت کم آتی تھیں پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک معلوم ہوا کہ پھوپھو اپنا مکان چھوڑ کر دوسرے علاقے میں جا رہی ہیں۔ یہ خبر سبھی کے لیے تعجب خیز تھی ابو نے بہت سمجھایا، امی نے بھی روکا مگر پھوپھو اور زارا آپی کا فیصلہ اٹل تھا۔ نہ جانے کب ان لوگوں نے اس۔ مکان کا سودا کر لیا تھا۔ دوسرے علاقے میں مکان خریدنے کے انتظامات بھی مکمل تھے۔ چند دنوں میں ہمارا پڑوس سُونا ہو گیا۔ حالانکہ وہ اپنے نئے مکان کا پتا بھی دے کر گئی تھیں مگر زندگی کی مصروفیتوں نے فرصت ہی نہ دی کہ کوئی جا کر ان لوگوں سے ملتا اور نیا مکان۔ دیکھ کر آتا۔ ہاں ابو کبھی کبھار ہو آتے تھے۔ میں جانے کا سوچتی ہی رہ گئی۔ ہر بار ایک عجیب سی شرمندگی پیروں میں بیڑیاں ڈال دیتی کیونکہ شعیب بھائی۔ میرے کزن تھے لہٰذا کچھ نہ کچھ میں خود کو بھی مجرم سمجھتی تھی اگرچہ میرا کوئی قصور نہ تھا۔

کافی وقت گزر گیا۔ ابو جی نے گلشن میں کافی بڑا گھر بنوا لیا تھا۔ کیونکہ اب بھائی شادی کے قابل تھے۔ چھوٹے مکان میں گزر نہیں ہوتی تھی لہٰذا ہم لوگ گلشن شفٹ ہو گئے۔

اب امی کو ہر وقت میری شادی کی فکر رہتی، تھی کیونکہ میں اب بی اے میں آ گئی تھی اور امی جان چاہتی تھیں کہ پہلے میری شادی کر دیں بعد میں بھائیوں کی دُلہنیں گھر میں آئیں۔

لیکن زارا آپی کی ناکام محبت نے کم عمری ہی میں میرے ذہن پر ایسا انمٹ نقش اُتارا تھا کہ اب مجھے مردوں سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ محبت، پیار یگانگت سب ایک کھلا دھوکہ محسوس ہوتا تھا۔ زارا آپی اور۔ شعیب بھائی کے عشق کے دور میں جو تصور کا ایک پیکر میرے دل میں خوبصورت خوابوں نے تخلیق کیا تھا شعیب بھائی کی بے وفائی نے اُسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور اس کا ایک ننھا سا مزار میرے دل آنگن میں بن گیا تھا۔ مجھے اب دنیا کے کسی مرد کا اعتبار نہ تھا۔ جو رشتہ آتا میں صاف انکار کر دیتی بھائی مجھے بہت چاہتے تھے۔ کیونکہ ابو جی کے انتقال کے بعد میں اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ ابو مجھے خاص اہمیت دیتے تھے۔ اور مجھے بھی سب گھر والوں کی بہ نسبت ابو جی سے زیادہ محبت تھی۔ ابو کے بعد بھائی بھی اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ میری دل آزاری نہ ہونے پائے لہٰذا کوئی بھی میری مرضی کے خلاف مجبور کرنا نہیں چاہتا تھا۔

امی کے ارادے کے خلاف دونوں بھائیوں کی شادی ہو گئی آخر لڑکی والے کب تک میری شادی کا انتظار کرتے بھابھیاں آپس میں سگی بہنیں تھیں اور بڑے اچھے مزاج کی مالک تھیں مل جل کر رہتی تھیں آپس میں۔

بھابی کے ایک بھائی صاحب مجھ پر بڑے مہربان تھے جب ملاقات ہوتی وہ مجھ پر خاص توجہ دیتے۔ ان کا نام تو نہ جانے کیا تھا سب انہیں کامی بھائی کہتے تھے شاید اصل نام کامران رہا ہوگا۔ یا شاید کچھ اور ہو میں نے کبھی ان کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

پر جانے کیا بات تھی اس شخص کی آنکھوں میں۔ حالانکہ بالکل عام سی کالی کالی آنکھیں تھیں وہ جیسے عام لوگوں کی ہوتی ہیں۔ مگر جب کامی بھائی میری طرف دیکھتے تو وہی عام آنکھیں بہت خاص نظر آئیں۔ اور کبھی کبھی تو مجھے اپنے تمام تر کٹھور پن کے باوجود بہت ڈسٹرب سا کر دیتیں۔

مجھے یوں لگتا جیسے رات کے پُرسکون لمحوں میں وہ آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہوں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی کامی کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتی مگر فوراً ہی زارا آپی کی آنسو بھری آنکھیں اور زرد چہرہ میرے سامنے آ جاتا اور مردوں کے خلاف نفرت کا جذبہ تازہ کر دیتا۔

نہ جانے کس حال میں ہوں گی زارا آپی۔

یقیناً شعیب بھائی کی یاد کو اب بھی انہوں نے دل سے لگا کر رکھا ہو گا یقیناً اب بھی رات کو ستاروں کی طرف تکتے تکتے ان کی ستاروں جیسی آنکھوں میں سمندر آ جاتے ہوں گے۔

اور بے وفائی کا زخم انہیں نہ جینے دیتا ہو گا نہ مرنے دیتا ہو گا۔

شاید وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی ہوں گی۔ کیونکہ غم وہ دیمک ہے جو انسانی بدن کو اندر ہی اندر چاٹ لیتا ہے اور انسان کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔

زارا آپی کا خیال آتے ہی میرا دل جیسے کوئی مٹھی میں جکڑ لیتا۔

وہ میری سگی بہن تو نہ تھیں مگر ان کی پاکیزہ اور معصوم محبت کو جنم لیتے آگے بڑھتے پھلتے پھولتے اور پھر بے وفائی کی بھینٹ چڑھتے میں نے دیکھا تھا۔ میں اس حادثے کی واحد گواہ تھی اور اس حادثے کا نقش میرے ذہن میں اتنا گہرا تھا کہ کامی کی نگاہیں بھی اُسے زائل نہ کر پاتی تھیں۔

اس روز امی میرے قریب آ کر بیٹھیں تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ ہو نہ ہو ضرور پھر وہی پرانا مسئلہ ہو گا۔

میں امی کے تیور پہچاننے لگی تھی۔ میگزین ایک طرف رکھ کر میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد امی نے اپنی پرانی خواہش کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"دیکھو فارہہ! میں اب بہت بوڑھی اور کمزور ہو گئی ہوں اور مزید تمہارا بوجھ اُٹھا کر چلنا میرے لیے ممکن نہیں رہا ہے بیٹا تم نے بہت ضد کر لی ہے۔ بس اب تم انکار نہ کرنا تمہاری شادی ہو گی تو پھر مجھے صحیح معنوں میں سکون ملے گا اور میں چین سے مر سکوں گی۔"

"اللہ امی میں اتنا بڑا بوجھ بن گئی ہوں آپ کے لیے۔" میں نے لاڈ سے کہا۔

"بیٹی تو ہوتی ہی بوجھ ہے۔ اور اس بوجھ کو جس قدر جلد ہلکا کر لیا جائے اچھا ہے۔ دیکھو اب جو رشتہ آیا ہے تمہارے لیے وہ دُلہن کے بھائی کامران کا ہے۔ کامی بہت اچھا لڑکا ہے اور تمہیں بہت اچھی طرح رکھے گا۔" امی جان نے بتایا۔

کامی کا نام سُن کر پل بھر کے لیے میرا دل دھڑکا۔

"ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ میں نے اس کی نگاہوں کا مطلب ٹھیک ہی سمجھا تھا۔"

امی میری سوچوں سے بے خبر بولے جا رہی تھیں۔

"دیکھو نا بڑی دلہن اور چھوٹی دلہن کی بھی یہ ہی خواہش ہے۔ اکلوتا لڑکا ہے، راج کرے گی میری بیٹی بس تو ہاں کرلے فری! سچ میرا بھرم رہ جائے گا۔" امی کے لہجے میں اتنی آس تھی کہ میں صاف انکار کی ہمت نہ کر سکی۔

"اچھا امی۔ میں۔ میں سوچ کر جواب دوں گی۔" میں نے سوچنے کے بہانے کچھ وقت مانگ لیا تا کہ بعد میں کسی اور ذریعے سے امی کو منع کروا دوں۔

زارا آپی کی محبت کے المناک انجام کی یاد آتے ہی مجھے محبت اور شادی کے نام سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی تھی۔

شعیب بھائی کے تو اب کئی بچے تھے اور زارا آپی؟ یقیناً وفا کی وہ دیوی ابھی تک پرانے اعتبار کی کرچیاں سینے سے لگائے کہیں زندہ ہو گی۔ انہوں نے دوبارہ تو اعتبار کا وہ رشتہ نہیں جوڑا ہو گا جو شعیب بھائی نے بڑی بے دردی سے توڑ دیا تھا نہ جانے کیوں مجھے پختہ یقین تھا کہ زارا آپی پرانی یادوں کے ناسور لیے تنہا زندگی کی سزا کاٹ رہی ہوں گی۔ کیونکہ عورت تو ایک بار ہی محبت کرتی ہے۔

امی سے دو تین دن سوچنے کی مہلت مانگ تو لی تھی مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنا انکار کس کی زبانی ان تک پہنچاؤں۔ بھابی کے ذریعے تو کہلوانا کچھ معیوب سا لگتا تھا کیونکہ بہرحال ان کے بھائی کا معاملہ تھا۔

پھر یوں ہوا کہ نازو کی شادی سر پہ آ پہنچی اور میں سب کچھ بھول بھال کر وہاں جانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔

نازو میری سہیلیوں میں وہ واحد سہیلی بچی تھی جو ابھی تک میری صف میں تھی یعنی کنواری تھی ورنہ تو تمام سہیلیاں پی کے گھر سدھار چکی تھیں اور کئی تو ایک دو بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔

اور اب اس آخری سہیلی نازو کی بھی شادی ہو رہی تھی۔ سہ پہر سے میں تیار ہو رہی تھی۔ تیاری مکمل کر کے جب میں بھابی کے کمرے میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ زاہد بھائی ابھی تک آفس سے نہیں لوٹے ہیں۔

"ہائے اللہ اب میں کس کے ساتھ جاؤں گی؟" میں پریشان ہو کر بولی۔

"بندہ حاضر ہے۔" ایک کونے سے صدا آئی۔ تو میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا وہاں کامی بیٹھا ہوا میری ہی طرف متوجہ تھا میں اپنی دھن میں اسے دیکھ ہی نہ سکی تھی۔

"ہاں اب ایسا کرو کامی کو ہی لے جاؤ تمہارے بھائی تو نہ جانے کب لوٹیں۔" بھابی نے پیش کش کی۔

مجھے مجبوراً ہامی بھرنی پڑی کیونکہ زاہد بھائی کا واقعی کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ کب لوٹ کر آئیں حالانکہ صبح میں نے یاد دہانی کرا دی تھی مگر بہت لاابالی اور بھلکڑ سے انسان تھے غالباً وہ بھول ہی چکے تھے کہ مجھے لے کر نازو کے ہاں جانا ہے۔

نازو کا گھر زیادہ دور نہیں تھا صرف ایک اسٹاپ کے فاصلے پر تھا۔ کامی اپنی بائیک لایا تھا مگر میں نے اس پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"بائیک سے یا مجھ سے؟" وہ شوخی سے بولا

"نازو کا گھر قریب ہے ہم پیدل بھی جا سکتے ہیں۔" میں نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

"جو حکم۔" وہ سر خم کر کے بولا۔

"ویسے آج تم لگ اتنی اچھی رہی ہو کہ واقعی میں ایکسیڈنٹ کر بیٹھتا۔" کامی میرے سبز کلر کے کرتے چوڑی دار پاجامے اور ستاروں بھرے دوپٹے پر ایک نظر ڈال کر بولا۔

"برائے مہربانی مجھ سے آپ اس طرح کی باتیں مت کریں۔" میں نے روکھے لہجے میں کہا اور قدم آگے بڑھا دیے وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

مجھے کامی کی طرف دیکھتے ہوئے خوف آ رہا تھا کیونکہ کامی کی آنکھیں آج اسی طرح چمک رہی تھیں جس طرح شعیب بھائی کی آنکھیں چمکتی تھیں جب وہ زارا آپی کی طرف دیکھتے تھے۔

"فارہہ! تم مجھ سے اتنی بیزار کیوں رہتی ہو؟ کیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟" کامی نے چلتے چلتے اچانک سوال کیا۔

"نہیں، نفرت تو نہیں کرتی۔" میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر نفرت کا الٹ ایک جذبہ ہوتا ہے یعنی۔" وہ پھر غیر سنجیدہ ہونے لگا۔

"جی نہیں! مجھے اس جذبے سے نفرت ہے۔" میں نے چمک کر کہا۔

"کیوں بھئی؟ بے حد بدذوق لڑکی ہو تم۔ یہ تو زندگی کا خوبصورت ترین جذبہ ہے۔" وہ حیرانی سے بولا

"ہاں اسی جذبے کا نام لے کر تو تمام مرد معصوم لڑکیوں کو بے وقوف بنایا کرتے ہیں۔"

"لیکن میں تو ان لوگوں میں نہیں ہوں فری۔ میں نے تو اپنی صداقت کا ثبوت دینے کے لیے عملی ثبوت بھی دیا ہے۔ شاید تمہیں علم ہو کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے۔"

"مت کریں ایسی باتیں۔ مجھے ان سب باتوں محبت بھرے جذبوں پہ اور دنیا کے تمام مردوں پہ ذرا سا بھی اعتبار نہیں۔"

میں نے جھنجلا کر کہا تو اس نے چپ سادھ لی اور پھر باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔

نازو کا گھر آ گیا تھا گیٹ پر وہ لمحہ بھر رکا۔

"کہو تو لینے آ جاؤں؟"

میں ایک پل کو سوچ میں پڑ گئی اگر منع کرتی ہوں تو پھر تنہا واپس آنے پر اور وہ بھی رات کے وقت امی بہت ناراض ہوں گی۔

"آ جائیے گا دس بجے تک۔ اگر بھائی آ جائیں تو انہیں کہہ دیجیے گا وہ آ کر لے جائیں۔" میں کہتی ہوئی کامی کی طرف دیکھے بغیر اندر چلی گئی۔

شادی میں بہت سی سہیلیاں آئی ہوئی تھیں میری بہت اچھی اور گہری دوست ثمینہ بھی اپنے گول مٹول سے بیٹے کے ساتھ موجود تھی۔ میں ثمینہ سے باتوں میں مصروف تھی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ بارات کا ابھی دور دور تک پتا نہیں تھا۔

باتوں کے دوران وقفہ آیا کیونکہ ثمینہ اپنے بیٹے عمیر کو جو زیادہ ہی تنگ کرنے لگا تھا باہر اپنے شوہر کے پاس چھوڑنے چلی گئی تھی۔

میں یونہی وقت گزاری کے لیے مہمان خواتین کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔

اچانک میری نگاہ ٹھٹھکی اور ایک چہرے پر جم سی گئی

اگرچہ اس چہرے میں کافی تبدیلی ہو گئی تھی مگر گہرے گہرے میک اپ سے آراستہ ہونے کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔

میں تقریباً جھپٹ کر ان کے قریب پہنچی اور خوشی سے چلائی۔

"زارا آپی آپ یہاں؟"

"ارے فارہہ تم۔" زارا آپی نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور ان کی آنکھوں میں بھی پہچان کا رنگ چمک اٹھا۔

"ارے فری! تم کہاں ہو بھئی؟ میں تو تمہیں بہت یاد کرتی ہوں سچ میں نے بہت کوشش کی تمہارے نئے گھر کا پتا کرنے کی لیکن معلوم نہ ہو سکا اور بتا ہے۔"

وہ تیز تیز بول رہی تھیں لیکن میں مارے حیرت اور صدمے کے انہیں دیکھے جا رہی تھی کیونکہ میرے ذہن میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جانے والی زارا آپی گوشت کے بے ہنگم پہاڑ کی صورت میرے سامنے موجود تھیں۔ ایک شوخ کلر کی ساڑی میں اپنا وسیع و عریض جسم چھپائے اور سلیقے سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ وہ یقیناً مجھ سے بہت اچھی لگ رہی تھیں چہرے پر سجی خوشیوں کے رنگ چمک رہے تھے اور رخسار بلش آن سے نہیں بلکہ اچھی صحت کی وجہ سے گلنار سے ہو رہے تھے چہرے پہ مسکراہٹ کھلی پڑ رہی تھی۔

"زارا آپی! آپ کی شادی ہو گئی؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"لو شادی! کئی بچے ہو گئے۔ اے ازہیر، افشاں، عمران ادھر آؤ بیٹا آنٹی کو سلام کرو اور وہ زیب نظر نہیں آ رہی ہے دیکھو فیض بھی اس کے ساتھ ہے۔ سب سے چھوٹا بیٹا ہے میرا، بھئی بہت شرارتی ہے۔"

تین عدد چھوٹے بڑے بچوں نے مجھے آ کر سلام کیا۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے زارا آپی کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔

اچانک ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں آیا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ شعیب بھائی نے دوسری شادی اپنی پسند سے یعنی زارا آپی کے ساتھ ہی کی ہو جبھی تو یہ اتنی خوش ہیں۔ کھلی پڑ رہی ہیں۔

"زارا آپی! آپ کے شوہر؟" میرا جملہ ادھورا رہ گیا وہ خوش دلی سے ہنس کر بولیں۔

"ارے ہاں! میں تمہیں شیرازی سے بھی ملواؤں گی۔ سچ بہت جولی اور بہت ہی اچھے انسان ہیں تم مل کر بہت خوش ہو گی۔" وہ بڑی محبت اور فخر سے اپنے شوہر کا تذکرہ کر رہی تھیں۔

"اے عمران بیٹا ذرا جا کر اپنے پاپا سے ان کا کارڈ لے آؤ۔" انہوں نے ایک بچے کو حکم دیا اور ذرا سی دیر میں بچہ ایک سفید کلر کا وزیٹنگ کارڈ لے کر آ گیا۔

"یہ لو فری! اس پتے پر ضرور آنا، فون کر لینا آنے سے پہلے تاکہ ہم کہیں جائیں نہیں۔" انہوں نے کارڈ میرے پرس میں ڈال دیا۔

میں حیران اور پریشان بیٹھی تھی۔

بچے ادھر ادھر ہوئے تو میں نے حوصلہ کر کے پوچھ ہی لیا۔

"زارا آپی! شعیب بھائی آپ کو یاد ہیں؟"

"شعیب!" انہوں نے لمحہ بھر سوچا اور پھر مسکرا دیں۔

"ارے رانی! اب تو بچوں نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ ویسے وہ دن یاد آتے ہیں تو بڑی ہنسی آتی ہے۔ اپنے اوپر، سچ ناسمجھی کے دور کی حماقتیں بھی کیا خوب مزے دیتی ہیں۔ سچ بڑے آنسو بہائے ہم نے، آہیں بھریں ٹریجڈی گانے سنے لیکن جب شادی ہوئی تو معلوم ہوا کہ زندگی کا اصل اور سچا حسن تو شوہر کے پیار اور بچے کی مسکراہٹ میں چھپا ہوا ہے۔ سچی محبت شادی

بچوں کے سامنے بہت خوش ہوں گے ہے نا فری؟"

"جی۔ جی ہاں!" میں نے چونک کر کہا۔

اور دل میں سوچا کہ آپ بھی اپنی جگہ خوش ہیں — شعیب بھائی بھی خوش ہیں صرف میں ہی اب تک اپنی خوشیوں کو آپ دونوں کی بے ثمر محبت کی وجہ سے ٹھکراتی رہی ہوں۔

"اور تمہارے بچے وغیرہ، شادی تو ہو گئی ہو گی؟" زارا آپی میری طرف متوجہ ہوئیں۔

"شادی نہیں ہوئی ابھی۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ہائیں! شادی نہیں ہوئی۔ ارے بھئی کیوں؟ لو اچھی خاصی عمر تو ہو گئی ہے ویسے ہاں اچھے رشتوں کا بھی تو کال پڑا ہوا ہے۔ بھئی تم میری طرف ضرور آنا فری دو تین بڑے اچھے گھرانے ہیں میری نظر میں۔ کیا خبر تمہاری قسمت سے وہیں ہو جائے۔" وہ روانی سے بولیں۔

"ارے تم یہاں بیٹھی ہو میں وہاں ڈھونڈ رہی ہوں تمہیں؟" ثمینہ ہانپتی کانپتی میرے قریب آ کر بولی تو میں کھڑی ہو گئی۔

"اچھا زارا آپی! پھر میں چلتی ہوں ذرا نازو کے پاس ہو آؤں۔"

"ہاں ہاں۔ مگر دیکھو فری آنا ضرور ہمارے گھر۔" انہوں نے یاد دہانی کرائی اور میں انشاء اللہ کہتی ہوئی اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں دلہن تیار ہو رہی تھی۔

ابھی رخصتی میں کافی دیر تھی کہ ایک بچے نے آ کر بتایا کہ میرے گھر سے کوئی صاحب مجھے لینے آئے ہیں۔

"اچھا پھر میں چلوں گی۔" میں نے ثمینہ اور نازو کی امی سے اجازت لی اور باہر آ گئی۔ شادی کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں اور پورا گھر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

گیٹ کے قریب ہی کامی کھڑا ہوا تھا۔

وہ کچھ بولا نہیں بس چپ چاپ چل پڑا۔

"اچھا ہوتا اگر اسکوٹر ہی لے آتے۔ اتنی دور پیدل ہی چلنا پڑے گا۔" کچھ دیر بعد میں بڑبڑائی تو اس نے پلٹ کر میری طرف حیرانی سے دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کمال ہے تمہیں تو اسکوٹر پہ بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔"

"ہوں۔ ڈر تو زندگی میں بہت سی چیزوں سے لگتا ہے لیکن۔ وہ میں نے سوچا کہ بیٹھوں گی ایک بار تبھی تو ڈر نکلے گا نا۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر کسی بائیک والے سے ہی واسطہ پڑ جائے۔" میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا تو کامی کا چہرہ کھل اٹھا۔

"گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ شاید یہ محاورہ لڑکیوں کے ہی لیے ایجاد کیا گیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے مگر میرے لیے تو یہ محاورہ صحیح رہے گا۔ کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔" میں نے نادم لہجے میں جواب دیا۔

"کامران! میں آپ سے شام کو کی گئی باتوں کی معذرت چاہتی ہوں مجھے معاف کر دیں گے۔"

"اس طرح نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"پھر کیسے؟" میں نے کچھ مایوسی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔

"تین بار اقرار کرنا ہو گا۔ پھر معافی ملے گی۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

گھر قریب آ چکا تھا میں چپ چاپ آگے بڑھتی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہو، فارہہ کر لو گی نا اقرار۔" وہ دروازے کے قریب رک کر سرگوشی میں بولا۔

میں نے پل بھر کو کامی کی طرف دیکھا اقرار کا وہ لمحہ اتنا خوبصورت اور اتنا مشکل تھا کہ میں گنگ سی رہ گئی پھر میں اپنے دل کی منتشر دھڑکنوں پر قابو پا کر اٹکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ مجھے لگتا ہے اب تو کرنا ہی پڑے گا۔" اور یہ کہتے ہی جلدی سے گھر میں داخل ہو گئی۔

*

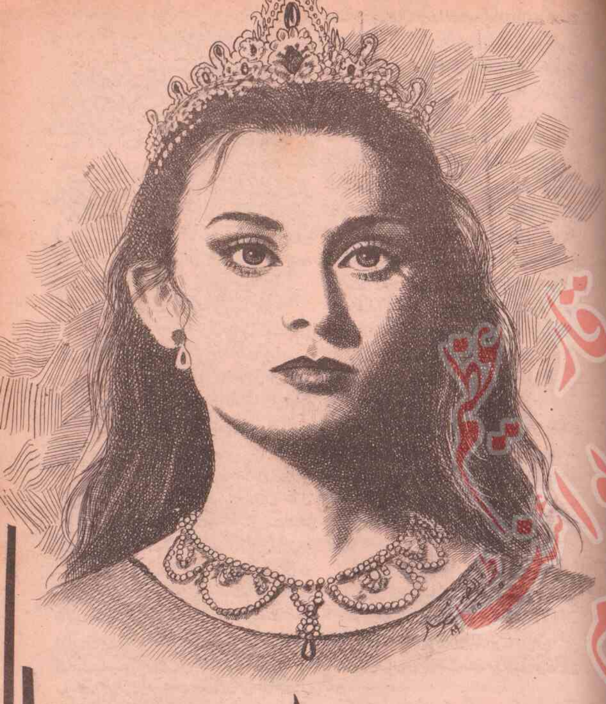

ریت اور سمندر

افسر سلطانہ

"میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں حماد صاحب۔" جب اس کم بخت نے بغیر نگاہیں اٹھائے اپنی پارسائی کو مزید معتبر بنانے کی کوشش کرتے ہوئے میری چائے کی پیشکش کو بے رخی سے ٹھکرا ڈالا تو میری رگ رگ میں جلن ہونے لگی۔ یعنی وہ لڑکی جسے میں بمع اس کے گھٹیا کرتوتوں کے عرصہ چار سال سے جانتا تھا۔ اس بے حیا نے میرے دیکھتے دیکھتے دو محبوب بدلے۔ دیدہ دلیری سے ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد پھر پہلے کو قبول کر کے زندگی انجوائے کرتی چلی آئی تھی۔ کس طرح ڈھٹائی سے میری آنکھوں میں دھول بلکہ ریت کے بگولے جھونک رہی تھی۔ میں جل کر کباب بلکہ سیخ کباب ہو گیا۔ کیسے کیسے بہروپیے ہوتے ہیں اس معصوم سی دنیا میں کیسے کھلم کھلا دھوکے۔ میری سانسیں الجھنے لگیں۔

"صرف چائے پینے کے لیے تو کہہ رہا ہوں۔"

میرے لہجے میں ڈھیر سا تمسخر تھا۔ چاہتا تھا بے بھاؤ کی سنا کر ان کا کچا چٹھا کھول کر اس کی ہتھیلی پر دھر دوں پر صاحب کے بلاوے نے اس کی مہلت نہ دی۔ وہ بڑی معصوم سی صورت بنا کر فائل اٹھا یہ جا وہ جا۔ میں دانت پیستا رہ گیا۔ بنتی ہے فرشتہ اونہہ۔ دانت کچکچا کر میں اس کی پشت پر پھیلے سیاہ بالوں پر اس کی صورت کی طرح لعنت بھیجتا گیا۔

وہ اس آفس میں چار سال پہلے بے حد گھبرائی اور خوفزدہ سی آئی تھی۔ لیکن اس سہمی سہمی لڑکی نے ہم تینوں میں سے کسی کو بھی لفٹ نہ کروائی شروع شروع کے دنوں میں نے اور عالی نے خاص طور سے اس کے قریب ہونے کی کوشش کی لیکن وہ بے حس سی اپنی میز پر پڑی فائلوں میں الجھی پوز کرتی رہتی۔ دو تین ہفتے گزرنے کے بعد ہم پیچھے ہٹ گئے اس لیے کہ ایک سالونے سلونے لڑکے کی آمد اور اس کی دھڑلے سے ہمت افزائی پر ہمیں پسپا ہو جانا پڑا۔ وہ لڑکا ایک عام کاروباری ضرورت کے تحت ہمارے آفس میں آیا تھا۔ جب تک اس کا کام ہوتا رہا مجھے اچھی طرح یاد ہے ان دونوں میں کسی قسم کی گفتگو تو کیا اشارہ بھی نہ ہوا تھا۔ لیکن فائل میں سے ضرورت کا کاغذ نکل جانے کے بعد وہ اچانک ہی جان پہچان والے بن گئے۔

وہ اکثر چھٹی کے وقت اسکوٹر لیے باہر کھڑا رہتا۔ سیاہ رنگ کی موٹر بائیک پر کئی مرتبہ وہ ہمارے سامنے دیدہ دلیری سے چڑھ کر بیٹھ جاتی میں اور عالی شیشوں کے پیچھے سے کھڑے ہو کر کئی مرتبہ یہ تماشا دیکھ چکے تھے۔ دو ایک مرتبہ ہم نے اسے بہت قریب سے بھی دیکھا لیکن وہ بڑی جرأت سے ہمیں نظرانداز کر گئی۔ حد تو یہ ہے کہ جب وہ اگلے دن آفس آتی تو سر اٹھا کر گھومتی رہتی۔ یہاں تک کہ ایک پل کے لیے بھی اس کی نگاہوں میں شرمندگی نہ جھلکتی۔ اس بے حیائی پر میرا تو دل چاہتا ڈوب مروں لیکن وہ لگتا تھا بے حس ہو گئی ہے۔ بے پروا۔

اس لڑکے کا نام سرور تھا اور چونکہ سینئر ہونے کی بنا پر فون میری ہی میز پر رہتا تھا لہٰذا با دل نخواستہ فون مجھے ہی اٹینڈ کرنا پڑتا۔ دل پر چھریاں لیے میں اسے سرور کے فون کے بارے میں مطلع کر دیتا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے وہ اس سے دھیمے دھیمے سروں میں دس دس منٹ گفتگو کرتی رہتی۔ لوٹتے سانپوں کو قابو کرنے کے لیے میں فائلوں پر جھک تو ضرور جاتا لیکن دو کم بخت کان اسی طرف متوجہ رہتے۔ وہ اتنی محو ہوتی۔ اس قدر کھوئی رہتی کہ اسے احساس بھی نہ ہوتا کہ نہ دیکھنے کے باوجود بھی میں اسے اکثر بیشتر دیر تک باتیں کرتا دیکھنے لگتا اور جلتا رہتا ہوں۔

"رات کھانے پر امی جان تمہاری منتظر رہیں گی۔"

میں زیر لب مسکراتا رہتا، تلملاتا رہتا۔

صاف کیوں نہیں کہتی کہ میں منتظر رہوں گی۔ واہ ری عورت۔ زبانی جمع خرچ میں تو تیرا جواب نہیں۔ کبھی وہ اسے جلوے کی اطلاع دے کر میرا کچومر بنا ڈالتی کہ باقی تو اسٹاف ممبرز الگ ہو گئے تھے لیکن میرے دل سے وہ اپنی برائیوں سمیت یا تو باہر نکل نہ پائی تھی یا میں شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

اکثر وہ فون پر سرور سے نہ آنے کا گلہ بھی کرتی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے میں نے خود کتنی بار سنا۔ اس نے اپنے باپ کے گھر پر نہ ہونے کی اطلاع سرور کو دے کر بھی بلوایا تھا۔ اس کا لہجہ خطرناک حد تک مخلصانہ اور گزارشانہ ہوتا۔ دل میں دہکتی آگ کو میں زبان کی کپکپاہٹ سے سرد کرتے کرتے تھکنے لگتا۔

کس قدر دوغلی فطرت کی لڑکی ہے۔ آفس میں مومنا صدقنا۔ آمنہ بنی رہتی۔ سر پر چادر رکھے۔ مجال ہے جو کسی کو سر اٹھا کر دیکھ لے۔ بات کر لے، کچھ کہہ دے، پوچھ لے، اور آفس سے باہر اسکوٹر پر اڑی پھرتی ہے۔ نہ صرف میں نے بلکہ عالی اور ظہور نے تو اسے سرور کے ساتھ ایک کیفے ٹیریا میں بیٹھے بھی دیکھا تھا۔ ویسے ہم جان گئے تھے معمولی درجے کے کلرکوں کو وہ کیوں اہمیت دیتی۔ جبکہ میں نے ہمت

کر کے ایک دن سرور کے بارے میں پوچھا، کریدا، اور اس کریدنے کے لیے مجھے جان جوکھوں سے گزرنا پڑا۔ پسینہ پونچھا کئی بار کھنکھارتے ہوئے قریب سے گزرا۔ ادھر ادھر ہوا۔ جوتے کے تسمے درست کیے۔ گلا صاف کیا۔

"سرور صاحب کیا کام کرتے ہیں؟"

"مقامی بینک میں کلاس ٹو آفیسر ہیں۔"

مجھے محسوس ہوا اسے میرا سوال کرنا قطعی اچھا نہیں لگا تھا کیونکہ میرے سوال کا جواب دینے کے بعد وہ فوراً ہی فائل میں کچھ اس قدر محو ہو گئی بلکہ فائلوں کے بوجھ میں چھپ گئی۔ اس دن اس نے لنچ کے لیے بھی سر نہیں اٹھایا۔ چند لمحوں میں کف افسوس ملتا رہا۔ کم از کم اسے کھانا تو ضرور کھانا چاہیے تھا۔

پھر

اچانک ہی سرور کے فون آنے بند ہو گئے۔ ان دنوں وہ ہم سب کو خاص طور پر مجھے بہت گھبرائی اور پریشان لگی۔ ایک انجانی مسرت تھی۔ اندر ہی اندر میں حد درجہ مسرور رہنے لگا۔ وہ جو اپنی پارسائی کا بڑا اعلیٰ و افضل ڈھونگ رچاتی تھی اس کا بھیانک انجام تو اس سے بھی برا ہونا چاہیے تھا۔ میرے اندر کا شیطان کود کود کر اچک اچک کر اچھل اچھل کر خوشیاں منانے لگا۔ مجھے ہی کیا عالی اور ظہور بھی میرے سو فیصد بلکہ ایک سو ایک فیصد ہم خیال تھے وہ سب کو نظرانداز کرتی چلی آئی تھی اتنی کہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کی بھی روادار نہ تھی۔ اس کا اتنا اچھا انجام ہمارا——— ڈھیروں چلوؤں خون بڑھا رہا تھا۔ میں اور عالی خاص طور سے خوب لطف اندوز ہوتے۔

"آج کل سرور صاحب فون نہیں کرتے؟"

اس کے آفس آتے ہی میں نے سوال کیا۔ اچانک اور اس قسم کے غیر متوقع سوال پر وہ ایک نگاہ ڈال کر رہ گئی۔ نہ جانے نگاہ گرم تھی یا نرم اس لیے کہ اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا کوئی جواب دیتی عالی نے اس سے اتنے دنوں نہ آنے کی وجہ بھی پوچھ ڈالی۔

"ابا جان کا انتقال ہو گیا۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

یہ بات یقیناً قابل تحسین تھی کہ اس نے خود کو کافی سنبھالا ہوا تھا۔ اس کے لہجے میں جو دکھ اور درد تھا۔ اس پر ہم سب دیر تک کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ باری باری میں نے، عالی نے اور ظہور نے تعزیت کی باقی لوگوں کو بھی بتایا۔ وہ بھی سب اسے تسلیاں دینے لگے۔ وہ صرف نم آنکھوں سے سنتی رہی بولی کچھ بھی نہیں۔

"آپ نے اطلاع کیوں نہیں کروائی؟" صدیقی صاحب اٹھ کر قریب آئے۔

"ہم یہاں نہیں تھے صدیقی صاحب!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "شادی میں شرکت کے لیے لاہور گئے تھے۔ یہ خبر نہیں تھی کہ خوشی موت میں تبدیل ہو جائے گی۔" صدیقی صاحب تعزیت کے بعد عادتاً اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

"بس بھئی! آپ پتا لکھوا دیں، پورا اسٹاف تعزیت کے لیے آنا چاہتا ہے۔" عالی نے کاغذ اس کے سامنے رکھتے ہوئے قلم بھی تھما دیا۔

وہ دیر تک اس کے ان دیکھے ان ملے باپ کی تعریفیں کر چکا تھا۔ میں اور ظہور ہنسی روک کر اپنی اپنی میزوں پر جا بیٹھے تھے۔ پتھر کو جونک لگتا دیکھ کر مجھے اس وقت عالی ضرورت سے زیادہ ابنارمل لگا۔

"ابھی تمام گھر والے لاہور ہی میں ہیں۔ میں آفس کی وجہ سے آ گئی ہوں۔ آپ لوگ بعد میں تشریف لائیں۔"

وہ عالی سے مخاطب ہونے کے بعد فون کا ڈائل گھمانے لگی۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ سب کا قوی خیال تھا کہ وہ ہمیں اپنے گھر نہ بلانے کا بہانہ تراش رہی ہے۔ شاید، شاید اسے یہ خوف ہو، ہم میں سے کوئی میں اور ظہور عالی یا کوئی اور اس کے گھر والوں کے سامنے سرور کا تذکرہ نہ کر ڈالیں۔

"احتیاط اچھی چیز ہے۔" عالی منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسا۔

"بیٹے! اس نے کچی گولیاں کھیلی ہوتیں تو اب تک ہمارے قابو میں آ چکی ہوتی۔" ظہور کے جبڑوں کے ساتھ اس کی توند بھی ہلنے لگی۔

"ہاں بھئی ہاں، ہم کیا اور ہماری حیثیت کیا۔ وہ تو کلاس ون اور ٹو کو گھاس ڈالنے کی عادی ہے۔"

"لیکن کلاس ٹو تو دغا دے گیا۔" شفیق اپنے قلم کو ایک طرف رکھتا ہوا بولا۔

"ارے بھئی روٹھ گیا ہو گا، منا لے گی۔"

لیکن ایسی نوبت نہیں آئی باپ کے مرنے کے بعد سے لے کر تقریباً چھ مہینے تک ہمیں سرور تو کیا سرور کی پرچھائیں بھی نظر نہ آئی۔ وہ اپنی میز پر ہمیشہ ہمیں سوچتی نظر آتی۔ خاموش خاموش، ہم سب اسے دیکھتے رہے۔ سرور کی جدائی کے بعد ہم نے دیکھا۔ اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی داخل ہو سکے۔ وہ بڑی شکستہ نظر آتی تھی، ٹوٹی ٹوٹی سی،

شاید وہ اس عادی مجرم گروپ سے تعلق رکھتی تھی جو محبوب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا ایک محبوب کی بے وفائی کا صدمہ بھگتنے کے بجائے اس نے جلد ہی ایک اور نیا محبوب دریافت کر ڈالا۔ قسمت کی دھنی تھی، اس مرتبہ اسے پہلے سے بھی بہتر چیز دستیاب ہوئی تھی۔ ہماری گنہگار آنکھوں نے دیکھا کہ یہ نیا مرغا کچھ زیادہ ہی ناز نخرے اٹھا رہا تھا۔ عمر میں تو مجھے وہ اس کا ہم عمر ہی لگتا تھا۔ مجھے اپنی بہنیں بے تحاشا یاد آئیں جن کے شوہر عمر میں تگنے یا کم از کم دُگنے ضرور تھے۔ میں ٹھنڈی سانسیں بھر کر رہ گیا۔ لڑکیوں کو اپنی کوششوں سے شاید زیادہ اچھے رشتے مل جاتے ہیں لیکن کیا آسمان پر جوڑے بننے والی بات تدبیروں سے بدل جاتی ہے؟ اس بات میں کوئی سچائی ہوتی بھی ہے یا نہیں یا یہ صرف اور صرف بزرگوں کے بہلاوے ہیں۔

مسٹر عثمانی کی فیئرویل تھی۔ ہم نے باقی چیزیں ریڈی میڈ خریدی تھیں البتہ فروٹ چاٹ کے لیے ظہور نے اس کی مدد مانگی۔ میں نے محسوس کیا اس نے بہت ہچکچا کر اپنی منظوری دی تھی، منظوری دینے سے پہلے یقیناً اس نے کسی ضروری کام کا تذکرہ کیا تھا جو اس کی موجودگی کے بغیر نامکمل رہ جانے کا سو فیصد خدشہ ثابت کرتا تھا۔

بہرحال پانچ بجے پارٹی شروع ہونا تھی۔ اس نے اپنے حصے کا کام چار سے پہلے ہی ختم کر ڈالا۔ پھر وہ خاموشی سے مزید ادھورے کام بھی نمٹاتی رہی لیکن چہرے پر اتنی سختی، اتنا وقار، اتنی متانت تھی کہ ہم میں سے کسی کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے ایک لفظ بھی کہہ ڈالتا۔ پارٹی ابھی شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ پرس اٹھا کر جانے لگی۔

"مس یحییٰ!" میں دوڑ کر نزدیک بھاگا "آپ جا رہی ہیں؟"

نہ جانے کیوں اس لمحہ میرا دل چاہا میں اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالوں۔ پوچھوں کہ وہ کہاں کیوں اور کس لیے جا رہی ہے؟ جانے میرے ذہن میں یہ واہیات خیال کس طرح آگیا تھا۔

"جی۔ ہاں۔" وہ بغیر میری طرف دیکھے اپنے خوبصورت پیروں پر مڑ گئی۔ اس کی سانولی رنگت میں بڑی کشش نمایاں تھی۔

"مجھے ایک بہت ضروری کام ہے، آپ عثمانی صاحب سے معذرت کر لیجیے گا۔"

اس کی سیاہ آنکھوں میں دکھاوے کی بھی مروت نہ تھی۔ مجھے غصہ آگیا۔ بے طرح، بری طرح، اب اس پل میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ میں اسے دانتوں سے کچلوں یا نظروں کے وار سے قتل کر ڈالوں۔

"معذرت تو میں کر لوں گا، لیکن ریٹائرڈ لوگ بے حد حساس ہو جاتے ہیں۔ یہ میرے خیال میں آپ مجھ سے بہتر جانتی ہوں گی اتنی پہچان تو ہمیں ہونا چاہیے نا مس یحییٰ۔" میں نے بے حد کاٹ دار لہجہ اختیار کیا۔

"پہچان،" وہ پہلی مرتبہ ہنسی اور بے اختیار کھلکھلا اٹھی میں سمجھ ہی نہ پایا اس نے ایسا کیوں کیا۔ شاید کوئی بیتی بات یاد کر کے ہنس دی ہو یا شاید اس کے محبوبوں میں سے کوئی یہ لفظ استعمال کرتا ہو یا آج کل محبتوں کی اونچی اڑان میں مصروف ہو۔ اتنی اونچی بغیر پروں کی بے تحاشا اڑان کہ جہاں سب کچھ نظروں سے دور ہو جاتا ہے۔ دور بہت دور اور تنہا شخصیت اس وقت اپنی ذاتِ واحد پر بھی قابو نہیں پا سکتی۔

"حماد صاحب! اگر آپ مجھے نہ جھٹلائیں تو یقین جانیے۔ پہچان تو گیا، انسان کو خود اپنی بھی پہچان کا دعویٰ نہیں ہونا چاہیے، ہم کیا ہوتے ہیں، خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ یہ بعض اوقات ہمیں بھی پتا نہیں چلتا۔"

اس کے رخساروں کا ڈمپل اور گہرا ہو گیا۔ اس سمے مجھے وہ اچھی لگنے کے باوجود اچھی نہیں لگی۔ بے حد بری تھی وہ۔

"اس پہچان میں بار بار بھی غلطی ہو سکتی ہے۔" وہ کھٹ کھٹ کرتی میری نظروں کی پہنچ سے بھی دور ہو گئی۔

"مس یحییٰ چلی گئیں۔" ظہور نے کافی دیر بعد نظریں ادھر ادھر دوڑا کر مجھ سے پوچھا تو میں صرف نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ میرا دل حقیقتاً بالکل نہ چاہا کہ میں اس بے ہودہ سی لڑکی کے بارے میں اپنے منہ سے ایک لفظ بھی ضائع کروں۔

"شاید کوئی بہت ضروری کام ہو گا۔" ظہور بے چارہ خود ہی اپنی رائے دے کر مڑ گیا۔

پارٹی شروع ہونے میں بمشکل دس پندرہ منٹ باقی تھے۔ کینٹین سے مطلوبہ مقدار میں سوفٹ ڈرنک دستیاب نہ

ہونے کی صورت میں ہم سب کو از حد ٹینشن تھی۔ ظہور نے مجھے اور عالی کو دوڑایا۔ میری کھٹارا اسکوٹر راستہ میں اٹکی زیادہ چلی کم۔ آخر کار مطلوبہ جگہ پہنچ کر ہم کافی دیر ٹھنڈی سانسوں کا تبادلہ کرتے رہے لیکن چند گھڑیوں پہلے والی سانسیں سینے میں اٹک گئیں۔ یحییٰ اسی خوبرو اور توانا نوجوان کے ساتھ ہمیں فیملی روم میں جاتی نظر آئی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تو یہ تھا ضروری کام۔ جس کی وجہ سے ایک بوڑھے اور ضعیف انسان کے احساسات و جذبات کو بالائے طاق رکھ کر وہ یہاں رنگ رلیاں منانے چلی آئی تھی۔ میں پارٹی میں تمام وقت اندر ہی اندر کھولتا رہا سچ تو یہ تھا کہ عثمانی صاحب کی الوداعی پارٹی میرے لیے شدید ذہنی کوفت کا باعث بن گئی تھی۔

اگلی صبح جب یحییٰ آفس میں گھسی تو کراہیت سے ہم سب نے منہ پھیر لیا۔ ہم سب مل کر طنزیہ جملوں میں اس کے کرتوتوں پر بار بار لعنت بھیجتے رہے لیکن اللہ جانے وہ کس موٹی کھال میں منڈھی ہوئی تھی کہ نہ اس کی پیشانی پر کوئی بل آیا۔ نہ چہرے پر ندامت۔ ایک جوابی لفظ بھی نہ بولی سنجیدگی سے فائلوں پر جھکی اپنا کام نمٹاتی رہی۔ ہم بیچارے معصوم اپنی ڈفلی اپنے راگ کے مصداق خاموش ہو بیٹھے۔

شروع کے دنوں دو ایک مرتبہ میں نے اور عالی نے اس کے نئے عاشق نامدار کا تاریخ جغرافیہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کبھی عالی کی نانی مرتی، کبھی میری دادی، غرض جس دن بھی یحییٰ ہاف ڈے لیتی ہم دونوں بھی اس کے پیچھے ہو لیتے۔ نہ جانے ہم دونوں ایسا کیوں کرتے تھے۔

شاید یہ وہ آگ تھی جو اس کے نظر انداز کرنے کی وجہ سے مستقل ہمارے اندر بھڑک رہی تھی۔ لیکن ایسے موقع پر اس کی چھٹی حس اس کا خوب ساتھ دیتی تھی (اس طرح کی لڑکیاں غیر معمولی حسیات کی مالک ہوتی ہیں) جب بھی ہم اس کا پیچھا کرتے وہ اپنا پروگرام ہی بدل ڈالتی۔ سیدھی گھر جاتی۔ ہم دونوں دو چار کرارے جملوں سے دلِ سوختہ کو تسکین پہنچاتے اپنی سالوں پہلے مری دادی اور نانی کا سوگ کسی منڈیر پر بیٹھ کر مناتے اور بدھوؤں کی طرح گھر لوٹ جاتے۔

اِس دن وہ اپنا کام ختم کر کے باہر نکل رہی تھی میں بھی اپنا پروموشن لیٹر لیے اس کے سامنے آگیا۔

"مبارک ہو۔ حماد صاحب۔" اس نے بہت خلوص اور محبت سے کہا اتنے کہ وہ جو ہمارے لیے ایک گھٹیا کردار تھی جس سے میں شدید نفرت کرتا تھا۔ اچانک ہی پل بھر کے لیے اتنی اچھی لگی کہ میں اسے چند لمحے دیکھتا رہ گیا۔ لیکن مبارکباد دینے کے بعد وہ بس اسٹاپ تک ایسی بنی رہی گویا میں وہاں موجود ہی نہ تھا۔ میں پھر بھن رہا تھا۔ اندر ہی اندر۔

اگلے دن—

میں اور عالی—— اپنی اپنی پروموشن کا جشن منا رہے تھے۔ آئس کریم ہاتھوں میں تھامے قہقہے بکھیرتے بکھیرتے عالی کی کہنی کے ٹھوکے نے مجھے سامنے دیکھنے پر مجبور کر ڈالا۔ وہ اپنے اسی نئے محبوب کے ساتھ خراماں خراماں معطر معطر چلی آرہی تھی۔ ہمیں یاد آیا۔ آج وہ آفس نہیں آئی تھی گو عالی نے ریت میں اپنی ایک عدد ٹانگ جان بوجھ کر گھسیٹتے ہوئے نظارہ دیکھنا چاہا لیکن میں اسے گھسیٹتا ہوا فوراً ہی ہٹ گیا۔ میں نے اپنے دل کو بہلا لیا تھا۔ میں اس سے نفرت کر رہا تھا۔

"اب بغیر ٹکٹ مزہ لوٹتے۔" عالی نے آنکھ دبائی۔

"عالی!" میں نے دانت پیستے ہوئے اپنے اس عزیز ترین دوست کو دیکھا جسے میں نے آج تک نظروں کی تلخی سے بھی نہ چھوا تھا۔

"صرف دو پہیے لگا کر شکل یاد کرنا تھی۔" وہ ہنسنے لگا بے تحاشا۔ قلقل۔ قلقل۔

"شکل یاد کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔" میں بھی زبردستی ناک سکیڑ سکیڑ کر مسکرانے لگا "ہاں کردار سمجھنے کے لیے برسوں درکار ہوتے ہیں۔"

اماں کے بھانجے کے بھتیجے کی خالہ کے بیٹے کے دادا کے انتقال کی خبر سن کر مجھے مجبوراً لاہور کوچ کرنا پڑا۔ وہاں کافی دن رکنے کے بعد جب میں واپس آیا تو میری نگاہ اس میز پر پڑی جہاں وہ بیٹھی تیز تیز ٹائپ رائٹر پر انگلیاں دوڑا رہی تھی، جس رفتار سے اس کی انگلیاں چل رہی تھیں عالی نے بتایا اسی رفتار سے وہ دنیا کو بیوقوف بنا رہی تھی یعنی اس نے محبوب کو تبدیل کر کے پھر سرور کو گلے لگا لیا تھا۔

"گھاگ قسم اوّل ہے۔" ظہور نے ٹکڑا لگایا۔

"جدھر کا پلڑا بھاری دیکھتی ہے۔ وہی انتخاب کر ڈالتی ہے۔ وہ تو ہمارے عہدے اس کی حیثیت کے نہیں، ورنہ ہمیں بھی قابو کر ڈالتی۔" نیا بھرتی ہونے والا اکرم بھی اب ہماری طرح بولنے لگا تھا۔

ہفتہ بھر کی غیر حاضری کے بعد اس کی درخواست آئی تو ہمیں باتوں کا ایک نیا عنوان مل گیا۔ اس کی ماں شدید بیمار تھی۔

"صدمہ سے بیمار ہو گئی ہو گی۔ بیٹی کے محبوب بدلنے کا صدمہ کچھ کم تو نہیں۔" ظہور کے ساتھ شفیق نے بھی اپنی رائے کا کھلم کھلا اظہار کیا۔ وہ پورے اسٹاف کے لیے گفتگو کا ایک بہترین بلکہ پسندیدہ ترین موضوع تھی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دونوں دعویدار ایک ساتھ ہی پہنچ گئے ہوں اور بے چاری اماں سے کوئی ہضم نہ ہو رہا ہو۔" ظہور کھی کھی کرنے لگا۔

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنانے کی خواہش نہ کر سکا ہو۔" اکرم پھر ترایا۔

"اور وہ تیسرا ڈھونڈنے نکل گئی ہو۔" شفیق نے رائے پیش کی۔

"اب یا تیں ہی ہوں گی یا اس کی ماں کو بھی دیکھنے جانا ہے۔" صدیقی صاحب۔ اللہ میاں کی گائے جو بڑے حوصلے اور خاموشی سے ہماری گفتگو صرف سُنا کرتے تھے۔ آج بولے۔

"میرا تو دل نہیں چاہتا۔" میں صاف صاف دو لوٹک بات کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔

"دل چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

صدیقی صاحب نے کچھ ناگواری سے مجھے دیکھا۔

"خون کھول جاتا ہے۔" میں نے گرمجی سے سر ٹیک دیا۔

"دو تین گھونٹ پانی کے چڑھا لینا۔" ظہور ہنس دیا۔ تنقید سب کرتے تھے لیکن صرف ذہنی تفریح کے لیے جب کہ میں اسے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا کر پیش کیا کرتا تھا۔ یقیناً یہاں میری وہی ازلی حساسی عادت مجھے ذہنی کرب میں مبتلا کر ڈالتی تھی۔

ہم ہسپتال پہنچے تو نرس کے ذریعہ مس یحییٰ کی ماں کی بیماری کی شدت کا اندازہ ہوا۔ وہ آٹھ دن بعد ہوش میں آئی تھیں۔ ہم سب وارڈ میں داخل ہوئے تو ہماری نظریں بیک وقت سرور اور ساحل سمندر پر رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے یحییٰ کے محبوبوں پر پڑیں۔ یحییٰ خاموشی سے ماں کے پائنتی بیٹھی تھی۔ ہم سب کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بڑے مخلص عاشق ہیں۔ ایک وقت میں دونوں موجود۔" عالی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"حالانکہ شفٹ میں ہونے چاہیے تھے۔" میں مسکرایا۔ میرے اندر کا آدمی گنگنایا۔

"آپ کی والدہ کی طبیعت خراب ہونے کی اطلاع ہمیں آج ہی ملی۔ کم از کم آپ فون ہی کر دیتیں۔" ہم سب نے شکوہ کیا۔

ذکیہ بلگرامی کے ۳ نئے ناول

بندھن
خوبصورت چار رنگا سرورق
مجلد بڑا سائز، قیمت ۲۱ روپے

گئے موسم کے گلاب
چار رنگا خوبصورت سرورق ۳۰ روپے
پیپر بیک ایڈیشن قیمت ۱۵ روپے

سرابِ زندگی
خوبصورت چار رنگا سرورق
مجلد بڑا سائز، قیمت ۶۰ روپے

ڈاک خرچ فی کتاب ۵ روپے، لیکن دو کتابیں ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ ہمارے ذمہ

شفیع برادرز، پوسٹ بکس ۵۸۶ کراچی

"میرے کراچی نہ پہنچنے پر روٹھی تھیں۔ شاید آپ سب پر بھی غصہ اتارا ہو گا۔" وہی ساحل سمندر والا لڑکا جلدی سے بولا۔

ہم سب نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا

"آپ کی تعریف۔" عالی سے نہ رہا گیا۔

"خادم کو عرفان کہتے ہیں۔ اس لڑکی یحییٰ کا بھائی ہونے کا شرف حاصل ہے۔"

"بھا۔ ئی۔" ہم سب کورس میں ہکلائے۔ تتلانا بھی بعید نہ تھا۔

"کیوں آپ سب کو بڑا تعجب ہو رہا ہے؟" وہ خوبصورت مسکراہٹ لیے ہوئے بولا۔

"اصل میں مس یحییٰ نے ہمیں اس قابل نہیں سمجھا کہ آپ سے تعارف کروا دیتیں۔" عالی تڑپ کا پتا پھینکتے ہوئے بولا۔

"جبکہ آپ تو آفس بھی آئے تھے فائل کے۔" وہ سرور سے بھی مخاطب ہوا۔

"اس وقت تو خیر مصلحت تھی۔" سرور ہنسا۔

"کیا مصلحت تھی۔" عالی نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ میں جانتا تھا اس کے اندر کی کیفیات کیا تھیں۔ یقیناً مجھ سے بہتر نہیں ہو سکتی تھیں اور میں تو ابتر ہو رہا تھا۔

"اصل میں حماد صاحب!" وہ میری ہونق صورت کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یحییٰ کی خواہش تھی کہ میں اس کا حوالہ نہ دوں۔ یہ سفارش پسند نہیں کرتی۔"

"ایسی بھی کیا بات تھی۔ کام کے بعد تعارف ہو جاتا۔" میں نے سہمے ہلکے سروں میں شکوہ کیا۔

"اول تو میں اس کے بعد آفس میں آیا ہی نہیں۔ کبھی کبھار اسے پک کرنے آ جاتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس بیچاری کی بڑی پریشانیاں تھیں۔" سرور ہمیں کوک کی بوتلیں دیتے ہوئے مسکرایا جو عرفان نے نہ جانے کس سے منگوائی تھیں۔ "بابا نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ کسی طور پر مجھے باہر بھیجنے پر رضامند نہ تھے۔ یحییٰ کی کوششوں سے میں ابا کی مرضی کے ساتھ باہر بھی جا سکا اور امی جان بھی مطمئن رہیں۔ کاش ابا زندہ رہتے۔" وہ ایک لمحہ کے لیے دل گرفتہ سا ہو گیا۔ "عرفان کو تو خیر میں نے پچھلے سال خود ہی بلایا تھا۔"

وہ ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"آپ خود ہی بتائیں یہاں کی تنخواہوں میں کیسے انسان گھو بنائے۔ کیسے گھر کا خرچ چلائے۔"

"اور میری بہن کا غصہ ابھی تک آسمانوں کو چھو رہا ہے۔ جبکہ مجھے قطعی چھٹی نہیں مل رہی تھی۔"

"اب بھی نہ آتے۔ تھوڑے سے ریال اور دینار بھیج دیتے۔" وہ روٹھی روٹھی ترچھی ترچھی عرفان سے مخاطب لڑکی کھٹاک سے میرے دل میں منتقل ہو گئی۔

"اوہ سویٹ سسٹر! اب تو ہنس دو۔ سرور بھائی تو کب سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہاں شیخ اپنا داماد ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاگل ہوا جا رہا ہے۔" عرفان بذلہ سنجی سے اس کے کندھے ہلاتا ہوا بولا تو وہ ایک دم ہی کھلکھلا پڑی۔

"گڈ۔ گڈ۔ ویری گڈ۔ اسی بات پر مستقل تین دن ہوٹلوں کا کھانا اور ساحلوں کی سیر لیکن امی جان کے مستقل ٹھیک ہونے پر۔" عرفان بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگا۔

"یہ تمہاری ہوٹلوں میں پیسے برباد کرنے اور ساحلوں پر گھومنے والی عادت کب جائے گی عرفان۔" سرور نے اسے پیار سے گھر کا۔

"عادت ڈالی تو آپ کی وجہ سے ہے۔" وہ اس کے کان کے پاس آ کر بولا۔ "جب آپ گھر بدر ہوئے تھے۔ اس وقت ہم بہن بھائیوں کی ملاقات کہاں ہوتی تھی؟"

"پھر بھی۔ تمہاری ہوٹل میں کھانا کھانے کی عادت بچپن سے ہے۔ یاد ہے امی سے خاص طور سے ایک روپیہ لے کر تم ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔"

"اور آپ اپنے روپے کی پتنگ اڑاتے تھے۔" وہ آپس میں ایک دوسرے کا ماضی کرید رہے تھے ہنس رہے تھے اور ہم سب منوں ٹنوں پسینوں میں نہلتے باہر نکل آئے۔

اور ——

جب پچھلے مہینے میں یحییٰ کو بیاہنے خاص طور سے سلطانی سہرے میں تمام وقت منہ چھپائے بیٹھا رہا تو یہ بات میری سمجھ سے بالاتر رہی کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں کیا؟ اور یہ بتانے کی تو قطعی ضرورت نہیں کہ حجلہ عروسی میں داخل ہوتے وقت میری کیا حالت تھی۔ یحییٰ کو رونمائی میں دینے کے لیے مجھے برسوں برس کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ اللہ قسم! لمحہ لمحہ لگتا تھا۔ سرخ گھونگھٹ سے جھانکتی آنکھیں قہقہے لگا لگا کر پوچھ رہی ہیں۔

"کیا تمہیں اپنی پہچان ہے مسٹر حماد درانی؟"

☆

ساحلوں کی شام

نبیلہ نقوی

جلال ماموں کی آمد کی خبر پا کر اماں کی باچھیں کانوں کو جا لگیں۔

"میرا بھائی پورے بیس سال بعد آئے گا۔ خدا ساتھ خیریت کے لائے۔ میرا ماں جایا۔ کیسی محبت ہوا کرتی تھی ہم دونوں میں۔"

بیتے دنوں کی یاد نے ان کے دل میں چٹکیاں سی بھریں اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ بھائی کی یاد جب بھی ستاتی تو اماں کے اشک بہہ نکلتے۔ ایسے میں مملکت ہی انہیں سنبھالتی۔ اب بھی وہی عالم ہوا چاہتا تھا۔

"اماں اب رونے سے کیا حاصل، ماموں آ رہے ہیں نا۔ جی بھر کر مل لیجیے گا ان سے۔" مملکت ان کے رونے سے بہت ڈرتی تھی۔ اسے تو اب تک وہ لمحات نہ بھولے تھے۔ جب اماں ابا کی لاش پر دھاڑیں مار رہی تھیں۔ اسے مکمل شعور تھا۔ وہ دوسری عورتوں کے ساتھ انہیں نہ رونے کی تلقین کرنے لگی۔ ابا کے مرنے کے صدمے کے ساتھ یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہیں شفقت مادری سے بھی محروم نہ ہو جائے۔

ابا کے ساتھ اماں نے بے مثال زندگی گزاری تھی۔ خاموش طبع سے ابا اماں کی بے سروپا باتوں کو بھی برداشت کر لیا کرتے۔ دونوں میں آپس میں بہت چاہت تھی اور ان کی محبت کا مرکز تین بیٹیاں تھیں۔ اسے یاد نہ تھا کہ کبھی ابا نے اماں کو طعنہ دیا ہو، یا بیٹا چاہا ہو۔ دو بیٹیاں کافی سیانی تھیں جب اماں نے انہیں اُمید سے ہونے کی نوید سنائی اماں دل و جان سے چاہ رہی تھیں کہ اس بار ان کی گود میں ہنستا مسکراتا بیٹا ہو۔ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور تیسری بیٹی نے آنکھ کھولی۔ اماں جھنجلائیں مگر ابا نے لپک کر گود میں بھر لیا۔

"یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ میری مملکت ہے۔" تب اماں کے دھواں دھار آنسو رک گئے۔ انہیں خدشہ تھا کہ ابا پیدا ہونے والی بیٹی کو اٹھا کر پھینک دیں گے بڑے دنوں کے بعد وہ سنبھلیں۔ ورنہ وہ بچی کو گود لینے کی روادار نہ تھیں

مملکت ہی نام پڑ گیا تھا اس کا۔ وہ تھی بھی بہت خوبصورت اور نرم و نازک بہنیں اس کی دیوانی تھیں۔ ابا تو جیسے ہی دفتر سے لوٹ کر آتے اسے گود میں بھر لیتے۔

یوں ماہ و سال بیتتے چلے گئے۔

ریشماں اور شادماں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ابا خاصے بوڑھے اور بیمار رہنے لگے تھے۔ مملکت پڑھ رہی تھی۔ اب تو اماں کی جان تھی اس میں۔ اسی کی ڈھارس تھی انہیں، وہ انہیں تسلی دیتی۔

"اماں! آپ فکر نہ کریں۔ ابا ٹھیک ہو جائیں گے۔" مگر ایسا موذی مرض تھا کہ جان لے کر ہی ٹلا۔ دونوں بیٹیاں اپنے شوہروں کے ساتھ آئی تھیں۔

بیاہی بیٹیاں کب تلک رہتیں۔ اب تو گھر میں صرف مملکت اور اماں تھیں ایک دوسرے کی غمگسار اور ہمدرد۔ اماں تو اس وقت سے ڈر رہی تھیں۔ جب مملکت بھی پرائی ہو گئی تو ان کا کیا بنے گا۔

"میری فکر نہ کریں اماں۔ مجھے کہیں نہیں جانا آپ کو چھوڑ کر۔" وہ انہیں سمجھاتی۔

"میں باولی ہوں جو تمہاری باتوں میں آ کر یہ غلطی

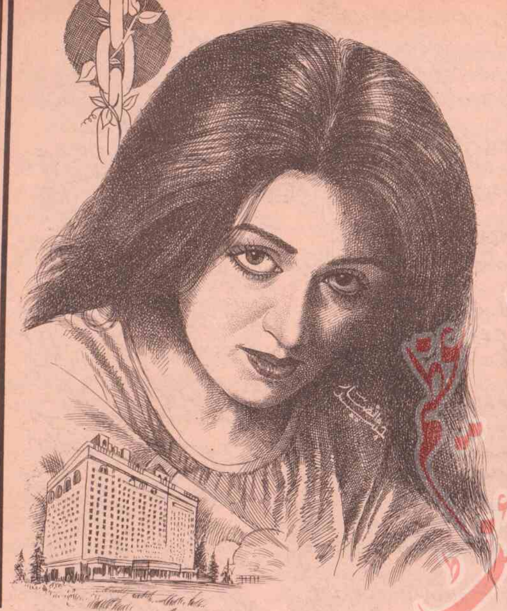

کروں گی۔ خدا وہ دن ضرور لائے گا جب میری مملکت دلہن بنے گی۔"

"دیکھی جائے گی۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر اماں کے گلے میں باہیں ڈال دیتی۔

بڑے ہی پُر درد دن تھے۔ شہر بھر میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ تعلیمی ادارے بند تھے۔ یہ بھی گھر بیٹھی تھی۔ اس کا تقرر مقامی کالج میں بطور لیکچرر ہو چکا تھا۔ وہ اپنی جاب سے مطمئن تھی۔ لیکن اماں مطمئن نہیں تھیں انہیں ہر وقت اس کی شادی کی فکر کھائے جاتی۔

مملکت خود ذہنی طور پر اماں سے جدائی برداشت کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ اس نے تھک ہار کر اماں کے آگے شرط رکھ دی اگر کوئی شخص اس گھر میں رہنا پسند کرے تو میں شادی کی حامی بھر لوں گی۔

فی زمانہ گھر داماد جیسی گالی۔ کوئی نوجوان سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ جو رشتے آتے یہ بات سن کر پلٹ کر نہ آتے۔ مملکت خوش ہو جاتی۔

"اچھا ہے ورنہ اماں تو کب کی نکال باہر کر چکی ہوتیں۔"

"اماں! سب مذاق اُڑا رہے ہیں۔ گھر داماد کی پخ

کیوں لگالی۔"

شادماں اور ریشماں آکر کہتیں۔

"میں کیا کروں مملکت کسی صورت نہیں مان رہی۔ میرے اکیلے پن کی وجہ سے اس نے یہ شرط لگائی ہے۔" اماں افسردہ ہو جاتیں۔

"زمانے کا دستور ہے اماں۔ میکہ تو چھوڑنا پڑتا ہے۔" ریشماں بہت بڑی بڑی باتیں کیا کرتی۔

"میری فکر میں کسی کو دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ریشماں آپا!" مملکت چڑ گئی۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ ہمیں اتنی باتیں سننا پڑتی ہیں سسرال میں۔"

"میں کسی صورت میں اماں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ ان کی اچانک طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ کون دیکھے گا انہیں۔ جسے غرض ہو گی مجھ سے شادی کی وہی بھرے گا ہامی۔ میں اماں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" مملکت فیصلہ کن انداز سے کہتی۔

"ملکہ عالیہ کا دماغ عرشِ معلی پہ رہتا ہے۔" ریشماں چپ نہ ہوتی۔ کچھ نہ کچھ کہہ ضرور جاتی۔ شادماں بھی جب آتی یہی قصہ چھیڑ کر بیٹھ جاتی۔

"سب کو اپنی ماؤں کی فکر ہوتی ہے مجھے اپنی ماں کی فکر ہے تو کونسا گناہ ہے یہ۔" مملکت کہتی

"کوئی پوچھے گا بھی نہیں بعد میں۔"

"مجھے پروا نہیں اس کی۔"

"خود کمانے لگ گئی ہو نا۔ اسی لیے منہ زور ہو گئی ہو۔" ریشماں طعنہ دیتی۔

"پلیز ریشماں آپا۔ میری سچ بات آپ کو کڑوی ضرور لگے گی۔ اگر آپ نے ہر دفعہ آکر یہ ہی بات کرنی ہوتی ہے تو مت آیا کریں۔ اماں کو تڑپاتے۔" مملکت نے عاجز آکر ایک روز سختی سے کہہ دیا۔ جیسے سنتے ہی، وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔

"تمہارا جو غرور ہے کسی دن ضرور ٹوٹے گا۔" وہ باقاعدہ کوسنوں پر اُتر آئیں۔

"مجھے غرور نہیں ہے آپ میری بار [illegible] نہیں ہیں۔" وہ گستاخی سے بولی۔

"ہم تو بے عقل ہیں۔ پندرہ افراد [illegible]

سسرال میں ان کے درمیان رہ رہی ہوں خوش اسلوبی سے، تمہارے خیال میں یہ کوئی بات ہی نہیں۔"

"وہیں رہیے۔ خدا آپ کو خوش رکھے اپنے گھر بار میں مگر خدارا اماں کا ذہن پراگندہ کرنے یہاں مت آیا کریں۔"

"نہیں آؤں گی۔" ریشماں لڑ بھڑ کر چلی جاتی۔

اگلے ہفتے پھر موجود ــ وہی موضوع۔

"اماں! آپ منع نہیں کرتیں انہیں۔" وہ زچ ہو جاتی۔

"صحیح تو کہتی ہے وہ بھی۔ لوگوں کی باتیں خاص کر سسرال والوں کے طعنے تیر کی طرح چھید کرتے ہیں سینے میں۔"

"ایسی کی تیسی سب کی۔ میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔" مملکت نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میری خاطر اپنی زندگی برباد مت کرو بیٹی۔" اماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔

"اماں! خدا کے لیے۔" وہ بلبلا کر ہاتھ جوڑ دیتی۔

"کم از کم آپ تو ایسا مت کہیں۔"

"مملکت میری بچی!" وہ بے قراری سے چمٹا کر رونا شروع کر دیتیں۔ ان کے آنسو اسے بے چین کر دیتے۔

"خدا کرے کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جائے جو اماں کے بہلاوے کا سبب بن جائے۔" صرف یہ ہی دعا ہوتی تھی لبوں پر۔ پھر اچانک اس کی دعا نے قبولیت اختیار کر لی۔

جلال ماموں کا خط آگیا۔ وہ اب مستقل رہنے کے لیے وطن آرہے تھے۔

دنیا میں واحد اماں ہی تھیں ان کی اپنی سگی بہن۔ اماں نے خط پڑھا وہ کبھی ہنستیں کبھی روتیں۔

"وہ میرا دلارا بھائی تھا۔ نرجس کے عشق میں پھنس کر کہیں کا نہ رہا اور پھر عشق کا بھوت تب اترا جب بیاہ کر لیا۔" وہ مملکت کو بتاتیں۔

"چند روز بعد نرجس کی قلعی کھل گئی وہ تو اکیلے لڑکوں کو لوٹ لیا کرتی۔ جائیداد ہضم کر کے بھاگ جاتی۔ تمام روپیہ ہضم کرنے کے بعد اس نے طلاق لے لی۔ اپنے بچے کی بھی پروا نہ کی۔ خالی ہاتھ بھائی کو دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا۔ اس کا کہیں دل نہ لگتا۔ تب میں نے دل پر صبر کی سل رکھ لی اور اس سے کہا ملک چھوڑ دے میں نے اپنی سونے کی چوڑیاں بیچ کر باہر جانے کا بندوبست کروایا۔ کچھ عرصہ تک وہ خط لکھتا رہا پھر۔ بھول بھال گیا۔

کتنا چاہا تھا بیٹا مجھے دے جائے۔ میرا کوئی بیٹا نہیں مگر نہ مان کے دیا۔ جانے کیسا ہوگا بچپن میں تو بہت گپلو سا ہوا کرتا تھا۔"

"مجھ سے کتنا چھوٹا ہوگا وہ" مملکت بے اندازہ خوش تھی۔

"ڈیڑھ سال غالباً یا ایک سال۔"

"اماں! ہم انہیں یہاں سے کہیں نہیں جانے دیں گے۔"

"یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کہیں اور جائے میرا پیارا سا بھائی۔ شکر ہے اُسے میں یاد تو آئی۔"

"آپ بھلا بھولنے والی چیز تھیں کیا؟" مملکت نے لاڈ سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

"وہیں لکچرر ہو گئی مگر بچپنا نہ گیا۔ اور میں چیز ہوں بھلا۔" اماں نے چاہت سے اس کا سر چوما۔

"تو اور کیا اماں! آپ تو میرے لیے۔ دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ ہیں۔ ٹھنڈی۔ میٹھی۔ کڑوی، نمکین، چاروں ذائقے۔ میری جان اماں۔" اس کا لاڈ انتہا کو پہنچ گیا۔

"اچھا پرے ہٹو۔" ان کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ انہیں وہ وقت یاد آجاتا جب اس کی پیدائش پر آنسو بہائے تھے۔ آج وہی بیٹی ان کا اثاثہ ثابت ہو رہی تھی۔ ان کی خاطر خود پر خوشی حرام کر رکھی تھی رشتے آتے تھے یہ شرط سن کر لوٹ جاتے۔

"آپ پھر رونے لگیں؟" مملکت سنجیدہ ہو گئی۔

"کہاں میری بچی۔ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ بھائی کے آنے کی خوشی میں بہہ رہے ہیں۔ جانے وہ کیسا ہو گا۔"

اماں اُٹھتے بیٹھتے بھائی کی باتیں کر رہی تھیں۔

"ایسا خوبصورت تھا۔ دنیا شہزادہ کہتی تھی۔ بہت محنتی تھا اپنا کاروبار تھا۔ محنت کی تو کاروبار چمک اٹھا۔ لیکن نرجس نے ایسا جال بچھایا کہ کہیں کا نہ رہا۔ کمبخت مکار عورتیں۔ مرد کو بدحواس کر دیتی ہیں۔ کسی کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے سب دشمن نظر آتے ہیں۔ یہ ہی حال جلال کا بھی تھا۔ کنگال کر کے رکھ دیا تھا اس نے۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا تھا۔ باہر جانے کے لیے میں نے اپنے کڑے بیچ کر پیسے دیے تھے۔ خدا کا شکر ہے۔ تمہارے ابا نے مخالفت نہ کی۔ اب میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گی۔"

ماموں جان آگئے تھے۔ وہ کتنی دیر سے بہن بھائی کے ملاپ کو دیکھ رہی تھی۔ رو رہے تھے۔ ہنس رہے تھے عجیب صورت حال تھی۔ خود اس کی پلکیں بھی نم ہو رہی تھیں۔ قدرے فاصلے پر جلال ماموں سے ایک انچ مزید لمبا سا نوجوان جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر کو دائیں شانے پر جھکائے کھڑا تھا گھونگھریالے گہرے براؤن بال لچھوں کی صورت میں پیشانی پر بکھرے تھے۔ سرخ و سفید رنگت۔ گہری براؤن آنکھیں وہ لبوں کو کوفت سے کاٹ رہا تھا۔ یا پھر اس کی عادت ہوگی دونوں بہن بھائی جی بھر کے ملے۔ پھر بچوں کا خیال آیا۔

"یہ میرا بیٹا ہے۔ شاہ عالم۔" جلال ماموں نے بتایا۔

شاہ عالم نے قدرے چوڑے شانے جھکائے، کوفت زدہ لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔

"میرا چاند، میرا لال۔" اماں نے اسے بازوؤں میں بھرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ اتنا لمبا چوڑا تھا۔ بانہوں کے آدھے حلقے میں آیا۔ مملکت نے لب بھینچ کر مسکراہٹ دبائی۔

"مملکت ہے یہ۔" اماں نے تعارف کرایا تو ماموں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ مملکت نے دوستانہ مسکراہٹ لیے شاہ عالم کو دیکھا۔ وہ بھی اسی کی سمت متوجہ تھا سلام دعا تک بات ہوئی۔

پھر طویل باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خاطر مدارات کے دوران مملکت نے شاہ عالم سے کافی باتیں کر لیں۔ وہ بھی شروع میں کچھ جھجکا تھا پھر فری ہو گیا۔

"ہاں تو شاہ عالم! اب بتاؤ آگے کیا ارادے ہیں؟"

"فی الحال تو مہمان بننے کا شوق ہے۔"

"اردو تو تمہاری ٹھیک ٹھاک ہے۔ کس نے پڑھائی؟"

"ڈیڈی نے۔"

"ہوں۔ معلوم ہے مہمانوں کے ساتھ میرا سلوک کچھ

ٹھیک نہیں ہوتا۔" مملکت نے اسے ڈرایا۔

"اچھا۔ کیا بھوت بن کر ڈراتی ہیں؟"

"نہیں۔ یہ ٹاپ سیکریٹ ہے۔" وہ مسکرائی۔

"او۔ گڈ۔ تب تو میری اور آپ کی دوستی چلے گی۔"

"ضرور۔ اور ویسے بھی تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ میرا احترام کرنا۔"

"واٹ؟" اس کی نیلی آنکھیں پھیل گئیں۔

"یس۔ برادر۔" اس نے بڑی ادا سے گردن جھٹکی۔

"میں پورے چھ فٹ تین انچ اور آپ یقیناً پانچ سے ایک آدھ انچ اوپر۔"

"جی۔ نہیں۔ میں فائیو فوٹ ہوں۔"

"تو کیا ہوا۔ مجھ سے تو چھوٹی ہیں۔"

"بات ہے عمر کی، قد کی نہیں۔"

"مگر۔؟" اس نے لچھے دار بالوں میں انگلیاں پھنسائیں اور اپنی آنکھیں اس کے سراپے پر ڈالیں۔

"اے۔ ڈھنگ سے دیکھو، باجی ہوں میں تمہاری۔" مملکت نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رعب جمایا۔

"دیکھی جائے گی۔" شاہ عالم طویل جمائی لے کر بولا۔

"نیند آرہی ہے چھوٹے بھائی؟"

"چھوٹا نہیں۔ ہاں نیند آرہی ہے۔"

"وہ سامنے والا بیڈروم تمہارا ہے۔"

"او کے۔" وہ طویل جمائیاں لیتا ہوا سیدھا بیڈروم کی طرف چلا گیا۔

مملکت دیر تک مسکراتی رہی۔ بے انتہا خوشی ہورہی تھی اسے۔

اتنی جلدی ہم دونوں فری ہوگئے۔ خوب لطف رہے گا۔ بے وقوف مجھے تو پورا بھائی لگا۔ اس پر خوب رعب جمایا کروں گی۔ جلال ماموں اور شاہ عالم کے آنے سے گھر — میں بہت گہما گہمی ہوگئی تھی۔

"میں اب تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم میرے پاس رہنا۔" اماں نے بھائی کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیسی آپ کی خوشی۔" جلال ماموں کو کیا اعتراض ہوتا۔ وہ تو خود اتنے عرصہ بعد بہن سے مل کر بے حد خوش تھے۔

شاہ عالم مملکت سے بے تکلفی سے باتیں کرتا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"میں تم سے شادی کروں گا۔"

"دماغ صحیح ہے چھوٹے! تمہارا۔ میں ایک لکچرار اور تم سے بڑی۔ یہ نہیں ہوسکتا۔"

"دوسری صورت میں جو تمہاری ڈیمانڈ ہے گھر داماد کی۔ وہ پوری ہونا ناممکن ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم گھر داماد کسے کہتے ہیں۔" مملکت نے بات اُڑائی۔

"جانتا ہوں سب۔ ہم تو یہاں ہی رہیں گے۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

"بکواس کم کیا کرو چھوٹے بھائی! ماموں سے بات کرلی ہے میں نے۔ میں تمہارے لیے لڑکی پسند کروں گی۔ میری شاگرد ہے۔ فریحہ۔ تمہیں دکھاؤں گی۔ اتنی پیاری ہے کہ حد نہیں۔"

"تو میں کیا کروں پھر؟" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"تم اس سے شادی کرسکتے ہو۔ اور کرو گے۔ آج آنا مجھے لینے، دکھاؤں گی۔ تم بہت غلط سوچوں میں پڑ گئے ہو، اور ہمارے ملک میں اسے اچھا بھی نہیں سمجھا جاتا کہ لڑکا منہ اٹھا کر خود سے شادی کے قصے چھیڑ دے۔"

"میں سب جانتا ہوں کیا کچھ ہوتا ہے اس ملک میں۔ اپنی پسند کا حق تو کوئی نہیں چھین سکتا۔"

وہ لاجواب ہوکر رہ گئی۔

"مجھ میں کیا نظر آیا بے وقوف! میں اتنی بڑی ہوں پھر میری سوچیں کافی میچورڈ ہیں۔ تم کھلنڈرے سے ہو۔ آئندہ غلط بات مت کرنا۔" اس نے ہنسی اڑائی۔

"یس میں پسند کرتا ہوں اور حاصل کروں گا۔"

"کیا۔؟"

"آپ کا دل؟" برجستہ جملے نے اس کا رنگ سرخ کردیا۔ مگر — خود پر قابو پایا۔ اور کہنے لگی۔

ع۔ ابھی کمسن ہو رہنے دو کہیں کھو دو گے دل میرا

"سمجھے بے وقوف۔" اس نے سر پر چپت لگائی۔

"میں بچہ وچہ نہیں ہوں اور شعر میری سمجھ میں نہیں آتے میری تھیوری ہے کہ جو چیز انسان کو پسند آجائے اسے حاصل کرنا جائز ہے۔ دوسری صورت میں جدوجہد کرنی چاہیے۔"

"تم اتنی گاڑھی اردو بولتے ہو۔ مگر میری بات نہیں سمجھتے میں نے تمہیں بھائی کی نظر سے دیکھا ہے اور وہ بھی چھوٹے۔ آئندہ محبت وحبت کی باتیں نہیں کرو گے دنیا میں بے شمار موضوع ہیں اور تم سب سے پہلے جاب تلاش کرو۔ جو ہمارے ملک میں مشکل سے ملتی ہے۔"

"ہمارے ملک میں تو سب سے زیادہ دل دکھایا جاتا ہے۔" اس نے انتہائی بُرا مانا۔ اور اُٹھ کر چلا گیا۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ یہ تو پاگل ہوگیا ہے اماں اور ماموں کو اس کی پسند معلوم ہوئی تو کتنی شرمندگی ہوگی۔ بے وقوف کہیں کا۔ اسے میں فریحہ کو دکھاؤں گی بہت پیاری لڑکی ہے وہ۔ میں تو اس کے ساتھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ خوبصورت ہے۔ ذمہ دار ہے مگر مجھے چھوٹا بھائی سا لگتا ہے میں کیسے ہامی بھر لوں۔ زچ کردیتا ہے پاگل کہیں کا۔

شاکنگ پنک کپڑوں میں ریشمی ریشمی دراز بالوں والی فریحہ بے حد جچ رہی تھی۔ وہ بے شمار قصے سنا رہا تھا۔ یہ چائے رکھ کر کھسک گئی تھی دونوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ مملکت خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔

رخصت بھی اس نے خود ہی کیا۔

وہ سیٹی بجاتے اس کے سر پر جا پہنچا۔

"بہت خوش ہو؟" مملکت نے نظر بھر کر شاہ عالم کو دیکھا۔ وہ پیشانی پر بالوں کے گچھے کو انگلیوں سے بیزاری سے پیچھے کرنے لگا۔

"فریحہ کیسی لگی تمہیں؟ بڑی باتیں ہوئیں۔"

"بے تحاشا ہنسنے والی لڑکیاں مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" وہ کہہ کر چلتا بنا۔

"اس کا مطلب ہے فریحہ تمہیں پسند نہیں آئی۔ ٹھیک ہے اب ذرا سنجیدہ سنجیدہ سی دکھاؤں گی۔"

وہ کرسی پر نیم دراز تھا مملکت نے اس کے سامنے جاکر کہا۔

"آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ قدرے خفا تھا۔

"بھئی میں چاہتی ہوں تمہارے سر میں جو خناس سمایا ہے وہ جلد بھاگ جائے۔ بزرگوں سے غلط بات نہیں کرتے۔"

"بہت بزرگ ہیں آپ۔ اب میں بالکل بات نہیں کروں گا آپ سے۔"

"اتنے ناراض نہیں ہوتے۔ چلو آؤ میں تمہیں سیر کرا کے لاتی ہوں۔" مملکت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔ وہ روٹھا روٹھا سا ہمراہ تھا۔ اس کی فوکسی سی سائیڈ پر جاکر رُکی۔

"سمندر کی ہوا کھاؤ۔" مملکت اس کے ساتھ دور تک ٹہلتی جارہی تھی۔ شاہ عالم جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے گردن جھکائے چل رہا تھا۔ براؤن بال ہوا سے منتشر تھے۔

"اب تلک ناراض ہو؟"

"مجھے کیا حق ہے آپ سے ناراض ہونے کا۔"

"ناراض نہیں ہوتے۔ میری بات غور سے سنو، مذاق کا کوئی پہلو نہیں۔ شاہ۔ میں نے جب تم لوگوں کے آنے کی خبر سنی تو بتا نہیں سکتی کس قدر خوشی ہوئی تھی۔ میں نے کبھی بھائی کا پیار نہیں پایا۔ بہنوئی ہیں دو میرے مگر بے حد مصروف۔ اور ان کی اتنی عزت کرتی ہوں کہ فری نہیں ہوسکتی۔ بڑا شوق تھا میرا بھی کوئی بھائی ہوتا۔ میں بھابھی ڈھونڈتی۔ بھائی کے سر پر سہرا سجاتی۔ میری یہ دبی ہوئی خواہش اُبھر کر سامنے اس لیے نہیں آئی کہ مجھے اُمید نہ تھی اس قسم کے حالات رونما ہوں گے۔ تمہارے آنے کی خبر سُن کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ حد نہیں۔ بن دیکھے بھائی کا روپ دے دیا تھا۔ پھر چھوٹا۔ اس سے میری شفقت میں اضافہ ہوگیا۔ میرے دل میں تمہارا مقام چھوٹے بھائی کا سا ہے۔ اور تم نے جو غلط سلط سوچیں اپنالی ہیں، انہیں جھٹک دو۔ یہ بھول ہے تمہاری۔ اور۔ اور میں بہت پیاری لڑکی سے تمہاری شادی کراؤں گی۔ کچھ عرصے بعد تمہاری سوچیں بدل جائیں گی سمجھے۔ اب دوستی کرلو — اور اپنے ذہن سے فرسودہ خیالات اُڑا دو۔" شاہ عالم نے طویل سانس لیا۔ جبر کے کتنی لمبے لمبے سانس پھیپھڑوں میں بھر لیے۔

"آپ کی خوشی اسی میں ہے تو۔ مملکت میں کوشش کروں گا۔ مزید شرمندہ نہ ہوں۔"

"شاباش۔ تم میرے لیے کوئی ٹھیک ٹھاک بندہ ڈھونڈنا۔ یہ نہ ہو کہ اپنی شادی کرا کے بھول جاؤ۔"

شاہ عالم نے مارے ضبط کے نچلا لب چبا ڈالا۔ اور سر ہلا دیا۔

"اتنی سعادت مندی کی اُمید نہ تھی تم سے۔" شاہ عالم کی روشن قندیل سی آنکھیں بجھ سی گئیں۔

واپسی پر یہ چہکتی رہی وہ ہوں ہاں کر رہا تھا۔

ایک بہترین ساتھی اس کی سوچیں تبدیل کر دے گا۔ میں ماموں سے کہوں گی جلد شادی کر دیں۔

گھر آ کے شاہ عالم سیدھا بیڈ روم میں چلا گیا۔ اماں اس کی منتظر تھیں وہ کافی خوش نظر آ رہی تھیں۔

"شاہ عالم کے ساتھ خوب گاڑھی چھن رہی ہے تمہاری۔"

"جی، بہت اچھا بچہ ہے۔"

"بچہ!" اماں ہکا بکا ہوئیں۔

"جی اماں! مجھے ضدی سا بچہ لگتا ہے۔ میں اس کے لیے لڑکی ڈھونڈوں گی۔"

"لڑکی تو موجود ہے۔ اور جلال کہہ رہا تھا چھوٹائی بڑائی کی اس کے نزدیک اتنی اہمیت نہیں۔ تمہاری شرط بھی پوری ہو جائے گی۔ اور تم۔"

"کیا مطلب اماں؟" وہ ٹھٹھک گئی۔

"عالم میرا بھائی ہے اور وہ بھی چھوٹا میں سوچ بھی نہیں سکتی ایسی بات۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" اس نے سختی سے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے لڑکی۔ بیسیوں بیماریوں نے گھیر رکھا ہے مجھے۔ کسی روز چل بسی تو تمہارا ٹھکانہ کیا ہوگا۔ مرد کے بغیر زندگی گزارنی دشوار ہو جاتی ہے۔ ساتھی ضرور ہونا چاہیے۔"

"آپ نے بھی تو مرد کے بغیر زندگی گزاری ہے میں تو چھوٹی تھی کافی۔"

"زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"مگر مجھے شاہ عالم سے شادی نہیں کرنی۔"

"تمہاری شرائط پر پھر کوئی لڑکا پورا نہیں اُترتا۔ یونہی رہنا ہے؟"

"جو اللہ کو منظور۔"

"اللہ بھی الٹی سیدھی ضدیں پوری نہیں کیا کرتا۔ خود لات مار رہی ہو۔ اب تو ماشا اللہ جلال ہے۔ میں تنہا بھی نہیں شاہ عالم نہیں تو کوئی اور تلاش کروں۔"

"کوئی ضرورت نہیں جسے غرض ہوگی خود آ جائے گا۔"

"غرض تو مجھے ہے۔ میں ہی کوشش کروں گی۔ تمہاری قربانی مجھے جیتے جی مارے ڈال رہی ہے۔" وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

"میری جان اماں! مت پریشان ہوں۔" مملکت نے ان کے گلے میں بازو ڈال کر تسلی دی۔

"میں تو جلال کی خواہش سن کر ایسی خوش تھی۔ بے قراری سے انتظار کر رہی تھی کہ تم آؤ تو خوش خبری سناؤں۔ اُلٹی بات سُن لی۔" اماں نے آنسو پونچھ کر کہا۔

"میں کسی صورت عالم سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کا شفقت بھرا پیار آتا ہے مجھے۔ بھائی لگتا ہے۔"

"دیکھو خدا میری مشکل جانے کب آسان کرتا ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز سے کہہ کر چلی گئیں۔

"اماں بھی وہی بات کرتی ہیں۔ شاہ عالم۔ قد میں لمبا ہے تو کیا ہوا ذہن تو مجھ سے چھوٹا ہے۔ جلال ماموں کے لاڈ پیار نے اسے ابھی تلک بچہ بنا رکھا ہے۔ اور مجھے بھی تو چھوٹا لگتا ہے۔ ضدیں کرنے والا۔ روٹھنے والا۔ تھوڑی سی خوشامد سے بہل بھی جاتا ہے۔ میرا پیارا سا بھائی ہے میں اس کے لیے اسی کی جیسی لڑکی ڈھونڈوں گی بھابی ہو گی وہ۔" وہ خود بخود منصوبے بنانے لگی۔

پھر اس نے واقعی لڑکی پسند کر لی۔ ثمرین بے حد پیاری سی۔ شاہ عالم نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ دل و جان سے مملکت کو پسند کرتا تھا مگر وہ اسے چھوٹا بھائی کہتی اور پھر اُس روز کے سمجھانے کے بعد وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اپنے دل کے زخم خود ہی بھرنے کا ارادہ کر لیا۔ ڈیڑھ سال کی بڑائی کوئی بڑائی نہ تھی۔ رشتہ طے ہونے سے پہلے تک اماں نے سمجھایا۔ جلال ماموں نے بھی کہا۔ لیکن اس کے خیالات نہیں بدلے نا ہاں میں تبدیلی نہ ہوئی۔

وہ خوب شاپنگ کر رہی تھی۔ اس کی خوشی میں سب خوش تھے۔ شاہ عالم۔ بجھا بجھا سا تھا۔ مملکت خوب گپ شپ لگاتی، پروگرام بناتی۔

"شاہ عالم کی شادی کر رہی ہیں اماں! کچھ تو سوچا ہوتا۔ مملکت میں کیا بُرائی تھی؟" ریشماں اور شادماں دونوں ہی ناراض تھیں۔

"وہ اسے بچہ سمجھتی ہے۔"

"دماغ خراب ہے اس کا۔ کسی بوڑھے سے کرے گی۔ وقت نکل گیا تو کوئی بوڑھا بھی نہیں ملے گا۔"

"ایسا مت کہو بیٹی!" اماں ریشماں کی بات سن کر کانپ اُٹھیں۔

"سب لوگ کہہ رہے ہیں۔ ماں بیٹی کی کمائی کھا

رہی ہے۔"

"بکتے ہیں سب جانتے ہیں میرا میاں چار دکانوں کا مالک تھا اس کا کرایہ ہی بہت ہوتا ہے بلکہ بچ رہتا ہے۔ مملکت کی تنخواہ تو میں ساری اس کے نام جمع کرواتی ہوں۔"

"لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے؟"

"آپ دونوں آ کر اماں کا سکون برباد کر دیتی ہیں۔" مملکت یہ باتیں سُن کر آگ بگولہ ہو گئی تھی۔

"تم اپنی زبان بند رکھو تمہاری میرے سامنے نہیں چلے گی۔" ریشماں بھی طیش میں آ گئی۔

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آ جاتی ہیں پریشان کرنے۔"

"بکواس جو کرتی ہو۔ دنیا ہنس رہی ہے۔"

"مجھے پروا نہیں کسی کی۔"

"ہمیں تو سہنا پڑتا ہے سسرال میں۔"

"سسرال والے تو کم ہی کہتے ہوں گے آپ ہی ماشا اللہ ہیں۔"

"تمہارے جیسی طراری نہیں ہے ہم میں۔" شادماں نے بھی حصہ لیا۔

"تمام بُرائیاں ہیں مجھ میں اور ظاہر ہے۔ پھر میں کسی کا گھر کیوں خراب کروں۔ مزید گناہ گاری۔" مملکت نے طنز کیا۔

"اس کی زبان اماں آپ نے بگاڑی ہے۔ اتنی جرأت آ گئی ہے۔ تو کہہ دیں ڈھونڈ لے خود ہی اپنے لیے کوئی بر۔ ہونہہ۔"

اماں دہل گئیں، ٹھنڈے پسینے آنے لگے "میری بچی برباد ہو جائے گی۔"

"اماں!" ریشماں اور شادماں گھبرا گئیں۔

مملکت گلوکوز کا پانی لے کر بھاگی آئی۔

"آپ دونوں غیبت کرنے کے بجائے ان کی دلجوئی کر لیا کریں تو مہربانی ہو گی، جانتی ہیں میرا واحد سہارا ہیں اماں، کیوں انھیں تکلیف دیتی ہیں۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"ہم یا تم؟" ریشماں چمک کر بولی۔

"مجھے اماں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔ نہ شادی کرنی ہے مت کیا کریں نصیحتیں فضول کی۔"

"ہم تو اب آیا نہیں کریں گے۔ فضول بکواس سُننے کو ملتی ہے۔"

"نہ آئیں جب آتی ہیں اماں بیمار ہو جاتی ہیں۔"

"ہمیں تمہارے جیسی چاپلوسی نہیں آتی۔"

"ڈپلومیسی تو خوب جانتی ہیں۔"

"اب یہاں آؤں تو مجھے موت آ جائے۔" ریشماں جاہلانہ انداز سے کوستی پیٹتی چلی گئی۔ ساتھ ہی شادماں بھی۔

"آپ ان کی باتوں میں مت آیا کریں اماں۔" وہ چمچ چمچ گلوکوز ان کے حلق میں انڈیل رہی تھی۔

"صرف مجھے جلانے آتی ہیں۔"

"صحیح بھی تو کہتی ہیں۔" اماں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانے کی، بس۔"

میرے بعد اس لڑکی کا کیا بنے گا۔ اماں کو فکر لاحق تھی اس نے نیند کی دوا کھلا کر انہیں سُلایا۔ ریشماں آپا تو جاہل ہیں نری، کالج سے آنے کے بعد مملکت شادی کی تیاریوں میں لگ جاتی۔

جلال ماموں کبھی کبھی اماں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ یہ ہمیشہ شاہ عالم کو ہمراہ رکھتیں، وہ بُرے بُرے منہ بناتا رہتا۔

"شکل سیدھی رکھا کرو۔"

"سیدھی ہے۔" وہ جواب دیتا۔

تقریباً ساری تیاری مکمل تھی، کارڈ چھپ کر آ گئے تھے۔ وہ کلاس لے رہی تھی کہ شاہ عالم کے آنے کی اطلاع ملی۔

"خیریت!" وہ اس طرح کبھی نہیں آیا تھا مملکت حواس باختہ وزیٹر روم میں آئی۔

شاہ عالم بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔

"اماں ٹھیک ہیں؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"گھر چلیں آپ۔"

"کیوں؟ بتاؤ اماں کو تو کچھ نہیں ہوا۔" وہ وحشت سے چیخی اس کی ساتھی لیکچرار بھی ڈر کر آ گئیں۔

"بتاؤ نا۔" اس نے شاہ عالم کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"مس مملکت کی والدہ اور ماموں حادثے میں انتقال کر گئے۔" لیکچرار عصمت نے سرگوشی میں سب کو بتایا۔

"ہائے۔"

"عالم۔ بتا دو مجھے۔" وہ بچوں کی طرح روتی جا رہی تھی عالم سہارا دے کر لے گیا۔

وہ دیوانہ وار چیختی گھر میں داخل ہوئی۔ محلے میں خبر پھیل چکی تھی۔ سب ہی موجود تھے۔

”عالم! یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیسے ہو گیا؟“ اسے جھنجوڑ کر وہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔ ان کی دل ہلا دینے والی چیخیں آسمانوں تک پہنچ رہی تھیں

آئل ٹینکر نے ٹیکسی کو ٹکر ماری۔ اس میں سوار جلال اور اماں ڈرائیور سمیت موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔

عالم کے گھر والے دلجوئی کر رہے تھے اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو ہم دونوں پاگل ہو جاتے۔ وہ ان کی ممنون تھی۔

ماں کی موت کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ کسی طرح بھول نہ رہا تھا۔ شاہ عالم اس کی گود میں سر اوندھائے پھوٹ پھوٹ کر روتا۔ وہ اس کے سر کو چومتی، بچوں کی طرح سہلاتی۔ خاموش کراتی، بہلاتی اس کی خاطر وہ خود کو سنبھالے رکھتی تھی۔ اس کے سامنے بہت کم روتی تھی۔

دنیا کا نظام اپنی ڈگر پر چل رہا تھا۔ فی الحال شادی کی تاریخ بڑھا دی گئی۔

ثمرین اکثر آجایا کرتی۔ اس کے سامنے وہ کچھ ہنس بول لیا کرتے ورنہ دونوں کو ایسی چپ لگی تھی۔ کوئی موضوع سمجھ میں نہ آتا کہ گفتگو کے لیے چھیڑا جاتا۔ ثمرین پر مملکت سو جان سے فدا تھی۔ اتنا پیار کرتی جیسے اس کی چھوٹی بہن ہو۔

”ثمرین کے آنے سے گھر کی سونی فضا بہتر ہو جائے گی۔ تاریخ دے دیں کوئی؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”آپ کی مرضی۔“ شاہ عالم نے لب کچل ڈالے۔ ذہنی انتشار کے عالم میں ہوتا تو لب چبانا اس کی عادت میں شامل تھا۔

”شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ مملکت نے اس کا شانہ تھپکا۔

کتنی عزم و ہمت والی ہے۔ مملکت میں تم سی کہاں سے لاؤں۔ کوئی بھی اس قابل نہیں جو زندگی بھر کی ساتھی بن سکے۔

”میں آپ کی شادی سے پہلے نہیں کر سکتا۔“ وہ دل پر جبر کر کے بولا۔

جب میری قسمت میں ہو گی تو ہو جائے گی، بے فکر رہو۔
— ثمرین نے کیا قصور کیا ہے جو اسے انتظار کی سولی پر لٹکا دیا جائے؟“

”ہر بات اپنی منواتی ہیں آپ۔“ وہ ناراض ہو گیا۔

”مت روٹھا کرو، شاہ عالم مجھے روٹھے منانے بھول گئے۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی اور پھر بے بسی سے رو دی۔ دونوں ہی بلک رہے تھے۔ شاہ عالم کا سر اس کی گود میں تھا جسے وہ سہلا رہی تھی۔

”ہیلو!“ پرفیوم کی مہک کے ساتھ ثمرین کی چہکتی آواز سنائی دی۔ مملکت نے جلدی سے آنسو پونچھے۔

”آؤ ثمرین!“ ثمرین کی تیز نگاہ شاہ عالم پر تھی جس نے اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا تھا۔ مملکت کا ہاتھ اس کے سر کو سہلا رہا تھا۔ تھپک رہا تھا۔

”عالم! ثمرین آئی ہے۔“ مملکت نے اس کا الجھے دار بالوں سے بھرا سر اوپر کیا۔

”آؤ۔“ وہ پلٹا۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اس کا سرخ چہرہ۔

”پھر رو رہے ہیں آپ؟“

”یہ آنسو کبھی خشک نہ ہوں گے۔ نہ دل کے زخم بھریں گے۔“ شاہ عالم افسردہ لہجے میں بولا۔

”وقت کے ساتھ ساتھ زخم بھر جاتے ہیں۔“ ثمرین کا لہجہ کچھ بدلا۔

”مجھے تو لگتا ہے۔ گھاؤ گہرے ہو جائیں گے۔“ وہ بڑبڑایا

”گاڈ! اتنی مشکل اردو مجھے بھی نہیں آتی اور انہیں۔“ ثمرین حیرت سے بولی۔

”مجھے بھی حیرت ہوتی ہے۔ تم بیٹھو میں چائے لاتی ہوں۔“

ثمرین نے قالین پر بیٹھے عالم کو دیکھا وہ انگلیوں سے منتشر بال سیدھے کر رہا تھا جو کسی صورت سنور نہ رہے تھے۔

”عالم! میرے ساتھ چائنیز چلیں گے۔؟“

”ہاں چلو، مملکت بھی بہت اداس ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”مجھے مت گھسیٹا کرو۔ تم دونوں ہو آؤ۔“ مملکت نے انکار کر دیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ ضرور چلیں گی۔“

کھانے کے بعد دونوں چپ چاپ تھے۔ ثمرین ہی چہک رہی تھی۔ ثمرین کو گھر ڈراپ کر کے وہ واپس آ گئے۔

وہ کالج سے لوٹی تو ریشماں سے شاہ عالم کی گرما گرم بحث چل رہی تھی وہ کسی صورت قابو نہ آ رہی تھی۔

ریشماں آپا کی آمد کسی جھگڑے کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ مملکت نے سوچا۔ تھکن سے اس کا برا حال تھا وہ کھانا کھا کر سونا چاہتی تھی۔ ساری دوپہر برباد ہو گی۔

”مملکت! شام کو کچھ مہمان آئیں گے۔“ ریشماں نے کہا۔

”کس سلسلے میں؟“ وہ چونکی۔

”تمہارا ہی سلسلہ ہے۔ نہ تم اتنی ضد کرتیں نہ یوں بیٹھی رہتیں، خیر شکر ہے، اچھا ہے، جو ہوا سو ہوا۔“ اس کی تیوری پر بل دیکھ کر ریشماں نے باقی الفاظ روک لیے۔

”لڑکے کی پہلی شادی ہو چکی ہے دو بچے ہیں۔“

”لڑکے اور بچے۔“ شاہ عالم نے طنز سے کہا۔

”تم خاموش رہو، یہ ہمارا معاملہ ہے۔“ ریشماں نے سختی سے جھڑک دیا۔

”ریشماں آپا! آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری عمر کا وہ حصہ ختم ہو چکا ہے، جس میں رشتے آتے ہیں تو خدارا کیوں پریشان کرتی ہیں اور شاہ کو جھڑکنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ شاہ نے ڈھونڈا ہے رشتہ میرے لیے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“ وہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”تم نے رشتہ ڈھونڈا ہے تو بتایا کیوں نہیں۔“

”مملکت نے منع کر دیا تھا۔“ شاہ عالم نے بات سنبھالی حالانکہ کوئی رشتہ نہ تھا۔

”خوب ہے، سگوں سے چھپایا جا رہا ہے۔ کیا کرتا ہے وہ؟“

”بعد میں بتاؤں گا۔“

”تم بتاؤ ابھی۔ میں بھی چھان بین کر لوں۔“

”ریشماں آپا! کھانا کھا لیں۔“ مملکت نے آ کر کہا۔

”چھپ چھپ کر رشتے طے ہو رہے ہیں۔“ ریشماں نے طنزیہ نظر ڈالی۔

”کیا ضرورت ہے کسی کو بتانے کی۔ آپ کھانا کھا لیں، مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ مملکت نے ٹالا۔

”لگ رہی ہے تو کھاؤ۔ میں تو اب ہرگز نہ پوچھنے آؤں گی۔ شریک بھی نہیں ہوں گی سمجھیں تم۔“ وہ جل کر بولیں۔

”ریشماں آپا! کبھی تو ڈھنگ سے بات کر لیا کریں۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”تم نے دیا کبھی ڈھنگ کا جواب، تیرے میرے اپنے ہو گئے سگوں کو سات سلام دفع ہو تم۔“ وہ ہیل بجاتی چلی گئیں۔

اس نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

”مملکت! آپ جھوٹ بولنے لگی ہیں؟“

”مت کرنا کوئی اور بات۔“ وہ بھنا اٹھی۔

وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

”کیوں خود کو برباد کر رہی ہیں؟“ شاہ عالم نے ہمت کر کے کہا۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ تم نے کھانا کھانا ہے؟“ وہ غرائی۔

”چلیے۔“ وہ اٹھ کھڑا۔ مملکت سے کچھ کہنا بے سود تھا۔ اس نے چند نوالے حلق میں اتارے۔ پھر پانی کے دو گلاس پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کو تو بہت بھوک لگی تھی؟“ شاہ عالم نے ٹوکا۔

”اب خواہش نہیں مجھے۔ تم کھاؤ۔“

”مجھے تو پہلے سے بھوک تھی ہی نہیں۔“ وہ بھی میز سے اٹھ گیا۔

”مملکت میں تمہیں کھو کر پاگل ہو جاؤں گا۔ مت گنواؤ مجھے، میں ذہن سے عمروں کے فرق کو مٹا ڈالوں گا۔

میں ثمرین کو خوش نہیں رکھ سکوں گا۔ میں کب تک جھوٹا نبھاؤں گا میری زندگی میں سوائے مملکت کے کوئی بھی نہیں آ سکتی۔“

مملکت برتن اٹھا کر سیدھی بیڈ روم میں چلی گئی اور تکیے میں منہ چھپا کر بے دریغ آنسو بہا ڈالے۔

”اماں! آپ کیوں میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا میرا ساتھ چھوڑ جائیں گی۔

شاہ عالم۔۔ بے وقوف ابھی تک پُراُمید ہے۔ اتنا پیارا سا میرا بھائی ہے، کیسے یہ جذبہ کھرچ ڈالوں اپنے دل سے وہ ثمرین کے ساتھ بہت خوش رہے گا۔ وہ اچھی لڑکی ہے پریشان نہیں ہونے دے گی۔ ساری گڑبڑ ختم ہو جائے گی۔“

شاہ عالم سے نظریں ملائے بغیر مملکت نے اسے دولہا بنا ڈالا۔ اگر ایک بار بھی اس کی سمت دیکھ لیتی۔ تو اپنے جذبے لٹا دیتی۔ اپنی بڑائی ختم کر دیتی۔ اُس کی آنکھوں سے شکوے عیاں تھے۔

وہ بے دلی سے ثمرین کو بیاہ لایا۔ مملکت قہقہے لگا

رہی تھی خوشی منا رہی تھی۔ مگر اس کی سمت اب بھی نہیں دیکھا۔

شاہ عالم شادی کے بعد بجھ کر رہ گیا تھا۔ نسرین کی کوئی بات نہ ٹالتا سارا وقت وہ اپنے پاس سے ہلنے نہ دیتی۔ کھانا بھی بیڈ پر لے جاتی۔ پھر کئی کئی دن کے لیے میکے لے جاتی۔ گھر کا سونا پن کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ شاہ عالم نے اسے سر پر چڑھا لیا تھا۔ اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔ وہ اس کی فرمائشوں پر بے دریغ پیسہ لٹا رہا تھا۔

عرصہ ہو گیا تھا دونوں سے بات چیت ہوئے مملکت کالج جاتی اور پھر تنہائیاں اس کی ساتھی ہوتیں۔

نسرین نے چند روز میں آنکھیں پھیر لی تھیں اس نے کوئی شکوہ شکایت نہ کی کیا حق پہنچتا تھا اسے۔

اکیلے پڑے پڑے سوچتے سوچتے دل گھبرانے لگتا۔ گھر آنے کو جی نہ چاہتا تھا اس کا۔ شاہ عالم تو ایسا نہ تھا۔

وہ تنہا چائے پی رہی تھی۔ گرمی نے الگ برا حال کر رکھا تھا لیکن چائے کے بغیر گزارا بھی نہ تھا۔

شاہ عالم گردن نہوڑائے گزر رہا تھا کتنا سنجیدہ اور مضمحل سا لگ رہا تھا۔ اس کی چال میں سستی تھی۔ بالوں کا گچھا پیشانی پر جھول رہا تھا۔ لباس بھی مسلا ملگجا سا تھا۔

وہ لمحہ بھر کو پریشان ہو گئی شاہ عالم تو بے داغ اور استری شدہ کپڑے استعمال کرتا تھا۔ چند روز ہی میں اس کی عادات کو کیا ہوا۔

"شاہ عالم!" اس نے پکارا

وہ رکا لیکن پلٹا نہیں۔

"ناراض ہو مجھ سے؟" وہ کپ رکھ کر خود چل کر قریب آئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ لب چبا رہا تھا۔

"تم لوگوں نے مجھے بالکل نظر انداز کر رکھا ہے۔ تیسرے فرد کی موجودگی کا تمہیں احساس تک نہیں۔ میرے لیے چند منٹ بھی نہیں تمہارے پاس۔ اس گھر میں تو لوگوں کی ویسے ہی کمی ہے۔ مل کر ناشتہ کرو، کھانا کھاؤ۔ مجھ سے باتیں کرو۔ یوں تنہا میں کیسے رہوں؟" اس کا شکوہ بھرا انداز شاہ عالم کو شرمندہ نہ کر سکا بلکہ اس نے سرد مہری سے کہا۔

"ہماری اپنی ایک لائف ہے ہم کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے فلیٹ لے لیا ہے آج وہاں شفٹ ہو رہے ہیں۔" وہ کہہ کر چلا گیا۔

"یا اللہ۔ یہ شاہ عالم تھا۔ یہ اتنا بدل چکا ہے۔ اب تنہائیوں کا زہر میرا مقدر بنے گا۔"

اس کے قدم ان کے رہائشی حصے کی سمت بڑھ گئے۔

نسرین سامان کی پیکنگ کر رہی تھی۔

"تم کیا کر رہی ہو؟"

"ہم نے فلیٹ لے لیا ہے، وہاں رہیں گے۔" نسرین نے رکھائی سے کہا

"یہاں کیا تکلیف تھی؟"

"ہمیں خود ہی احساس ہو گیا۔ کوئی کب تک کسی کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ ہر انسان کو پہلے سوچ لینا چاہیے۔"

"میں تنہا کیسے رہوں گی؟" وہ گھبرا گئی۔

"یہ بات آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھی۔ کوئی کسی کا سہارا نہیں بنتا علاوہ شوہر کے۔ وہ وقت آپ نے گنوا دیا اب پچھتاوے رہ گئے۔"

ذرا سی لڑکی جو چند روز پہلے بیاہی گئی تھی۔ کتنی بڑی بات کہہ گئی۔ مدلل گفتگو سے قائل کر لینے والی مملکت لاجواب ہو کر رہ گئی۔

"میری مانو تو کچھ میرا ہی احساس کر لو اس گھر پر تم دونوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا میرا۔ تنہا نہیں رہ سکتی میں"

"آپ ہمارے پاس آتی جاتی رہیے گا۔"

"میں شاہ عالم کو مجبور کروں گی کہ وہ یہاں سے نہ جائے۔ میری بات نہیں ٹالے گا وہ۔"

"وہ پہلے میرا شوہر ہے میری بات سنے گا وہ۔ آپ کا حق تو بہت بعد کا ہے۔" نسرین اطمینان سے بولی اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"وہ میرا بھائی ہے۔" مملکت کا لہجہ کمزور تھا۔

"اس کا آپ سے دور رہنا ضروری ہے۔ ورنہ وہ اعصابی تکلیف میں مبتلا ہو جائے گا۔"

"کیا مطلب؟" اندیشے اور دل دکھا دینے والی کتنی ساری باتیں یکدم ہی وارد ہو کر اس کا ذہن ماؤف کرنے لگیں۔

"اسے آپ کا بہت خیال ہے۔ ظاہر ہے اب وہ بات کہاں ممکن ہے۔ وقت گزر گیا۔" نسرین نے اس کو بغور دیکھا۔

وہ لڑکھڑا سی گئی۔ مزید کچھ کہے بغیر دروازے کا سہارا لے کر باہر چلی گئی۔

"میں۔ میں نے اپنی زندگی برباد کر لی۔ کس کے لیے؟ کس کی خاطر؟ اماں کیوں مر گئیں آپ؟ کیوں تنہا چھوڑ دیا مجھے؟ ریشماں آپا سچ کہتی تھیں۔ اب تو دونوں بہنیں پلٹ کر نہ آئی تھیں۔ اس وقت وہ شدت سے یاد آ رہی تھیں کوئی ساتھی کوئی غمگسار درکار تھا۔ وہ ٹیکسی لے کر باہر نکل گئی اسے لگ رہا تھا ایک پل بھی یہاں رہی تو دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔ ٹیکسی اس نے مقامی پارک کے نزدیک روکی۔ کافی لوگ تھے۔ یہ بھی گاڑی لاک کر کے اندر آ گئی۔ اور سنگی بینچ پر بیٹھ گئی۔ رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس بھاگتے دوڑتے بچے بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ بے فکری کی زندگی۔ انہیں علم بھی نہ ہو گا کہ خدا نے ان کی قسمت کیسی بنائی ہے۔ لیکن کچھ لوگ تو اپنے ہاتھوں سے زندگی برباد کر لیتے ہیں۔ جیسے مجھے کہا جاتا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں اماں کی خاطر اپنے اوپر خوشی حرام کر لی تھی۔ مجھے اب زندگی بھر تنہائی کا زہر پینا ہے۔

شاہ عالم نے گھر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا! اتنی بے رخی اور نسرین کی طنزیہ گفتگو ابھی تو وہ چند روز کی دلہن تھی۔ کچھ عرصہ بعد —— تو جانے کون کون سے الزامات لگا دے مجھ پر۔ میری قسمت میں خواری لکھی ہے۔ وہ ہتھیلیاں کھول کر لکیروں کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ لکیریں پڑھنی بالکل نہیں آتی تھیں۔ شاہ میرے پیچھے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اب بالکل بھول گیا۔ میں تو سمجھتی تھی، شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا مگر بدل جانے کے متعلق نہ سوچا تھا۔

"میرے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔" اس نے طویل سانس کھینچ کر ہتھیلیاں آپس میں ملا لیں اور کھیلتے کودتے بچوں کو دیکھنے لگی۔

"آپ کو دست شناسی آتی ہے؟" ایک شخص سامنے آ کر بولا۔

"جی نہیں تو۔" وہ لمحہ بھر کو نروس سی ہو گئی۔

"آپ اتنے غور سے دیکھ رہی تھیں میں سمجھا"

"ڈیڈی!" ایک چہکتی آواز کے ساتھ بڑا سا بال اچھالا گیا جو سیدھا مملکت کے سر سے ٹکرایا۔

"بس، سوری آنٹی!" چھ سات سال کی بچی بھاگتی ہوئی آئی اور معذرت کرنے لگی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"یہ میری بیٹی ہے۔" اس شخص نے تعارف کرایا۔

"اتنی ڈر کیوں گئی ہے یہ۔ اتفاق سے لگی ہے بیٹا۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر بچی کو قریب کیا۔

"ڈیڈی!" اس نے باپ کی ٹانگ پکڑ لی۔

"نہیں بیٹا کچھ بھی نہیں کہیں گی یہ۔" اس کے باپ نے بہلایا مگر بچی ڈر کر رونے لگی۔

"ٹافی کھائیں گی؟" مملکت کو بچی پر بے ساختہ پیار آ گیا۔

وہ کچھ نہیں بولی باپ کی ٹانگ سے لپٹی روتی رہی۔

"کیا ہوا اسے۔ بیمار ہے کیا؟ آپ تشریف رکھیے۔" مملکت نے دور ہٹ کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

وہ شخص شکریہ کہہ کر قدرے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"آپ بتانا پسند کریں گی کہ بچی کو کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، یہ پریشان تھی۔"

"بیٹا اب تو میرے پاس آ گئی ہیں آپ کو کوئی نہیں مار سکتا۔" وہ بچی کی پشت تھپکنے لگا۔

"کیا پریشانی ہے۔ ہو سکتا ہے میں کوئی مدد کر سکوں۔" اس کی فطری ہمدردی عود آئی۔

جانے کیوں وہ بے چین ہو گئی تھی پوچھنے کے لیے۔ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ یا کسی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"یہ پارک کی باؤنڈری وال کے سامنے گلابی رنگ کا جو چھوٹا سا گھر نظر آ رہا ہے نا میرا ہے۔ آپ چلنا پسند کریں گی وہیں جا کر میں بتا سکوں گا۔"

"جی!" اس نے قدرے تامل کیا۔ پھر ساتھ ہو لی۔ بلا سوچے سمجھے۔

اس نے چھوٹے سے ورانڈے میں اسے بٹھایا اور مشروب پیش کیا۔

"آپ کی وائف کہاں ہیں؟" اس نے گلاس لیتے ہوئے پوچھا۔

"ایک سال پہلے اس کا انتقال ہو گیا۔"

"اوہ! آپ تنہا ہیں؟"

"جی میں تنہا نہیں، ساتھ میری بچی ہے۔"

"یہ اتنی خوف زدہ کیوں ہے؟"

"مار سہہ سہہ کر خوف زدہ ہو گئی ہے۔"

"کون مارتا رہا اسے، آپ؟" اس نے حیرت سے

پوچھا۔

"نہیں، جن کے پاس بچی کو چھوڑا تھا وہ، دراصل میری جاب اس طرح کی ہے مجھے ملک سے باہر اکثر جانا پڑتا ہے۔ اس صورت میں بچی کا مسئلہ تھا۔ اور یہ مسئلہ میرے ایک جاننے والوں نے حل کر دیا مگر میں نہیں جانتا تھا۔ وہ بچی کو چھوٹی چھوٹی شرارتوں پر کڑی سزا دیں گے، پہلے تو میں نہ جان سکا۔ مگر اب حقیقت معلوم ہوتی تو میں اسے اپنے پاس لے آیا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"بچے تو شرارت کرتے ہی ہیں آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ آئندہ جب ملک سے باہر جائیں بچی کو میرے پاس چھوڑ دیا کریں۔" اس نے خلوص سے پیش کش کی۔

"آپ؟"

"جی میں مقامی کالج میں لیکچرار ہوں۔ کچھ فاصلے پر میرا گھر ہے۔ دراصل میں تنہا ہوں۔ میرے چھوٹے بھائی نے شادی کرلی ہے اور وہ علیحدہ رہنے چلا گیا، اگلا سوال آپ کا یہ ہوگا کہ آپ تنہا کیوں ہیں؟" وہ جبراً مسکرائی پھر مختصراً اپنے متعلق بتا دیا۔

"آپ کا عزم قابل ستائش ہے۔" وہ کافی متاثر ہوا۔

"دنیا تو مذاق اڑا رہی ہے میرا۔" وہ دل گرفتگی سے بولی۔

"بچی آپ سے مانوس ہو جاتے تو مجھے اعتراض نہیں۔"

"پھر تو اس کے لیے مجھے روز آنا پڑے گا۔"

"کبھی میں بھی آجاؤں گا۔"

"تو کل شام آپ چائے میرے ساتھ پیجیے گا۔" مملکت نے دعوت دی۔ جو شکریہ کے ساتھ قبول کرلی گئی۔

"آپ کا نام؟ اتنی باتیں کرلیں۔ نام سے واقفیت نہیں ہوئی۔"

وہ شخص مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پُرخلوص سی تھی۔ اس سے بات کرکے اجنبیت کا احساس نہ ہوا تھا۔

"مملکت!"

"خوب!" وہ پھر مسکرایا۔ "میں شاہ جہان ہوں۔"

"عجیب اتفاق ہے۔ میرے بھائی کا نام شاہ عالم ہے۔" وہ اس عجیب سی سچویشن پر مسکرائی۔

"شاہ جہاں صاحب! بچی کا کیا نام ہے؟"

"ٹینا۔"

مملکت نے ٹینا کو بلایا۔ بچی اب قدرے شرما رہی تھی۔

"آنٹی سے دوستی کریں گی۔" اس نے پیار سے پوچھا۔

وہ باپ کی سمت دیکھنے لگی پھر باپ کے اشارے پر سر ہلا دیا۔

"کل آپ میرے گھر آئیں گی؟"

بچی نے سر ہلا کر ہامی بھری۔

مملکت نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ کافی دیر ہوگئی میں کتنی اپ سیٹ تھی۔ بہل گئی۔

شاہ جہاں اور ٹینا اسے فوکسی تک چھوڑنے آئے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو دونوں کے ہاتھ بلند ہوئے۔

"بہت اچھے انسان ہیں یہ۔ بچی بھی پیاری سی ہے حالانکہ اسے بچے سنبھالنے نہیں آتے تھے۔ پیارے البتہ ضرور لگتے تھے۔ میں کتنی بہل جاؤں گی۔ وہ پہلے ہی سے سوچ کر خوش ہونے لگی۔ اکیلا گھر کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ چلو خدا نے میری تنہائی دور کرنے کا سامان کر دیا بچی توجہ چاہتی ہے۔

چائے پر اس نے خاصا اہتمام کر ڈالا بمقررہ وقت پر شاہ جہاں اور ٹینا آگئے۔

"آپ کو مکان تلاش کرنے میں دشواری تو نہیں ہوئی؟"

"قطعی نہیں۔"

وہ درمیانے سے قد کا ڈلیسینٹ سا انسان لگ رہا تھا۔ صاف ستھرا ڈھنگ کا لباس اس پر جچ رہا تھا۔ بچی کے لیے اس نے کافی ساری ٹافیاں چاکلیٹ منگاتے تھے۔ جنہیں پاکر بہت خوش تھی۔ اس سے کافی فری بھی ہوگئی، یوں روز روز کی ملاقات سے اجنبیت تو بالکل دور ہوگئی تھی۔

اس بار شاہ جہاں پندرہ روز کے لیے منیلا جارہا تھا۔ ٹینا بخوشی رہنے کو تیار تھی۔

وہ بڑی فرمانبردار سی بچی تھی۔ اس کی تربیت میں کافی محنت کی گئی تھی۔ ماں کی شفقت سے محروم اس بچی پر مملکت کو بڑا پیار آتا۔ عجیب سی انسیت ہوگئی تھی۔

ٹینا اس کے پاس تھی اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ بچے کتنے معصوم اور پیارے ہوتے ہیں۔

"میں اب ہمیشہ آپ کے پاس آجایا کروں گی۔ وہاں نا سکینہ آنٹی مجھے اتنے زور سے تھپڑ مارتی تھیں اور سارے سارے چاکلیٹ چھین لیتی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اچھے بچے تو وہ ہوتے ہیں جو کسی کو اپنی چیز دیں۔"

"دیا تو کرتی تھی میں، مگر وہ پھر بھی چھین لیتی تھی۔

آپ آنٹی مجھے کبھی نہیں ماریں گی؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔" اس نے بے ساختہ اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"آپ بہت اچھی ہیں۔" ٹینا خوش ہوگئی تھی۔

"آج کل بچی کس کی ہے تمہارے پاس؟" ریشماں نے آتے ہی سوال کیا۔

"ہے ایک۔" مملکت کو ان کا انداز تخاطب پسند نہ آیا۔

"اب تم نے نرسری کھول لی ہے۔ دو چار میں بھی بھجوا دوں بچے۔" ریشماں حسب عادت طنز پر اتر آئیں۔

"پلیز ریشماں آپا!" مملکت نے لجاجت سے کہا۔

"شادی تم نے کرنی نہیں۔ ایرے غیروں کے بچے پالنے سے بہتر ہے اپنے بچے پالو۔"

"آپ گھٹیا باتیں مت کیا کریں۔"

"میری حقیقت سے پُر باتیں تمہیں گھٹیا لگتی ہیں۔ اس دفعہ وہ بچی چھوڑنے آئیں تو کہہ دینا ان سے شادی کرلیں۔ دنیا باتیں بنا رہی ہے۔"

"آپ کے سسرال والے ہوں گے۔" اس نے گہرے طنز سے کہا۔

"اب تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ وہ شخص اچھا ہے تو کیا برائی ہے بچی تم سے ویسے ہی قریب ہے، اب تم مجھ سے نہ چھپاؤ، پسند آگیا ہے نا وہ؟" ریشماں چاپلوسی سے بولیں۔

"ریشماں آپا! بچی جہاں پہلے رہتی تھی، وہ لوگ اسے مارتے تھے۔" مملکت نے ان کی بات نظر انداز کرکے سمجھایا۔

"مجھ سے ملوانا اب آئے تو۔" ریشماں نے سنی ان سنی کردی۔

وہ کچھ نہ بولی۔

ریشماں کے جانے کے بعد اس نے سر پکڑ لیا تنہائی کا خوف دور کرنے کے لیے اس نے بچی کو اپنے پاس رکھا تھا لوگ باتیں بنانے لگ گئے۔ انسان کو کسی طرح چین سے نہیں رہنے دیتے یہ دنیا والے دوسروں کی ٹوہ میں لگی رہتی ہے۔ میں اب نہیں رکھوں گی بچی کو، کتنی شرمندگی کی بات ہے۔

وہ لوٹ آیا تھا، پُرخلوص مسکراہٹ کے ساتھ پرفیوم کی دو بڑی بڑی پیکنگ اس کی طرف بڑھائیں۔

"شکریہ۔ اس کی بھلا کیا ضرورت تھی؟"

"خاص طور پر آپ کے لیے خریدی ہیں۔ انکار مت کیجیے۔"

ٹینا بے شمار چاکلیٹ کے پیکٹ سنبھالے آگئی جنون کی حد تک شوق تھا اسے۔

"چلیں بیٹا!" شاہ جہاں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"جی۔ آنٹی آپ بھی چلیں گی ہمارے ساتھ۔"

"میں پھر آؤں گی۔" اس نے کہہ کر ٹالا۔

"تنگ تو نہیں کیا ٹینا نے۔"

"بالکل بھی نہیں، بڑی اچھی بچی ہے۔"

"میں اب کبھی نہیں رکھوں گی بچی کو۔" اس نے مصمم ارادہ کرلیا سوچا تھا بہل جایا کروں گی مگر لوگ۔ خدا انہیں سمجھائے" وقت کسی طرح نہیں کٹ رہا تھا۔ شاہ عالم تو غالباً اسے بھول چکا تھا پلٹ کر آیا ہی نہیں۔ منہ دیکھے کی محبت تھی وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ لامتناہی سوچیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ کالج غیر معینہ مدت کے لیے بند ہوچکے تھے۔ کالج جس علاقے میں تھا وہاں کرفیو نافذ تھا گھر میں رہ رہ کر وہ انتہا سے زیادہ پریشان ہوگئی، اب اسے ٹینا کی آمد کا انتظار بھی نہ تھا پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ انکار کر دے گی۔

وہ بے کلی سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی شاہ جہان کو دیکھ کر ٹھٹک گئی، وہ تیز تیز قدموں سے چلا آرہا تھا شریف النفس انسان جس کی مسکراہٹ خلوص سے بھرپور تھی، جس کی موجودگی کوفت کا باعث نہ بنتی جس کی نگاہ نیز نہ برساتی تھی۔

"ٹینا کہاں ہے؟" وہ تنہا کبھی نہ آیا تھا لہذا فوراً ہی احساس ہوا۔

"گاڑی میں سو رہی ہے۔ کچھ بخار بھی ہے مجھے آج امریکہ جانا ہے۔ آپ کو بیمار بچی کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑے گی میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"وہ مجھے بچے سنبھالنے نہیں آتے۔ شاہ جہاں صاحب کجا کہ بیمار بچے۔" اس نے رکھائی سے کہہ کر منہ پھیر لیا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ پریشان ہو کر بولا۔

"جی ہاں، سوری میں بچی کو نہیں رکھ سکتی۔" اس نے منہ پھیر لیا۔

"میں تو مطمئن ہو گیا تھا۔ کہ اس کی نگہداشت کا ذمہ آپ نے اٹھا لیا ہے۔" شاہ جہاں بہت پریشان نظر آرہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے۔"

"اگر میں درخواست کروں کہ صرف اس بار رکھ لیں میں نے فیصلہ کیا ہے۔ بچی کی خاطر یہ ملازمت چھوڑ کر کوئی اور ڈھونڈ لوں گا تب تک آپ۔" وہ منت کر رہا تھا۔

اسے اچانک کیا ہو گیا تھا۔ حالانکہ ٹینا کی بیماری کی خبر نے اسے بے چین کر دیا تھا۔

"بہر حال آپ نے بچی کی دیکھ بھال کی آپ کا بہت بہت شکریہ۔" وہ پلٹ گیا۔ اسے اس کے رویے پر اچھنبا ہوا تھا اتنی سرد مہری کی توقع نہ تھی، مملکت اسے باہر تک چھوڑنے آئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ مملکت قریب آگئی۔

"لاک کھولیے، ٹینا کو دیکھوں کتنا بخار ہے۔" اسے بے ساختہ پیار آگیا بچی پر۔ شاہ جہاں نے لاک کھول دیا۔ ٹینا پچھلی سیٹ پر لیٹی تھی اس نے آنکھیں کھولیں۔

"آنٹی آداب ؟" اس نے ہولے سے کہا۔

"بخار کیوں چڑھا لیا آپ نے ؟" مملکت نے پیار سے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"خود ہی ہو گیا۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"کافی تیز بخار ہے مگر آپ تو بہادر ہیں نا۔" مملکت نے چہرہ چھو کر دیکھا۔

"میں بخار میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔"

"بیٹے! ہم اپنے گھر جا رہے ہیں، اب آنٹی کو خدا حافظ کہہ دیں۔" شاہ جہاں نے مداخلت کی۔

"تو میں کہاں رہوں گی ؟" ٹینا حیران ہو کر بولی۔

"آپ کی سکینہ آنٹی سے کہہ دوں گا وہ اب نہیں ماریں گی بیٹا۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی ڈیڈی۔" ٹینا روہانسی ہو گئی۔

"آنٹی! آپ نہیں رکھیں گی مجھے ؟" اتنی حسرت پنہاں تھی لہجے میں کہ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔

"پلیز آپ بچی کو لے آئیے۔ میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گی۔" وہ کھڑکی میں منہ ڈال کر بولی۔

"آپ کو زحمت ہو گی۔" وہ خوشگواری سے مسکرایا تھا مگر پھر بھی تامل کیا۔

"میری باتوں کا برا مت مانیے گا۔ میں آپ کو بتاؤں گی کہ کیوں منع کیا تھا۔" وہ کہہ کر پیچھے ہٹی۔ اندر لا کر اس نے ٹینا کو بستر پر لٹایا۔ دوائیں، کپڑوں کا بیگ رکھا۔ اور ساتھ ہی گھر کی چابی بھی بڑھا دی۔

"اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو۔"

"کیا مطلب، میں بچی کی ضرورت پوری نہیں کر سکتی" وہ قدرے برا مان کر بولی۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" شاہ جہاں نے آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک لیے اسے دیکھا۔

"چابی اپنے پاس رکھیے، میں چاہتا ہوں یہ آپ کے پاس رہے۔" اس کی دبی دبی مسکراہٹ نے مملکت کو بوکھلا دیا۔

"جی۔ مگر۔"

"آپ کے پاس کافی وقت ہے سوچنے کے لیے میں نے آپ کے بارے میں بہت سوچا۔ آپ بھی تنہائی کا شکار ہیں اور میں بچی اور خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ لیلیٰ کے علاوہ کوئی اور میری زندگی میں داخل ہو گی۔ مجھے اعتراف ہے مرحوم بیوی سے مجھے بے انتہا محبت ہے۔ مگر آپ نے میری سوچوں کے زاویے بدل دیے زندہ رہنے والوں کو سہاروں کی ضرورت ہے۔ بغیر سہارے کے رہنا ممکن نہیں۔ یہ میری خود غرضی ہے کہ آپ کی مرضی معلوم کیے بغیر اپنی مرضی ٹھونس رہا ہوں۔ لیکن میں ایسا سوچنے میں حق بجانب ہوں، میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ آپ میری اور ٹینا کی زندگی میں نئی روح پھونک دیں گی پھر امید رکھوں کہ آپ میرا ساتھ قبول کریں گی۔" وہ گردن قدرے جھکائے پھول برسا رہا تھا اس پر۔

مہک نے حصار کھینچ دیا اس کے گرد۔

"لیتی ہیں ذمہ داری، آپ ہم دونوں کی۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔ شاہ جہاں کی عادات کی وہ پہلے سے معترف تھی۔ پھر اس پیغام نے دل کے ایوان میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو گئی وہ تنہائی کے زہر سے واقف تھی۔ شاید خدا نے میری قسمت میں اس شخص کو لکھا تھا۔ اور اس میں کوئی برائی بھی نہ تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے شاہ جہاں کے گھر کی چابی اٹھائی مضبوطی سے مٹھی بند کر لی۔

"شکریہ۔"

"شاہ جہاں مملکت کو جلد اپنے گھر لے جائے گا۔" وہ بے انداز خوشی دبا کر بولا تو، اس کی پلکیں جھک گئیں۔

*

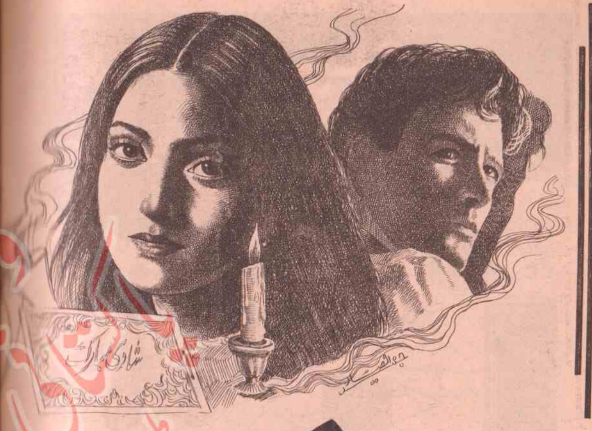

سنا دو [illegible] زندگی

نسیم سحر قریشی

گوہر کو ان کی بہن جوہر نے فون کر کے بلایا تھا۔ انہیں کسی نامعلوم شخصیت نے کچھ تصاویر بھیجی تھیں۔ یہ تصویریں ایک خوبصورت گھر کی تھیں اور اس میں گھر کے مختلف حصے دکھائے گئے تھے۔ گوہر گھر پہنچی تو پتا چلا کہ اس کی ماموں زاد بہن ارم اور اس کے بھائی کو بھی یہ تصویریں بھیجی گئی ہیں۔

شبیر بہت عرصے بعد وطن واپس آئے تھے انہیں اپنی منہ بولی بہن سدرہ اور ان کی بیٹی ماورا سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے پاکستان میں بہت خوبصورت گھر بنوایا تھا۔ بار ایسوسی ایشن کے اصرار پر وہ الیکشن میں کھڑے ہو گئے۔ شبیر کو پتا چلا کہ سدرہ کی نند کی بیٹی فسطینہ نے ان کے گھر کی تصویریں بنائی ہیں۔

گوہر ارم کے ساتھ اس گھر میں پہنچی جس کی تصویر بھجوائی گئی تھی۔ وہاں اس کی ملاقات ڈیڈی سے ہوئی۔ وہ بہت حیران

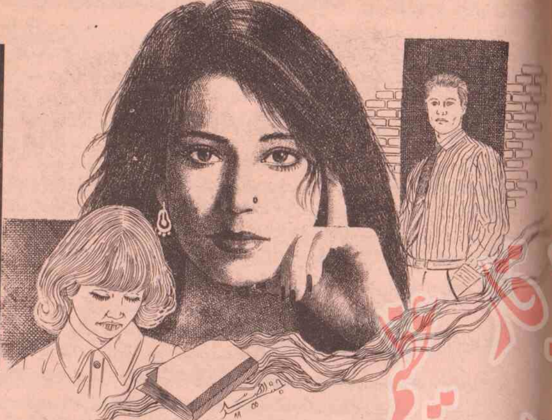

تھے کہ قصہ کیا ہے۔ شبیر آئے تو انہوں نے ان سے پوچھا۔ شبیر نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔

جوہر کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہاں گوہر بھی گئی۔ انہیں علم ہو چکا تھا کہ شبیر واپس آچکے ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیر کی منگنی فسطینہ سے ہو رہی ہے، گوہر بری طرح اپ سیٹ ہو گئی۔

گوہر ماضی میں پہنچ گئی تھی۔

اس کا ایف اے کا رزلٹ نکلا تھا اور بخت نے آکر اسے بتایا تھا کہ وہ تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئی ہے۔ وہ رو رہی تھی تب ہی پتا چلا کہ اس کے ماموں کا بیٹا شبیر آیا ہے۔ اس نے شبیر کو پہلے بھی دیکھا تھا لیکن ایک لائق طالب علم کی حیثیت سے ٹی وی میں انٹرویو دیتے ہوئے شبیر نے بتایا کہ بخت نے جھوٹ بولا ہے وہ تو فرسٹ پوزیشن میں کامیاب ہوئی ہے۔ شبیر نے اسے اخبار میں تصویر شائع کرانے کی اجازت بھی نہیں دی۔

شبیر کے والد شاہنواز نے ایک غیر مسلم لڑکی سے شادی کی تھی جسے ان کے والد سر عبداللہ نے قبول نہیں کیا۔ کنیز فاطمہ ایک بچے شبیر کو جنم دے کر فوت ہو گئی تھی تو شاہنواز شبیر کو ایک نرسری میں داخل کرا کر اپنی دوسری بیوی سعیدہ کے ساتھ بیرون ملک چلے گئے اور یوں شبیر کی زندگی ہوسٹلوں میں گزرتی رہی یہیں اس کی ملاقات عدی سے ہوئی۔ عدی کے گھر والوں سدرہ آپا، عذرا اور ممی ڈیڈی نے اس سے سگے بیٹوں سے بڑھ کر سلوک کیا۔

گوہر کی امی صفیہ شاہنواز کی سگی بہن تھیں لیکن غربت اور امارت کے درمیانی فاصلے ان کو دُور رکھے ہوئے تھے۔

شبیر نے ایف اے کیا تھا کہ اچانک ایک روز شاہنواز عسکری آگئے۔ وہ پاکستان میں سیٹل ہو گئے تھے۔ شبیر کو وہ اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ جہاں سعیدہ بیگم اور ان کے بچوں نے سرد مہری سے ان کا استقبال کیا۔ غفور بابا جو شاہنواز

عسکری کے خاندانی ملازم تھے۔ ان کے ساتھ شاہنواز عسکری نے اسے اپنی زمینوں کی سیر کے لیے بھیجا۔ عدی بھی اس کے ساتھ تھا۔

گاؤں میں شبیر کو پتا چلا کہ غفور بابا کا پوتا مسرور ایک لڑکی رالو کو چاہتا ہے، اور رالو کا سودا اس کے باپ نے کر دیا ہے۔ رالو خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ شبیر نے اسے بچا لیا اور مسرور کو دس ہزار روپے دے دیئے تاکہ وہ رالو سے شادی کر سکے۔

شبیر نے عبداللہ پور کی حویلی بھی گاؤں کے اسکول کے لیے وقف کرا دی۔ جس پر شاہنواز عسکری کو بہت غصہ تھا۔ شبیر گھر آیا تو شاہنواز غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔

انہوں نے شبیر پر الزام لگایا کہ وہ عاصم کے اشارے پر یہ سب کر رہا ہے۔ شبیر مزدوروں کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن شاہنواز عسکری کو یہ بات پسند نہ تھی۔ انہوں نے شبیر کو گھر سے نکال دیا، شبیر عدی بن جمال کے گھر رہنے لگا، گوہر اور جوہر شاپنگ کے لیے گئیں تو راستے میں انہیں نبیل ملا، نبیل کو جوہر ایک نظر میں پسند آ گئیں اور جوہر کا رشتہ طے ہو گیا۔ شبیر نے گوہر کو فون کیا تو گوہر نے آواز سنتے ہی فون بند کر دیا، کیونکہ وہ اس کے کردار سے بدگمان تھی۔

جوہر کی شادی پر دلنواز، شاہنواز اور خاندان کی بزرگ چچی جان بھی آئیں، چچی جان اور دلنواز نے فیصلہ کیا کہ گوہر کو شبیر سے منسوب کر دیا جائے، گوہر راضی نہ تھی لیکن ماں کے آنسوؤں سے مجبور ہو گئی۔

گوہر بازار گئی تو شبیر کے ساتھ عذرا بن جمال کو دیکھا، اس کی بدگمانی اور بڑھ گئی، شبیر نے گوہر کو فون کیا تو گوہر نے اپنے خیالات اس پر ظاہر کر دیے، شبیر نے اسے بتایا کہ عذرا کو وہ اپنی بہن سمجھتا ہے۔

عاصم دکان سے لوٹے تو بہت پریشان تھے، کیونکہ سعیدہ نے ان سے فون پر شبیر کی بہت برائیاں کی تھیں۔

صفیہ اور عاصم نے فیصلہ کیا کہ دلنواز سے جا کر ساری بات کریں گے۔ وہ لاہور چلے گئے۔

گوہر گھر پر تھی کہ پولیس شبیر کو پوچھتی ہوئی گھر آ گئی۔ شبیر نے دو گھروں کو اجڑنے سے بچایا تھا۔ لیکن دشمنوں نے اس پر اغوا کا الزام لگا دیا۔ شبیر نے خود پولیس اسٹیشن جا کر ساری بات صاف کر دی۔ شبیر نے گوہر کو فون کیا تو خاصی برہم تھی۔

گوہر نے شبیر سے کہا کہ اگرچہ یہ رشتہ ہو چکا ہے لیکن وہ انگوٹھی تب ہی پہنے گی جب شبیر کے کردار پر اسے یقین ہو گا۔ عاصم اور صفیہ بیگم دلنواز عسکری سے شبیر کے بارے میں پوچھنے گئے تو دلنواز عسکری گوہر کا دل شبیر کی جانب سے صاف کرنے کے لیے اسے گاؤں لے گئے۔ وہاں جا کر گوہر کو شبیر کے اوصاف کا پتا چلا۔

گوہر ایک دن گھومنے گئی تو شدید باد و باراں کے طوفان میں گھر گئی، ہوش آیا تو پتا چلا کہ وہ سکندر پور کے جاگیردار کے گھر میں ہے اور ان کا بیٹا ڈاکٹر ہارون واسطی اسے اُٹھا کر لایا ہے، وہ ہوش آنے پر اسے واپس عبداللہ پور چھوڑ گیا، گوہر نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ وہ دلنواز کے گھر لاہور آ گئی تھی، شبیر اسے یونیورسٹی لے جانے کے لیے آ گیا، لیکن وہ بہت سرد مہری سے پیش آ رہا تھا۔

گوہر نے شبیر کو بتایا کہ اسے شبیر کے بارے میں جو شکوک و شبہات تھے، وہ اب دور ہو چکے ہیں، اور وہ ہر قدم پر شبیر کا ساتھ دے گی، سدرہ کے ایکسیڈنٹ کی خبر آئی تو شبیر عدی کو چھوڑنے کراچی چلا گیا، یونیورسٹی میں گوہر کو مامون واسطی مل گیا، اس نے کہا کہ گوہر اس کے بھائی ہارون واسطی کی پسند اور انتخاب ہے، اس لیے اس کو شبیر عسکری سے بات نہیں کرنی چاہیے۔

گوہر مامون واسطی کو جھڑک کر آگے بڑھ گئی۔ شبیر نے یونیورسٹی الیکشن میں کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

عدی اور عذرا، سدرہ آپا کے پاس لندن پہنچ گئے تھے، وہاں ڈاکٹر ہنری نے ان کا استقبال کیا۔ عدی کو کاغذات نامزدگی داخل کرانے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ گوہر اس کے ساتھ یونیورسٹی چلے لیکن مامون نے بھی اسی دن جواب مانگا تھا اس لیے گوہر یونیورسٹی نہیں گئی۔ شام کو وہ عائکہ کے ضد کرنے پر اسے تحفہ دلانے نکلی تو بازار میں مامون واسطی مل گیا۔ مامون واسطی نے اسے ڈراپ کیا۔ وہ اتری تو پورچ میں شبیر کی سوزوکی کھڑی دیکھی۔

شبیر نے بتایا کہ اس نے کاغذات نامزدگی داخل کر دیے ہیں۔ شبیر جیت گیا۔ شبیر پر قاتلانہ حملہ کیا گیا لیکن وہ بچ گیا۔ آئی جی پنجاب کا تبادلہ کر دیا گیا۔ مامون عسکری نے گوہر کو فون کر کے بتایا کہ یہ شبیر عسکری کے لیے مامون واسطی کا تحفہ ہے۔

یونیورسٹی میں نوشی کے حسن کے چرچے تھے۔ نوشی کی ماں کا تعلق اس علاقے سے تھا جہاں راتیں جاگتی ہیں، دن سوتے ہیں۔ اس کے باپ نے شادی کر کے اسے ایک علیحدہ گھر میں رکھا تھا۔ اپنی ماں کے انتقال کے بعد نوشی اپنی نانی کے ساتھ رہتی تھی۔ یونیورسٹی میں اس کی ملاقات امتیاز رند سے ہوئی جو ایک بگڑا ہوا عیاش زمیندار تھا۔ اس نے نوشی کو بھی اپنے دام میں لانا چاہا جب نوشی اس کے دام میں نہ آئی تو اس نے نوشی کے ڈرائیور کو ساتھ ملا کر اغوا کرا لیا اور بے عزت کر کے گھر واپس بھجوا دیا۔ نوشی دنوں بستر پر پڑی رہی۔ یونیورسٹی واپس آئی تو مجسم انتقام تھی یہاں اس کی ملاقات مامون واسطی سے ہوئی۔

مامون واسطی سے اس کی ملاقاتیں ہوئیں تو مامون واسطی اس کے قریب آ گیا۔

شبیر نے یونیورسٹی الیکشن جیت کر تقریر کی۔ اور اس کی اپیل پر لوگوں نے بڑی رقوم جمع کرائیں۔ شبیر ایک اچھا منتظم ثابت ہوا۔

ڈاکٹر ہنری شبیر کے نانا ہیں۔ یہ انکشاف باتوں کے دوران عدی اور اس کی فیملی پر ہوا۔

ہارون واسطی کے گھر والے گوہر کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔

شبیر امتیاز رند سے بات کر رہا تھا کہ نوشی آ گئی۔

اس نے کہا کہ وہ شبیر سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ شبیر نے گوہر سے کہا کہ وہ اکیلی چلی جائے خود وہ نوشی کے ساتھ چلا گیا۔ نوشی نے اسے ساری بات بتائی تو شبیر نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے نقصان کی تلافی کرے گا۔ اس نے نوشی سے شادی کا فیصلہ کر لیا اور فون کر کے یہ بات گوہر کو بھی بتا دی اور نوشی کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا کہ وہ اس سے شادی کر کے امتیاز کو قانون کی عدالت میں گھسیٹے گا۔ نوشابہ نے اس کا فیصلہ تسلیم نہیں کیا۔ وہ امتیاز کو قتل کرنا چاہتی تھی، دوسرے دن جب شبیر امتیاز سے بات کر رہا تھا تو نوشابہ آ گئی اس نے چار گولیاں امتیاز کے سینے میں اُتار دیں۔ شبیر نے اس کو روکنے کی کوشش کی لیکن نوشابہ نے خود کو بھی گولی مار لی۔ شبیر کے ہاتھ میں ریوالور تھا اس لیے اِس پر دوہرے قتل کا مقدمہ بن گیا۔ یہ خبر گھر پہنچی تو سعیدہ بیگم بہت خوش ہوئیں۔

اٹھارویں قسط

"مام۔ مام۔" شاذیہ پھٹی آنکھوں سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔

"مام۔ آپ ماں ہیں۔ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ آخر بھائی ہمارے بھائی ہیں۔ ہمارے پاپا کے بیٹے ہیں۔ اُن کی زندگی۔"

"شاذی ڈونٹ بی سلی۔ ممی نے تو اُنہیں نہیں کہا کہ وہ قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کریں۔ نہ ہی ممی جج کی کرسی پر بیٹھی ہیں جو شبیر بھائی کا فیصلہ اُن کے ہاتھ میں ہے۔ تم خواہ مخواہ ان کی وکالت نہ کرو۔ ممی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ اُن کے لچھن تو ہمیشہ سے ہی خراب تھے۔ اب گوری کو پتا چلا ہو گا لڑکی کی خاطر مر مٹے۔ قتل جیسا جرم سرِ عام کر دیا۔ ہزاروں لڑکیوں کے پیچھے تو بھاگے ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو کسی انجام تک پہنچنا ہی تھا۔" ارم بے حد سنجیدہ تھی۔

"ارم پلیز یہ وقت ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔" شاذی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس کے دل میں درد کی کئی لہریں ایک ساتھ اُتر گئی تھیں۔ کچھ بھی ہو شبیر کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا تھا جو شاذیہ کی

رگوں میں تھا۔ اُسے اپنی ماں اور بہن کی یہ سرد مہری بلکہ سنگدلی بہت زیادہ بُری لگی تھی۔

"یہ جرم ظہیر بھائی یا منیر بھیا کر بیٹھتے تو۔"

"ارے لڑکی! بہت چل نکلی ہے تیری زبان، خدا نہ کرے میرے بیٹے ایسا کیوں کرنے لگے۔ وہ میرے بیٹے ہیں۔ اُن کے جسم میں شریف اور خاندانی لہو گردش کر رہا ہے۔ شبیّر پر تو سارا اثر اس کی ماں کا ہے۔ جانے کیسی عورت اُٹھا لایا تھا تمہارا باپ۔ جو ایسا بدبخت بیٹا نصیبوں میں لکھا گیا۔ جب بھی لایا باپ کے لیے کوئی مصیبت ہی لایا۔"

"بہر حال یہ وقت ایسا وقت نہیں ہے کہ ہم اُن کی برائیاں گنوا کر ان سے دُور بیٹھے رہیں۔"

"بکومت۔ جب اُن کا اس گھر سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ تو ہمارا مطلب ہی کیا رہ گیا ہے اُن سے۔" ارم نے پھر ٹوکا۔

"تمہارے باپ کو غرض ہو گی تو جا کے مل آئیں گے۔ میں تو کہیں نہیں جانے کی۔" سعیدہ بیگم نے فیصلہ سُنا دیا۔ شاذیہ افسردہ سی ایک طرف جا بیٹھی۔ ارم خبر کی تفصیل پڑھنے لگی۔ اور سعیدہ بیگم ٹیلی فون پر جانے کس کو اطلاع دینے لگیں۔

"حوصلہ کریں ممّی۔ خدا خدا کر کے سدرہ آپا روبصحت ہوئی ہیں۔ آپ نے حوصلہ ہارا تو وہ پھر سے بیمار پڑ جائیں گی۔ وہ بارہا مجھ سے پوچھ چکی ہیں۔ میں نے انہیں آپ کے پاس آنے سے روکا ہوا ہے۔ ایک مصیبت اور ہے کہ پاکستان کے لیے نمبر ہی نہیں مل پا رہا۔ ممّی! آپ اپنے کمرے میں بند رہیں تو میں آپی کو زیادہ دیر روک نہیں پاؤں گی۔ وہ آپ کے کمرے میں آجائیں گی۔ آپ کی حالت دیکھ کر پریشان ہوں گی اور بات بتاتے ہی بن پڑے گی۔"

"عذرا۔ میری بیٹی۔ میری پیاری اجّی۔ تم کیسے کہہ رہی ہو۔ میں ماں ہوں اجّی۔ مجھے چین کیسے آسکتا ہے۔ ایک ماں ایسی خبر سُن کر کیسے بیٹھ سکتی ہے چُپکی۔ اُس پر ہر مصیبت ہمارے یہاں آنے کی وجہ سے آئی ہے۔ عذرا۔ تم خود سوچو۔ خود۔ یہ خبر ایسی ہے کہ میں پُرسکون ہو کر بیٹھ جاؤں۔ نہیں نہیں مت روکو مجھے مت پابندی لگاؤ مجھ پر۔ مجھے رونے دو۔ مجھے اس بربادی پر ماتم کرنے دو۔ سدرہ اب ٹھیک ہے۔ میں یہاں ایک پل نہیں رہوں گی۔ مجھے اپنے بچّے کے پاس جانا چاہیے۔ مجھے جانا ہو گا۔ ہائے میرا بدقسمت شبیّر۔ جانے کیسا ہو گا۔ کس حال میں ہو گا۔ اجّو۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ یہ قتل اُس نے نہیں کیے۔"

"ممّی آپ بہت بھولی ہیں۔ شبیّر نے یہ قتل کُھلے عام کیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"اوہ میرے خدا۔ خدا جانے وہ کیسے حالات تھے جو اُسے اس منزل تک لے آئے۔ وہ لڑکا اور لڑکی کون تھے۔"

"اخبار نے تو یہی لکھا ہے ممی رقابت کا معاملہ تھا۔"

"نہیں، نہیں میں نہیں مان سکتی۔ میرا بچّہ ایسا نہیں ہے۔"

"ممّی۔ آپ گھر بیٹھنے والی عورت ہیں آپ کو باہر کے معاملوں کی کیا خبر۔"

"عذرا! اُس کی عمر کا سارا نہ سہی کافی حصّہ میرے ساتھ گزرا ہے میں اُس کی فطرت سے واقف ہوں وہ کسی ذی روح کو سوئی چبھو دینے کے حق میں بھی نہیں ہے۔"

"ممّی آپ کا کیا خیال ہے قتل صرف ظالم لوگ ہی کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ قتل چند لمحوں کا کھیل ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ جذباتی لمحہ ہم سے کوئی سا جرم کرا سکتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک قتل کر سکتا ہے۔ کسی

[illegible]

عمل کیا ہے۔"

ممی زارو قطار رونے لگیں۔ عذرا خاموش بیٹھی اُن کی گریہ زاری پر اپنا دل مسوستی رہی۔

"چاہے یہ سچ بھی ہو۔ قتل کا جرم اُس نے کیا بھی ہو تو بھی ایک ماں کے دل سے اُس کا پیار کیسے نکل سکتا ہے۔ ہائے میرا شبیّر۔ اجّی۔ کیا وہ پھانسی چڑھ جائے گا۔ کیا اُسے موت کی سزا ہو جائے گی۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ شبیّر۔ شبیّر۔ شبیر۔ میری جان، میرے بچے تم کہاں ہو۔" وہ دیوانوں کی طرح شبیّر کو آوازیں دینے لگیں۔

عذرا نے اُنہیں تھام لیا۔

"ممی۔ ممی۔ خود کو سنبھالیں۔ آپ نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو۔"

"مجھے ضرور کچھ ہو جانا چاہیے۔ نہیں جینا ہے مجھے۔ اتنا بڑا پہاڑ میں نہیں اُٹھا سکتی۔ نہیں ہے مجھ میں اتنی طاقت اس خبر نے میرے دل کا سارا چین اور قرار چھین لیا ہے۔ جمال کہاں ہیں۔ اُن سے کہو۔ مجھے ہر حال میں پاکستان جانا ہے۔ وہ نہیں کوشش کریں گے تو میں سفارت خانے والوں سے التجا کروں گی۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

"ممی۔ ڈیڈی گئے تو ہیں۔ اسی کام سے ہی گئے ہیں۔"

"کسی کو کوئی فکر نہیں ہے سب چین سے ہیں۔"

"ممی! آپ بہت زیادہ جذباتی ہو رہی ہیں۔ ڈیڈی کی پریشانی کا آپ کو اندازہ ہی نہیں۔ بس وہ خاموش رہتے ہیں ظاہر نہیں کرتے۔ اور آپ ہیں کہ ہمیں بھی بے حوصلہ کرتی ہیں۔"

"عذرا۔ کیا چاہتی ہو تم۔ آخر کیا۔ میں اُس کا نام بھی نہ لوں۔ اُسے یاد بھی نہ کروں۔ تمہیں کیا خبر۔ حوالات میں بند ہو کر چند لمحے گزارنا بھی مشکل ہوتا ہے اور وہ پورے دو دن سے حوالات میں ہے۔ خدا جانے کس حال میں ہے۔ باپ اُس کا تو ویسے بھی دشمن ہے اُس کا۔ وہ تو اُس کی ساری مصروفیات کے خلاف تھا۔ مجھے یقین ہے وہ اس کی معاونت کے لیے ہرگز نہیں آیا ہو گا۔ اور وہ چچا۔ کیا خبر وہ بھی۔ وہ بھی اُس کے ساتھ ہے یا نہیں۔"

عذرا خاموش ہو گئی۔

"عذرا۔ ڈاکٹر ہنری کو بتایا تم نے۔؟"

"ڈیڈی نے بتایا ہو گا۔ ڈاکٹر صاحب اس طرف تو آئے ہی نہیں۔"

"عدی کہاں ہے۔؟"

ڈیڈی کے ساتھ گیا ہے۔ وہ بھی بہت پریشان ہے۔ افتخار بھائی الگ فکر مند ہیں۔ ڈیڈی صبح اُن پر خفا ہو رہے تھے۔ فون نہیں مل رہا۔ تو اس میں افتخار بھائی کا کیا قصور۔ آپ بھی ڈیڈی کی طرح خواہ مخواہ ہی ہم سے خفا ہو رہی ہیں۔ ایک دو دن میں آپ کے جانے کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں ابھی فون کرتی ہوں ڈاکٹر صاحب کو لیکن ممّی! اُن کو بتانے سے کیا حاصل ہو گا۔ بیچارے پریشان ہوں گے اُن کی زندگی میں پہلے بھی کوئی خوشی نہیں ہے۔"

"تو اُن سے بات چُھپا کر کیا ملے گا۔ آخر وہ اُن کا نواسا ہے۔ اپنوں کے دُکھ اُٹھانے ہی پڑتے ہیں۔ بلکہ اُن سے بات چُھپا کر ہم زیادتی کریں گے۔ تم دیکھ لینا وہ کتنے خفا ہوں گے۔ وہ ایک بہادر انسان ہیں عذرا۔ اِس بات کو بھی فیس کر لیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ میں فون کر رہی ہوں۔" عذرا اُن کے قریب سے اُٹھ کر فون کی طرف بڑھی۔

جمال احمد اندر داخل ہوئے۔

"کیا ہوا؟ کچھ پتا چلا میرے شبیّر کا؟"

وہ بے تابی سے آگے بڑھیں۔

"ناداں مت بنو۔ بس پاکستان چلنے کی تیاری کرو۔ ہم سب لوگ ہی چل رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہی کچھ معلوم ہو سکے گا۔ افتخار کہہ رہا تھا کل کی فلائیٹ سے ہم جا سکیں گے۔"

"شکر ہے خدایا۔ جمال! میں شبّو سے مل سکوں گی نا؟"

"میں خود بھی بے حد پریشان ہوں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس تمہارے مزید کسی سوال کا کوئی جواب نہیں۔ پلیز مجھے پریشان مت کرو۔" جمال احمد اُلجھے اُلجھے سے لگ رہے تھے۔ عدی بھی کمرے میں آ پہنچا۔

"ممی آپ کی دعائیں پوری ہوئیں۔ کل ہم لوگ چل رہے ہیں۔ عذرا۔ بھئی جلدی سے سامان کی پیکنگ شروع کر دو۔ ممی۔ جب سے میں نے یہ خبر سُنی ہے ایک پل کو بھی چین نہ پا سکا۔ یہ سب آخر کیا ہے میں سمجھ ہی نہیں پا رہا۔ خدا کرے یہ سب ایک الزام سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ خدا کرے شبیّر نے ایسے بھیانک جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ خدا کرے۔" وہ صوفے پر ٹک گیا۔

"ممی! ڈیڈی کہہ رہے تھے ہمیں یہ خبر ڈاکٹر ہنری سے نہیں چھپانا چاہیے۔ خدانخواستہ بات بڑھ گئی تو وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ آخر وہ اس کے نانا ہیں۔"

"عذرا انہیں رنگ کر کے بتانے لگی ہے جاؤ تم بات کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔ بلکہ میں ان کے ہاں چلا جاتا ہوں۔"

"عذرا۔ عذرا۔ اگر نمبر نہ مل سکا ہو تو فون رکھ دو۔ میں اُن کے پاس خود جا رہا ہوں۔" عدی نے زور سے آواز دی۔

"عدی میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔ اِس گھر کی خاموشی سے مجھے خوف آنے لگا ہے۔" عذرا نے سامنے آ کر اُس کی بانہہ تھام لی۔

"عدی۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا تم سوچ سکتے ہو شبیّر نے سرِعام دو انسانوں کو قتل کر دیا ہو گا۔"

"میں تو۔ کچھ بھی سوچنے سے قاصر ہوں۔ میں خود بھی بے حد پریشان ہوں۔ سخت بے چین ہوں۔ اِن لمحوں میں وہ کہاں ہو گا، کیسا ہو گا، کیا سوچتا ہو گا۔ یہ ساری فکریں میرے اندر ہلچل مچائے ہوتے ہیں۔ وہ مجھے کتنا عزیز ہے اس کی خبر مجھے آج ہوئی ہے۔"

"عدی! ہم جن لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ اُن سے کسی طور نفرت نہیں کر سکتے۔ یہ سن کر بھی کہ وہ انسانی جانوں کا قاتل ہے مجھے اُس سے ذرا برابر نفرت نہیں ہوئی۔ اُس کی زندگی ہم سب کے لیے کتنی ضروری ہے۔"

"ہاں عذرا۔ تم سچ کہہ رہی ہو۔ نفرت تو میرے دل میں بھی پیدا نہیں ہوئی اور ممی کو دیکھا ہے تم نے۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے۔ شبیّر سے جدائی کا دُکھ ہماری ممی کو ہم سے چھین ہی نہ لے۔"

"خدا نہ کرے۔ عدی! تم پاکستان جاتے ہی اُس سے ملو گے؟"

"ظاہر ہے۔ ملنا تو ناگزیر ہے۔"

"ہم۔ مگر۔ میں۔ میں کیسے ملوں گی اُس سے۔ نہیں عدی مجھ میں اُسے دیکھنے کی تاب نہیں۔ عدی کیا اُسے پھانسی کی سزا ملے گی۔ عدی! کیا وہ مر جائے گا۔ عدی! کسی انسان کو اس احساس کے ساتھ دیکھنا کہ چند دنوں بعد اسے نہیں دیکھ سکیں گے دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ میں اُسے نہیں دیکھوں گی میں اُس سے نہیں ملوں گی۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔"

"پگلی۔ سارے فیصلے اُس رب کے ہیں جو اِس کائنات کا مالک ہے۔ وہی ہو گا جو اُسے منظور ہو گا۔ انسان

کو ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔"

"عدی! اس کے خواب کتنے حسین اور دلکش تھے۔ وہ تو انسانوں کو زندگیاں دینے کی بات کرتا تھا خوشگوار زندگیاں۔ اُس نے کیسے کسی کو مار دیا۔ کیسے؟ آئی کانٹ بلیو۔ (میں یقین نہیں کر سکتی)۔"

"ہمارے سارے سوالوں کا جواب صرف اُسی کے پاس ہے۔ وہ ہی ہمیں بتا سکتا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ ورنہ اخباروں نے تو کئی رنگین کہانیاں گھڑ دی ہیں۔" عدی نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

"چچی اماں۔ بہت ہو چکی۔ اب نہ ہو گی۔ آپ کی حمایت نے میری آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی۔ میں محبت کی عینک لگا کر دیکھتا رہا۔ عیب تو مجھے کبھی نظر ہی نہ آئے۔ میں سخت شرمندہ ہوں صفیہ آپا سے، عاصم بھائی سے۔ میں ان دونوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ میرے پاس اپنے دفاع کے لیے کوئی ہتھیار نہیں ہے میں اس نالائق کی کوئی حمایت اب نہیں کر سکتا۔ عاصم بھائی کو اختیار ہے بیٹی کے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں اس کی زندگی جس انداز سے سنواریں۔ میں اس کا ماموں ہوں دشمن نہیں۔"

"ہم تو سدا شاہنواز کو قصوروار گردانتے آئے شاہنواز آخر باپ ہیں بے سبب نفرت کیسے کر سکتے تھے۔ یہی لچھن انہیں پہلے نظر آتے ہوں گے۔ آخر کچھ عرصہ وہ اُن کے پاس بھی تو رہا ہے۔" عاصم نے جھٹ کہا۔

صفیہ چپ چاپ بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ اُنہوں نے کسی بات میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا۔ بولنے کو کچھ کہنے کو رہ ہی کیا گیا تھا جو وہ کہتیں۔ شبیّر نے تو ساری حدیں پھلانگ لی تھیں۔

"عاصم بھائی۔ یہ تو بچی نے رات کو ہمیں بتایا۔ اگر وہ نہ بتاتی تو میں اب بھی یہی کہہ رہا ہوتا کہ شبیّر بے گناہ ہے۔"

"کیا بتایا تھا اُس نے؟" چچی نے پوچھا۔

"آپ نہیں سُن رہی تھیں کیا۔ انگوٹھی اُتار کر وہ آپ ہی کو تو دے رہی تھی۔" دلنواز بھڑک اُٹھے۔

"آمنہ! تم نے نہیں سنا تھا؟"

آمنہ بھی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ دلنواز کے سخت لہجے پر چونک اُٹھیں۔

"جی۔ جی ہاں۔ شبیّر نے گوہر کو بتایا تھا کہ وہ اُس کے بجائے کسی اور لڑکی سے شادی کرے گا۔"

"کسی اور سے کیوں؟ اس لڑکی سے جس کو اُس نے جان سے مار دیا۔" دلنواز تو کھول رہے تھے غصّے سے۔

عاصم اور صفیہ نے ایک دم اُنہیں دیکھا۔

"آپ کو تو خبر ہے عاصم بھائی ایسی لڑکیاں کب کسی ایک کی ہوتی ہیں۔ حُسن کا جال لے کر شبیّر جیسے بے وقوفوں کو قدم قدم پر پھانستی پھرتی ہیں۔ اس نے کسی اور کے ساتھ دیکھا برداشت نہ کر سکا اور مار دیا۔"

"ورنہ کچھ بھی کرتا پھرے وہ۔ خس کم جہاں پاک خدا کا شکر ہے کہ ہماری بیٹی اس کے چنگل سے نکل آئی۔ اگر شادی کے بعد یہ سب کچھ ہوتا تو۔" عاصم بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔

"ہاں جی۔ میں بھی خدا کا شکر گزار ہوں یہ ذمہ داری تو مجھ پر ہی عاید ہوتی۔ میں آپ لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ گوہر بہت پیاری بچی ہے اعلا کردار کی شریف النفس بیٹی ہے۔ اُس کی بربادی مجھے چین نہ لینے دیتی۔"

"دلنواز۔ میں نے فیصلہ کیا ہے گوہر کو اپنے ساتھ لے جانے کا۔ اُس نے اِس حادثے کا بہت زیادہ اثر لیا ہے۔ چپ چاپ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی ہے۔"

"میں آپ کو روک نہیں سکتا عاصم بھائی۔ میں تو اُسے یہاں اعلا تعلیم کی خاطر لایا تھا مجھے کیا خبر تھی وہ

بے چاری تیرے گھر سے اتنا بڑا کام کرنے جائے گی۔ آپ نے جائیے۔ میرا خیال ہے اُس کی بہتری اسی میں ہے۔" دلنواز رونے لگے۔

"اے دلنواز بیٹے۔ شاہنواز نے کیا کہا ہے شبیّر کے بارے میں؟" چچی اماں نے پراُمّید انداز میں پوچھا۔

"کیا کہتے وہ؟ جو کہا ٹھیک ہی کہا۔"

"کب آئے گا وہ؟"

"معاف کیجیے چچی اماں! کم از کم شبیّر کے لیے تو ہرگز نہیں آئیں گے انہیں ضرورت بھی کیا ہے۔ ایسے ناہنجار بیٹے کی پشت پناہی کرنے کی۔" آمنہ جھٹ اُس کے دفاع میں بول پڑیں۔

"آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو۔ اُس کے وارث تو ہم لوگ ہی ہیں نا۔ اس دنیا میں یہ پہلا قتل نہیں ہوا ہزاروں لوگ ہزاروں لوگوں کو اس سے پہلے بھی قتل کر چکے ہیں۔ یہ ایک غلط فعل ہے لیکن انسان ہی کیا کرتے ہیں۔ آج پانچ دن ہو گئے ہیں۔ آپ نے اُس کی خبر گیری تک نہیں کی۔ ایک بار اُس کے پاس نہیں گئے۔ اُس سے پوچھا تک نہیں۔"

"مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بدنامی اور رسوائی جو مجھے اور میرے خاندان کو مل چکی ہے کافی ہے۔ ہمارا خاندان قاتلوں کا خاندان نہیں ہے۔ تم ہمارے خاندان کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لو۔ ایسی قبیح حرکت کسی نے کی ہو تو۔ تمہیں خبر ہے میں نے ان دنوں گھر سے قدم باہر نہیں رکھا۔ اخباری نمایندے شکاری کتوں کی طرح بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں نے اسی خوف سے ٹیلی فون ریسیو کرنا بند کر دیا ہے۔ میں کیوں جاؤں۔ کس لیے؟ لوگوں کی نظروں کے تیر کھانے۔ انجانوں کو بھی یہ جتانے کہ میں اس لعین منحوس قاتل کا چچا ہوں ہرگز نہیں۔"

آمنہ اتنا سخت جواب سُن کر خاموش ہو گئیں۔

"بیٹا خطائیں انسان کرتا ہے۔ وہ بھی ایک انسان ہے غصے میں آدمی کو کچھ نہیں سُوجھتا۔"

"آپ وکالت نہ کریں چچی اماں۔ اُس نے میرے اعتبار و اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے، میرے یقین کو توڑا ہے۔ میں اُسے معاف نہیں کر سکتا۔ میں اُس سے محبت کرتا تھا۔ بے تحاشا محبت۔ اُسے بہت اچھا جان کر۔ یہ سوچ کر کہ اُس سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ پر وہ اس قابل نہ تھا۔ اُسے اس بے لوث محبت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ سایوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے مجھے۔ میری خواہشوں کو بھول گیا تھا اُس نے مجھے ہی نہیں ایک اور معصوم کو بھی دھوکا دیا ہے۔ اور میں اس کا یہ جرم کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اُس کی طرف نہیں جا سکتا۔ بھائی جان نے بھی کہہ دیا ہے۔ اُن کا شبیّر کے قول و فعل سے کوئی تعلق نہیں۔ دو دن پہلے کے اخبار میں اُن کا بیان چھپ چکا ہے۔ انہوں نے اپنی لاتعلقی کا اعلان کر دیا ہے۔ آج کے بعد اس گھر میں شبیّر کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہو گی۔ وہ جیے یا مرے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔"

دلنواز نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

"عاصم بھائی۔ گوہر کو آپ جا کر لے آئیں۔ ڈاکٹر نے صبح کہا تھا۔ گیارہ بجے تک اُسے ڈسچارج کر دیں گے۔ عامر اور ساغر بھی وہیں ہیں۔ آمنہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلی جائے گی۔"

آمنہ اپنی نشست پر پہلو بدل کر رہ گئیں۔ بے بسی کے ساتھ دلنواز کو دیکھا۔ وہ سدا کے انتہا پسند تھے۔ ٹوٹ کر چاہنے والے۔ آمنہ نے تصویر کا دوسرا رُخ آج پہلی بار دیکھا تھا۔ اُن کے چہرے پر جو کچھ رقم تھا اُس کا مفہوم شدید ترین نفرت ہی تھا۔ وہ اُنہیں بغور دیکھتی رہیں۔

اُن کے دل میں شبیّر کی انسیت کا نرم اور نازک سا پودا انہوں نے ہی لگایا تھا۔ اور آج نفرت کی تند و تیز آندھی بن کر وہ محبت کے تناور درخت کو اُن کے دل کی دھرتی سے اکھاڑ پھینکنے پر تلے تھے۔

کیا محبتیں یوں نفرتوں میں بھی بدل جایا کرتی ہیں؟ آمنہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

کتنا روئی تھیں وہ۔ کتنا تڑپی تھیں۔ شبیّر کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے۔ اُس کے پاس جانے کے لیے۔ کسی نے ایک نہ سُنی تھی۔ خاندان کا خاندان اُس سے لاتعلق ہو کر رہ گیا تھا۔ گوہر تو اُسی روز سے ہاسپٹل میں تھی۔ ڈاکٹروں نے اُس کا علاج خواب آور انجکشن تجویز کیا تھا۔ تین دن مسلسل عالم بیہوشی میں رکھا گیا تھا اُسے۔ عامر نے صبح بتایا تھا کہ آج وہ ہوش میں ہے لیکن انتہائی خاموش اور سوگوار۔ کسی سے بات تک نہیں کرتی۔

کیسی قیامت ٹوٹ پڑی تھی اِس گھر پر، اِس گھر کے باسیوں پر۔ عاصم آئے تو آمنہ کی ڈھارس بندھی کہ وہ دلنواز کے دل میں شبیّر کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا کر سکیں گے۔ لیکن وہ تو سب سے زیادہ بھرے ہوئے تھے۔ اُس کا نام سننا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ صفیہ خاموش بھی تھیں اور شرمندہ بھی۔ جیسے یہ جرم شبیّر نے نہیں انہوں نے کیا ہو۔ شاہنواز نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہی کہہ دیا تھا۔ کہ وہ مرے یا جیے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ کاظم عاصم کے بھائی تھے۔ وہ بھی اُن ہی کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ دلنواز نہ خود فون اُٹھا رہے تھے نہ کسی دوسرے کو اس کی اجازت تھی۔ گھر کا مین گیٹ بند کیے پورا پورا دن اندر پڑے رہتے۔ کئی اخباری نمایندے آ کر چلے گئے تھے۔ وہ شبیّر کے متعلق ایک لفظ کہنے یا سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ چچی اماں بے چاری کی کوئی سنتا نہ تھا۔ آمنہ سے کہہ سُن کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھیں۔ ایک بات نے سب کو لاجواب کر رکھا تھا اور وہ وہی بات تھی گوہر کی بتائی ہوئی کہ شبیّر نوشی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی زبان سے اقرار کیا تھا۔ گوہر کو خود بتایا تھا۔ آمنہ حیران تھیں۔ اُن کی چشم بینا نے تو یہی دیکھا تھا کہ وہ گوہر کو بہ دل و جان چاہتا ہے۔ اُسے پسند کرتا ہے۔ کتنا خوش تھا وہ۔ جب سے گوہر اُس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اپنے دل کی ہر بات وہ سہولت کے ساتھ آمنہ کو بتایا کرتا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ شبیّر ایک عام سوچ کا مالک عام سا نوجوان ہے۔

پھر اُس کا یہ کہنا کہ وہ کسی اور لڑکی سے شادی کر رہا ہے اُن کی سمجھ سے باہر تھا۔

جانے کب عاصم اور دلنواز اُٹھ کر چلے گئے۔ صفیہ بیگم ان کے قریب آ بیٹھیں۔

"آپا۔ آپا۔ آپ بھی یہی خیال کرتی ہیں۔ آپ بھی شبیّر کو بُرا سمجھتی ہیں؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتی نہ اچھا نہ بُرا۔ میری تو عمر ہی طعنے سننے میں کٹ گئی۔ پہلے بھائی کے نام کا طعنہ تھا اب شبیّر کے نام کا ہے۔ چچی! آپ اس کام کی ابتدا ہی نہ کرتیں۔ دلنواز اُسے اپنے گھر ہی نہ لاتے۔ جیسے پھر رہا تھا۔ اِدھر اُدھر پھرتا رہتا۔ جیسی گزار رہا تھا گزارتا رہتا۔ بن ماں باپ کے بچے تو جھاڑیوں کی مثال ہیں۔ خودرو بیلوں کی طرح ہیں۔ جدھر رُخ ہوا بڑھتی گئیں۔ نہ کانٹ چھانٹ نہ روک رکاوٹ۔ میں نے تو اُسے اِس لیے کلیجے سے لگایا تھا۔ کہ پھوپھی ہوں۔ ماں بن جاؤں گی۔ جو پیار اُسے اس دنیا میں نہیں ملا میں دے دوں گی۔ بیٹی دینے سے ہی رشتہ مضبوط ہو سکتا تھا۔ مگر۔ اُس نے تو کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا۔"

"بیٹی میں نے یہ چونڈا دھوپ میں سفید نہیں کیا۔ ایک عمر لگی ہے اس عمل میں۔ میں نے دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ اچھا بھی بُرا بھی۔ اچھائی کے لبادے میں چھپے بُرے انسان بھی میری نظروں سے گزرے ہیں اور معتوب انسان بھی۔ جنہیں زمانہ سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ میرا دعوا ہے کہ شبیّر ہرگز بُرا نہیں ہے۔ اُس میں اوباش اور گھٹیا انسانوں والی کوئی بات میں نے ایک پل کو نہیں دیکھی۔ یہ قتل اُس نے کیا؟ کیوں کیا؟ کیسے کیا؟ یہ بھی کوئی راز ہے۔ دیکھ لینا تم۔ اس کی تہہ میں ضرور کوئی بات ہو گی۔ تم اس کے پاس جاؤ تو سہی۔ اُس کی سُنو تو سہی۔ وہ کیا کہتا ہے، کیا بتاتا ہے۔ لیکن تم سب نے تو اُسے — بڑی عجیب سزا دی ہے۔ اُسے تنہا کر دیا ہے۔ یہ کیسا انتقام ہے۔ یہ کیسا بدلہ ہے اور کس بات کا۔ سوچو تو سہی۔ اس کی ماں زندہ ہوتی تو اُس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتی۔ اُسے یوں بے یار و مددگار چھوڑ دیتی۔ ارے میرے بچے کو ان لمحوں میں

اپنوں کی، اپنے پیاروں کی کتنی ضرورت ہوگی۔ کیا سوچتا ہوگا وہ۔ زخمی انگلی بھلا کس نے کاٹ پھینکی وہ بُرا ہے یا اچھا ہے تو ہمارا ہی نا۔ ہم ایک برائی کے سبب اُس کی ساری اچھائیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

تینوں رونے لگیں۔ باآواز بلند۔

"کس کا سوگ منا رہی ہیں آپ۔ کس کا ماتم کرنے لگی ہیں کون مر گیا ہے۔" دلنواز جانے کہاں سے دوڑے چلے آئے۔

"رونا ہے تو کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈیے آپ سب میرے گھر میں یہ گریہ وزاری نہیں ہو سکتی۔ میں ایسے وفا ناشناسوں کے مر جانے پر بھی رونے کا قائل نہیں ہوں۔ آئندہ میں ایسی صورتحال نہ دیکھوں۔ مجھے جینا ہے انسانوں کی طرح خوشحالی کے ساتھ۔ سکون کے ساتھ۔ میرا اُس سے کوئی ناتہ نہیں ہے اپنے کیے کی یہی سزا مجھے کافی ہے۔" وہ دندناتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

تینوں دم سادھ کر رہ گئیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہ سکیں۔

"دلنواز کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ ایسا تو نہ تھا۔ کیا چاہتا ہے یہ۔ اس غم کو سینے میں دبا لوں۔ مر جاؤں اُس نے یہ سب کچھ اس لیے کہا ہے تاکہ یہ گھر اُس کا ہے۔ چلی جاؤں گی میں۔ کہیں اور رہ لوں گی۔" چچی اماں پھر رونے لگیں۔

"نہیں چچی۔ آپ ایسا سوچیں بھی نہ۔ انہیں تو شبیر کے کیے کا صدمہ ہے۔ بہت پریشان اور اپ سیٹ ہیں وہ۔ آپ تو ہماری ماں ہیں، بزرگ ہیں اس گھر کی مالک ہیں۔"

"نہیں نہیں میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں ماں ہوتی، بزرگ ہوتی اس گھر کی مالک ہوتی تو وہ میرا حکم مانتا اور مجھے شبیر ـــــ کے پاس لے جاتا۔"

"خدا کے لیے چچی اماں۔ آپ۔ آپ۔ اُس کا نام نہ لیں۔ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیں۔"

"تم لوگ مجھے نہیں روک سکتے۔ اُسے یاد کرتے سے اُس کے لیے رونے سے۔ ارے ملنے پر پابندی لگا دو۔ دل کی بھڑاس نکالنے سے تو نہ روکو۔ تم سب کے دل اُس کے لیے پتھر ہو گئے ہیں میں۔ میں تو وہی ہوں۔ آخر اُس کی دادی ہوں۔ دادی بھی ماں ہوتی ہے۔ اُس کے سینے میں بھی اپنے بچوں کی محبت سے بھرا دل ہوتا ہے۔ میں تم سب کی طرح سخت دل نہیں ہوں۔ میں روؤں گی، فریاد کروں گی، اسے یاد کروں گی۔ اور تم سب مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔"

چچی اماں اور زور سے رونے لگیں۔

"آپا۔ آپ چل رہی ہیں گوہر کے پاس۔"

"نہیں آمنہ تم جا کے لے آؤ۔ مجھ میں تو اُسے دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں۔ میں۔ میں نہیں جاؤں گی۔"
صفیہ اپنی آنکھیں صاف کرتی کمرہ چھوڑ گئیں۔

صفیہ چچی اماں کے پاس جا بیٹھیں۔ اور ان کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر وہ بھی بے بسی سے رونے لگیں

کائنات کی ساری رنگینیاں، دنیا کی ساری رونقیں اُسی وقت دم توڑ گئی تھیں جب اس کے کانوں نے یہ روح فرسا خبر سُنی تھی۔ خوشی کا کوئی احساس اُس کے دل کے آس پاس باقی نہیں رہ گیا تھا۔ کتنی خالی خالی ہو گئی تھی وہ۔ یہ خبر سننے کے بعد یوں لگا تھا کہ کوہ گراں بلکہ ساتوں آسمان اُس پر اچانک آ گرے اور وہ ان کے بوجھ تلے دب کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہے۔ پس گئی ہے۔ پھر وہ ہوش کی دنیا سے ہی دور نکل گئی۔ جانے کتنے دن بیت گئے۔ ہوش میں آئی تو سلسلہ وہیں سے جُڑ گیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

"خدایا یہ جو میں نے سُنا ہے یہ سب جھوٹ ہو۔ بالکل جھوٹ۔ ایک بھیانک مذاق ہو۔ صرف میری آزمائش ہو۔"

"عامر۔ عامر۔" اُس نے ڈرتے ڈرتے کرسی پر بیٹھے عامر کو پکارا۔

"میں کہاں ہوں۔ تم کیوں یہاں بیٹھے ہو۔ شششش۔ شبیر کہاں ہے۔"

"آپی آپ ہاسپٹل میں ہیں۔ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔"

"اور شبیر۔"

عامر کا سر جھک گیا۔

"وہ جیل میں ہیں۔"

"جیل میں؟"

"ہاں انہوں نے دو قتل کر دیے ہیں۔"

"اوہ میرے خدا۔ عامر کہہ دو۔ کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے۔"

"نہیں آپی! یہ جھوٹ نہیں ہے۔ آپ شبیر بھائی کا نام نہ لیں۔ پاپا سخت خفا ہوں گے۔"

"کیوں؟ کیوں خفا ہوں گے وہ؟"

"وہ نہیں چاہتے کہ کوئی اُن کا نام بھی لے۔ وہ آپ کے پاس آئے تھے۔ اخبار والوں نے جانے کیسے پہچان لیا دوڑے چلے آئے۔ اُن سے سوال کرنے لگے۔ انہوں نے سب کو جھاڑ دیا۔ کہا کہ آپ لکھ دیں میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں اپنے قول و فعل کا وہ خود مالک ہے۔ آپی۔ کیا انہوں نے آپ سے کہا تھا کہ وہ نوشابہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔" وہ بڑے بوڑھوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔

وہ خاموش رہی۔ اُسے اُس رات کی ساری باتیں تواتر کے ساتھ یاد آنے لگیں۔

شبیر نے کس ڈھٹائی سے نوشابہ سے ملاقات کا اقرار کیا تھا۔ اور اُسے یہ نوید بھی سُنائی تھی کہ وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔

گوہر اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکی۔ ساری صورتحال اس پہ واضح ہو گئی۔ نوشابہ ایک حسین ہرجائی لڑکی تھی۔ اُس نے شبیر کو اپنے فریب کے دام میں الجھا لیا۔ وہ اُس کے لیے سنجیدہ ہو گیا۔ (اس سوچ نے گوہر کا دل کاٹ دیا)، اور اچانک اُسے کسی اور کے ساتھ دیکھ کر مشتعل ہو گیا۔ یہ تو ہر مرد کی فطرت کا خاصا ہے۔ اپنے سے منسوب ذات کو وہ ہر حال میں خود تک محدود دیکھنا چاہتا ہے۔ اور خود آزاد فضاؤں کے پنچھی کی طرح اونچی اُڑان کو ہرگز معیوب نہیں سمجھتا۔

اس کا سر چکرانے لگا۔ دماغ گھومنے لگا۔

"نہیں شبیر۔ نہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی کہ تم ایسے بے وفا تھے۔ ایسے ہرجائی تھے۔ جانے کن جنموں کا اُدھار تم نے چکایا ہے۔ کس جرم کا بدلہ لیا ہے مجھ سے۔ کاش میں نے تمہاری زبانی یہ نہ سنا ہوتا کہ تم مجھے بھول کر کسی اور کے ہو گئے ہو۔ کاش۔ یہ آناً فاناً کیسی کایا پلٹی یہ اچانک کیا ہو گیا۔ کاش میں نے اپنا غم اپنے آپ تک ہی محدود رکھا ہوتا۔ گھر میں کسی کو نہ بتایا ہوتا۔ یہ سب تم سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ میں اور میری کہی ہوئی بات ہے۔ کاش یہ سب لاعلم ہوتے۔"

دروازہ کھلا۔ عاصم اور آمنہ اندر داخل ہوئے۔

"بابا۔ بابا۔" گوہر کسی چھوٹی سی بچی کی طرح بلک اُٹھی۔ اُن کی کھلی باہنوں میں سما گئی۔

"بابا۔!"

"میری بچی۔ میری گوہر۔ میری جان۔" عاصم حسین نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ اس کا چہرہ اپنے مہربان ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"مجھے۔ کہاں؟ کہاں لے جائیں گے۔"

"اپنے گھر اور کہاں۔ بہت عرصہ تم نے دکھوں میں گھر کر گزار لیا۔ اب کوئی ستم نہیں ہونے دوں گا۔ تو مجھے اب بتایا ہے صفیہ نے تم تو اُس وقت بھی انکاری تھیں۔ صفیہ نے تم پر زبردستی کی تھی۔ باپ سے تو بیٹی ہی دوراندیش تھی۔ اپنے بابا کو معاف کر دینا گوہر۔ میں نے تو فرض کر لیا تھا کہ وہ ایک اچھا انسان ہے، مجھے کیا خبر تھی۔"

گوہر زار و قطار رونے لگی۔ عاصم اپنی آنکھوں کی نمی اُس سے چھپاتے اُس کے اشک پونچھنے لگے۔ مختصر سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ وہ پچھلی نشست پر آمنہ اور عاصم کے درمیان کسی معمول کی طرح بیٹھی تھی۔ گاڑی شہر کی سڑکوں پر بھاگ رہی تھی اور گوہر کو وہ بیتے دن یاد آ رہے تھے۔ جب جب وہ شبیر کے سنگ ان سڑکوں پر سے گزری تھی۔ کتنے خوش ہوا کرتے تھے وہ دونوں شاداں و فرحاں۔ شبیر کو اُونچی آواز میں بجتے شوخ نغمے چلتی گاڑی میں بے حد بھلے لگتے تھے۔ وہ آواز آہستہ کرتی شبیر کے ہاتھ پھر آگے بڑھ آتے۔

"گوری۔ چلنے دو۔ زندگی کی روانی کا احساس ہوتا ہے۔ جب تم ساتھ ہوتی ہو تو جی چاہتا ہے لمحوں کا سارا حسن اور خوشی کشید کر لوں۔"

آج گاڑی میں کتنی خاموشی تھی۔ عامر اور ساغر کے ہوتے ہوئے بھی۔ بابا اور امی کے ہوتے ہوئے بھی اُن میں سے ہر ایک دوسرے سے بات کرنے کا حوصلہ ہی اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔

دلنواز انہیں خدا حافظ کہنے گھر کے گیٹ تک آئے۔ گوہر اُن کے سینے سے لگتے ہوئے سسک اُٹھی۔

"میں۔ میں شرمندہ ہوں گوہر۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں نے سوچا۔ میں تمہارے دامن میں خوشیوں کے پھول بھر دوں گا۔ میں شاید بھول گیا تھا۔ خوشیاں تو رب دیتا ہے۔ بندے کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کسی کو دینے کے لیے۔ آئی ایم سوری گوہر۔ میری دہلیز سے جاتے ہوئے تمہارے دامن میں انگارے ہی انگارے ہیں۔ یہ دُکھ میں تا عمر نہیں بھولوں گا۔ جاؤ۔ اللہ کی امان میں۔" وہ بھی رو دیے۔

لٹی پٹی خالی خالی گوہر خاموشی کے ساتھ اپنے ماں باپ کے ساتھ ایرپورٹ کی طرف آ گئی۔

دو گھنٹے کیسے گزرے اُسے خبر ہی نہ ہوئی۔ سحر زدہ سی وہ جہاز سے اُتری اور بابا کے پیچھے چل دی۔ نبیل اُنہیں لینے آئے تھے۔ وہ اُنہیں سلام کر کے گاڑی کی پچھلی نشست پر اماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔

نبیل نے بابا سے کچھ نہیں پوچھا۔

"وہ اسری نہیں آئے۔" عاصم گویا ہوئے۔

"نہیں۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو لے آؤں۔ جوہر بھی اُدھر ہی ہیں۔" نبیل پھر خاموش ہو گئے۔

"میں گوہر کو ہمیشہ کے لیے لے آیا ہوں۔ پڑھنا ضروری بھی ہے تو پرائیویٹ امتحان دے دے گی۔" انہوں نے خود ہی نبیل کو بتایا۔

"اچھا کیا آپ نے شبیر کی کوئی خبر۔"

"کیا خبر ہو — پورے خاندان نے اس سے ناتا توڑ لیا ہے۔ وہ جانے اور اس کا کام۔" انہوں نے بیزاری کا اظہار کیا۔

نبیل ان کے کڑے تیوروں سے ہار مان کر پھر چپ ہو گئے۔ گھر آ گیا — جوہر دروازے میں ہی کھڑی تھیں۔ گوہر کو سہارا دینے کے لیے بھاگ کے آئیں۔ گوہر بھی اپنے کمرے تک آنے تک ہی صبر کر سکی۔ بہن سے گلے مل کے وہ بے تحاشا

رودے تھی۔

"آپا — میری آپا — یہ کیا ہو گیا —؟"

"یہ سب کیا ہے — میں کیا کروں —"

"صبر — صبر گوری — صبر سے کام لو۔ یہ سب خدا کو منظور تھا۔" اسری اندر آ گئے — انہوں نے گوہر کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"مت روؤ گوہر — میرا دل دُکھتا ہے — میں اسی لیے تو لاہور نہیں آیا بلکہ اسی سبب تمہیں لینے ایرپورٹ نہیں آیا تھا — کہ تمہارا دُکھ میری برداشت سے باہر تھا۔ بلکہ یہ ساری بات میری سمجھ سے باہر ہے — وہ ایسا تو نہیں تھا — اُس نے ایسا کیوں کیا — کیسے کیا —؟ ایک روز قبل ہی اس کے بیان سے بھرا اخبار پڑھا تھا میں نے — دوسروں کے لیے راہ کا چراغ بنتے بنتے وہ اندھیروں میں کیسے ڈوب گیا۔ اسے تو کشت و خون سے نفرت تھی۔ وہ تو امن و سلامتی کا پیامبر تھا۔ اپنے کالج میں کتنے فخر سے بتایا کرتا تھا کہ وہ میرا فرسٹ کزن ہے، بلکہ میرا ہونے والا بہنوئی ہے۔ میری پیاری بہن کا فیانسی ہے۔ اب میں لوگوں کے سوالوں کا جواب کیونکر دوں گا۔"

اسری بھی بچوں کی طرح رونے لگے۔ گوہر کے اندر بھی طوفان مجتمع کھڑے تھے — ان طوفانوں کو باہر آنے کا راستہ مل گیا۔ کوئی بڑا اس طرف نہیں آیا۔ تینوں بہن بھائی مل کر روتے رہے۔

"گوری —! بابا کا فیصلہ ہے کہ وہ یہ رشتہ سدا کے لیے ختم کر دیں گے۔ کیا تم اس فیصلے سے خوش ہو —؟"

"رشتہ تو بابا سے پہلے شبیر نے توڑ دیا ہے اسری بھائی — بابا کا اس میں کوئی قصور نہیں۔" وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔

"بابا نے جو فیصلہ کر دیا ہے وہ درست ہے۔ آخر ماں باپ ہی اپنی اولاد کے اچھے بُرے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔" جوہر آپا نے جھٹ کہا۔ اسری چُپ ہو گئے۔

نبیل اندر آئے۔

"بابا کہہ رہے ہیں گوہر کو آرام کرنے دیا جائے۔ آپ لوگ اِدھر آ جائیے۔ گوہر بی بی — آپ لیٹ جائیں۔ ڈاکٹر کی تاکید ہے کہ آپ خاموشی سے لیٹی رہیں۔ ابھی ابھی ایک طویل سفر کر کے آئی ہیں آپ —" وہ حد درجہ سنجیدہ تھے۔

"ہاں ہم چلتے ہیں۔ چلیں آپی!"

"آپی — تم رک جاؤ نا —" گوہر نے التجا کی۔

"آپ جائیں۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔"

جوہر اُس کے پاس بیٹھ گئیں — "آپی — کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں دل کی بات بھی کسی سے نہ کہوں۔ گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔"

"نہیں میری جان! تم ہر بات مجھ سے کہہ سکتی ہو۔ لیکن ابھی ڈاکٹر کی رائے زیادہ اہم ہے — میں تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں گی۔ مگر کچھ دیر ٹھہر کر۔ اور سنو اب تم روؤ گی نہیں۔"

"مت روکو آپی — رونا تو اب میرا مقدر ہے۔ میرا نصیب ہے — میں کبھی نہ روتی — گر مجھے یہ یقین ہوتا کہ وہ میرا ہے — صرف میرا — مجھے اس سانحے کا نہیں شبیر کی صریح بے وفائی کا دکھ ہے آپی۔ اپنے مان ٹوٹ جانے کا صدمہ ہے — اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ ایک پل میں۔ کسی غیر لڑکی کی خاطر — یہ بات کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے آپی۔ مگر — مگر اس کے باوجود — اس کے باوجود — میں اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکی۔ وہ میرے اندر اسی شان سے براجمان ہے۔ اسی شان سے آباد ہے۔ یہ جان کر بھی کہ اس نے کسی اور کے لیے قتل جیسا خوفناک جرم اپنے حساب میں لکھوا لیا ہے۔ میں اس سے نفرت نہیں کر سکی آپی — مجھے اپنی اس بے بسی کا دکھ بھی ہے۔ میں اپنی ذات کی بربادی پر رو رہی ہوں — مجھے کچھ سُجھائی نہیں دے رہا۔ کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔ میری کیا خطا تھی آپی۔ مجھ پر زندگی

بھاگ گئی ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟"

"گوری! جان۔ آرام کرو پلیز۔ میرا خیال ہے میں تمہیں خواب آور دوا دے دوں۔"

"نہیں نہیں آپی! میں سونا نہیں چاہتی — میں سوچنا چاہتی ہوں۔ اپنے بارے میں۔ اس دنیا کے سنگدل لوگوں کے بارے میں۔ میرے ذہن پر بوجھ ہے — میرے دماغ میں الجھنیں ہیں — میں بھٹک رہی ہوں — مجھے راستہ نظر آنا چاہیے۔ آپ چلی جائیں — مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میں پھر آپ سے باتیں کروں گی۔"

جوہر دروازہ بھیڑ کر باہر چلی گئیں

"شبیر! تمہیں یہ سب کرنا ہی تھا تو کم از کم مجھے تو اس احساس سے دوچار نہ کرتے۔ میرے سینے میں یہ خنجر تو نہ اتارتے اپنی بے وفائی کا خنجر۔ مجھے یوں تو نہ ٹھکراتے۔ میں کیا کروں شبیر۔ میں کہاں جاؤں — مجھ میں تو اتنی طاقت بھی نہیں کہ چل کر تمہارے پاس آجاؤں۔ تم سے کم از کم بے وفائی کا حساب ہی پوچھ لوں — میں کتنی خود غرض ہو رہی ہوں۔ مجھے تمہاری زندگی یا موت کی نہیں صرف اپنے تہی داماں ہو جانے کی فکر ہے — صرف اپنے لُٹ جانے کا غم ہے۔ یہ حادثہ بڑے عجیب انداز میں ہوا ہے۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں تمہاری حمایت میں ایک لفظ کہنے کی حیثیت میں نہیں ہوں — میں نے خود ہی سب کو بتایا تھا — کہ تم نے مجھ سے ناتا توڑ کر کسی غیر کو اپنا بنا لیا ہے۔

شبیر! تم پرائے ہوئے تھے — ہو جاتے۔ اپنا زندگی کے ساتھ یہ ظلم تو نہ کرتے — ایک رات میں یہ کایا کیسے پلٹ گئی۔ جس کی خاطر تم نے برسوں کا ایک ناتا توڑا وہ چند لمحوں میں اتنی بُری کیسے ہو گئی کہ تم نے اسے مار ڈالا۔ سرِعام دو انسانوں کو قتل کر دیا۔ شبیر — مجھے تو سب سے زیادہ اپنے بھرم کے ٹوٹ جانے کا دکھ ہے۔ میں نے تمہیں آسمان سمجھا تھا۔ بہت اونچا جانا تھا۔ مم مگر تم —"

وہ پھر رونے لگی۔ دل میں عجیب کُھد بُد سی لگی تھی۔ دماغ ان جذبوں کی نفی کرتا تھا۔ دل کچھ اور باور کراتا تھا۔

"بعض لوگوں کے لیے عزتِ نفس ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ تم بھی میرا مان تھے شبیر — ! تمہارا وجود میری توقیر کا باعث تھا۔ آدمی جسے چاہتا ہے اسے ساری دنیا سے برتر اور سب میں ممتاز دیکھنا چاہتا ہے۔ تم وہ نہیں رہے شبیر — جسے ایک دن بڑے اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے دل میں بسا لیا تھا۔ تم وہ نہیں رہے بلکہ تم وہ ثابت نہیں ہوئے — تم نہیں میں دنیا والوں کی نظروں میں گر گئی ہوں تمہاری ذات کے حوالے سے۔ میں کیا کروں۔ کیا کروں۔"

وہ پھر رونے لگی۔ اس کی سوچ کے دھارے شبیر کی ذات کے کناروں تک بہتے جاتے اور لوٹ آتے۔

چھٹیوں کے ایام میں وہ اکثر اس سے ٹیلی فون پر بات کرتا مصروفیت میں سے چند لمحے نکال کر۔ اکثر دنیا کی باتیں کرتا کبھی دل کا احوال بھی سُناتا۔ ایک ماہ پہلے ہی تو اس نے بذریعہ ڈاک ایک کیسٹ بھیجی تھی جس میں صرف ایک گیت ہی ریکارڈ تھا۔ وہ کیسٹ اب بھی اس کی الماری میں پڑی تھی۔

"گوری! رات کے پُرفسوں لمحات میں جب فضا میں چار سو خاموشی پھیلی ہو، چاندنی رات میں اپنے سفید بستر پر بیلے کی کلیاں بچھا کر — چاند کو ہمراز بنا کر یہ گیت ضرور سُننا — میں، مجھے ایسا لگے گا کہ میں بھی تمہارے ہمراہ ہوں۔ میں نے اس گیت کو دیوانگی کی حد تک سُنا ہے۔ لمبی سڑکوں پر بے مقصد ڈرائیونگ کرتے ہوئے۔ تمہیں تصوّر میں اپنے پاس بلا کر۔"

گوہر پلنگ سے اتری۔ الماری کی طرف گئی۔ کیسٹ اب بھی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اس نے مغربی دیوار کی طرف دیکھا اس کی لکھنے کی میز پر اس کا ٹیپ ریکارڈر بھی موجود تھا۔ وہ کیسٹ اٹھا لائی ریکارڈ آن کیا اور خوبصورت آواز اس کے دل کے درد میں اضافہ کرنے کے لیے پورے کمرے میں پھیل گئی۔ اس نے پوری آواز کھول دی۔

جھلمل ستاروں کا آنگن ہو گا
رم جھم برستا ساون ہو گا
جھلمل ستاروں کا آنگن ہو گا
رم جھم برستا ساون ہو گا

ایسا سندر سپنا اپنا جیون ہو گا

تیری آنکھوں سے سارا سنسار میں دیکھوں گی
دیکھوں گی اِس پار یا اُس پار میں دیکھوں گی
نینوں کو تیرا ہی درشن ہو گا
رم جھم برستا ساون ہو گا
روئیں گی یہ آنکھیں پھر بھی میں تو مسکراؤں گی
دکھ کے طوفانوں سے بھی میں نہ گھبراؤں گی
جب ساتھ میرے میرا ساجن ہو گا
رم جھم برستا ساون ہو گا
جھلمل ستاروں کا آنگن ہو گا
پریم کی گلی میں اک چھوٹا سا گھر بنائیں گے
کلیاں نہ ملیں نہ سہی کانٹوں سے اسے سجائیں گے
بگیا سے سندر وہ بن ہو گا
رم جھم برستا ساون ہو گا
پھر تو مست ہواؤں کے ہم جھونکے بن جائیں گے
نیناں سندر سپنوں کے جھروکے بن جائیں گے
من آشاؤں کا درپن ہو گا
رم جھم برستا ساون ہو گا

فل والیوم نے کمرے کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔

"گوری۔ گوری — !" جوہر کی آواز اس آواز میں کہیں دب گئی تھی۔

وہ روئے جا رہی تھی۔ بار بار ریوائنڈ کر کے سن رہی تھی اور دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

"گوہر۔ گوری! دروازہ کھولو۔"

جوہر اونچی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ وہ روتے روتے دروازے تک آئی۔

"گوری ہوش سے کام لو — دالان میں بابا امری، نبیل سب ہی بیٹھے ہیں۔ کیا کر رہی ہو تم۔ اتنی اونچی آواز میں بھی چلاتے ہیں ریکارڈر۔ سب کیا کہیں گے۔"

"میں اس سے بھی اونچی آوازوں کے شور میں اپنے دل کی آواز گم کر دینا چاہتی ہوں آپی۔ مجھے مت روکو۔ مت ٹوکو۔ یہ شور مجھے سکون دے رہا ہے۔ پلیز آپی۔"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

جوہر نے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔ میں اپنے حواسوں میں ہوں۔ بس لُٹ جانے کا ماتم کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز آپی۔ جو کرتی ہوں کرنے دو۔ چلی جاؤ۔"

اس نے پھر گیت لگا دیا۔ اب کے آواز کچھ آہستہ تھی۔ لیکن وہ میز پر سر رکھے تسلسل کے ساتھ روئے چلی جا رہی تھی۔ بھرم ہی نہیں خواب بھی ٹوٹ گئے تھے۔ تصوّر بھی زخمی ہوئے تھے۔ آرزوئیں بھی لہولہان تھیں۔ نہ مرنے کی تمنا نہ جینے کی آرزو۔ جانے کون سا موڑ تھا زندگی کا۔

"گوہر کی حالت دیکھی ہے آپ نے؟"

"دیکھ رہا ہوں بڑی اچھی طرح سے — اور سوچ رہا ہوں کہ اسے یہ سزا تمہاری طرف سے ملی ہے۔"

"میری طرف سے — میں اسے سزا دوں گی؟"

"تم ہی چلی تھیں نا ٹوٹے رشتے جوڑنے — ظہیر میں کیا برائی تھی — وہ بھی تو بھتیجا تھا تمہارا۔"

"میں نے تو کچھ اور سوچا تھا۔"

"چلو اب تو خوش ہو۔ اس ناہنجار نے وہ زخم لگایا جسے بھرنے کے لیے برسوں چاہییں۔ میری بیٹی نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"کیا ہونا ہے؟ دوسروں کی خاطر ہم اپنی زندگیوں میں زہر نہیں گھول سکتے۔"

"کیا مطلب؟"

گوہر کی زندگی کے لیے خوشیوں کی جتنی اب ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ جانتی ہو ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟"

"خبر ہے مجھے۔"

"ڈاکٹر ہارون واسطی کے بارے میں، میں نے چھان بین کرائی ہے۔"

"جی — کیوں؟ کس لیے؟"

"کیا تمہیں خبر نہیں وہ کس لیے یہاں آئے تھے؟"

"جانتی ہوں۔"

"تو میں نے بھی اسی سبب سے پوچھا ہے لوگوں سے۔ ڈاکٹر ہارون ایک بہت اچھا نوجوان ہے۔ اس کے کردار کا ہر شخص معترف ہے۔ حالانکہ اس شہر میں آئے اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ امین واسطی اپنے علاقے کے خاصے بااثر زمیندار ہیں۔ دوسرا بیٹا یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہے، وہ بھی شریف النفس ہے۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ چھوٹی سی فیملی — اور اچھے لوگ۔ میں نے امین واسطی صاحب کے پاس پیغام بھجوا دیا ہے۔ وہ جب چاہیں آکر — بات پکی کرلیں۔"

"عاصم — !" صفیہ نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"ہوں۔"

"گوہر اب بھی شبیر کی منسوبہ ہے — اس منگنی کے ٹوٹنے کا کوئی اعلان نہیں کیا کسی نے — وہ میرا بھتیجا ہے۔ قتل کے کیس میں جیل میں بند ہے — اُسے کسی بھی وقت پھانسی کی سزا سنائی جا سکتی ہے — اور آپ — آپ —"

"میری خوشیاں اور میرے غم میرے اپنے ہیں۔ کسی کی خوشیوں اور غموں سے بندھے ہوئے نہیں۔ مجھے اپنی بیٹی کی زندگی اور اپنی عزتِ نفس دونوں ہی عزیز ہیں۔ اس نے میری بیٹی کو ٹھکرا کر ایک آوارہ لڑکی کا دامن تھاما تھا — تو میری بیٹی کسی شریف آدمی کے سنگ کیوں نہیں بیاہی جا سکتی۔ میں اِس کام میں کوئی تاخیر نہیں کروں گا۔ اس کے مقدمے کا فیصلہ جلد از جلد ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں پھانسی چڑھ جانے سے قبل وہ یہ نوید بھی سنتا جائے۔ جسے اس نے، ایک عام سے لڑکے کے لئے ٹھکرا دیا اسے ڈاکٹر ہارون جیسے انسان نے اپنی بیوی بنا کر فخر محسوس کیا۔"

"عاصم — میں — میں — بہت پریشان ہوں۔"

"تم عمر کے ہر دور میں پریشان رہی ہو۔ اور میں اپنی زندگی کا لائحہ عمل محض تمہاری پریشانیوں سے ڈر کر تبدیل نہیں کر سکتا۔ آج کل میں ان کی طرف سے پیش رفت ہو گی — وہ جب آئیں تو انہیں یہ احساس نہ ہو کہ تمہیں ذرہ بھر بھی کوئی پریشانی ہے۔" عاصم حسنین نے کڑے الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

بڑے دنوں بعد وہ اپنے کمرے سے صحن تک آئی تھی۔ صفیہ نے امین واسطی کی آمد کی خبر کو اس سے چھپا کے رکھا تھا۔ اور آج جب اُس نے میز پر رکھا روزنامہ اٹھایا تو زندگی کے معمولات میں سے ایک کی طرف لوٹ آنے پر انہیں خوشی ہوئی۔ وہ جلدی سے گاؤ تکیہ اُٹھا لائیں۔

"لیٹ جاؤ۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک جاؤ گی۔" انہوں نے تکیہ دیوان پر رکھ دیا۔

"نہیں اماں میں لیٹے لیٹے تھک گئی ہوں۔" اس نے اخبار کے پہلے صفحے پر نگاہ کی —

امتیاز نوشابہ کیس کے ملزم شبیر عسکری کی حمایت میں یونیورسٹی
کے طلبہ کا احتجاجی جلوس —"

اس کی اس خبر پہ توجہ کا سبب شبیر عسکری کی تصویر تھی۔ کتنی دیر اس کی نظریں اس تصویر پر جمی رہیں۔

مشتعل طلباء نے پولیس کے خلاف نعرہ بازی کی — کئی سرکاری اور نجی املاک کو نقصان پہنچایا۔ ایک پٹرول پمپ کو آگ لگا دی۔ انہوں نے بڑے بڑے کتبے اٹھا رکھے تھے جن پر مختلف مطالبات درج تھے جن میں سے نمایاں مطالبہ شبیر عسکری کی رہائی کا تھا۔

ایک اور خبر تھی —

شبیر عسکری نے وکالت نامے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

گوہر نے جلدی جلدی خبر پڑھی جس کا خلاصہ تھا — طلباء یونین کے عہدیداروں نے اپنی طرف سے شبیر عسکری کو ضمانت پر رہا کرانے کا انتظام کیا — کیونکہ شبیر کے ورثاء نے اس سے مکمل لاتعلقی کا اعلان کر دیا ہے — اور کوئی بھی اس سے ملنے تک نہیں آیا — ہائی کورٹ کے وکیل مسٹر انور عباسی وکالت نامے پر دستخط کرانے گئے تو ملزم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی پُراسرار خاموشی نے پولیس اور جیل حکام دونوں کو حیران کر رکھا ہے۔ وہ نہ جرم سے انکار کرتا ہے نہ اقرار کرتا ہے۔"

گوہر کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ کے مسل کچل ڈالا۔ اس نے اخبار دور پھینک دیا۔

"کیا ہوا گوری — کہا تھا نا لیٹ جاؤ۔ ابھی تمہاری طبیعت صحیح نہیں ہے۔"

وہ اُٹھ کر اندر چل دی — جلدی سے جوہر کا نمبر ملایا۔

"آپی — آپی — میرا دم گھٹ رہا ہے — میں مر رہی ہوں —"

"گوری — ! حوصلے سے کام لو — سب کو جینا ہی ہوتا ہے جب تک موت نہ آئے۔"

"نہیں آپی — ! یہ جینا، جینا نہیں — موت اس سے آسان ہو گی — آپی ! میں تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں۔"

"عقل سے کام لو — یہاں گھر میں سب لوگ ہیں — میں آرہی ہوں ابھی چند لمحوں میں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

چند منٹوں میں ہی وہ گوہر کے روبرو تھیں۔

اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

آپی — ! میں نے ہار مان لی ہے — اپنے جذبوں سے اپنے دل سے — کوئی امید نہیں کوئی آس نہیں — زندگی کی خبر بھی ہے کہ بے رحم ہے — بے وفا ہے — پھر بھی میں اسے نہیں بھلا سکی۔ اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکی — آپی میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں اُس سے ملنا چاہتی ہوں — وہ آج بھی میرے اندر باہر میرے ساتھ موجود ہے۔ آپی ہر روز، ہر شب وہ مجھے خواب میں نظر آتا ہے۔ خاموش سا چُپ چاپ سا۔ کبھی آہیں بھرتا کبھی آنسو بہاتا — آپی — سب نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ جو اس نے کیا وہ اس کا اپنا فعل تھا۔ میری محبت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ میں — میں بھی اسے حالات کی نذر کر دوں — آپو — میں اس کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ پلیز آپو — ایک بار اس سے کچھ پوچھنے — کچھ کہنے۔"

"گوری بابا کو خبر ہو گئی تو ہم سب کی جان نکال دیں گے۔"

"کیا آپ میرا ساتھ نہیں دیں گی۔ آپ میری بہن نہیں ہیں۔ کیا میری پریشانیوں میں آپ کا کوئی حصّہ نہیں۔ آپ نہ گئیں تو میں اکیلی چلی جاؤں گی۔ چاہے واپسی کا کوئی راستہ باقی رہے یا نہ رہے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے جانتی ہو کل تمہاری سسرال سے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔"

"میری سسرال والے۔"

"ہاں ڈاکٹر ہارون کے گھر والے۔ تمہیں انگوٹھی پہنانے اور شادی کی تاریخ لینے۔"

"نہیں — نہیں۔"

"یہ بابا کا فیصلہ ہے۔"

"وہ بھی تو سب کا فیصلہ تھا۔"

"تم بابا کا غصّہ جانتی ہو۔" گوہر کا سر جھک کر رہ گیا۔

"آپی تم نے انہیں نہیں روکا۔ ابھی تو میرے کاندھے میری اپنی لاش اٹھانے سے بھی قاصر ہیں۔ شادی تو بہت بھاری بوجھ ہے مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔"

"تو کیا کرو گی۔؟"

"انتظار کروں گی۔ موت کا ہی سہی انتظار تو ہو گا۔"

"شبیر تو اپنے کیے کی سزا بھگتے گا اور تم۔"

"میں محبت کرنے کی سزا۔ ہو سکتا ہے اُس کے مرجانے پر زندہ میں بھی نہ رہوں۔ آپی۔ زندگی میں محبت ایک بار ہی کی جاتی ہے۔ کسی کو شریکِ سفر ایک بار ہی جانا جاتا ہے۔ بابا کس شراکت کی ذمہ داری مجھے سونپنا چاہتے ہیں شبیر سے بچھڑ کر میں زندہ ہی کب ہوں۔ تعلق داریاں رشتے ناتے تو زندہ لوگ نبھایا کرتے ہیں۔ گوہر تو ایک لاش ہے۔ ادھوری اور تشنہ امنگوں کی لاش۔ جس کی آخری آرزو ایک بار شبیر سے مل لینا ہی ہے۔ وہ ہر روز مجھے بلاتا ہے صدائیں دیتا ہے۔ میرے تعاقب میں دوڑا چلا آتا ہے۔ میں اُس کی طرف لپکتی ہوں تو آنکھ کھل جاتی ہے۔" اس کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ حسرتیں تھیں شکستگی تھی۔

"میں شادی نہیں کروں گی۔ کبھی بھی نہیں۔"

"بابا انہیں زبان دے چکے ہیں۔"

"میں بھی کسی سے عہد کر چکی ہوں۔ وہ مکر گیا تھا۔ میں تو نہیں بھولی۔ مجھے اپنا عہد یاد ہے وہ سمجھتا تھا اسے میری ضرورت نہ تھی۔ لیکن میں سمجھتی ہوں اُسے میری ضرورت ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ آپ کو میرا ساتھ دینا ہو گا۔"

"میں ایسا وعدہ نہیں کر سکتی۔ میں تو نبیل سے بھی نہیں کہہ سکتی وہ کیا سوچیں گے۔ کیا خیال کریں گے۔ تمہیں اپنے بابا کی عزت کا کوئی پاس نہیں۔ تم اس سے ملنے کے لیے بضد ہو۔ جس نے تمہیں ٹھکرا دیا۔"

"آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں گوہر۔ ہم بابا کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتے۔ بھول جاؤ سب باتیں۔ اب وہی ہو گا جو بابا چاہیں گے۔" اسری جانے کہاں سے آ گئے۔ دونوں بہنوں کا رنگ فق ہو گیا۔

اسری نے گوہر کے سر پہ اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

"ہم سب نے اُسے سمجھنے میں غلطی کی۔ وہ تم جیسی لڑکی کے قابل نہ تھا۔ اسے اُس کے کیے ہوئے کی سزا بھگتنے دو۔ دوسروں کی خاطر اپنی زندگی تباہ کرنا دانشمندی نہیں۔ زندگی بہت طویل ہے۔ لیکن دکھوں کے بوجھ بھی بہت زیادہ بھاری ہوتے ہیں۔ اُس سے ملنے کی خواہش ایک نادانی ہے اگر مناسب ہوتا تو میں خود تمہیں لے جاتا۔"

اسری شاید اُس کی ساری گفتگو سُن چکے تھے۔ اُس کا سر مزید جھک گیا۔ وہ باہر چلے گئے۔

"کس نے کہا تھا یہاں کھڑے ہو کر تقریر کرنے کو۔" جوہر کو سخت ملال تھا۔ اسری نے اس کی باتیں سُن لی تھیں۔

"گلا گھونٹ دیں آپ میرا۔؟"

گوہر نے بیچارگی کے ساتھ کہا۔

"اسری بابا سے کہہ دیں گے اور انہیں بے حد افسوس ہو گا۔"

وہ چپ ہو گئی جوہر کی بات درست تھی۔

"آپی۔ کیا بابا مجھے چند دن کی مہلت بھی نہیں دے سکتے۔"

"میری چندا۔ میں اُن سے کہہ چکی ہوں وہ ایک پل کی تاخیر پر بھی تیار نہیں ہیں۔ کم از کم ایک شاندار قسم کی منگنی کا انتظام تو مکمل ہو ہی چکا ہے۔"

گوہر بے بس سی ہو کر رہ گئی۔

دوسری شام وسیع و عریض صحن میں قدرے اونچے بنے اسٹیج پر گوہر آتشی گلابی کامدار سوٹ میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ تیز روشنیوں کی جگمگاہٹ میں اس کے چہرے کی زردیاں میک اپ میں چھپ کر رہ گئی تھیں۔ ارم اور شازیہ اس کے ساتھ تھیں۔ اس کی اکلوتی نند ڈاکٹر ہارون کی دلاری بہن بھی اس کے پاس تھی۔ دنیا کے سارے سرد گرم سے بے خبر۔ بھائی کی منگنی پر حد درجہ خوش بار بار اس کے چہرے کا دیدار کرتی اسے اپنے دل میں سمو رہی تھی۔

"نہ ہوئے بھائی جان۔"

"کیوں کہاں گئے ہیں آپ کے بھائی جان؟" ارم نے پوچھا۔

"اچانک ہی انہیں امریکہ جانا پڑا۔ ہوتے تو ضد کر بیٹھتے کہ دلہن کو ابھی رخصت کرا کے لیے چلتے ہیں۔"

"اچھا ہوا۔ ورنہ جتنی اچانک منگنی کی خبر ملی اتنی اچانک ان کے مکمل پرایا ہو جانے کا دکھ سہنا پڑتا۔ لیکن میں تو سمجھ رہی تھی۔ برآمدے میں آپ کے ساتھ کھڑے وہ خوبرو نوجوان ڈاکٹر ہارون ہی ہیں۔"

ارم نے حسبِ عادت اسے کریدا۔

"ارے نہیں وہ تو میرے چھوٹے بھیا مامون واسطی ہیں۔ سچ پوچھیے تو اس ناتے پر وہ ہارون بھائی سے کم خوش نہیں ہیں۔ جیسے منگنی بھائی جان کی نہ بلکہ اِن کی ہو۔ بھابھی کا رُخِ روشن دیکھنے کو بے تاب تھے میں بمشکل سمجھا بجھا کے آئی ہوں۔ کہ ابھی ان کا ملنا ناممکن ہے۔ بھابھی انہیں جانتی ہیں — وہ اُن کے یونیورسٹی فیلو بھی تو ہیں۔"

گوہر اپنی جگہ پر چپ بیٹھی تھی۔ واقعی کسی سرد لاش کی طرح۔

منگنی کی رسم ادا ہو گئی۔ بیگم واسطی نے گوہر کے ہاتھ میں ہشت پہلو ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی۔ سعیدہ بیگم خوش خوش ان کے ساتھ ان کے پہلو میں جا بیٹھیں۔ خاندانی اختلافات کو یکسر بھلا کر۔ انہیں تو اس وقت بس ایک ہی خوشی تھی شبیر سے اس کا گوہر مراد چھن گیا تھا۔ زندگی سے موت کی طرف جاتے جاتے وہ اپنی آخری متاع سے بھی خالی ہو گیا تھا۔ بیگم واسطی اپنے بیٹے کی تعریفوں میں لگی تھیں۔ جو واقعی تعریف کے قابل ہی تھا۔

سیاہ سوٹ میں ملبوس مامون واسطی عین اس کے سامنے براجمان تھا۔

"یہ نیا رشتہ مبارک ہو بھابھی جی۔! چند دنوں بعد ان ہاتھوں میں میرے بھیا کے نام کی مہندی ہو گی۔" اس نے اپنی جیت کا احساس دلایا۔ گوہر کا دل کٹنے لگا۔ کتنی بے بس تھی وہ۔ رسموں رواجوں کی بھاری

زنجیروں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

"اس انگوٹھی کا حسن بڑھ گیا ہے۔ آپ کی انگلی کی زینت بن کر۔ اور آپ بھیا کے نام سے منسوب ہو کر کچھ زیادہ اچھی لگنے لگی ہیں۔ ہر شے اپنے مناسب مقام پر اچھی لگتی ہے۔ اور جلد یا بدیر اپنے ٹھکانے تک ہی پہنچ ہی جاتی ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا۔"

وہ بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

"ارے ہم آپ کے دیور بھیا ہیں۔ ہمیں اک نظر دیکھ لینا جرم تو نہیں۔ کب سے منتظر تھے اس دن کے اِن مبارک گھڑیوں کے۔ ہم تو اپنے جذبوں کی ساری شدتیں آپ کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ اتنی محبت دیں گے آپ کو کہ گزرے دنوں کی یاد بھی آپ کے قریب سے نہیں گزرے گی۔ اور ہمارے بھیا۔ وہ تو جناب آپ کے دم دیوانے ہیں۔ آپ کو کیا خبر وہ کتنے خوش ہیں۔ بس مارے مجبوری کے امریکہ میں ہیں۔ روحانی طور پر آپ کے آس پاس موجود ہوں گے۔ آیا ہی سمجھیے انہیں۔ ہم تو ڈرتے ہیں انہیں اور ان کی بے پناہ محبت کو پا کر آپ ہم غریبوں کو بھول ہی نہ جائیں۔ یاد رہے کہ ہم اس کہانی کا مرکزی کردار ہیں۔ ہم نہ ہوتے تو یہ دن بھی نہ ہوتا۔"

وہ ہنس رہی تھی۔ بلکہ ہنس ہنس کے دوہری ہو رہی تھی۔ اِس کی نگاہوں میں بھائی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"آپ کو اپنی وکالت خود کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے بھابھی سے سب کہہ دیا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے اس بارانی صبح ایک آسمانی حور بھولے سے زمین پر اُتر کر ہمارے گھر آن پہنچی تھی یہ مامون بھیا ہی تھے جنہوں نے یہ مسئلہ حل کیا کہ آپ آسمانی نہیں ارضی حور ہیں۔ اِسی دنیا کی باسی ہیں۔"

مامون آنکھوں میں شوخ چمک لیے مسکراتا رہا۔ جوہر بھی وہیں آگئیں۔

اُن کے چہرے پر خوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایک مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ مہمانوں کا استقبال کر چکی تھیں اور اب ان کی خاطر تواضع کر رہی تھیں۔

"آئیے جوہر آپا۔۔۔! آپ بھی بیٹھیے ہمارے ساتھ۔ مامون بھیا تو آپ کے زبردست مداح ہیں۔۔۔ بتا رہے تھے آپ ایک آئیڈیل خاتونِ خانہ ہیں۔" وہ چہکی۔۔۔ اور جوہر کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ ہماری بھابھی کی ہی نہیں ہماری بھی بڑی بہن ہیں۔ ہم سدا آپ کا احترام کریں گے۔"

وہ سعادت مندی سے کہہ رہا تھا۔ اور گوہر اندازہ لگا چکی تھی۔ کہ اِس خاندان نے اس کے اہلِ خانہ کو اپنی خوش اخلاقی کا اسیر کر لیا تھا۔ اس نے ایک کٹیلی نگاہ مامون پر ڈالی جو مسکراتے ہوئے جوہر آپا سے مخاطب تھا۔

تقریب ختم ہو گئی مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ گوہر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وسط ستمبر کی ایک نیم سرد رات تھی۔ کمرے میں خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ عقبی دریچے سے آدھی رات کے چاند کی کرنیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اس نے زیورات لباس اور پھول نوچ کر دور پھینک دیے۔ سوتی سادہ سے لباس میں منہ ہاتھ دھو کر میز کی طرف آئی۔ انگوٹھی اس کے ہاتھ کی انگلی میں اب بھی موجود تھی۔

اس کی سانسیں بند ہونے لگیں۔ شبیر کے نام کی انگوٹھی پہن کر بھی وہ بہت دنوں تک پریشان رہی تھی اور۔۔ اب بھی۔ اب بھی وہ پریشان ہے۔

کیا گزرتے دن اسے چین بخش دیں گے۔ وہ نئی صورتحال سے متفق ہو جائے گی۔ اس تبدیلی کو مان لے گی۔ کتنی خالی الذہن ہو رہی تھی وہ۔

"ہم لڑکیاں آخر کیا ہیں؟ ماں باپ کے لیے محض ایک ٹارگٹ۔ ایک نشانہ جسے سامنے رکھ کر وہ ستم

کی مشق کیا کرتے ہیں۔ بابا کو۔ اماں کو۔ جوہر آپا کو۔ اسری بھائی کو کسی کو بھی اس کے احساسات کی کوئی پرواہ نہیں۔ سب خوش ہیں ایک اونچے خاندان سے ناتا جوڑ کر۔ یہ وہی بابا ہیں جنہوں نے سدا سر عبداللہ کی جاگیر اور دولت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ کیا وہ مجھے ایک جاگیردار کی بہو بنا کر صرف اور صرف شبیر سے انتقام لے رہے ہیں۔ جس کا زندگی اور اس کی باقی ماندہ احتیاجات پر کوئی استحقاق باقی نہیں رہا۔ انتقام کے لیے وقت کتنا غیر مناسب اور طریقہ کتنا گھٹیا ہے۔ کاش بابا کاش آپ نے سوچا ہوتا۔" وہ ایک بار پھر رو دی۔

کہاں رہ گیا۔ اس کا جھلمل ستاروں سے سجا آنگن جہاں رم جھم برستی ساون کی پھوار نے اپنا حسن بکھیر رکھا تھا اس نے پلے (PLAY) کے بٹن کو آپ ہی آپ دبا دیا۔

جھلمل ستاروں کا آنگن ہو گا
رم جھم برستا ساون ہو گا

سنتے سنتے شب سحر میں بدل گئی اور سارے نصیب کے ماروں کی طرح وہ بھی بے سدھ ہو کر وقتِ سحر سو گئی۔

اِس دن کے حوالے سے کتنے پیارے پیارے خوش رنگ لمحوں کے دلفریب خواب انہوں نے دیکھ ڈالے تھے۔

وقتِ ملن کی گھڑیوں کا سارا حسن ان کی آنکھوں میں محفوظ تھا۔

وہ سوچتے۔ جانے کیسے اپنا تعارف کرائیں گے۔ کیا کہہ کے اُسے مخاطب کریں گے۔ کیسے سرپرائز دیں گے۔ وہ انہیں دیکھ کر کتنا خوش ہو گا۔ ان کے نرم گالوں پر بار بار بوسے دے گا۔ انہیں گلے لگائے گا۔ بلکہ مضبوط باہوں میں بھر کر جکڑ دے ڈالے گا۔ وہ چلّاتے رہ جائیں گے۔ فریاد کرتے رہیں گے۔ لیکن وہ ایک نہیں مانے گا۔

اُن سے سو سو سوال کرے گا۔ اپنا اور اُن کا رشتہ پوچھے گا۔ پھر جب رات ہو گی تو ان کے بوڑھے لیکن طاقتور بازوؤں میں چھپ کر ان کے سینے سے لگ کر سو جائے گا۔ وہ اُن سے جھگڑا کرے گا۔

"آپ اتنی مدت کہاں رہے نانا جان! کہ میں آپ کی محبت کے لیے ترستا رہا۔" وہ ان سے جھوٹ موٹ روٹھ جائے گا اور وہ منانے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتے پھریں گے۔ التجا کریں گے بلکہ ہاتھ جوڑیں گے۔

لیکن آہ

یہ وقت یہ بے رحم لمحے۔
جو کسی کی خوشیوں کی پروا نہیں کرتے۔
جو کسی کے لیے اپنی رفتار میں کمی بیشی نہیں کرتے۔
جو اکثر بہت کچھ چھین لے جاتے ہیں۔

اِن بے رحم لمحوں نے بوڑھے ڈاکٹر ہنری کی زندگی کی پہلی خوشی ان سے چھین لی تھی۔

جہاز میں بیٹھے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر لگ رہے تھے۔ نہ انہوں نے کسی سے بات کی نہ اخبار پڑھا۔ مسز جمال بھی خاموش رہیں۔ جمال احمد شبیر کی خبروں سے متعلق اخباروں کا مطالعہ کرتے رہے۔ عدی اور عذرا بھی سرگوشیوں میں صرف شبیر کی باتیں ہی کرتے رہے۔

"ہم اِس وقت کہاں اُتریں گے۔" ڈاکٹر ہنری نے جمال احمد سے پوچھا۔

"لاہور ایئر پورٹ پر۔ کراچی سے لاہور کا سفر دو گھنٹوں میں ہی ختم ہو جائے گا۔ ہم آدھا سفر طے کر چکے ہیں۔"

"کیا اس وقت ہم شبیر سے مل سکیں گے ۔"

"مجھے یقین ہے ۔ ایسا ضرور ہو گا ۔"

"جمال احمد ۔ میں نے ایسی ملاقات تو خواب میں بھی نہ دیکھی تھی ۔" وہ سخت افسردہ تھے ۔

"مجھے اس کا احساس ہے ۔ لیکن میں خوش بھی ہوں ۔ آپ شبیر کا بہت مضبوط سہارا ثابت ہوں گے ۔ اسے درحقیقت اِن ہی لمحات کے لیے آپ کی ضرورت تھی ۔ ڈاکٹر ہنری ۔ وہ آپ کا خون ہے ۔ آپ کا نواسہ ہے ۔ دنیا میں بڑے بڑے لوگوں سے بھیانک جرم سرزد ہو جاتے ہیں ۔ اسے اب بھی ہم سب کی محبت کی ضرورت ہے ۔"

"جمال احمد ۔ میرا دل جانے کیوں بے حد مطمئن ہے میں جب سوچتا ہوں کہ وہ ٹینا کا بیٹا ہے تو دل مانتا ہی نہیں کہ وہ قاتل ہے ۔"

جمال احمد کے لبوں پر اداس مسکراہٹ رینگ گئی ۔

"آدمی مرتے دم تک نیک امیدوں کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ۔ اسی کا نام زندگی ہے ۔" انہوں نے فیصلہ دے دیا ۔

لوہے کی سلاخیں اِن دونوں کے درمیان حائل تھیں ۔ ڈاکٹر ہنری کی نظریں سامنے کھڑے انسان پر جمی تھیں ۔ میلے لباس ۔ ستے چہرے ۔ بڑھی شیو ۔ ویران آنکھوں اور چہرے پر سجی وحشت ناک سنجیدگی کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا یہ لڑکا ۔ شبیر تھا ۔ اُن کی ٹینا کا بیٹا ۔

"شبیر ۔۔۔" انہوں نے افسردہ لہجے میں اسے پکارا ۔

"ہم تمہارے نانا ہیں بیٹے ۔ تمہارے بدنصیب نانا ۔"

"میرے نانا ۔۔۔ مجھے افسوس ہے جناب اِس دنیا میں میرا کوئی نہیں ۔"

"یقین کرو ۔ ہم تمہارے نانا ہیں ۔ ہم تم سے ملنے کے لیے بے تاب تھے ۔ پر اِن سب کا خیال تھا ۔ کہ ہمیں تم سے اچانک ملنا چاہیے ۔"

"کن سب کا ؟"

"جمال احمد کا عدی کا عذرا کا ۔ افتخار کا اور تمہاری ممی کا ۔"

"ممی ۔۔ کہاں ہیں ممی ۔ عدی ۔ عدی کہاں ہے ۔۔ اور آپ ۔۔ ڈاکٹر ہنری ہیں نا ۔ صلح و امن کی باتیں کرنے والے ۔ انسان دوست ڈاکٹر ہنری ۔ آپ میرے نانا کیسے ہیں ۔ ایک ناکام انسان کے ۔ ایک ہارے ہوئے شبیر کے نانا ۔۔ یہ وقت تو رشتے ٹوٹنے کا ہے ڈاکٹر ہنری ! نئے رشتوں کے جُڑنے کا نہیں ۔" وہ رو دینے کو تھا ۔

"نہیں میرے بچے یہ نیا رشتہ نہیں یہ سب سے پہلا اور پرانا رشتہ ہے ۔ تم ہماری ٹینا کے بیٹے ہو ۔"

"ٹینا ۔۔ ٹینا ۔۔" شبیر بڑبڑایا ۔

*

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

ریاض فاطمہ

سبق

سچی کہانی

"میرے براؤن موزے کہاں ہیں ؟" اقبال دھاڑے تو مجھے غصہ آگیا ۔

"مجھے نہیں معلوم ! اپنی چیزیں آپ خود سنبھال کر رکھا کریں ۔"

"تو پھر تمہارا کام کیا ہے ۔" ان کی پیشانی پر کئی بل پڑ گئے ۔

"اقبال آپ کو بالکل بھی احساس نہیں ہے کہ میں بھی نوسروس کرتی ہوں ۔ گھر پر شام کو تھکی ہاری آتی ہوں اس کے باوجود تمام کام سنبھالنا کیا میری ہی ذمہ داری ہے ۔ کم از کم اپنی چیزیں ۔"

"زیادہ لیکچر دینے کی ضرورت نہیں آمنہ بیگم ۔" وہ غرائے "میں نے محسوس کیا ہے کہ جب سے تم نے سروس کرنا شروع کی ہے تمہارے انداز ہی بدل گئے ہیں ۔ گھر میں ہر چیز جگہ سے بے جگہ رہنے لگی ہے ، کھانا پکانے میں تمہاری دلچسپی نہیں رہی ۔ ایک ہی دن پورے ہفتہ کا کھانا پکا کر فریزر میں دبا دیتی ہو ۔ کوئی سسرال سے آتا ہے تو ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں ۔ شربت اور

جانے سے آگے بڑھتی ہی نہیں ہو، اس دن۔"

ان کا لیکچر جاری تھا، میں کانوں پر ہاتھ رکھ کر بیڈ روم میں چلی آئی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ شام ساڑھے پانچ بجے کے قریب آفس سے واپس آئی تھی۔ سڑک پر گاڑیوں کے سائرن، دھوئیں سے طبیعت ویسے ہی عاجز آئی ہوئی تھی۔ سوچا تھا گھر جا کر کچھ دیر آرام کر کے رات کے کھانے میں لگوں گی، سالن بیشک بقول اقبال کے میں ایک ہی دن یعنی جمعہ کو پکا کر فریزر میں "ڈبا" دیتی تھی لیکن بہر حال چاول اور روٹی تو پکانا ہی پڑتے تھے۔ روٹی بھی انہیں گھر کی ہی پسند تھی۔ سلاد اور دو چار چٹنیوں کے بغیر کھانا ان کے حلق سے نہ اترتا تھا۔ کھانے سے فراغت پا کر بچوں کو ہوم ورک کرانا بھی میرے ہی معمول میں شامل تھا۔ اس دوران اقبال انتہائی فراغت سے اخبار کا مطالعہ کرتے تھے۔ ضرورتِ رشتہ سے لے کر ٹینڈر نوٹس تک ان کی نظر سے گزرتے تھے اور میں بیچاری صرف اخبار کی شہ سرخیاں ہی دیکھ پاتی تھی۔ اپنا سر پکڑے میں بیڈ پر لیٹی تھی کہ دروازہ دھڑ سے کھول کر وہ اندر آ گئے۔ میں نے گویا ناراض ہو کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"کیا ہوا ایسے کیوں لیٹی ہو؟" انہوں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"سر میں درد ہو رہا ہے۔" میری آنکھوں میں فوراً ہی آنسو امڈ آئے۔

"پہلے بتانا تھا۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔ پھر سنگھار میز کی نچلی دراز میں سے ٹیبلیٹ نکالی۔ (نچلی دراز بطور فرسٹ ایڈ بکس استعمال ہوتی ہے) بڑی محبت سے گلاس میں پانی لے کر آئے۔ (کبھی کبھی تو محبت کا اظہار ہونا تھا)

"لو یہ ٹیبلیٹ کھالو، دس پندرہ منٹ بعد آرام آجائے گا۔"

ان کی محبت دیکھ کر میں کچھ دیر پہلے کا ان کا "جلال" بھول چکی تھی۔ ان کے ہاتھ سے ٹیبلیٹ لے کر منہ میں رکھی۔ پانی کے چند گھونٹ پیے اور ذرا آرام سے مسہری پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی۔ وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سر کے اطراف میں اُگے چند بالوں کو سنوارنے لگے۔

"تھوڑی دیر آرام کر کے اُٹھ جانا۔" ان کا لہجہ سرسری سا تھا لیکن میں خطرے کی بُو بھانپ گئی۔ (ان کو کوئی "مطلب" ضرور تھا)

"کیوں؟" میری نگاہیں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"آج احمد صاحب آئیں گے، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ، تم ذرا اچھے سے کھانے کا بندوبست کر لینا۔" انہوں نے یوں کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جبکہ میں ان کی بات سُن کر ڈھے سی گئی تھی۔

"میرے تو سر میں درد ہو رہا ہے۔" میرے لہجے میں حقیقی نقاہت آگئی۔

"دس پندرہ منٹ میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔" اقبال نے لاپروائی سے کہا۔ "میں تمہاری مدد کر دوں گا۔" انہوں نے آفر دی۔

میں پانچ ہی منٹ بعد اُٹھ کھڑی ہوئی۔ فریزر سے کباب نکالے۔ مرغی نکال کر قورمہ چڑھایا، چانپیں پکائیں پلاؤ کے لیے یخنی چڑھائی۔ ایپرن باندھے میں کچن میں بے حد مصروف تھی تب اقبال "مدد" کے لیے کچن میں "تشریف" لائے۔

"ہاں بھئی! مجھے بتاؤ کیا کام ہے۔" پتیلیوں کے ڈھکنے ہٹا ہٹا کر بظاہر چمچ چلانے کے بہانے انہوں نے "ڈشز" کا جائزہ لیا، پھر مطمئن ہو کر میرے ہاتھ سے پلیٹیں لے لیں۔

"لاؤ میں انہیں کھنگال دیتا ہوں۔" میں بادام پستہ کی ہوائیاں کاٹنے لگی۔ دو چار پلیٹیں دھو کر وہ بیزار ہو گئے۔

"اچھی خاصی صاف ستھری ہیں، تمہیں تو خواہ مخواہ کام بڑھانے کی عادت ہے۔"

"اچھا آپ یہ کاٹ دیں، پلیٹیں میں دھو لیتی ہوں۔"

"یہ بات ہوئی نا۔" انہوں نے پلیٹ میرے ہاتھ سے لے لی اور باہر لاؤنج میں جا بیٹھے۔ پلیٹیں دھوتے دھوتے کچن کی کھڑکی سے میں نے اُن کو جھانکا۔ ان کا منہ چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ دیکھا، منہ پھر چل رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر جھینپ سے گئے۔ پلیٹ آدھی ہو چکی تھی۔

"گھور کیوں رہی ہو، چکھ رہا تھا کہ کہیں بادام کڑوے تو نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ہوائیاں کاٹ کر پلیٹ میرے حوالے کر کے پھر معصوم سا چہرہ بنا کر انہوں نے میری طرف دیکھا۔

"اور کوئی کام؟" (جیسے ابتک نجانے کتنا کام کر لیا تھا)

"کام؟" میں نے سوچا۔ "اوہ ہاں ایسا کریں آپ سلاد بنا دیں۔"

"لاؤ سامان دے دو۔" انہوں نے تابعداری سے کہا۔

میں نے جلدی سے فریج سے سلاد کے پتے، پودینہ، ٹماٹر، کھیرا، مولی، گاجر نکال کر دیے، پیاز دی، اتنا سارا سامان دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔

"کیا مطلب؟ کیا یہ سب کچھ مجھے کاٹنا پڑے گا؟"

"ہاں اور کیا؟ دو منٹ میں سب کچھ کٹ جائے گا، آپ کاٹنا شروع تو کریں۔" میں نے حوصلہ افزائی کی۔

"کہاں بیٹھ کر کاٹوں۔" انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"ڈائننگ ٹیبل پر ہی سامان رکھ لیں، وہیں کاٹ لیں، لیکن ذرا جلدی۔" سامان خود ہی ٹیبل پر رکھا۔ سلاد ڈش اور چھری حوالے کی۔

"مونا!" تھوڑی دیر بعد ان کی زوردار آواز آئی میں چونک کر کچن سے باہر نکلی، یا اللہ خیر!

"کیا ہوا؟" میں نے ڈر کر انگلیاں وغیرہ دیکھیں، چھری کافی تیز تھی خدانخواستہ کہیں انگلی وغیرہ تو نہیں کاٹ بیٹھے لیکن شکر ہے سب کچھ ٹھیک تھا۔ پھر اتنی خطرناک چیخ کیوں؟

"ادھر دیکھو۔" ان کی فخریہ آواز آئی۔ "ارے بھئی ان کھیرے کے قتلوں کو دیکھو کس قدر نفاست سے میں نے انہیں کاٹا ہے، سچ سچ بتاؤ اتنا باریک تم کاٹ سکتی تھیں، اور یہ مولیاں دیکھو، سب بالکل برابر برابر کٹی ہیں۔" انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"واقعی میں ایسی ہنرمندی سے نہیں کاٹ سکتی تھی۔" میں نے دل رکھنے کی کوشش کی تو وہ خوش ہو گئے۔

"آج کا سلاد لاجواب ہوگا۔"

"ذرا جلدی کیجیے، آدھے گھنٹے میں آپ نے دو مولیاں اور ایک کھیرا کاٹا ہے۔" میں نے زیر لب کہا۔ اب سب کچھ تیار تھا (سوائے سلاد کے) تیاری ہنوز جاری تھی۔

"کسی شوروم میں تو سجانا نہیں ہے، آپ خوامخواہ اتنی محنت کر رہے ہیں۔" میں نے چڑ کر کہا۔ اور دوسری چھری لے کر ان کی مدد کرنے لگی۔ مہمانوں کے آنے سے چند منٹ پہلے وہ فارغ ہوئے۔ میں نے چھلکوں وغیرہ کو ہٹا کر میز صاف کی، اسی وقت بیل بجی۔

"اقبال! پلیز آپ دروازہ کھول دیں۔"

"کھول رہا ہوں۔" وہ کرسی سے اُٹھے پھر ناقدانہ انداز سے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"مونا ڈیئر، اپنا حلیہ تو ٹھیک کر لو جا کر، ان کی بیوی پہلی مرتبہ ہمارے گھر آ رہی ہیں، پہلا امپریشن اچھا پڑنا چاہیے۔"

"اوہ ہاں!" میں نے کہا۔ "کپڑے تبدیل کرنا تو میں بھول ہی گئی۔" میں جلدی سے ڈریسنگ روم کی طرف بھاگی۔

بیل اس مرتبہ کافی طویل ہو چکی تھی۔ اقبال جلدی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ میں استری شدہ گلابی پرنٹڈ سوٹ پہن کر "تیار" تھی۔ لیکن "آن" کی وجہ سے جلدی سے ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر بالوں پر برش کے دو تین ہاتھ بھی مار ہی لیے۔ مجھے بمشکل تمام اس "مکمل" تیاری میں پانچ منٹ لگے تھے۔

"آداب!" میں نے کمرے میں موجود مہمانوں کو بڑی تمیز سے سلام کیا۔

"ارے تم!" مسز احمد نے ایک سریلی آواز بلند کی میں بغور ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن افسوس پہچان نہ پائی۔

"میں محمودہ ہوں، تمہاری پرانی کلاس فیلو۔ ارے بھئی میٹرک میں ہم ساتھ پڑھا کرتے تھے۔" میں اب بھی نہ پہچان پائی۔

"ارے بھئی ثریا سوکھی کے ساتھ رہا کرتی تھی میں، اب یاد آیا۔"

"اوہ ہاں!" میں بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ثریا سوکھی کے ساتھ والی محمودہ کو تو میں جانتی ہوں لیکن؟"

"تھوڑی "موٹی" ہو گئی ہوں اس لیے۔" انہوں نے قدرے شرمندگی سے اپنے بھاری تن و توش کو دیکھا۔

"کتنے بچے ہیں؟"

"چھ ماہ شادی کو ہوتے ہیں۔" میں شرما گئی۔

"صرف چھ ماہ؟" وہ سوالیہ نشان بن گئیں۔

"ارے بھئی تمہیں بتایا تو تھا کہ اقبال صاحب کی شادی ابھی چند ماہ قبل ہی ہوئی ہے۔ انہی دنوں جب تم خیرپور گئی تھیں۔ اپنی نانی سے ملنے۔" احمد صاحب نے مداخلت کی تو میں نے شکر ادا کیا۔

"ہماری شادی تو میٹرک پاس کرتے ہی ہو گئی تھی اور اب دیکھ لو چار بچے ہیں، لیکن تم کیا کرتی رہیں؟" انہوں نے مشکوک ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں ایم اے کر رہی تھی۔"

"ایم اے۔" ان کا لہجہ تمسخر آمیز تھا "آجکل تو سب ہی ایم اے، بی اے کر رہے ہیں، لیکن "انجام" بہرحال شادی ہی ہے۔"

"مسز اقبال،" احمد صاحب نے کہنا چاہا۔

"بھابی پلیز!" اقبال نے تصحیح کی۔

"بھابی، آپ ان کی باتوں کا برا نہ مانیے گا میں بھی نہیں مانتا۔"

"میں بھی نہیں مان رہی۔" میں ان کا مطلب سمجھ چکی تھی۔

"ارے بھئی کھانا لگاؤ، دیر ہو رہی ہے۔" اقبال نے "انڈر اسٹینڈنگ" کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہا۔ میں ان کی نظریں پہچان چکی تھی سو اٹھ کھڑی ہوئی۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد بیڈ کے ایک کونے پر وہ چھت پر مسلسل نگاہیں جمائے ہوتے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" حتی الامکان مٹھاس لہجہ میں سمو کر میں نے کہا۔

"سوچ رہا ہوں اگر مسز احمد تمہاری کلاس فیلو ہیں تو؟" وہ رک گئے۔

"تو کیا ہوا؟" میں پریشان سی ہو گئی۔

"وہ تو اچھی خاصی عمر کی لگتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب دمعنی تم اب خود تلاش کرو، میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔" میں چند لمحہ سوچتی رہی۔

"آپ کا مطلب ہے کہ میری عمر؟"

"ہاں یہی مطلب ہے۔" وہ دانت کچکچا کر بولے۔

"ایک کلاس کے سارے طالب علم ایک ہی عمر کے ہوتے ہیں؟"

"تقریباً" انہوں نے کہا۔

"لیکن محمودہ کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں تھا۔" میں نے بات مزید آگے بڑھائی "اس کے ماں باپ نے اسے بہت دیر سے اسکول میں داخل کروایا تھا۔ ان کے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ پانچویں کلاس پاس کرنے کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا، پھر کئی سال بعد اس نے چھٹی کلاس میں داخلہ لیا، ہمارے تو یہ پرانے جاننے والے ہیں، ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔"

"خیر! اب کیا ہو سکتا ہے۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"غیروں میں شادی کرو تو یہی ہوتا ہے، جبکہ رشتہ داروں میں شادی کرنے کے کئی فوائد ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے تنک کر پوچھا۔

"مثلاً یہی کہ عمروں وغیرہ کا صحیح پتا ہوتا ہے۔"

"یہ تو آپ کو اپنی شادی کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔" میں منہ لپیٹ کر بیڈ کے دوسرے کونے پر کروٹ لے کر لیٹ گئی۔

"لاحول ولاقوۃ، اپنی عمر دیکھتے نہیں ہیں، سارے بال سر سے غائب ہو چکے ہیں، اور مجھے بڑھیا بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔" میں دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

اس واقعہ کو کئی دن ہو چکے تھے۔ لیکن اندر ہی اندر میرے اور اقبال کے درمیان سرد جنگ جاری تھی۔

"کل تیار رہنا، احمد صاحب کے بیٹے کی سالگرہ ہے۔" اقبال نے کارڈ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا جانا ضروری ہے۔" میں تلخ سی ہو گئی۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔" ان کا لہجہ مجھ سے زیادہ تلخ تھا۔

سالگرہ کی تقریب میں ہم قدرے دیر سے پہنچے تھے۔ کافی مہمان آ چکے تھے۔ چہرے پر مسکراہٹیں سجائے میں اور اقبال سب سے مل رہے تھے اتنے میں ایک شناسا شکل دیکھ کر میں چونک گئی۔

"ارے ماجد چچا آپ!" وہ محمودہ کے والد تھے۔ انہوں نے بغور میری طرف دیکھا "آمنہ بیٹا تم! کیسی ہو؟" انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"اقبال یہ محمودہ کے والد ہیں اور ماجد چچا یہ"

"یہ تمہارے شوہر نامدار۔" وہ مسکرائے۔

"تم نے تو سنا ہے خوب پڑھا لکھا۔" انہوں نے ستائش بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"جی ہاں ایم اے کیا ہے۔" میں نے فخر سے کہا۔

"فرسٹ کلاس۔"

"اور ایک یہ ہماری محمودہ بیٹی تھی، پڑھ کر ہی نہ دیا۔ بیشک میں لڑکیوں کی تعلیم کا مخالف تھا، لیکن محمودہ کی امی کو تو اسے پڑھانے کا شوق تھا، لیکن افسوس اس نے پڑھ کر ہی نہ دیا۔ ایک کلاس میں دو سال لگانا تو جیسے اس کی عادت تھی۔ خدا خدا کر کے پانچویں کلاس سے نکلی پانچ سال گھر میں آرام کیا پھر چھٹی میں داخلہ لیا، جس طرح سے اس نے میٹرک کیا ہے، میں ہی جانتا ہوں۔"

ماجد چچا کو بولنے اور "مفصل" بولنے کی عادت شروع سے تھی۔ لیکن اس وقت ان کی عادت مجھے بہت اچھی لگی۔

"تم نے کس قدر کم عمری میں ایم اے کیا ہے، آج کل کیا کر رہی ہو؟" انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

"یہیں ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہوں۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"محمودہ" اسی وقت وہ قریب سے گزری تو میں نے اسے آواز دی۔

"تم اس کا نام کیوں لیتی ہو، پہلے بھی میں ہمیشہ تمہیں منع کرتا تھا ارے بھئی یہ تم سے کم از کم آٹھ نو سال بڑی ہے۔ اس کو باجی کہا کرو۔" (زمانہ طالب علمی میں بھی ہمیشہ وہ مجھ سے یہی کہا کرتے تھے۔)

"تھی تو کلاس فیلو۔" میں ہنسی۔

"اب بھی تمہارا جواب وہی ہے۔"

کم سن بننے کی خواہاں محمودہ کا چہرہ اتر چکا تھا۔

"ابا! آپ تو ہمیشہ مجھے بڑا بنانے پر تلے رہتے ہیں۔"

"ایک تو عورتوں کی عمر چھپانے کی عادت ختم نہیں ہوتی، ارے بھئی آمنہ تو ہمارے محمود کے ساتھ کی ہے۔"

محمودہ کی شامتِ اعمال کہ اسی وقت محمود قریب سے گزرا۔ چوبیس پچیس سال عمر کے لڑکے جیسے لگتے ہیں وہ بھی لگ رہا تھا۔

"یہ ہے میرا بیٹا محمود۔" ماجد چچا نے کہا۔

میں نے اقبال کے چہرے پر نظر ڈالی۔ چہرے پر غیر معمولی بشاشت آ گئی تھی۔ میں مطمئن ہو گئی (شکر ہے میری کم عمری کا یقین تو آیا) واپسی پر اقبال دھیرے دھیرے کوئی گیت گنگنا رہے تھے۔

"مجھے خوامخواہ غلط فہمی ہو گئی تھی، تم تو واقعی اتنی ہی عمر کی ہو جتنی نظر آتی ہو۔" انہوں نے معذرت خواہانہ انداز سے پیار سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ لیکن میں ناراضگی سے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

"وہ مسز احمد کی وجہ سے۔" انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

"کل کسی اور کی وجہ سے مجھے کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیے گا۔"

"توبہ بھئی توبہ۔" انہوں نے کان پکڑے تو میں ہنس پڑی۔

"اب تو تم سولہ سال کی لگ رہی ہو۔"

"سوچ لیں۔" میں نے انہیں چھیڑا

"ارے بابا غلطی ہو گئی، اب آئندہ کسی کی باتوں میں نہیں آؤں گا۔" چہرے پر سچائی کی چمک دیکھ کر میں مطمئن ہو گئی۔

وہ ایک سبق اقبال کے لیے ایسا کافی ثابت ہوا کہ آج شادی کو بیس سال گزرنے کے باوجود بھی اب وہ اپنی رائے اپنے اندازوں کو مقدم رکھتے ہیں۔ کبھی کسی کی بات کا اثر نہیں لیتے،

ہاں! اتنا بتا دوں، اپنی عمر آج تک انہوں نے مجھے صحیح نہیں بتائی۔

⁂

فہمیدہ ثروت رضوی

اس گھر کے سونے آنگن میں کوئی خوشی نہیں کوئی عید نہیں
کوئی خواب نہیں امید نہیں کوئی عید نہیں تجدید نہیں

اک شخص ہمارا اپنا ہے ہم سب سے کتنا بے گانہ
ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں پر اس سے گفت و شنید نہیں

آنے والے برس بھی شاید دکھ کی کہانی لکھنا ہو
پھر اپنے سارے خواب جلیں خوشیوں کی کوئی نوید نہیں

بکھرے بال، ویران آنکھیں، کپڑے بھی پیوند زدہ
یہ غربت کے مارے بچے کیا ان کی کوئی عید نہیں

نشتر دے یا مرہم دے کس کو ہے پرواہ یہاں
اپنے مسیحا سے ہم کو اب کوئی بھی امید نہیں

سب عید منائیں گے ثروتؔ جشنِ چراغاں ہوتا ہے
اپنے لیے یہ دن بھی عام، تم ہی نہیں تو عید نہیں

نورجہاں بیناگلؔ

پچھلی عید کی چاند رات کو
تم ——
کتنی دیدہ دلیری سے میرا ہاتھ تھامے
(آنکھوں میں خواہشوں کے ننھے منے چمکتے جگنو لیے)
بے تکان بولے چلے جا رہے تھے
کہ ——
دیکھنا آنے والے لمحوں کو ہم اپنی
گرفت میں لیں گے
اور ——
میرے نام کی چوڑیاں کسی خوش کن لمحے میں
تمہاری کلائیوں میں بول اٹھیں گی
مگر یہ کیا کہ ——
(لمحوں کو قید کرنا تو چراغ تلے اندھیر والی
بات ہوئی)
تم تو مجھے بھی
اپنی قیدِ حیات میں نہ
باندھ سکے

امت الصبور

آئینہ خانے میں

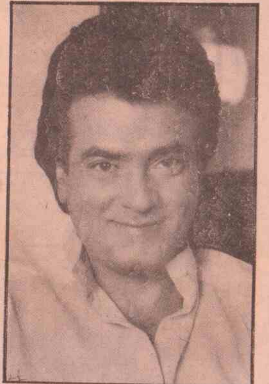

مادھوری ڈکشٹ اور خوبصورتی

مادھوری کا کہنا ہے کہ میرے لیے خوبصورتی ایک سیدھے سادھے انسان میں ہوتی ہے شکل و صورت ہی میں خوبصورتی پنہاں نہیں ہوتی بلکہ وہ انسان کے اندر ہوتی ہے، مدھوبالا کی زندہ دلی مینا کماری کا جذباتی پن نرگس کی تیزی یہ سب ان کا حسن تھا اب میں اس زمانے کی بات کرتی ہوں فرح خوبصورت ہے اور نیلم بہت معصوم ہے جیکی کی موجودگی اچھی لگتی ہے جبکہ انیل کام اچھا کرتا ہے میں سمجھتی ہوں میں خوبصورت نہیں ہوں بس ٹھیک ٹھاک ہوں مگر جب کوئی میری تعریف کرتا ہے تو مجھے الجھن سی ہوتی ہے میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرے آئی بروز اچھے ہوں، ناک چھوٹی، بال لمبے لمبے اور جلد اچھی ہو۔

جتیندر کی نظر میں

جتیندر اسکرین کے باہر موٹے جسم والی عورتوں کو پسند کرتا ہے اس لیے مینا کشی کے مقابلے میں سری دیوی یا ریکھا کے ساتھ زیادہ مطمئن رہتا ہے وہ حال ہی میں شادی شدہ پونم کے ساتھ شوٹنگ کر رہا تھا تو اس نے کہا پونم اب بڑی خوبصورت لگ رہی ہو تمہارا وزن تھوڑا سا بڑھ گیا ہے —— جتیندر کی ان باتوں کو دیکھتے ہوئے شوبھا کو سخت ورزش کا پروگرام ترک کر دینا چاہیے اور آرام کرنا چاہیے کیونکہ جتیندر نے شاید اسے یہ نہیں بتایا کہ اسے نہ صرف گداز جسم والی بلکہ موٹی عورت بے تحاشہ پسند ہے۔

مہوش حسن چشتی چشتیاں شریف

ریکھا کی دلچسپ باتیں

میں کبھی رنگے ہاتھوں نہیں پکڑی گئی بلکہ میں نے لوگوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔

اگر میں چور ہوتی تمام ایٹم بم چوری کر کے دنیا کو امن کا گہوارہ بنا دیتی۔

میرا عزیز ترین دوست خدا ہے۔

مجھے دادی بننے کی خواہش ہے۔

میری زندگی کا سب سے بڑا راز۔ کہ میں ابھی تک غیر شادی شدہ ہوں۔

ریکھا نے کہا اس کی پسندیدہ لو اسٹوری اس کی اپنی زندگی ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والا سب سے باوقار شخص کون ہے تو ریکھا نے کہا کہ وہ خوبصورتی اور وقار کو کوئی اہمیت نہیں دیتی کیونکہ ایسے لوگ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اسے شور شرابے والے نوجوان لوگ پسند ہیں۔

ریکھا سے جب پوچھا گیا کہ اگر جیا اسے چائے کی دعوت دے تو وہ کون سا لباس پہنے گی تو جواب دیا صرف ایک مسکراہٹ۔

عابدہ دقیق عابی وزیر آباد

شبانہ اعظمی کی ندامت

شبانہ اعظمی کو کون نہیں جانتا اور پھر وی۔ سی۔ آر نے تو انڈین فلم انڈسٹری کو ہماری جڑوں میں بٹھا دیا ہے تو جی ذکر تھا شبانہ کا کہ جس کی خوبصورت، فطری اور جاندار اداکاری نے آرٹ موی کو اس مقام پر کھڑا کر دیا کہ جس کے بارے میں آج سے دس سال پہلے سوچنا بھی ایک مذاق لگتا تھا۔

جب شبانہ سے پوچھا گیا کہ انہیں اپنی آرٹ فلموں میں سب سے زیادہ کون سی فلم پسند ہے

شبانہ: ”مجھے ویسے تو تمام فلمیں معیاری لگتی ہیں مگر ارتھ اور منڈی زیادہ پسند ہیں۔“

سوال: کمرشل فلموں میں سے کسی ناکام فلم کے بارے میں بتائیں اور وجہ بھی؟

شبانہ: ناکام تو نہیں کہہ سکتے آپ ہاں کٹی ہیں جیسے فقیرا، سیدھی راہ، وغیرہ ایک فلم جو میری ہٹ فلموں میں سے تھی وہ کامیاب ہونے کے باوجود مجھے ناکام لگتی ہے کیونکہ اس میں کہے گئے ایک جملے نے مجھے اپنے ضمیر کے سامنے جو ندامت دی ہے وہ میں ساری عمر نہیں بھول پاؤں گی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میں ہر طرح کے رول لے رہی تھی ان ہی میں ایک فلم تھوڑی سی بے وفائی بھی تھی۔ جو کہ بعد میں اچھا بزنس کر گئی اس فلم میں میں نے ایک جملہ کہا تھا کہ

”پتی (شوہر) کے گھر کا دکھ بھی ماں باپ کے گھر کے سکھ سے بہتر ہے۔“

اب جبکہ میں سمجھتی ہوں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے یہ جملہ کیوں کہا میں اگر ڈائیلاگ میں سے اسے کٹوا دیتی تو برا نہیں ہوتا مگر اب میں اس کی تلافی اس طرح کر سکتی ہوں کہ جو بھی رول لوں پہلے اسے اسٹڈی کروں پھر ہاں کروں۔ اس لیے اب میں جو بھی رول لیتی ہوں دیکھ بھال کر لیتی ہوں شاید اسی لیے میں آرٹ موی کی طرف آئی کیونکہ اس میں معاوضے کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ اصل چیز حقیقت اور پرفارمنس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کم کام لیتی ہوں تاکہ اپنے معیار کو برقرار رکھوں اور دوبارہ وہی غلطی نہ کروں۔

ظل ہما افضال۔ لاہور

محبوبہ کا سہارا

سنا گیا ہے کہ آج کل متھن کی قسمت کا ستارہ گردش میں ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج کل ان کی سبھی فلمیں دھڑا دھڑ فلاپ ہو رہی ہیں۔ قسمت کے ستارے کی گردش کے ساتھ ساتھ متھن خود بھی گردش میں ہیں اور وہ اور ان کی بیوی یوگیتا بالی جگہ جگہ جوتشیوں کے پاس جا کر متھن کی کامیابی کے لیے ٹونے ٹوٹکے کر رہے ہیں اور مستقبل کا حال جاننے کی کوشش کر رہے ہیں جو ابھی سے تاریک نظر آتا ہے۔

متھن کی بیوی اس سلسلے میں بڑی گرم جوش نظر آ رہی ہیں کیونکہ انہیں خطرہ لاحق ہے کہ ان ناکامیوں سے مایوس ہو کر متھن اپنا غم غلط کرنے کے لیے کہیں ایسی راہ اختیار نہ کر لے جو اس کے لیے ممنوع ہے کیونکہ مایوسی اور یاس کے عالم میں انسان اکثر اس چیز کا سہارا لیتا ہے جو اس کے لیے ممنوع ہوتی ہے۔ متھن کے لیے وہ ممنوع چیز ان کی ایکس محبوبہ سری دیوی ہے کیونکہ فلمی دنیا میں غم غلط کرنے کے لیے بیوی کے بجائے محبوبہ کا سہارا لیا جاتا ہے کیونکہ محبوبہ نہ گھر کا مسئلہ کھڑا کرتی ہے نہ بچوں کا خود بھی سکون سے رہتی ہے دوسرے کو بھی رہنے دیتی ہے۔

جیتندر سدا بہار ہیرو

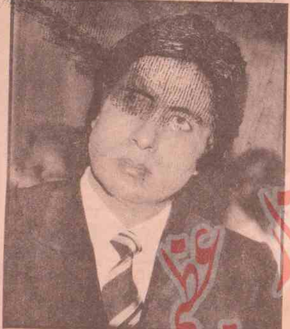

جیتندر اگرچہ امیتابھ اور راجیش کی طرح سپر اسٹار تو نہ بن سکا لیکن باکس آفس پر اس کے نام پر جو بھیڑ پہلے لگا کرتی تھی وہ اب بھی اسی طرح لگا کرتی ہے اور وہ موجودہ دور کے نئے ہیروز سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں وہ اپنی جگہ کانسٹنٹ ہے۔ سپر اسٹارز جتنی تیزی سے بلندی پر گئے تھے اتنے ہی زور سے نیچے آن گرے۔ مگر جیتندر ابھی تک اپنی یکساں رفتاری کے ساتھ قائم دائم ہے۔ اسی لیے ابھی کچھ عرصہ قبل اسے سدا بہار ہیرو کا خطاب ملا ہے اس کا سارا کریڈٹ جیتندر کو خود ہی جاتا ہے اس لیے کہ اس نے شروع سے اپنی متوازن صحت کا خیال رکھا ہے کہ آج وہ ۴۹ سال کا ہو کر بھی جوان نظر آتا ہے۔ شروع میں جیتندر بہت سگریٹ نوشی کرتا تھا۔ ہر شاٹ مکمل ہونے کے بعد اس کو سگریٹ کی طلب محسوس ہوتی تھی مگر پھر اچانک اس نے اس بری اور پختہ عادت کو ایک دم چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ ڈائیٹنگ بھی شروع کر دی تاکہ اس کی فگر صحیح رہے ورزش وہ شروع ہی سے کرتا تھا۔

ان سب چیزوں کی بدولت آج بھی اس کے جسم کی ساخت اتنی خوبصورت اور متناسب ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کے برابر ہیروئنوں کے ساتھ ان ہی کی طرح ناچ کود سکتا ہے۔ ویسے جیتندر کا کہنا ہے کہ انسان اپنی عمر سے نہیں سوچ سے بوڑھا ہوتا ہے۔

سائرہ بانو اور دلیپ کی شادی

یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ جب دلیپ کمار اور سائرہ بانو کی شادی کی خبر سن کر سب چونک گئے کیونکہ یہ خبر بھی کے لیے انتہائی غیر متوقع تھی۔ پھر یہ شادی ہو بھی گئی۔ مگر عوام الناس کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ آخر یہ سب ہوا تو کیسے ہوا۔ کیونکہ ایک طرف سائرہ بانو اور راجندر کمار کی ——— انوالومنٹ اور دوسری طرف دلیپ کا سائرہ بانو سے دگنا بڑا ہونا۔ دلیپ نے تو فلم لیڈر کی شوٹنگ کے دوران ان کے ہیروئن بننے پر اعتراض کیا تھا کہ سائرہ دلیپ کے سامنے بچی لگتی تھیں پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔

قصہ یوں ہے راجندر کمار کی بیوی نے اس سلسلے میں کافی ذہانت کا ثبوت دیا تھا جب ان کو یقین ہو گیا کہ ان کا شوہر ہاتھ سے نکلنے ہی والا ہے تو انہوں نے بڑا کارآمد حربہ اختیار کیا وہ یہ کہ ان کی بہت بڑی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ راجندر کمار کو علم نجوم پر اندھا اعتماد تھا انہوں نے جوتشیوں کے ذریعے راجندر کمار سے کہلوا دیا کہ اگر انہوں نے ”ایس“ نامی لڑکی سے شادی کی تو ان کا فلمی کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ اتفاق سے ان ہی دنوں راجندر کمار کی فلمیں بھی فلاپ ہونے لگیں بس انہوں نے گھبرا کر سائرہ کو خدا حافظ کہا۔

اس طرح سائرہ کی زندگی سے راجندر کمار نکل گئے

فرح بد دماغ اور جھگڑالو کیوں ہے؟

بھارتی فلم انڈسٹری نے اداکارہ فرح کو سب سے زیادہ بد دماغ اور جھگڑالو قسم کی لڑکی کے خطاب سے نوازا ہے۔ فرح کیوں ایسی ہے؟ اس کی بدکلامی، بدمزاجی، نت نئے افیئرز، مارپیٹ، ہدایت کاروں سے فساد آخران سب چیزوں سے وہ کیا ثابت کرنا چاہتی ہے؟ اس سلسلے میں جب فرح سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ جب سے وہ پیدا ہوئی اپنے گھر والوں کے لیے دردِ سر بنی رہی اور اس کی وجہ تھی۔ اس نے لڑکوں کی طرح پرورش پائی، لڑکوں والے انداز اپنائے۔ ”ٹام بوائے“ کے نام سے محلے میں بدنام تھی۔ اس لیے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو بیٹا نہ ہونے پر

چھوڑا تھا۔ وہ اپنی ماں کے لیے بیٹا بننا چاہتی تھی۔ بس اسی لیے اس نے ایسی روش اختیار کی جو لڑکوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

وہ اسکول میں پڑھائی سے زیادہ کراٹے پر توجہ دیتی تھی۔ ہمیشہ اپنے پاس چاقو رکھا کرتی تھی۔ جہاں کسی نے چھیڑا یا نازیبا حرکت کی بس کر دی وہیں اس کی دھنائی۔ یہاں تک کہ ایک پولیس والا بھی اس کی زد میں آگیا۔ اس نے فرح کے ساتھ بدتمیزی کی تھی اور فرح نے اسے ایسا کراٹے کا داؤ دکھایا کہ اسے بھی نانی یاد آگئی پھر فرح اسے لے کر پولیس اسٹیشن گئی مگر ہوا کیا کہ حوالدار کو چھوڑ کر اسے روک لیا گیا۔ تاوقتیکہ اسے اس کی ممی چھڑانے نہیں آئیں۔ اس کی ممی بھی اس کے ساتھ بہت سخت اور سنجیدہ رویہ رکھتی ہیں اس لیے وہ اور ضدی ہو گئی ہے اور راجیش سیٹھی سے افیئر کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اس کی والدہ کو سخت ناپسند تھا۔

سری دیوی نمبرون ہیروئن کیسے بنی؟

سری دیوی جو آج کل بھارتی فلموں کی نمبر ون ہیروئن مانی جاتی ہے اسے اپنے ابتدائی زمانے میں بڑی مایوسیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔

اس کی پہلی فلم "سولہواں ساون" تھی۔ جس میں اس کا ہیرو امول پالیکر تھا۔ حالانکہ فلم بہت اچھی بنی ـــ تھی مگر عوام نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس سے پہلے اس نے ایک فلم "جولی" بھی کی ـــ تھی مگر اس فلم میں اس کا رول اس قدر مختصر تھا کہ وہ عوام کی توجہ نہ پا سکی۔ اس کے بعد اس نے بہت کوشش کی، اسٹوڈیوز کے چکر لگائے مگر ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

پھر قسمت کی خوبی دیکھیے کہ ایک دن اس کی ملاقات جیتیندر سے ہو گئی اور جیتیندر نے سری دیوی کو اپنی ناک چھوٹی کروانے کا مشورہ دیا جو قدرے موٹی تھی۔ اور فلمسازوں کو شکایت بھی یہی تھی کہ اسکرین پہ اس کی ناک بہت موٹی نظر آتی ہے۔ اور پھر واقعی یہ مشورہ بڑا کارگر ثابت ہوا جونہی سری دیوی نے اپنی ناک کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ اسے دھڑا دھڑ فلمیں ملنی شروع ہو گئیں اور سب کی سب کامیاب گئیں ان ہی فلموں میں اس کی فلم "ہمت والا" بھی تھی جو اس نے جیتیندر کے ساتھ کی تھی۔ وہ فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سری دیوی جو بمبئی سے ناکام و نامراد لوٹ رہی تھی اب وہاں مستقل قیام پذیر ہے۔ یوں اسے اگر ہم صحیح صحیح دیکھیں تو وہ ایک معمولی شکل و صورت کی دبلی، پتلی سانولی سی لڑکی ہے مگر جب بھرپور میک اپ کے ساتھ فلمی اسکرین پر نمودار ہوتی ہے تو فلم بینوں کے دلوں کی دھڑکنیں رک جاتی ہیں۔

خالدہ جیلانی

کہنا کسی یہ کیوں میرے دل جو ہمارا

ریحانہ کنول ——— کراچی

عید کا چاند فلک پہ نظر آیا جس دم
میری پلکوں پہ ستارے تھے تیری یادوں کے

ستارہ خان ——— ملتان

عید کا دن بھی یونہی بیت گیا
ہم کبھی جیتے اور مرتے رہے
کر گئی موت اپنا کام تمام!
ہم تیرا انتظار کرتے رہے

نائلہ افشاں ——— چکوال

میں نے چاہا کہ تجھے عید پر کچھ نذر کروں
جس میں احساس کے سب رنگ ہوں روشن روشن
جس میں آنکھوں کے تراشے [illegible] لاکھوں
جس میں شامل ہو میرے قلب کی دھڑکن دھڑکن

ثمینہ طلعت قائمی ——— جلال پور بھٹیاں

عید کا چاند جس دم نظر آیا فلک پہ
میری پلکوں پہ ستارے ہوں گے تیری یادوں کے

خالدہ، ساجدہ خان ——— علی پور چٹھہ

دوستوں سے دُور جا کر کیا مزہ ہے عید کا
دوستوں کی دید حاصل ہو تو پھر ہے لطفِ عید

عاصمہ فہیم ——— کراچی

ہم نے پردیس میں کیں چاند کو یہ تاکیدیں
اُن سے کہنا کہ انہیں لاکھ مبارک عیدیں

عالیہ خان ——— عمر کوٹ

کب تیری یاد کی تقریب بنا عید کا چاند
تیری یاد آئی تو دیکھا نہ گیا عید کا چاند
غم کے بادل تھے فضاؤں میں ایسے چھائے
دل کی دنیا میں منور نہ ہوا عید کا چاند

سیدہ شبانہ نقوی ——— کراچی

تمہاری صبح حسین ہو شبِ قمر کی طرح
تمہاری رات منور رُخِ سحر کی طرح

کوئی بہشت کا پوچھے تو کہہ سکو ہنس کر
کر وہ بھی خوب جگہ ہے ہمارے گھر کی طرح

سبین فاطمہ ——— پرانا سکھر

میں ہوں اگر خاموش آج تو ہنسا تُو بھی نہیں
مجھ سے بچھڑ کر کسی اور سے ملا تو بھی نہیں
خنک خنک سی مسکراہٹ کے ساتھ عید مبارک
مان لے کہ مجھ سے زیادہ خود کو جانتا تو بھی نہیں

ثناء رزاق ——— پرانا سکھر

تجھ تک اے دوست میرا کس طرح آنا ہوگا
یہ عید کے دن یونہی گزر جائیں گے۔

[illegible] حنیف ——— کراچی

وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تُو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

غزالہ جبین ——— بورے والا

مبارک نام ہے تیرا مبارک عید ہو تجھ کو
جسے تُو نے چاہا اُس کی دید ہو تجھ کو

صوفیہ ملک ——— کوہار

چاند دیکھا تیری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تیری دید اب کے
دل دُکھا ہے نہ وہ پہلا سا نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے

کنیز بی مبین ——— پرانا سکھر

آنکھیں ہیں دیدِ دوست کی مدت سے منتظر
کچھ تشنگی نظر کی مِٹا چاند عید کے
آئیں وہ بھی میری دید کے لیے!
صورت کسی بہانے دکھا چاند عید کے

صائمہ رزاق یوسفی ——— پرانا سکھر

بہ فیضِ عید بھی پیدا نہ ہوئی یک رنگی
کوئی ملول کوئی غم سے بے نیاز رہا!
بڑا غضب ہے خداوندِ کوثر و تسنیم
کہ روزِ عید بھی طبقوں کا امتیاز رہا!!

زبیدہ غفار ——— گوجرانوالہ

نئی خوشی سے فلک کی سیاہ چادر پر
ہلالِ عید سرِ شام جب نظر آیا!
کوئی تو فرطِ مسرت سے ہو گیا پاگل
کسی نے جھوٹی تسلی سے دل کو بہلایا

راشدہ امجد ——— علی پور چٹھہ

پردیس میں عید آئی تو کیا ہو گا یہ دل شاد
رہ رہ کے ہر اِک گام پہ آتا ہے وطن یاد

فرزانہ سلیم ——— میاں چنوں

اِک چاند کے نکلنے سے ہوگی نہ عید اپنی
بھرپور ظلمتوں کو مٹا لیں تو عید ہو

رضیہ امین ——— کراچی

صبحِ عید کی دستک سُن کر دروازے پر
روشن روشن کھل اُٹھے پھول میرے آنگن میں

عشرت جہاں ——— کراچی

کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے برس
ہم ہی غافل تھے کہ آئی نہیں عید اب کے برس

تنویر عالم ——— کراچی

ذرا دم کو بھلا دو قصہ دردِ جدائی تم!
مجھے دل سے نہیں لیکن مناؤ عید کا دن ہے

شہینہ ——— لاہور

آج کی عید پر ہے کیا موقوف
ایسی عیدیں ہزار دیکھیں آپ

فریدہ عباس ——— جھنگ

سونا سونا آنگن میرا رہتا ہے جو تم بن جاناں
اپنی خوشبو سے مہکاتا اگر اس کو عید کے دن

خالدہ ظہیر ——— کراچی

عید کا چاند دیکھنے والے
آ کہ میری بھی عید ہو جائے

ممتاز شیریں ——— ٹھٹھہ

جو شخص کھو گیا ہم سے اندھیری راہوں میں
اُسی کو ڈھونڈ کے لاؤ کہ عید آئی ہے۔

عائشہ، فاطمہ نیاز ——— علی پور چٹھہ

ہائے افسوس کہ رسماً بھی کسی نے مجھ کو
آن کر عید مبارک نہ کہا عید کے دن

تبسم نذیر ——— بھاولنگر

وہ مقام آیا حیات میں وہ سُلجھ گیا میں اُلجھ گئی
رہی اس کے جال میں کاٹتی میرے گرد تن گیا وہ جال سا

[illegible] لوزین سید ——— ساہیوال

یہ روزِ عید، یہ جشنِ طرب مبارک ہو
عطا ہوئی ہے خوشی بے طلب مبارک ہو

مُبین فاطمہ ——— پرانا سکھر

دے انہیں جنبش کبھی عہدِ وفا کے واسطے
تیرے ہونٹوں پر نہاں میرا ہلالِ عید ہے

بشریٰ قریشی ——— ملتان

تمہارے بس میں اگر ہو تو بھول جاؤ ہمیں
تمہیں بھلانے میں شاید ہمیں زمانہ لگے

ستارہ ملک ——— ساہیوال

کسی دن دیکھنا وہ آ کے میری کشتِ ویراں پر
اُچٹتی سی نظر ڈالے گا اور شاداب کر دے گا

عائشہ ظہور بھٹی ——— سرگودھا

میں نے آنکھوں میں حسیں خواب سجائے کب تھے
پیار کے تاج محل میں نے بنائے کب تھے
زندگی تو نے ہر اک لمحہ نئے زخم دیے
ہاں مگر داغِ جگر ہم نے دکھائے کب تھے

فاطمہ حبیب ——— پرانا سکھر

غزل لکھوں کبھی سادہ سے خط لکھوں اس کو
اداس دل کے لیے مشغلے تلاش کروں

ثروت خان ——— ملیر کراچی

مقیّد کر دیا سانپوں کو یہ کہہ کر سپیروں نے
یہ انسانوں کو انسانوں سے ڈسوانے کا موسم ہے

عائشہ، فاطمہ نیاز ——— علی پور چٹھہ

میرے ہاتھوں کی لکیروں کے اضافے ہیں گواہ
میں نے پتھر کی طرح خود کو تراشا ہے بہت

فرخ شہزادی ——— لاہور

سوکھے پتوں کو دیکھ کر ناصر
یاد آتی ہے گُل کی باس بہت

تبسم ناز ——— کراچی

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

*

باتوں سے خوشبو آئے

امت الصبور

اسوۂ حسنہ

حضور اکرمؐ جب اپنی محل سرائے میں اپنی بیویوں کے پاس تشریف لاتے تو آپ کا ان کے ساتھ برتاؤ یہ ہوتا سب سے زیادہ نرم، سب سے زیادہ ہنسنے والے، سب سے زیادہ کریم۔ جتنی کہ بہت سے کام جو کہ عورتوں کے ہوتے ہیں وہ خود اپنے دست مبارک سے انجام دیتے۔ مثلاً آٹا گوندھتی ہوتیں تو آپ پانی لا کر دیتے۔ کبھی چولہے پر لکڑیاں پہنچا دیتے کبھی چارپائی ڈھیلی دیکھی تو ادوائن کسنے لگتے۔ غرض یہ کہ اپنے گھر کے کام باوجود دونوں جہاں کے بادشاہ ہونے کے اپنی بیویوں کے ساتھ خود کیا کرتے تھے۔

ہم بھی ان کے امتی ہیں۔ ہم کو ان کی سنتوں پر چلنا چاہیے جب کہ ہمارے ہاں کے مرد اس بات کو اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ بیوی کی گھریلو کاموں میں کوئی مدد کریں۔

دینا زحامد کراچی

حدیث نبوی

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

منافق کو سردار مت کہو اس لیے کہ ایسا ہوا تو تم اپنے رب کو ناراض کرو گے۔ سردار نہ کہو کا مطلب ہے کہ ایسا آدمی جو جانتے بوجھتے قول و عمل کا تضاد رکھتا ہے جس کو اسلام کی حقانیت پر یقین نہیں ہے، جس کو اسلامی تعلیمات کے بارے میں شک ہے ایسے آدمی کو اپنا سردار نہ بناؤ اگر ایسا کرو گے تو خدا کی ناراضگی مول لو گے اور جس سے خدا ناراض ہو جائے اس کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ دنیا میں بھی ذلت اور آخرت میں بھی تباہی۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

غیبت کا ایک کفارہ یہ ہے کہ آدمی دعائے مغفرت کرے اس شخص کے لیے جس کی اس نے غیبت کی ہے اور یوں کہے کہ اے اللہ تو میری اور اس کی مغفرت فرما۔ اگر وہ شخص موجود ہے اور اس سے اپنا جرم معاف کرایا جا سکتا ہے تو معاف کرا لے۔ اگر معافی کا کوئی امکان باقی نہ رہا ہو اس کے مر جانے کی وجہ سے یا دور دراز علاقوں میں جا بسنے کی وجہ سے تو پھر اس کے لیے دعائے مغفرت کے سوا کوئی راہ نہیں۔

ناصر ادریس جڑانوالہ

دو خُلق

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا دو خلق ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ ایک سخاوت اور دوسرا نیک خوئی۔

اور دو خلق ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے ایک بخل اور دوسرا بد خوئی۔

روبینہ ناز۔ شاہینہ ناز

موتی مالا

- انسان علم کا بہت بڑا بوجھ اٹھانے کے باوجود خود کو پھولوں کی طرح محسوس کرتا ہے
- قسمت پتھر کے مانند نہیں ہے کہ بدل نہیں سکتی۔
- کثرت گو کی زبان تو زندہ ہوتی ہے لیکن دل مردہ ہوتا ہے۔
- تعلیم انسان کے لیے وہ حیثیت رکھتی ہے جو سنگ مرمر کے ٹکڑے کے لیے فن سنگ تراشی۔
- غلامی کے چاہے کتنے ہی حسین نام کیوں نہ رکھے جائیں، غلامی بہر حال غلامی ہے۔

منزہ اختر گوجرانوالہ

ماں کی اطاعت

ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ابو اسحاقؒ رحمۃ اللہ علیہ کی داڑھی مبارک یاقوت و جواہرات سے مرصع ہے۔ صبح ہوئی تو اس شخص نے حضرت ابو اسحاقؒ سے اپنا خواب بیان کیا۔ آپ روتے ہوئے فرمانے لگے "تو نے سچ کہا۔ کل میں نے اپنی والدہ ماجدہ کے قدم چومے تھے۔ اور یقیناً اسی کی بدولت مرتبہ حاصل ہوا ہے۔"

کلثوم مشتاق کوھلی سیالکوٹ

فیثا غورث نے کہا

- ★ ایسے شخص کی صحبت میں نہ بیٹھو جس کی شہرت اس کے برے اعمال کی وجہ سے داغدار ہو اور جسے لوگ پیٹھ پیچھے برا کہتے ہوں۔
- ★ عام آدمیوں کے پیچھے مت چلو۔ صرف دانشمندوں کی پیروی کرو
- ★ دوسروں کے گناہوں کو معاف کر دو مگر اپنے گناہوں کو معاف نہ کرو

شبانہ بٹالوی

والدین کی نافرمانی

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ فرماتے ہیں کہ "علقمہ نامی ایک شخص جو نماز روزہ کا بہت پابند تھا، جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس کے منہ سے باوجود تلقین کے کلمہ شہادت جاری نہ ہوتا تھا۔ علقمہ کی بیوی نے آنحضورؐ کی خدمت میں ایک آدمی بھیج کر اس واقعہ کی اطلاع کرائی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا۔

"علقمہ کے والدین زندہ ہیں یا نہیں؟"

معلوم ہوا کہ صرف والدہ زندہ ہیں اور وہ علقمہ سے ناراض ہیں۔ آپ ان کی والدہ سے ملے۔ آپ نے علقمہ کے بارے میں دریافت کیا۔ والدہ بولیں۔

"علقمہ نہایت نیک ہے لیکن بیوی کے مقابلہ میں ہمیشہ میری نافرمانی کرتا ہے۔ اس لیے میں اس سے ناراض ہوں۔"

آپ نے کہا کہ اگر اس کی خطا معاف کر دے تو یہ اس کی بہتری ہے" مگر اس نے انکار کر دیا۔ تب آپ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا۔ "لکڑیاں اکٹھی کرو اور اس میں آگ لگا کر علقمہ کو اس میں ڈال دو۔"

بڑھیا یہ سن کر گھبرا گئی کہ اس کے بیٹے کو آگ میں ڈال کر جلا دیا جائے گا۔

آنحضورؐ نے فرمایا۔ "ہاں! اللہ کے عذاب کے مقابلے میں ہمارا عذاب ہلکا ہے۔ خدا کی قسم جب تو اس سے ناراض ہو گئی۔ اس کا نماز، روزہ، صدقہ کچھ قبول نہیں ہو گا۔"

بڑھیا فوراً بولی۔ "آپؐ کو گواہ کرتی ہوں کہ میں نے علقمہ کو معاف کر دیا ہے۔"

آپؐ نے لوگوں کو خطاب کر کے کہا۔ "دیکھو علقمہ کی زبان سے کلمہ جاری ہوا کہ نہیں؟"

سب نے کہا کہ اب علقمہ کی زبان پر کلمہ جاری ہے۔ آپؐ نے اسے غسل دینے کا حکم دیا۔ اور تجہیز و تکفین کے بعد آپؐ گھر لوٹ آئے۔

(لوبیہ حیدر۔ جام پور)

بندہ و بندہ نواز

دوسرے اسلامی خلیفہ فاروق اعظمؓ ایک رات گشت پر تھے۔ اچانک ایک گھر سے گانے کی آواز آئی۔ حضرت فاروقؓ پچھواڑے کی دیوار سے گھر میں کود گئے۔ گھر میں ایک مرد زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک عورت تھی اور قریب ہی شراب رکھی تھی۔ حضرت فاروقؓ نے کہا۔

"اے شخص! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ان گناہوں کے بعد اللہ تیری پردہ پوشی کرے گا؟ تو سزا کا مستحق ہے"۔

اس شخص نے جواب دیا۔ "اے امیر المومنین! دیکھیے سزا دینے میں جلدی نہ کیجیے۔ میں نے صرف ایک گناہ کیا ہے مگر آپ سے تین گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ پہلا گناہ، اللہ کہتا ہے کہ کسی کی ٹوہ میں نہ رہا کرو۔ آپ میری ٹوہ میں تھے۔ دوسرا گناہ، کسی کے گھر میں پچھواڑے کے دروازے سے داخل نہیں ہونا چاہیے۔ مگر آپ آئے تیسرا گناہ، آپ اجازت کے بغیر میرے گھر میں گھسے"۔

یہ سن کر فاروق اعظمؓ پر خوف طاری ہو گیا اور واپس پلٹ آئے۔

محبت

محبت طویل قربت کا ردعمل نہیں۔ یہ تو وحی کی طرح ہماری روحوں میں اتاری جاتی ہے۔ یہ تو اک احساس ہے جو محسوسات سے ماورا ہے۔ یہ احساس روحانی ہم آہنگی سے جنم لیتا ہے۔ ہم جذبۂ محبت کی تخلیق پر قادر نہیں۔ اسے ایک مدت تو کیا صدیوں میں بھی تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔

(خلیل جبران)

(غازیہ ندیم لوٹنی۔ کراچی)

☆

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

وطن دوست خدا دوست

نواب مشتاق احمد خان حیدر آباد (دکن) کا بیان ہے کہ ایک بڑھیا اپنی گٹھڑی لیے ہوئے ان کے فرسٹ کلاس ڈبے میں داخل ہوئی۔ کچھ دیر بعد ایک ٹکٹ چیکر نے آکر سب کے ٹکٹ دیکھے۔ یہ قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ ان دنوں درجہ اول اور سوئم میں کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی لیکن بلا ٹکٹ سفر کرنے پر۔ پوچھ گچھ ضرور ہوتی تھی۔ بڑھیا کی باری آئی تو اس نے ٹکٹ چیکر سے التجا کرتے ہوئے کہا۔ بیٹا! میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر آئی ہوں۔ میری کل کائنات اب صرف یہ گٹھڑی ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔ نواب صاحب خود ایک ریلوے افسر رہ چکے تھے۔ وہ خاموشی سے مشاہدہ کرتے رہے کہ دیکھیں چیکر کیا کرتا ہے۔ چیکر نے جو کچھ کیا عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے اپنی کاپی سے رسید کاٹی اور رندھی ہوئی آواز میں بڑھیا کو جواب دیا۔

”اماں! مجھے معلوم ہے کہ تم کتنی مظلوم ہو مگر تم ہی بتاؤ ٹکٹ کے بغیر ریل میں سفر کرنے سے پاکستان کیسے چلے گا جس کے لیے تم نے اور میں نے بڑی قربانیاں دی ہیں، اس لیے رسید تو بنے گی تاکہ ملک کا نقصان نہ ہو البتہ اس کی رقم میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔“

قندیل وفا — کنڈیارو

کھانے کا کھانا

قائداعظم محمد علی جناح جب گورنر جنرل مقرر ہوئے تو ان کی میز پر زیادہ کھانے کبھی نظر نہیں آتے تھے۔ وہ اکثر کہتے ”جب میری قوم کے افراد ایک وقت کا کھانا بھی بمشکل کھاتے ہیں تو پھر مجھے طرح طرح کے کھانے پکوا کر کھانا زیب نہیں دیتا۔“

ایک دفعہ مسٹر محمود الحسن آپ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ آپ نے انتہائی معمولی کھانا کھایا جب کہ محمود الحسن کافی دیر تک کھاتے رہے۔ اسی دوران وہ قائداعظم سے بولے

”آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔“

قائداعظمؒ نے جواب دیا۔

”دنیا والے اسی لیے تکلیفوں میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ کھانا بہت زیادہ کھاتے ہیں۔“

رفیق عابی ۔ وزیر آباد

دلیل

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے مسجد اقصیٰ کا دروازہ تعمیر کروایا۔ حجاج نے اس کے سامنے ایک دوسرا باب ازراہ عقیدت تعمیر کرایا۔

ایک مرتبہ بجلی گری اور اس نے عبدالملک کے بنائے ہوئے دروازے کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ لیکن حجاج بن یوسف کا بنایا ہوا دروازہ صحیح سلامت رہا اور اسے آنچ بھی نہ آئی ۔ یہ بات عبدالملک کو گراں گزری۔ حجاج نے ایک مراسلہ بھیجا جس میں تحریر تھا۔

”ہم دونوں ابن آدم (ہابیل قابیل) کی طرح ہیں کہ ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی نا قبول۔“

یہ پڑھ کر عبدالملک کا صدمہ جاتا رہا۔ وہ خوش ہو گیا۔

نوید اختر ۔ راولپنڈی

دیانت داری

وکیل کی حیثیت سے قائداعظم محمد علی جناح بہت دیانت دار تھے۔ انہوں نے اپنی فیس پندرہ سو روپے روزانہ سے کبھی زیادہ نہیں لی۔ اس دیانتداری کی تعریف ان کے ہندو دوستوں نے بھی کی ہے۔ لاہور کے مشہور وکیل اور سیاسی لیڈر دیوان چمن لال نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص محمد علی جناح کے پاس آیا اور کہا کہ میرے مقدمے کے کاغذات پڑھ کر اس پر رائے دیں۔ کاغذات بہت تھے اور اس قسم کے معاملوں میں وکیل فی گھنٹہ فیس لیا کرتے تھے۔ جب حساب لگایا گیا تو کافی رقم بنتی تھی لیکن موکل نے صرف دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا چنانچہ قائداعظم نے کاغذات پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اس شخص نے کہا آپ کاغذات پڑھنا شروع کر دیں اور جب رقم ختم ہو جائے تو جہاں تک پڑھا ہو اس پر رائے دے دیں۔ اس پر محمد علی جناح راضی ہو گئے لیکن کاغذات پڑھنے میں جو وقت صرف ہوا اس کا معاوضہ صرف ساڑھے تین ہزار روپے ہوتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے رائے دے دی اور باقی رقم اس شخص کو واپس کر دی۔

نوید اختر ۔ راولپنڈی

نیابت

حجاج بن یوسف ایک دن اپنے مصاحبوں سے کہنے لگا۔

”مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو میری نیابت کے فرائض انجام دے سکے مگر وہ شخص ایسا ہونا چاہیے کہ ہر وقت ترش رو نظر آئے، کم گو ہو، امین ہو اور چاہے کیسا ہی بڑا آدمی سفارش کرے وہ حق و انصاف کی راہ سے قدم نہ ہٹائے سفارش ماننے والے لوگ ریاست اور سیاست کے قابل نہیں ہوتے۔ ایک مصاحب نے عبدالرحمٰن عمرو تمیمی کا نام پیش کیا۔ حجاج نے تمیمی کو بلایا اور نیابت کی پیش کش کی۔ انہوں نے جواباً کہا۔

”میں یہ خدمت صرف اس صورت میں قبول کروں گا کہ اگر آپ کا لڑکا بھی کوئی قصور کرے گا تو میں اسے سزا دیے بغیر نہیں رہوں گا۔“

حجاج عمرو تمیمی کی اس بات سے خوش ہوا اور کہا۔

”خدا تم پر رحمت کرے، تم اس خدمت کے لیے نہایت موزوں ہو۔“

قدسیہ یاسمین ، بھکر

علم کی برتری

ایک دفعہ ہارون الرشید گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک گوشہ نشین عالم ابوالحسن علی بن حمزہ سے ملاقات ہو گئی۔ ہارون الرشید احتراماً گھوڑے سے نیچے اُتر آیا اور مصافحہ کر کے ان سے دربار میں نہ آنے کی شکایت کی۔ انہوں نے جواب دیا۔

”امیر المومنین! مطالعے میں مصروف رہتا ہوں۔ سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔“

”پھر اتنے علم کا فائدہ؟“ ہارون نے کہا۔

ابوالحسن بن علی بن حمزہ نے جواب دیا۔

”امیر المومنین ایک دو فائدے ہوں تو بتاؤں لیکن اس کا ایک یہی فائدہ کیا کم ہے کہ اس کی بدولت امیر المومنین گھوڑے سے اتر کر باادب مصافحہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔“

حمیرا راحت قریشی ۔ بیول

محمد ابن ابی عامر

قرطبہ کے ایک وکیل کا بیٹا عامر جس کے لیے دربار میں ایک غیر معمولی عرضی نویس کی ملازمت اس سنہری زینے پر پہلا قدم ثابت ہوئی جس کی معراج اسے وزارت عظمیٰ تک لے گئی۔ زمانہ طالب علمی میں مسجد قرطبہ کے صحن میں عامر کو اداس دیکھ کر اس کے دوستوں نے پوچھا۔ ”عامر! تم آج اتنے خاموش کیوں ہو؟“ اس نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت کے بارے میں سوچ رہا ہوں جب مجھے اندلس کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہو کر اس ملک کے تمام مسائل حل کرنا ہوں گے۔“ یہ سن کر عامر کے دوست بہت محظوظ ہوئے اور ہنسنے لگے۔ عامر نے کہا۔

”میں واقعی عنقریب اندلس کا وزیر اعظم ہونے کو ہوں ابھی وقت ہے جو کچھ مانگنا ہو مانگ لو۔“

عامر کے ایک دوست نے حالقہ کا قاضی بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دوسرے نے پولیس کا حاکم اعلیٰ بننے کا اظہار کیا۔ تیسرے نے قرطبہ کے باغات کا نگراں پسند کیا۔ چوتھے نے آگے بڑھ کر عامر کے گال پر طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا کہ اگر تمہاری اگلی بارہ پشتوں میں بھی کوئی وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوا تو تم مجھے الٹا گدھے پر سوار کر کے شہر کے بازاروں اور گلیوں میں پھروانا۔ کچھ مدت بعد عامر کا یہی دوست اس دن کو کوس رہا تھا جب اس نے یہ بات کہی تھی۔

* * *

ادارہ

مہندی کے ڈیزائن

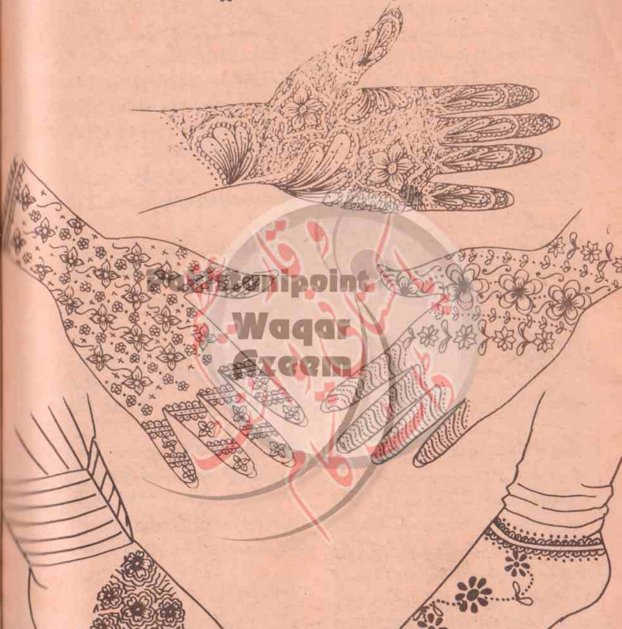

Pakistanipoint
Waqar
Azeem